Suspense Digest July 2018

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے ۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کردیں ۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

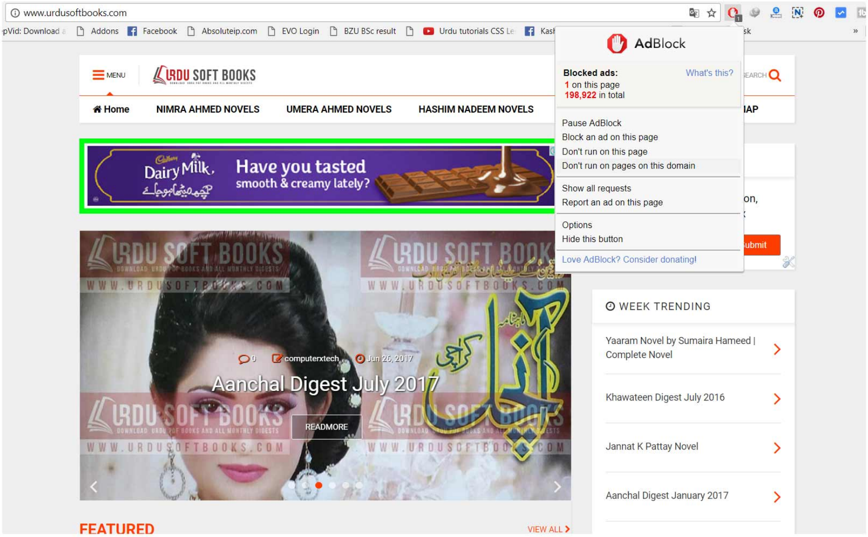

Click Here to Visit UrduSoftBooks.com

سسپنس ڈائجسٹ

CPNE | MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

انشائیہ — 07 — جون ایلیا

زندگی کا باریک بینی سے جائزہ لینے والے ایک صاحب نظر کی باتیں

آپ کے خط — 08 — مدیر اعلیٰ

سسپنس کی مجلس مشاورت وقارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

نااتفاقی — 16 — ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

چور مچائے شور — 63 — تنویر ریاض

بہت پیارے چال چلنے والے ایک شاطر کی بدحالی کا دلفریب نقشہ

فریب آرزو — 73 — ابوالفرح ہمایوں

بے بنیاد حقیقتوں کے مکر و فریب اور ڈھلتی عمر کی خوفناک بے بسی

آخری باب — 105 — زویا اعجاز

کبھی اپنوں اور کبھی غیروں سے ٹھکرائے جانے والے ایک معصوم انسان کا قصہ

رنگ آسماں — 78 — اے آر راجپوت

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

جلد 47 • شمارہ 07 جولائی 2018 • زرِ سالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail: jdpgroup@hotmail.com

وسیلہ — 121 — محمد الیاس
نفرت سے منہ پھیرنے والے جوڑے کی محبت بھری کہانی

آخر کار — 126 — مرزا امجد بیگ
بیگ صاحب کی ڈائری سے ایک معتبر تعلق کا عبرتناک انجام

شکنجہ — 151 — انجم فاروق ساحلی
قانون کے شکنجے میں پھنسنے والے ایک پولیس آفیسر کا دلچسپ ماجرا

محفلِ شعر و سخن — 160 — قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

دھتکار — 163 — جام مظہر سلیم
دھتکارے ہوئے لوگوں پر احسان جتانے والے ایک کم ظرف کی روداد

وقت — 172 — حسام بٹ
ایک عزم بازی گر کی بازی گری...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک طویل داستان

باریک بین — 199 — زبیر حسن
اپنی ہر سوچ پر خوب صورتی سے عمل کرنے والے ایک پرفیکشنسٹ کا قصہ

سفر بخیر — 207 — منظر امام
اپنی ذات اور حالات میں الجھے ایک مسافر کی بدگمانی

حضرت موسیٰ — 213 — رضوانہ ساجد
مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

پراسرار محافظ — 225 — نادیہ نور
ایک اسرار بھرے سفر کی بھیدوں بھری روداد

سنگین خاتمہ — 232 — نشور ہادی
ایک بے بنیاد بات پر زندگی کی عمارت کو متزلزل کرنے والے ضمیر فروش لوگوں کی عبرت اثر داستان

کترنیں — * — ادارہ
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے چٹکلے اقتباسات، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

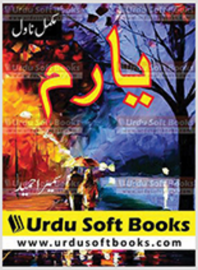

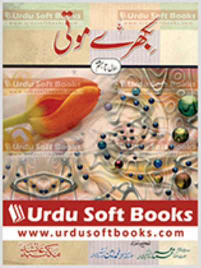

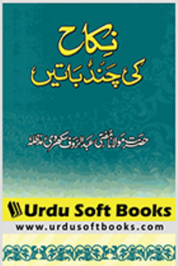

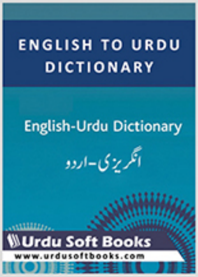

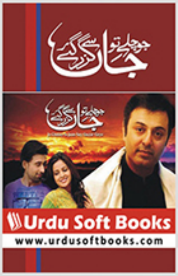

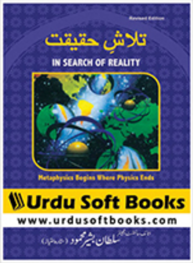

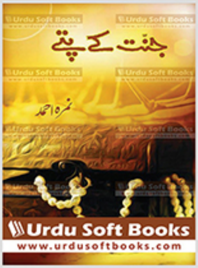

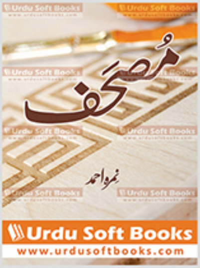

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

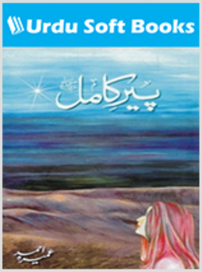

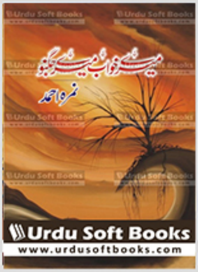

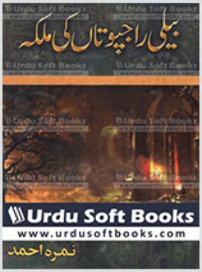

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

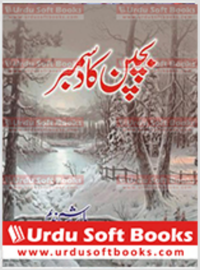

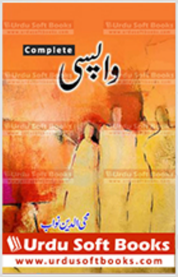

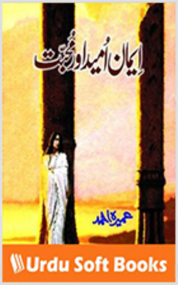

انشائیہ

جون ایلیا

ہمہ رُخ

ازل سے زمانے پر ایک ابدی استغراق مسلط ہے۔ لمحے اس ابدی استغراق میں گزر رہے ہیں، ساعتیں تمام ہو رہی ہیں اور وقت ہے کہ بہہ رہا ہے۔ زندگی نے دنوں اور راتوں کی ایک اور میعاد پوری کر لی۔

ہاں، ایک سال اور تاریخ کے وجود نے نگل لیا ہے۔

قوموں نے تجربات و مشاہدات کا کچھ زہر اور اکٹھا کر لیا ہے۔

لمحوں کے بے زنہار ریلے میں وجود کے کھوے چھل گئے ہیں مگر حیات کی تیز گامی برقرار ہے۔

میں ماضی کے راہ جو، کرسٹوفر کولمبس کی دریافت عظیم امریکا میں نئے سال کے حاشیے پر کھڑا ہوں۔ منفعت اور خسارے کی فردِ حساب لیے۔ دنوں اور راتوں سے میری اب تک کی جو معاملت رہی ہے، اس میں منافع کم اور خسارہ زیادہ ہے۔ بلکہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ کیا، میں اس خوش گمانی میں رہوں کہ یہ آنے والا سال تلافی کی کوئی صورت مجھے دکھائے گا؟ کیا میں اس سے کچھ امیدیں وابستہ کر لوں؟

لگتا یوں ہے کہ آنے والے دن بھی بہت واقعہ انگیز ہوں گے۔ یہ واقعات مہربان ہوں گے یا نامہربان؟ میں خود ہی جواب طلب ہوں اور خود ہی جواب دہ۔

سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے۔ ہر قدم پر یقین اور اعتماد کو ٹھیس کیوں لگتی ہے؟ اس قحط الرجال اور بے یقینی کی اس گرم بازاری کا کوئی تو سبب ہوگا۔ کیا انسان فطرتاً اچھے اور فطرتاً بُرے ہوتے ہیں۔ تاریخ کی درس گاہ نے جو علم ارزاں کیا ہے، اس کی روشنی میں سماجی قدروں اور رشتوں کا مسئلہ کچھ یوں ہی ہے۔

میں جس سماج میں ہوں، خود غرضی اور خود مرادی اس کا دستور اور حق تلفی وہاں کا رواج ہے۔ ایک شخص اپنی خوشی کے لیے دوسروں کا دل چیر دیتا ہے، اپنے فائدے کے لیے دوسرے کو مبتلائے فریب کرتا ہے اور ایک شخص پر ہی کیا موقوف! یہاں تو گروہ کے گروہ ایسے ایسے افعال میں ہمہ وقت وہمہ رخ مصروف ہیں۔ شاید یہ میدان تیار ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں دوڑنے والے دوسروں کو پیچھے دھکیلتے، پاؤں تلے روندتے آگے بڑھیں۔ اب کون سلامت روی اختیار کرے۔ نہیں، اب کوئی سلامت روی اختیار نہیں کرے گا، کوئی اپنا حقیقی کردار ادا نہیں کرے گا۔

یہاں جو برا نہیں، بے وقوف ہے۔ ''برے ہشیار'' کا بھی کچھ زیادہ قصور نہیں، وہ اپنی برائی میں ایک تہائی کا ہی ذمے دار ہے۔ باقی ذمے داری اس سماج کی ٹھہری جس کی بنیاد ہی شر پر رکھی گئی ہے۔ اب یہاں جو ہے، وہ ہونا تھا۔

برف وباراں کی شام کو اگر کوئی خستہ حال مسافر کپکپاتا، کھانستا تمہارے مسکن کے پاس سے گزرے تو اسے پناہ دو، اپنا کمبل اسے اُڑھا دو، اس کی مدارات کرو اور میری جان، اس کے لیے بھی تیار رہو کہ جب وہ واپس ہوگا تو تمہارے سینے میں چاقو اتار کے، کل اسباب میزبان ہی کے کمبل میں لپیٹ کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔

اسے آنے والی زمہریری شام کا خوف ستا رہا ہے اور آج شام جس کمبل نے اسے سردی سے پناہ دی ہے، وہ تمہارا ہے۔ اب اگر چلتے وقت وہ کچھ زادِ راہ اور یہ کمبل تم سے مانگتا ہے یا تم خود ہی یہ چیزیں اسے بخش دیتے ہو تو یہ احسان ہوگا۔

ایک مغربی دانشور کا کہنا ہے کہ انسانوں میں ابھی اتنی اہلیت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ احسان کا بوجھ سہار سکیں۔ وہ جو بولنا نہیں جانتا، اسے بولنا سکھاؤ، پر اس توقع کے ساتھ کہ جب وہ پہلی بار روانی سے بولے گا تو تمہیں گالی دے گا۔ جسے لکھنا نہیں آتا، اسے لکھنے کی مشق کراؤ، پر نفس کی اس آمادگی کے ساتھ کہ جب وہ اپنا نام لکھنا سیکھ لے گا تو سب سے پہلے تمہارے قتل کے محضر پر دستخط کرے گا۔

مگر یہ بددل ہونے کی بات نہیں۔ ایک انسان دوسرے انسان سے مایوس ہو سکتا ہے لیکن انسانیت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ انسان صرف زمانے میں سانس لیتے ہیں اور انسانیت زمانوں میں زندہ ہے... تو اب کہ جب ہم نئے سال کے حاشیوں پر کھڑے ہیں اور منفعت اور خسارے کی فردِ حساب ہمارے ہاتھوں میں ہے تو ہم انسانیت کے بارے میں سوچیں جو زمانوں میں زندہ تھی اور زندہ رہے گی!

☆☆☆

آپ کے خط

عزیزان من
السلام علیکم

جولائی 2018ء کا دلفریب شمارہ عید کی خوشیاں لیے حاضر ہے، لیجیے جناب سورج کی غضب ناکی اور بجلی کے محکمے کی بے حسی کے باوجود مسلمانوں نے رمضان المبارک کے فیوض و برکات سے دامن بھر لیے۔ اللہ تعالیٰ ہماری عبادتوں کو قبول فرمائے اور عید کا دن جو روزے داروں کے لیے انعام کے طور پر عنایت کیا، مکمل خوشیوں کے ساتھ منانا نصیب ہو۔ عید کی اپنی ایک رونق ہوتی ہے مگر ہمارے ملکی، معاشرتی حالات اور ہمارے اپنے رویے رفتہ رفتہ اس نہج پر آ گئے ہیں کہ اب عید کی رونقیں بھی کچھ ماند پڑتی جا رہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ پہلے ہمارے بزرگ ان خاص تہواروں کی اہمیت سے بچوں کو آگاہ کرتے رہتے تھے جبکہ آج کل کے والدین اپنی مشینی زندگی، بے تحاشا مصروفیات اور بیزاری کے سبب اس طرف سے غفلت برت رہے ہیں کہ بچوں کو ماہ رمضان اور عید کی خاص الخاص اہمیت کا ادراک کرا سکیں۔ بہرحال جو بھی ہے جس طرح ہمیں اپنے بچپن میں عید کی اہمیت اور خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ بالکل یہی خوشیوں بھرا احساس ہمیں اپنی نئی نسل میں بھی منتقل کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی ہمیں امید ہے کہ اپنے اردگرد پیشہ ور بھکاریوں سے ہٹ کر آپ نے سفید پوش خاموش لوگوں کا بھی بھرم رکھتے ہوئے انہیں بھی اپنی خوشیوں میں شامل کیا ہوگا۔ ادارے کی جانب سے تمام اہالیان وطن کو عیدالفطر کی ڈھیروں میٹھی میٹھی مبارک باد قبول ہو۔ عید کی گہما گہمی کم ہوگی، تو الیکشن کا ہنگامہ عروج پر پہنچ چکا ہوگا۔ انتخابات کی تاریخ آ چکی ہے اور تمام سیاسی بازیگر اپنی اپنی بساط کے مطابق ایک دلچسپ انوکھی بساط بچھائے بیٹھے ہیں، اگرچہ انتخابات کی تیاریاں اپنی جگہ مگر واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کی نااہلی اور ڈھٹائی اپنی جگہ بدستور اپنی قائم ہے۔ کیونکہ ان کے پاس U.C کا بجٹ کھانے کا ہر ہتھکنڈا موجود ہے۔ گندگی اگلتی سڑکیں اور گٹر اپنی حالت پر آج بھی نوحہ کناں ہیں جبکہ از خود پیدا کیے جانے والے پانی کے بحران نے واٹر بورڈ اور ٹینکر مافیا کی چاندی کرادی ہے حالانکہ سپریم کورٹ نے عوام کے ریلیف کے لیے ایمرجنسی سیل قائم کرنے کا حکم دیا۔ جہاں کوئی فون اٹھانے کی بھی زحمت تک گوارا نہیں کرتا۔ اف...... اف...... کس کس بات کو رویا جائے بہرحال عید کے دلکش لمحات میں کچھ دیر کے لیے تمام غموں کو بھلا کر دوست دشمن سب سے ان خوشیوں کو بانٹتے ہوئے ہمیں بھی اپنی بزم کی جانب پیش قدمی کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے جہاں اتنے پیارے ساتھی ہمارے منتظر ہیں۔

✠ عبدالجبار رومی انصاری، بورے والا سے نامہ لے کر حاضر ہیں ”سبز لاکٹ گلے میں موتیوں کا ہار ہے، سرخ ہونٹ کا جل نینوں کا خوب سنگھار ہے، بننے سنورنے کی مشکل سے فرصت ملی ہے لڑکی کو۔ مجبوری کا نام شکریہ ہے صفحات اگر کم ہو گئے، کوئی بات نہیں سسپنس ہم تو ہر دم ہی تیرے ہو گئے اور تعلیم کا جو حال ہے، بس کچھ نہ پوچھو وہ تعلیم وطن میں کاروبار بن گئی۔ سرکاری پرائیویٹ کی مذاق بن گئی۔ نصاب میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا بنیاد جو پڑی تو سب کھوکھلی بن گئی۔ ام عبداللہ بھی پراثر تبصرہ کر رہی ہیں، مبارک ہو صدر محفل بن گئی ہیں۔ دوسرے نمبر پہ جو تبصرہ جاں ہوئے ہیں، منشی عزیز مئے نے بھی کئی زاویے ملا دیے ہیں۔ کسی کا بھی تبصرہ کچھ خاص نہیں ہوتا۔ کسی کے پلے تو کچھ خاص نہیں ہوتا، سرجی کی تنگ ودو بعد جاں گسل دیکھی، کسی کے پلے تو کچھ ڈالا کرو سرجی، جب بھی دیکھی ناک پہ پڑی بل دیکھی، ڈھیروں مبارک باد ہو تمہیں۔ محمد صفدر معاویہ، خوشیاں لے کر محمد زین علی جو گھر آ گیا۔ کلی پھول بنی تو چار سو مہکی۔ ایمانے زارا شاہ محفل میں خوب چہکی۔ بھائی ریاض بٹ چھوڑ و حکومت کے دعوؤں کا کیا بھرم رکھنا۔ وعدہ وفا نہیں کرنا مہنگائی سے عوام کی ناک میں دم رکھنا، زرین آفریدی حالات سے باخبری ضروری ہے۔ دنیا کے درد جان کر کچھ ہمدردی بھی ضروری ہے۔ چلبلی ہیر کے رانجھے کی سب کو ہی فکر پڑی ہے۔ نہ دیکھو نجھی، جنگل، بیلے اس نے تو شہر میں گنار پکڑی ہے۔ میرا خط دیر سے ہی لگا پھر بھی محبت ہے سسپنس کی، ورنہ محکمۂ ڈاک کی طرف سے تو فکر لگی رہتی ہے۔ پڑھے بغیر سکون نہیں بس سسپنس کا دیدار ہو جائے۔ ایسی محبت ناہید یوسف؟ کاش ہر کوئی اس کا خریدار ہو جائے۔ صبا سحر کی پہلی کاوش بھی سحرانگیز ٹھہری۔ دل میں جذبہ جنوں ہو تو لکھنے کا شوق بڑھ جاتا ہے۔ کہانیوں میں کانٹے کی طرح آتے ہیں، جو کانٹے تھے کانٹا بن کے نکل گئے، جو نامور تھے خان خاناں ہو گئے، مکافات عمل سے بھی انکار ممکن نہیں، خاموش دشمنی کا وہ آخر شکار ہو گئے۔ کانٹے زبردست کہانی اچھی رہی اور رنگ آسماں دکھاتا ہے کیسے کیسے رنگ، رنگ آسماں۔ اریبہ نے رہائی پائی۔ ریتارا کاشیوں کی ہے مسیحائی ہوئی، تو فرنگی جنگ تیار ہے پرتاب سے ہو کے بدگماں، کہانی بے حد عمدہ جا رہی ہے۔ مک مکا پر یہی کہوں گا کہ وہ اچھا ہوا چودھری مک مکا کی دیت

پر آیا۔ بشریٰ کی جان گئی سادہ لوح اصغر کا گھر بسایا، انصاف کی ریت نبھائی اور بہت اچھی۔ کسی کو انصاف دلایا تو کسی کو کڑی سزا سے بچایا۔ پرفیومز کی بوتلوا نڈیلتے علی بھی وقت میں عمدہ پرفارم دے رہے ہیں۔ رگ و پے میں دوڑ جائے سنسنی وقت کی چال ہے، ساحل سمندر پہ آئی عورت جانے کیوں بے حال ہے، ڈیلفی سے بچتا علی معطر جاں پینا کا ہم خیال ہے، شارو کا تصور بھی دامن گیر ہے اور دشمنوں کا بھی جال ہے۔ آخری کہانی کفارہ نے بھی دکھی تو کیا مگر، گناہ گار توبہ نہ کرے تو برباد ہوتا ہے، اک عمل ہے مکافات کا، اطہر کی طرح دو چار ہوتا ہے، مونا و بہزاد بھی بربادی میں پیچھے نہ رہے، ہو کفارہ ادا تو عروبہ کی طرح گھر آباد ہوتا ہے۔ سسپنس کلاسک کی کہانی آخری کیل بھی اچھی رہی۔ دولت ہتھیانے والے مر گئے۔ قناعت پسند بھائی نے کچھ ڈالر رکھے اور باقی کول کے ساتھ جلا دیے۔ آخری گھر بہت پسند آئی۔ بدنیتی در آئی۔ آخری گھر بنایا تو مخلصی باقی نہ رہی، سالوں کام کا اسے تو اچھا صلہ دیا گیا۔ راحت نصیب ہی نہ تھی آخری گھر بنایا تو......

''حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بہت ہی پیارا اور دل و جان سے پڑھ رہے ہیں اس کی ہر سطر ہی نصیحت آموز ہے۔ لاڈلی قوم کے کیا کیا ناز نخرے تھے، فرعون سے نجات پا کے ملے دن سنہرے تھے، ٹھنڈے چشمے، بادل سایہ من و سلویٰ پایا تھا، پھر بھی پیارے موسیٰؑ کو شکوے ہر دم کرتے تھے۔''

✿ چلبلی ہیر کی آمد جھنگ صدر سے ''مرحبا اسٹاف سسپنس ڈائجسٹ۔ 15 مئی کو ہی جون کا سسپنس ہمیں مل گیا۔ رمضان کریم شروع ہونے سے پہلے اپنا پیارا ڈائجسٹ لے کر بیٹھ گئے۔ دو دن میں خاصا مطالعہ بھی کرلیا۔ انشائیہ میں جون ایلیا جی کے امید پر مبنی، آمریت اور جمہوریت کے مابین فرق کو نمایاں کرتی ایک پرفکر تحریر پیش کی۔ اداریہ کافی طویل اور پراثر تھا۔ ساتھ سسپنس ڈائجسٹ کے صفحات بھی کم کردیے۔ پیاری مدیرہ آپ کچھ رحم کرتیں۔ صفحات کم نہ کرنے کی سفارش ہی کردیتیں۔ ادارہ قیمت تو پہلے ہی بڑھا چکا ہے (اسے مہنگائی کے ہاتھوں مجبوری سمجھ کر قبول کر لیجیے) خطوط کی محفل پر نظر پڑی تو عبداللہ جی کی اماں صاحبہ نے آتے ہی صدارت پر حق جمالیا تبصرہ واقعی زبردست تھا۔ مبارک باد، ام عبداللہ...... بہنا جی ہیر تو میرا اصل نام ہے بس یہ چلبلی کا اضافہ آپ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کے لیے کیا ہے کیونکہ کسی کو ہنسانا بھی ایک عبادت ہے۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ منشی محمد عزیز مئے، چلبلی ہیر تنقید سننے کا بھی حوصلہ رکھتی ہے۔ رمضان پاشا جی تبصرہ پسند کرنے کے لیے نوازش۔ بابر عباس انکل ہیر سڑیل لوگوں سے دور رہتی ہے۔ محمد رفاقت کا بھی شکریہ۔ محمد صفدر بھائی بیٹے کی مبارک باد۔ ایمانے زارا شاہ آپ کی محبتوں کی مشکور ہوں ڈیئر۔ ریاض بٹ جی، زرین آفریدی جی اور ادریس احمد جی، انجم فاروق ساحلی، ناہید یوسف، صبا سحر اور امتیاز احمد سب کے تبصرے بہترین تھے۔ عبدالجبار رومی صاحب آپ کے والد کے انتقال کا سن کر دکھ ہوا۔ اسٹوری کی ابتدا سسپنس کلاسک کے سلسلے آخری کیل سے کی۔ اثر نعمانی صاحب بہترین لکھتے تھے۔ سسپنس اور تھرل سے بھرپور زبردست۔ ملک صفدر حیات کی مک مکا بہت شاندار تھی جیسے کوئی پنجابی مووی دیکھ رہے ہوں۔ ازدواجی دلدل، انجم فاروق ساحلی کی کہانی پسند آئی۔ ہنری اور ایڈونا ایک دوسرے کو مارنے کے طریقوں میں زندگی گزار رہے تھے۔ رنگ آسماں اے آر راجپوت اور حسام بٹ کی وقت دونوں کے صفحات بہت ہی کم کردیے۔ داستانیں دونوں ہی بس گزارے لائق تھیں۔ آپ نے مزید تین چار سال بڑھا دیے۔ بچھو رام اور نجو بائی کی جنگ کیا رنگ لاتی ہے۔ آگے پتا چلے گا۔ اسد علی بھی جرمن شیفرڈ اور پینا کے درمیان پھنسا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی کانٹے متاثر کن تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مکافات عمل کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ کوئی اپنا بویا ہوا کاٹے بغیر اس دنیا سے نہیں جاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چھٹا حصہ پڑھا، اپنے علم میں اضافہ کیا۔ ماشاءاللہ رضوانہ ساجد جی۔ کفارہ اسما قادری صاحبہ ویلڈن آخری صفحات کا حق ادا کرتی داستان۔ بہت لاجواب۔ مونا اور عروبہ کے کام اور انجام کی بہترین سبق آموز کہانی۔ عروبہ کے لالچ اور کم ظرفی نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تو مونا کے گھمنڈ نے اس کو ہوش سے بیگانہ کردیا۔ انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ اسے توبہ کی توفیق ہوجائے اور وہ اپنے رب کے حضور سربسجود ہو کر اس سے اپنی غلطیوں اور گناہوں کی معافی طلب کرلے۔''

✿ محمد رفاقت، نواب آباد، واہ کینٹ سے محفل میں شریک ہیں ''شمارہ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے جون ایلیا کی امید پڑھی۔ بات تو ٹھیک ہی ہے ہم نے جمہوریت، آمریت اور بادشاہت یہ سب تجربے کرلیے ہیں مگر دل کسی سے بھی مطمئن نہیں ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلی کہانی کانٹے پڑھی جو ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے تحریر کی۔ اکبر بادشاہ اور خان خاناں کی زندگی پر تحریر تھی۔ بہت ہی اچھی تاریخی کہانی ہے، پسند آئی۔ رنگ آسماں کا آٹھواں حصہ۔ آخری گھر، خوف کا حصار، تیسری قبر، قاتل کمیٹی، رضوانہ ساجد کی ''حضرت موسیٰ علیہ السلام''، محفل شعر و سخن۔ سب سسپنس کی مقبولیت میں اضافہ کررہے ہیں اور جو خط قارئین ارسال کرتے ہیں ان سے بھی رسالے کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس رسالے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ اپنے وقت پر مل جاتا ہے اور میں تو اس کا مستقل چاہنے والا بن گیا ہوں اور ہر بار خط اس میں میرا ہوتا ہے جس سے مجھے بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ آپ میرا خیال رکھتے ہیں۔'' (یہ تو محبت سے محبت کی بات ہوتی ہے۔ آپ کو سسپنس پسند ہے اور سسپنس کو آپ کی دوستی!)

✵ محمد شاہد نواز، خانیوال سے شریک محفل ہیں ”پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ (بہت دیر کی مہرباں آتے آتے..... خوش آمدید) سسپنس کی قیمت میں پورے 10 روپے اضافے کے بعد اس بار سنا ہے کہ اس کے اوراق میں کمی کردی گئی ہے۔ بھئی یہ تو زیادتی ہے۔ (بے شک ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں مگر آسمان کی جانب گامزن مہنگائی نے ہر ایک کی کمر توڑ دی ہے۔ کاغذ کی قیمتوں میں اضافے کے سبب ایسا کیا گیا) ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی کافی دن سے پڑھنے کو نہیں مل رہی، خیریت تو ہے نا؟ منظر امام کافی پر فکر اور معاشرتی رویوں کو اجاگر کرتی کہانیاں لکھتے ہیں۔ سسپنس کے تمام لکھاری ماشاءاللہ بہت محنت اور جاں فشانی سے ہمارے لیے بامقصد اور اصلاحی کہانیاں لکھتے ہیں۔ میری طرف سے تمام لکھاریوں کا بے حد شکریہ۔ مریم کے خان کی کہانیاں بھی غائب ہیں۔ گلوبلائزیشن ہمارے کرپٹ سیاست دانوں اور جاگیرداروں کا منہ کالا کرتی ایک پر فکر تحریر تھی۔ قاتل کمیٹی نے اپنی انا کو قائم رکھنے کے لیے ماموں کو موت کی آغوش میں سلادیا۔ مجھے یہ بات آج تک سمجھ نہیں آئی کہ جس چاند پر دنیا نصف صدی پہلے پہنچ چکی ہے، وہ آج تک ہمیں ٹھیک سے نظر بھی نہیں آیا۔ BSC کے پریکٹیکلز ہو رہے ہیں اس لیے باقی رسالہ ابھی نہیں پڑھ سکا۔“ (بھئی سسپنس سے محبت اپنی جگہ مگر تعلیم پر خصوصی توجہ پہلی ترجیح ہونی چاہیے)

✵ محمد صفدر معاویہ کا خط ضلع خانیوال سے ”جون کا ماہنامہ سسپنس تیسرے روز ے کو صدر بازار میں یاسین خان سے لیا۔ ماڈل کو عید کی مناسبت سے تیار کیا گیا۔ محترم جون ایلیا کی امید تک پہنچے تو آج صاحب بڑے گرم نظر آئے۔ ایلیا جی کی کہی سب باتیں آج سچ ثابت ہو رہی ہیں۔ دراصل وہ ساری زندگی حقیقت بیان کرتے رہے۔ آپ کا اداریہ پڑھا آپ کی صفحات کم کرنے والی بات ہم قبول تو کرلیں گے، پر ایک ساتھ 32 صفحات کم کر دیے۔ بہرحال پھر بھی ہم آپ کے ممنون ہیں کہ ایسا معیاری ماہنامہ پڑھنے کو مل رہا ہے۔ سچ کہا ہے یہاں ہر بندہ صرف کمانے کے چکر میں ہے، کوئی ڈاکٹر ہو یا تاجر ہو یا کوئی اسکول والا ہو، میڈیکل والا ہو پر ایک دن تو سب کے سامنے اپنا کھرا کھوٹا عیاں ہو جائے، وہ دن ان کی بربادی کا ہوگا۔ کبھی کوئی اتنا کما کے قبر میں لے گیا کہ چلو فرشتوں کو دے کر جان چھڑالیں گے۔ محفل میں آئے، ام عبداللہ بہترین تبصرے کے ساتھ محفل کی صدارت کر رہی ہیں۔ مبارک ہو جی۔ منشی جی خیر تسی نائب ہی ہو۔ فضل عباس، بابر عباس کا بھی خوب صورت اندازِ بیاں۔ رمضان کا بھی خوب تبصرہ۔ کتنی مٹھائی چاہیے، گلاب جامن ہوں، رس گلے یا پھر برفی ہو، بندہ حاضر ہے۔ ایمانے کا تبصرہ بھی اچھا رہا۔ عبدالجبار رومی انصاری صاحب اللہ پاک آپ کے والد کو جنت الفردوس میں مقام اعلیٰ نصیب کرے۔ کانٹے ڈاکٹر ساجد امجد کی بہترین تحریر رہی۔ تاریخ کے حوالے سے جو کچھ خان زماں اینڈ کمپنی نے خان خاناں کو رسوا کرنے کے لیے کیا وہی پلٹ کر ان پر آیا اور تمام دشمن موت سے ہمکنار ہوئے اور خان خاناں کا دامن صاف ہوا۔ اگرچہ وہ دنیا میں باقی نہ رہا سچ کہتے ہیں جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ منظر امام کی آخری گھر سبق آموز تحریر تھی۔ انسان کسی کا برا چاہتا ہے تو اس کا اپنا برا ہوتا ہے۔ تنویر ریاض کی خوف کا حصار اچھی رہی۔ اے آر راجپوت کی رنگ آسماں تیزی کے ساتھ منازل طے کر رہی ہے۔ سازشیں تیار ہو رہی ہیں پر ان کو تقدیر کے وار کا علم نہیں۔ شاہ زین رضوان کی تیسری قبر بھی اچھی رہی۔ میں آخر تک نہیں سوچ سکا کہ جارج کے ساتھ ایسا سلوک ہوگا۔ طیب سنجرانی کی قاتل کمیٹی نے ماموں کی جان لے لی۔ حیرانگی کی بات کہ آدھی رات کو چاند کہاں سے نظر آتا ہے۔ اللہ کا بہت کرم ہوا کہ اس دفعہ پورے ملک میں ایک دن ہی روزہ رکھا گیا۔ ملک صفدر حیات کی نمک حرام میں ملک صاحب نے چودھریوں کا سارا غرور ناک کے ذریعے نکال دیا۔ اگر غیرت مند ہوتا تو پہلے اصغر علی کے گھر قیامت نہ ٹوٹتی۔ انجم فاروق ساحلی کی دلدل میں میاں بیوی ہوشیار تھے۔ میاں کو تو قسمت بچا گئی آخری لمحوں میں محفل شعر و سخن بھی عمدہ رہی۔ علی اختر کی گلوبلائزیشن آج کی سیاست کے منہ پر تھپڑ تھا۔ وقت بھی اچھی جا رہی ہے۔ پتا نہیں آخر میں کون آگئی علی کی جاننے والی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو فرعون سے نجات مل گئی اور اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کر دیا، پر آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بھی سرکشی پر اتر آئی ہے۔ سسپنس کلاسک کی پہلی کہانی اثر نعمانی کی آخری کیل عمدہ رہی۔ حرام کا مال کسی کو نصیب نہ ہوا۔ اسما قادری کی کفارہ میں غم اور خوشی دونوں کے رنگ نمایاں رہے۔ حسد ایسی چیز ہے جو سب کچھ برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ اللہ پاک ذاکر انکل کو صحت کاملہ اور شفائے کلی عطا کرے آمین۔ اور سسپنس کے تمام افراد تمام قارئین اور اہلِ وطن کو دلی عید مبارک ہو۔“ (آپ سب کو بھی ہماری جانب سے عید کی ڈھیروں مبارک باد)

✵ زرین خان آفریدی، حیدرآباد سندھ سے شاملِ محفل ہیں ”ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ گرل نے سستا سا نیکلس سیٹ پہنا ہوا تھا۔ اس پر اترا بھی رہی تھی۔ انشایئے میں امید نظر آئی اور ہمارے پیارے وطن میں تو زور و شور سے اکھاڑ پچھاڑ بھی ہوئی ہے سیاست دانوں کے درمیان۔ بس دعا کی جاسکتی ہے۔ اللہ سائیں ہم پاکستانیوں پر رحم فرمائے۔ بزم دوستاں میں ہماری نئی دوست ام عبداللہ صدارت پر نظر آئیں۔ تبصرہ بھی منفرد انداز لیے ہوئے تھا۔ مبارک باد ڈیئر۔ آپ کی محبت کا بہت شکریہ میرا تبصرہ پسند آیا۔ چلبلی کے تبصرے پر مجھے ہنسی آگئی۔ واقعی بڑھاپے تک یہ نام ان کے ساتھ نتھی رہے گا۔ رمضان کریم کی بابرکت مصروفیات کے باعث سسپنس ڈائجسٹ کو زیادہ ٹائم نہیں دے پائی۔ اس وجہ سے معذرت۔ صرف سلسلہ وار داستانیں پڑھ پائی ہوں، دونوں مصنفین حسام بٹ اور اے آر راجپوت نے اچھی اقساط پیش

کیں۔ ویلڈن۔ انشاء اللہ اگلے ماہ فل تبصرہ دوں گی۔ آپ سب کو عید سعید کی مبارک باد۔ مراسلے بہت پسند آئے اور محفل شعر و سخن بھی لاجواب رہی۔ بہت بہت شکریہ ادارہ سسپنس ڈائجسٹ میرے انتخاب کو اعزازی پوزیشن دینے کے لیے۔“

✽ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کررہے ہیں ”ارے واہ سسپنس کلاسک، بہت خوب۔ آخر کار آپ نے سسپنس کلاسک کی ابتدا کر ہی دی۔ (کیوں نہ کرتے...... آپ کی فرمائش اور مرحوم مصنفین کو خراجِ تحسین اپنی جگہ) اہلِ محفل اور دیگر قارئین کو چاہیے کہ وہ ایڈیٹر صاحب کو دھڑا دھڑ شکریے کے خطوط ارسال کردیں۔ فہرست میں اسما قادری کا نام دیکھا تو آنکھوں کے سامنے ایک شاندار محل رقص کرنے لگا، ہائے شیش محل...... اس بار طبع زاد کہانیوں میں قیدی نے بہت متاثر کیا۔ آخری گھر بھی کافی اثر انگیز کہانی تھی۔ وقت اور رنگِ آسماں کے کیا ہی کہنے۔ ان دو کہانیوں نے نیندیں اڑا رکھی ہیں۔ کک مکا، صفدر حیات ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سرخرو رہے۔ قاتل کمیٹی، یہ کہانی رویت ہلال کمیٹی پر ایک پُرزور تازیانہ تھی۔ تیسری قبر بھی بڑی زوردار کہانی تھی۔ ازدواجی دلدل، پسند نہیں آئی۔ گلوبلائزیشن، یہ ایک بہت ہی پرانے موضوع کو نئے انداز میں لکھی ہے اور خوب لکھی ہے۔ علی اختر کو داد دیتا ہوں۔ اثر نعمانی کی کافی ساری کہانیاں پڑھ رکھی ہیں لیکن آخری مکمل پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ آپ نے یہ کہانی شائع کرکے میری دیرینہ آرزو پوری کی ہے۔ اس کے لیے خصوصی شکریہ...... (آپ خوش تو ہم خوش)۔ کفارہ، اس کہانی کی تعریف یہ ہے کہ اسے محترم اسما قادری صاحبہ نے تحریر کیا ہے۔ اشعار کی محفل کے تمام اشعار مجھے پسند آئے۔ خصوصاً شہریار خان، صفدر معاویہ، بابر عباس، ساجد انصاری اور مدحت صاحبہ کے اشعار دل کو بھائے۔ کترنیں بھی سب کی سب لاجواب تھیں۔ میری جانب سے سسپنس کے تمام کارکنوں کو درجہ بدرجہ سلام اور دعائیں۔ یہ جملہ تو آپ کبھی نہیں چھاپتے۔“ (اب چھاپ دیا...... اب تو خوش)

✽ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے عرض کررہے ہیں ”عرض یہ ہے کہ سسپنس ڈائجسٹ ملا مگر بہت ناتواں ناتواں لگا۔ اس ناتوانی کا تجسس ہوا کہ گرانی پیپر کا قضیہ ہے تو ہم اس پر یہی رائے بہتر سمجھتے ہیں کہ اگر مناسب سمجھیں تو قیمت تھوڑی اور بڑھا لیں صفحات وہی رہنے دیں، یعنی 290 تقریباً۔ (آپ کی پسندیدگی اور محبت ایک طرف مگر قارئین کی جیب کی اجازت ایک طرف۔ ساری باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے) گرمی نے ہوش ٹھکانے لگا دیے ہیں مگر روزہ دار پوری استقامت کے ساتھ روزے رکھ رہے ہیں۔ دن ہیں کہ پر لگا کر اڑ رہے ہیں۔ رمضان شریف کا انتظار سال بھر ہوتا ہے جب آتا ہے تو پلک جھپکتے ہی اختتام ہوجاتا ہے۔ ہماری طرف سے سسپنس پڑھنے والے تمام دوستوں کو پُرخلوص مبارک باد پیش ہے۔ سرورق پر ذاکر صاحب کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ روبہ صحت ہونے پر تہنیت کا اظہار کرتے ہیں۔ سرورق کے بعد انشائیہ سے مستفید ہوئے۔ سچ کہا امید ہے تو سب کچھ ہے، امید نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ناموں کی محفل میں سرفہرست ام عبداللہ تھیں۔ دیگر نئے و پرانے دوست بھی اپنی آراء سے آگاہی دے رہے تھے۔ اس کے بعد کانٹے ملاحظہ کی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی بہترین تحریر تھی جو تاریخ کے گمشدہ اوراق سے پردہ اٹھا رہے تھے۔ دوسری تحریر منظر امام صاحب کی آخری گھر تھی۔ ان کی ہر تحریر اثر پذیر ہوتی ہے۔ مختصر لفظوں میں بڑا پیغام دے جاتے ہیں۔ خوف کا حصار بھی بہتر تحریر تھی۔ رنگِ آسماں کا سفر بھی کامیابی سے جاری ہے۔ تیسری قبر اور قاتل کمیٹی اپنے انداز میں لکھی کہانیاں تھیں۔ ازدواجی دلدل بھی اچھی کہانی ثابت ہوئی۔ محفل شعر و سخن میں اچھے اور معیاری اشعار نے لطف دوبالا کردیا اور گلوبلائزیشن میں سیاسی بساطوں میں کیا کیا سیاسی چالیں ہوتی ہیں۔ پینترے بدلے جاتے ہیں، انسانی قدریں پامال ہوتی ہیں، انسانیت کی تذلیل کی جاتی ہے۔ محض جھوٹی شان بنانے کو...... یہی سب کہانی میں پیش کیا گیا۔ وقت بھی اچھے انداز میں سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ اندازہ ہے ابھی تادیر چلے گی۔ قیدی بھی اچھی لگی۔ ایمان کو نئی روشنی سے جلا دینے والی حضرت موسیٰؑ کی داستان بھی جاری ہے۔ کہنہ مشق لکھاری اثر نعمانی اور اسماء قادری کی دونوں تحریریں آخری صفحات کا حق ادا کرنے میں حق بجانب تھیں۔ بہترین تحریریں رہیں۔ کترنیں بھی حاصلِ مطالعہ رہیں۔ عیدالفطر کی مبارکباد تمام عالمِ اسلام کو پیش ہے۔“ (خیر مبارک)

✽ فضل عباس، بابر عباس، گلیانہ روڈ، کھاریاں سے نامہ لے کر حاضر ہیں ”سسپنس کا نیا شمارہ اپنی تمام تر خوب صورت رعنائیوں کے ساتھ سترہ مئی کو ملا یعنی پہلے روزے والے دن۔ سر آپ کو، سسپنس کے دیگر اراکین کو رمضان کی خوش گوار اور بابرکت خوشیاں بہت بہت مبارک ہوں اور دوسرے نمبر پر چونکہ آنے والا جولائی کا شمارہ عید کے قریب قریب ہوگا اس لیے آپ سب کو عید کی خوشیاں بھی بہت بہت مبارک ہوں اور سسپنس کے ذریعے ہی میں سسپنس کے تمام ساتھیوں کو بھی عید مبارک کہتا ہوں۔ سر جی سرورق کی چڑیل زیادہ پسند نہیں آئی۔ اس بار جون ایلیا مرحوم نے امید کا دیا جلایا ہوا تھا جس کی روشنی میں، میں اپنی خوب صورت محفل میں پہنچا تو آپ کو مہنگائی کا رونا روتے ہوئے پایا۔ سر جی افسوس صد افسوس آپ نے سسپنس کے صفحات کم کردیے ہیں۔ آپ سے عرض کیا تھا سسپنس کی قیمت بے شک سو روپے کردیں ہم نے لینا ہی لینا ہے مگر آپ نے قیمت بڑھانے کے بجائے سسپنس کے صفحات کم کردیے (کیونکہ حالات سے مقابلہ بہت ضروری تھا) اس بار کرسیِ صدارت پر ایک نیا نام ام عبداللہ یمنی جی کو باجی کہہ دیا اور اپنا خط پہلے نمبر پر کرلیا۔ (ایسا ہرگز نہیں ہوتا جیسا آپ سوچتے ہیں) صفدر

جی، بیٹی کی مبارک ہو، خدا نے رحمت کا فرشتہ آپ کے گھر بھیجا ہے۔ ایمانے زارا شاہ ڈر گئی ہیں کیا؟ ارے بی بی اچھے اچھے مجھ سے ڈرتے ہیں آپ بھلا کس کھیت کی گاجر ہیں۔ ادریس بھائی کیوں روکھا سوکھا تبصرہ لکھ مارتے ہو، بڑا ہی بے جان تبصرہ ہوتا ہے۔ کچھ رنگینی پیدا کریں، کچھ سنگینی پیدا کریں خط میں۔ چلبلی ہیر کیا انکل انکل لگا رکھا ہے ہر کسی کو انکل نہیں کہتے، زبان پر چھالے نکل آتے ہیں۔ آپ بھی بڑی وہ ہیں (یہ بھی خوب رہی...... انکل کو انکل نہیں تو کیا بولیں؟) کہانیوں کی شروعات ڈاکٹر صاحب کی خوب صورت تحریر جو اپنے اندر بہت سا اسرار لیے ہے اور خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ رنگِ آسماں کیا ونڈرفل کہانی ہے۔ وقت بڑی ٹھنڈی ٹھار جا رہی ہے۔ حسام بٹ صاحب کچھ کریں نہیں تو اس کو بند کر دیں۔ اس بار آخری صفحات پر اسما قادری صاحبہ کفارہ لے کر حاضر ہوئیں اور اس بار حق کفارہ ادا کر دیا ہے۔ ویل ڈن اسما قادری صاحبہ۔ آپ کی کفارہ ایک اچھی اور معیاری تحریر تھی اور اس کے لیے آپ داد کی مستحق ہیں۔ اس بار کے شروع کے صفحات ڈاکٹر ساجد امجد کے نام اور آئندہ ماہ علی اختر...... صاحب واہ کیا جوڑ ہے۔ خیر ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی کانٹے صحیح طرح کانٹے ثابت ہوئی۔ تاریخی لحاظ سے پسند آئی۔ بہت اچھے ڈاکٹر صاحب اور بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔ قاتل کمیٹی طیب سنجرانی کی ایک مختصر اچھی معیاری تحریر تھی، شاباش طیب سنجرانی صاحب۔ منظر امام صاحب ہر بار منفرد انداز کی تحریر کے ذریعے حاضر ہوتے ہیں اور یہی ایک اچھے رائٹر کی نشانی ہوتی ہے۔ منظر امام صاحب نے آخری گھر کے ذریعے متاثر کیا۔ واہ واہ منظر صاحب! کیا شعر ہے۔ اثر نعمانی صاحب ایک بڑا نام انہوں نے بڑی معیاری اور خوب صورت کہانیاں پڑھنے کو دی ہیں۔ بہرحال آخری کیل اثر نعمانی صاحب کی ایک اچھی تحریر تھی۔ علی اختر صاحب اس بار سیاست کی سیاہ کاریاں گلوبلائزیشن کی شکل میں لے کر آئے بہت اچھے علی اختر صاحب۔ گلوبلائزیشن اچھی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں صرف اپنے شعر پسند آئے، باقی ایویں ہی تھے۔ تنویر ریاض خوف کا حصار، شاہ زین رضوان تیسری قبر بھی اچھی تھیں جبکہ انجم فاروق ساحلی کی ازدواجی دلدل نے بور کیا۔ مک مکا حسام بٹ کی اچھی تحریر تھی۔ آخر میں ذکر کروں گا اس روشن تحریر کا جو دلوں کو منور کرتی ہے اور آنکھوں کو ٹھنڈک دیتی ہے۔ رضوانہ ساجد کی تحریر جو اللہ کے پیارے نبی کے حالاتِ زندگی بہتر انداز میں پیش کر رہی ہیں۔ ونڈرفل بہت اچھے رضوانہ جی، خدا آپ کو اس کا اجر دے (آمین) سر جی آخر میں پرانے دوستوں کو یاد کرتے ہوئے پکاروں گا جن میں بشریٰ افضل، اریبہ بخاری، سعدیہ شیخ، روبینہ نفیس انصاری، اعجاز احمد راحیل، ہمایوں سعید، تفسیر عباس بابر، قدرت اللہ نیازی، قیصر اقبال کچھ، حکیم رضا شاہ...... دوستو! آپ کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں، جلدی سے آجاؤ مہربانی ہوگی۔"

✠ محمد زبیر ساگر کی دعائیں گوجرہ سے "پیاری آپی عذرا رسول صاحبہ، آپ اور سسپنس کے پورے اسٹاف کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ معراج انکل اور عذرا آپی کو بہت بہت زیادہ لمبی عمر دے۔ یہ ہے دل کی دعا۔ جون کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ سسپنس میری جان، خوب صورت ٹائٹل، خوب صورت حسینہ گلے میں ہار کانوں میں بالیاں۔ ٹائٹل کی حسینہ ایسے دیکھ رہی ہے جیسے کوئی ناگن ہو اور ابھی ڈس لے۔ واہ واہ کیا بات ہے، دل جھوم گیا۔ سسپنس کا پرانا قاری ہوں۔ خط کبھی کبھی لکھتا ہوں۔ سلسلے وار کہانیاں اچھی جا رہی ہیں۔ کچھ کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ عید کی خوشیاں عید کے رنگ عید مناؤ سب کے سنگ۔ عید کی خوشیاں ہمیں تب ہی ملیں گی جب ہم رمضان کے روزے رکھیں گے اور نماز پڑھیں گے۔ قرآن پاک پڑھیں گے اور اللہ تعالیٰ کو ہر وقت یاد کریں پھر ہمیں عید کی خوشیاں ملیں گی۔ میری یہ دعا ہے کہ ہم سب مسلمان اللہ تعالیٰ کو راضی کر لیں آمین۔ میری پیاری آپی میرا یہ خط آپ عید کے شمارے میں شائع کر دیں، بڑی مہربانی ہوگی۔" (لیجیے جناب آپ کا خط حاضر ہے مگر کہانیوں پر تبصرہ کہاں ہے؟)

✠ خلیق ربانی انجم، چارسدہ سے لکھتے ہیں "جون 2018ء کا سسپنس ڈائجسٹ 18 مئی کو ملا اور جلدی جلدی ورق گردانی کر ڈالی تاکہ اگر آپ کے خط کی محفل میں حاضری دینی ہو تو دے سکوں۔ اس لیے ٹائٹل سے ہوتے ہوئے فہرست کے صفحات پر پہنچ کر فہرست پر نظر ڈالنے لگے اور پھر جون ایلیا صاحب کے انشائیہ سے ہوتے ہوئے قارئین کی محفل سے (آپ کے خط) سے لنگوٹ کس کے بسم اللہ کر لی۔ مختصر اداریہ میں بہت سے مسائل پر نشتر زنی کی گئی تھی اور پرائیویٹ اسکولوں کی چھٹیوں میں فیس لینے کا رونا رویا گیا تھا۔ جو ہنوز قائم و دائم اور دلی ہنوز دور است والی بات ہے اور چیف جسٹس صاحب اور عدالت عالیہ کے واضح احکامات بھی پانی پر کھینچی لکیر ثابت ہوئی۔ ام عبداللہ کراچی سے صدارت فرما رہی تھیں۔ منشی محمد عزیز، اکرم شاہ، بابر عباس، فضل عباس (کھاریاں)، رمضان پاشا، کراچی، محمد رفاقت (واہ کینٹ)، محمد صفدر معاویہ، ایمانے زارا شاہ، ریاض بٹ (حسن ابدال)، زرین آفریدی، ادریس احمد خان (کراچی)، چلبلی ہیر (جھنگ صدر)، انجم فاروق ساحلی، عبدالجبار، ناہید یوسف، صبا سحر اور امتیاز احمد کے تبصرے پسند آئے۔ خطوط کی محفل سے سیدھے ملک صفدر حیات (حسام بٹ) سے مک مکا کرنے کے لیے ان کے مک مکا میں پہنچے۔ جو چودھری الیاس گھمن کو مک مکا پر راضی کر رہے تھے بلکہ راضی کر دیا تھا۔ اس کے بعد انجم فاروق ساحلی کی ازدواجی دلدل پڑھ ڈالی۔ اس میں نجانے کیوں میاں بیوی ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے تھے؟ اور بات تب بنی جب دونوں کی جان ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی اور آخر میں شکر الحمدللہ کہ قارئین کے امتحان کے دن ختم ہوئے اور سسپنس کلاسک کا

آغاز کردیا گیا۔اب تو انہی صفحات پر سسپنس میں بہت پہلے شائع ہونے والی کہانی (کزن) شائع کریں نا۔‘‘(انشاء اللہ رفتہ رفتہ آپ کی فرمائشوں پر عمل کیا جاتا رہے گا اور سسپنس کلاسک کا سلسلہ چلتا رہے گا)

✠ محمد ہمایوں تنولی، مانسہرہ سے محفل کی زینت بنے ہیں ’’جون کے شمارے کی تمام کہانیاں اچھی تھیں مگر آخری گھر اور کفارہ نے زیادہ متاثر کیا۔ان کہانیوں میں ہمیں یہ سبق دیا گیا جو تم بوؤ گے وہی کاٹو گے۔اس کے علاوہ قاتل کمیٹی میں یہ بات واقعی حیران کن تھی کہ چاند دیکھنے کا وقت تو مغرب اور عشا کے درمیان ہوتا ہے۔یہ آدمی رات کو 2 بجے چاند کہاں سے طلوع ہو گیا۔ملک صفدر حیات کو مک مکا واقعی مک مکا تھی۔ وقت تو حسام بٹ کی ایسی کاوش ہے جب تک پڑھ نہ لوں نیند نہیں آتی۔قیدی بھی زبردست کہانی تھی۔اس میں ہمیں یہ سبق دیا گیا ہے کہ بغیر تحقیق کیے کسی کو دوست نہ بناؤ۔رنگ آسماں بھی اچھی کہانی ہے مگر سمجھ نہیں آتی یہ پاکستان بننے سے پہلے کی ہے یا بعد کی۔(پہلے مکمل ہو جانے دیں......پھر سمجھ بھی آجائے گی) اور آخر میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی کانٹے پڑھی۔خدا جانے ساجد صاحب کیسے دل لگا کر لکھتے ہیں کہ کہانی پڑھتے پڑھتے ان کے کرداروں میں کھو جاتے ہیں اور خود...... کو اسی زمانے میں انہی کرداروں میں ڈھال لیتے ہیں۔خدا تمام پڑھنے لکھنے والوں کو صحت و تندرستی دے۔آمین۔‘‘

✠ طارق خان، ڈبی تمبر کھولہ سے خط لکھ رہے ہیں ’’سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کے کانٹے چنے، ساجد صاحب کس چیز کے ڈاکٹر ہیں مگر لکھتے تو کہانیاں ہیں۔کیا کہانیاں لکھنے میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔خیر جو بھی ہے اچھا لکھتے ہیں۔کہانی پڑھتے پڑھتے ان کے کرداروں کے ساتھ انہی کے زمانے میں چلے جاتے ہیں۔اس کے بعد آخری گھر پڑھی۔آخری گھر مصنف نے خراب بنایا اور اسی مکان میں اس کا ٹھکانا بن گیا۔سچ ہے جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔اس دفعہ ملک صفدر حیات کی مک مکا پڑھ کر ان کے لیے دل سے دعا نکلی کہ کیسے اتنے بڑے چودھری کی بہن کو ایک غریب سے بیاہ دیا۔کفارہ پڑھ کر ایسا لگا کہ کسی کے ساتھ بھی دھوکا فریب نہ کریں کہ وہ اس دنیا میں پکڑ لے۔ قاتل کمیٹی واقعی قاتل کمیٹی نکلی کہ چاند کا دورانیہ تو مغرب سے عشا کے درمیان ہوتا ہے۔رات کو 2 بجے مولوی نے .... چاند رات کا اعلان کردیا۔واہ رے مولا۔وقت کو وقت ملنے کا بہانہ کرنا وقت ایک بہترین کہانی ہے حسام بٹ کی۔پہلے یہ بتاؤں۔میرے ایک ماموں ہیں محمد ہمایوں تنولی۔اسلام آباد میں سروس کرتے ہیں۔یہ سسپنس اور سرگزشت پر انہوں نے ہی لگایا ہے۔اب تو میں عادی ہو گیا ہوں۔‘‘(بہت خوب......ماموں جان کا شکریہ)

✠ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے ’’جون کا شمارہ چند دن انتظار کے بعد یعنی 15 کے بجائے 18 تاریخ کو ملا۔اتنا انتظار بھی برداشت نہ ہو رہا تھا۔واقعی ہوشربا مہنگائی نے ہر سطح پر زندگی اجیرن کردی ہے۔اس دفعہ تو صفحات کم کردیے۔انشائیہ جون ایلیا صاحب ایک حساس دل کے ساتھ لکھتے ہیں جو موجودہ حالات کی بہترین عکاس ہوتی ہے۔سرورق کی حسینہ مجھے کچھ پریشان لگتی ہیں۔شاید کان کے بندے کا کوئی پرابلم ہے۔مدیر اعلیٰ کا مقدمہ تعلیم جو پہلے ایک مقدس پیشہ تھی اب تجارت ہے۔عام طور پر ہمارے یہاں پرائیویٹ اسکول اور انگلش میڈیم کا جنون ہے۔انگلش کو ایک زبان نہیں بلکہ قابلیت سمجھا جاتا ہے۔بچہ انگلش اور اردو کے درمیان اٹک جاتا ہے۔اس پر ناپختہ اساتذہ جن کو بچوں کی کمزوریوں اور کمزور بنیادوں کا علم ہی نہیں ہوتا۔خطوط کی محفل ایک کہکشاں ہے۔کوئی ستارہ آب و تاب سے چمکتا ہے، کوئی کم مگر سب سے مل کر ایک خوب صورت کہکشاں بنتی ہے۔ام عبداللہ کراچی سے میر کارواں ہیں، مبارک ہو۔بہت سے دوست میرے تبصرے کو پسند کرتے ہیں، شکرگزار ہوں۔میرے دو دوست کھاریاں سے ڈانٹ بھی پلاتے ہیں۔یہ ماہنامہ صرف تفریح طبع نہیں ہے بلکہ تلخ اور شیریں حقیقتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔حساس دل اور معاشرے کی ناہمواری کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔پہلا صفحہ جون ایلیا کا انشائیہ ہے۔جس میں تفریح نہیں ہوتی۔کل کو یہ کہنا کہ انشائیہ بہت سیاسی ہے اس لیے اس کو نکال دیا جائے۔وہ ایک صفحہ دل میں اتر جاتا ہے۔بہرحال دوستوں کی محفل کو محبت کی نظر سے دیکھیں تو بہت خوب صورت نظر آئے گی۔میں نے کھاریاں کا کھارا خط بھی بہت پیار سے پڑھا، لکھتے رہیے۔کانٹے، تاریخ کی ہوشربا داستان۔کتنی جنگیں، کتنی سازشیں، کتنی احسان فراموشیاں، شاید اب کا دور بھی اتنا خونخوار نہیں۔مغل بادشاہ اکبر کی شان و شوکت کا احوال اور ہر وقت جنگ و جدل، زمین خون سے آلودہ، بہت معلوماتی سلسلہ ہے۔آخری گھر، منظر امام کی تحریر کی خصوصیت ہے کہ سادہ موضوع مختصر کہانی لیکن پراثر اور آج کل کے انسانوں کے متعلق ایک اعلیٰ تعمیراتی ماہر، لیکن جب وہ تھک گیا تو اپنی زندگی بھر کی مہارت کو چھوڑ کر ایک خراب تعمیراتی شاہکار بنایا جو کہ اصل میں اس کا ہی انعام تھا۔مگر جیسی نیت ویسی برکت۔رنگ آسماں، ایک اچھا مہماتی سلسلہ، دو مختلف کہانیوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا اور دلچسپی کو برقرار رکھنا بھی کمال کی مہارت ہے۔دونوں حصے ابھی اپنے منطقی انجام سے بہت دور ہیں۔تیسری قبر، ایک مختصر پلاٹ کی کہانی۔چونکا دینے والی ابتدا مگر باقی کہانی اپنا مزہ کھوتی گئی۔قاتل کمیٹی، پرانے وقتوں کے حساس جگت ماموں، ممانی جن پر ہمیشہ محرومیوں اور دکھوں کے سائے چھائے رہے پھر بھی لوگوں کا احساس رہا۔معاشرے کی بے وقوفی کے رات کے تیسرے پہر نہ جانے کس مجبوری میں چاند دیکھنے کی اطلاع دینا ان کے لیے معمولی بات تھی لیکن ایک احساس کے مارے شخص کی موت بن گئی، کسی کو پتا ہی نہ چلا۔مک مکا، انسپکٹر ملک صاحب کا

ایک شاہکار کارنامہ۔ اس دفعہ ایک طاقتور اور گھمنڈی مجرم سے ٹکراؤ تھا لیکن ایمان کی طاقت سے بھرپور پولیس آفیسر نے مجرم کو گردن سے پکڑ ہی لیا۔ واہ مزے دار کہانی اور جستجو بھری داستان۔ ازدواجی دلدل، بے حد پراسرار اور عجیب کہانی، ایک چھت کے نیچے رہنے والے میاں بیوی اور ایک دوسرے کی جان کے دشمن۔ کیسے کیسے زہریلے منصوبے، ایک سے بڑھ کر ایک موت کا پلان اور خود کو بچانے کی ترکیب بھی۔ دونوں کا کامیاب منصوبہ ایک ہار گیا اور ایک قسمت سے بچ گیا۔ گلوبلائزیشن، سیاسی جوڑ توڑ اور مکروفریب کی کہانی جہاں پرانے پاپی، نوجوان نسل کو پچھاڑ دیتے ہیں۔ وقت، ایک ایسا سلسلہ جو نیرنگی، تیزی، مہمات کے ساتھ بڑھتی گئی لیکن حسام بٹ جیسے لکھاری کو کیا ہوگیا، کیا تھک گئے ہیں۔ کہانی رک سی گئی ہے اور ایک دائرے میں گھومنے لگی ہے۔ کبھی طلسماتی چکر میں گھوم کر باہر نکلتی ہے تو ایک عجیب سا افسانوی رنگ طاری کر لیتی ہے۔ قیدی، بھروسا کرنا اور اس کا ٹوٹنا بڑی بات نہیں لیکن بھروسے کے بدلے ایک عذاب میں مبتلا کر دینا بہت بڑا گناہ ہے پھر ایک تعفن زدہ معاشرے میں جہاں انصاف اور قانون کا وجود نہ ہو۔ اس پر ایک مجبور آدمی۔ اس کہانی کو پڑھ کر دوستی، خلوص اور بھروسا کے نام سے جھرجھری آ گئی۔ اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور بے گناہ کو بچا لیا گیا۔ آخری کیل، ایک مکار اور چال باز شخص کی ڈکیتی کی مکمل منصوبہ بندی، جس کا ساتھ دینے والے دو بھائی، قدم قدم پر چالاکی، مغربی ماحول کی عیارانہ چالبازی، جب سب کام کامیابی سے ہوگیا۔ مجرم بھی مارا گیا اور ایک بھائی بھی مگر بھائی کی محبت میں ایک بہت بڑی رقم کو بھائی کے ساتھ ہی جلا کر راکھ کر دیا۔ بھائی کی محبت کی عمدہ کہانی۔ کفارہ، ماہنامہ کی آخری اور شاہکار کہانی۔ اسما قادری کے قلم نے جادو جگا دیا۔ ایک مجبور عورت اور اس کے عزم کی داستان۔ جب کوئی انسان، رشتوں، معاشرے کی بے رحمی کا شکار ہو کر تنہا رہ جاتا ہے تو خدا اس کے ساتھ ہو جاتا ہے، اس کہانی میں ایسا ہی ہوا۔ جب وہ لڑ لڑ کر تباہی کے نزدیک پہنچ گئی۔ خدا نے ایک مضبوط سہارا دے دیا۔ بہت نصیحت آمیز کہانی، ہار جانے والوں کے لیے ہمت باندھنے والی داستان حیات۔ اس دفعہ کترنیں کچھ کم محسوس ہوئیں۔ اشعار کی محفل بھی اچھی رہی۔''

(پسندیدگی کا بے حد شکریہ)

✠ ناہید یوسف کی مہمانداری کراچی سے ''اف! ہمیں کیا پتا تھا کہ ہم ان دنوں اس جگہ قیام پذیر ہوں گے جن دنوں ''سورج چاچو'' اپنا غصہ لوگوں پر اتار رہے ہوں گے۔ جی ہاں، آپ ٹھیک سمجھے...... بھئی ہم ان دنوں کراچی آئے ہوئے ہیں اپنے شوہر صاحب کے ساتھ۔ کیونکہ یہاں ہماری سسرال بھی ہے اس لیے قیام کچھ طویل ہوگیا۔ مگر یلا کی گرمی نے ہلا کے رکھ دیا۔ خیر اب کیا ہوسکتا ہے، فی الحال تو برداشت کر رہے ہیں۔ سسپنس ہمیں کراچی سے ہی خریدنا پڑا۔ اس دفعہ فہرست بڑی تگڑی تگڑی سی لگی، شاید اس کی وجہ سسپنس کلاسک میں جگمگاتا نام اثر نعمانی مرحوم کا تھا۔ اثر نعمانی صاحب کے کیا کہنے...... بہت زبردست انداز تحریر تھا۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے۔ مغربی ماحول تھا مگر کہانی میں مشرقیت کی جھلک تھی۔ بھائی سے بھائی کی محبت بہت اچھی لگی۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ کہانیوں پر تبصرے سے پہلے کچھ اور ذکر ہو جائے...... یعنی صفحات کا۔ آپ کی مجبوری بجا مگر صفحات میں کمی مناسب نہیں۔ قارئین تحریری مواد میں اضافے کے خواہاں ہیں نہ کہ کمی کے۔ خیر اندرونی معاملات پر تو آپ ہی بہتر انداز میں فیصلہ کر سکتے ہیں اس لیے فیصلہ آپ پر چھوڑا اور اسے کھلے دل سے تسلیم بھی کریں گے۔ انسان کو کشادہ دلی کا ثبوت دینا چاہیے، کسی بھی معاملے میں۔ اسما قادری صاحبہ کا نام دیکھ کر ان کی کہانی کی طرف لپکے۔ کفارہ نہایت خوب صورتی سے لکھی گئی تحریر تھی۔ جس میں سب کے لیے سبق تھا۔ ایسی کہانیاں معاشرتی برائیوں کی درستگی اور ذاتی بدلاؤ کا سبب بنتی ہیں۔ واقعی توبہ کرنے سے گناہوں کی معافی ہوتی ہے اور سچے دل کی توبہ سے رحمت خداوندی نازل ہوتی ہے۔ ویلڈن اسماجی، دل خوش کر دیا۔ اس کے بعد رنگ آسماں پڑھی۔ یقین جانیں ہمیں بالکل انٹرسٹنگ نہیں لگی، پتا نہیں کیوں، ہم برائی نہیں کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہانی ہمارے مزاج کے مطابق نہ ہو۔ ہم کیوں رائٹر کو دوش دیں۔ وقت انتہائی سست روی سے اپنے سفر پر گامزن ہے۔ بٹ صاحب سے گزارش ہے کہ کہانی کی رفتار میں نمایاں تیزی لائیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی کہانی کانٹے پڑھی۔ تاریخ سے آگاہی بھی ملی اور دلچسپی کا عنصر بھی شامل تھا۔ منظر امام کی آخری گھر بہترین اور لاجواب کہانی تھی۔ مختصر کہانی نے بہت کچھ سمجھا دیا۔ حضرت موسیٰ کا قصہ...... ایمان افروز واقعات۔ ویلڈن رضوانہ ساجد۔ روح تک سرشار ہوگئی۔ علی اختر صاحب کی گلوبلائزیشن بھی اچھی کہانی تھی۔ جاگیرداروں وڈیروں کی یہی چالبازیاں چلتی آ رہی ہیں۔ شاید بدلاؤ ممکن نہیں کیونکہ جب تک ہم خود کو نہیں بدلیں گے، سدھار ناممکن ہے۔ انجم فاروق ساحلی کی ازدواجی دلدل کچھ خاص مزہ نہ دے سکی۔ قیدی بھی بس گزارے لائق لگی۔ شاہ زین رضوان کی تیسری قبر اچھی کہانی تھی۔ بے چارہ جیکسن کھوج لگانے کے چکر میں اپنی قبر کھدوا بیٹھا۔ قاتل کیٹی بھی ٹھیک رہی۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین رہا۔ آخر میں محفل میں اول نمبر پر آنے والی ام عبداللہ کو مبارکباد۔ تمام قارئین و ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کو عید کی دلی مبارک باد۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے

محمد جبار، سرگودھا۔ جنید احمد ملک، گلستان جوہر، کراچی۔ ظہیر الدین، شاہ فیصل کالونی، کراچی۔ سرفراز جہانگیر، راولپنڈی۔ صغیر احمد، پشاور۔ شازیہ کنول، ملتان۔ امتیاز احمد، منڈی بہاؤالدین۔

ناانفاقی

ڈاکٹر ساجد امجد

یہ تو سنتے چلے آئے ہیں اتفاق میں برکت اور ناااتفاقی ہمیشہ زحمت کا باعث بنتی رہی ہے... بہرحال وہ دور بھی اتفاق سے نااتفاقی کا ایسا برا دور تھا جس میں بہ ظاہر سب ایک دوسرے کے دوست مگر درحقیقت ایک دوسرے کی آستین میں سانپ بن کر بیٹھے تھے اور جب کسی کی گہری نگاہوں نے یہ سب بھانپ لیا تو کنڈلی مارے یہ ناگ پھن لہراتے باہر نکل آئے... برہان نظام شاہ، علی عادل شاہ اور سب سے بڑھ کر ایک عورت ہونے کے ناتے چاند بی بی نے جس حوصلے اور عزم کا رستہ اختیار کیا اس نے آنے والے لوگوں کے لیے تاریخ میں ایک یادگار باب رقم کردیا ہے۔ محلاتی سازشیں اقتدار کی بنیاد کو ہلا دیتی ہیں اور جہاں لرزش جڑ پکڑلے وہاں مضبوطی ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ یہی حال اس اتحاد و اتفاق کا بھی ہوا جو محض ذاتی مفاد کی خاطر حصول اقتدار کی جنگ لڑتے ہوئے آپس میں کرتے رہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

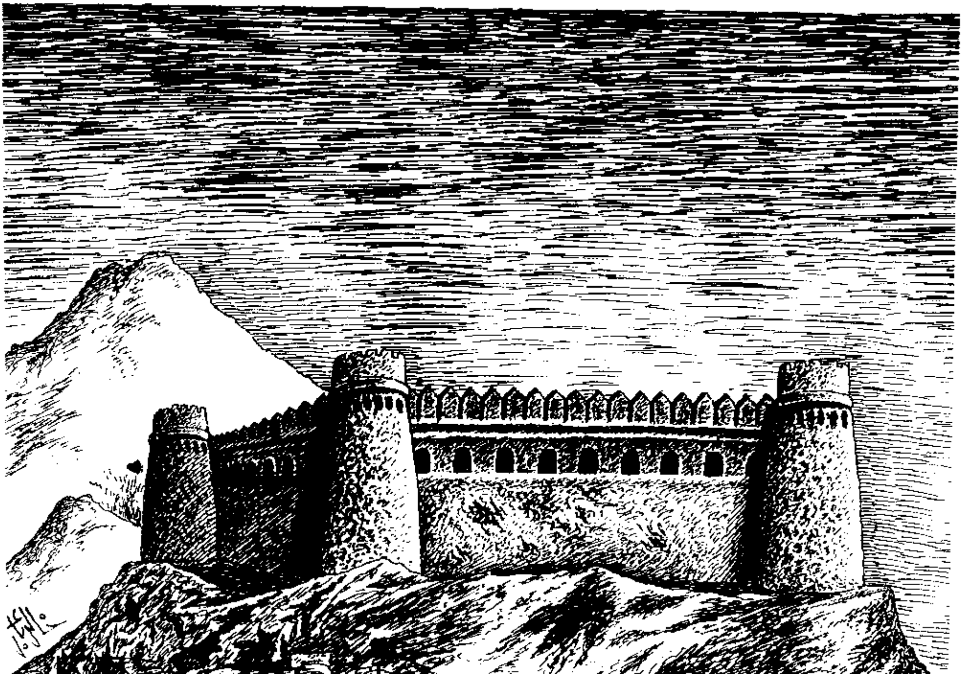

جنوبی ہندوستان کی ریاست بیجاپور کے قصر شاہی میں رات اتر آئی تھی۔ موی شمعیں دریچوں سے جھانک جھانک کر رات کے آنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ محل کے تمام اضافی راستے بند کر دیے گئے تھے۔ فوجی دستے جگہ جگہ تعینات ہو گئے تھے۔ اسی محل کے ایک کمرائے خاص میں حکمراں علی عادل شاہ کی بیوی چاند بی بی بے قراری سے ٹہل رہی تھی۔ پھر وہ راہداری میں نکل آئی لیکن محل میں پھیلا ہوا ہولناک سناٹا اسے پھر کمرے میں لے آیا۔

یہ بے قراری اس لیے تھی کہ علی عادل شاہ ابھی تک اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ یہ ایک خلافِ معمول بات تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ رات آ گئی ہو اور علی عادل شاہ کمرے میں نہ آیا ہو۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے وہ شاہی کام نمٹالیا کرتا تھا حتیٰ کہ اگر کوئی قاصد بھی آتا تو وہ اسے مہمان خانے میں بھیج دیتا کہ دن نکلنے کے بعد بات ہو گی۔ کوئی امیر بھی ہمت نہیں کر سکتا تھا کہ دن چھپنے کے بعد اس کے پاس کسی کام سے حاضر ہو۔

چاند بی بی کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ''بیدر'' کی ریاست کی جانب سے کوئی سفارت آئی ہے۔ علی عادل شاہ اس سے معروفِ گفتگو ہے۔ یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ تھا کہ آخر ایسی کیا بات چیت ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ اچانک اس کا دل زور سے دھڑکا۔ کہیں احمد نگر سے پھر کوئی معرکہ تو درپیش نہیں ہو گیا۔ احمد نگر چاند بی بی کا میکا تھا

جہاں اس کا بھائی مرتضیٰ شاہ بحری حکمرانی کر رہا تھا۔ بیدر اور احمد نگر میں دشمنی چلی آرہی تھی۔ علی عادل شاہ، بیدر کا اتحادی تھا لہٰذا یہ خطرہ ہمیشہ موجود رہتا تھا کہ اس کے میکے اور سسرال میں جنگ نہ چھڑ جائے۔ یہ چاند بی بی کی بصیرت اور دور اندیشی تھی کہ اب تک یہ نوبت نہیں آئی تھی۔

وہ ان خیالوں میں بہت دور تک چلی گئی تھی کہ چوب داروں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ علی عادل اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی کمرے کے دروازے تک آئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی دستک ہوتی، اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ علی عادل شاہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ چاند بی بی نے اس کے سر پا کا جائزہ لیا۔ ناگواری اور اداسی علی عادل شاہ کے چہرے سے ظاہر تھی۔ وہ سر جھکائے اس کے ساتھ اندر آ گیا۔ چاند بی بی کی بھی ہمت نہ ہو سکی کہ اس سے کوئی سوال کرتی۔ وہ صرف اتنا کر سکی کہ اس کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔

”مجھ سے خفا ہو؟“ علی عادل شاہ نے اس کی خاموشی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

”ہم آپ سے خفا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہم تو صرف یہ سوچ رہے ہیں کہ ایسی کیا بات ہوئی کہ آپ افسردہ ہیں۔“

”سلطنت کے بکھیڑوں میں بہت سی ایسی باتیں ہو جاتی ہیں۔“

”ہمیں نہیں بتائیے گا۔“

”ضروری نہیں کہ ہر بات آپ کو بتائی جائے۔“ علی عادل شاہ کے لہجے میں ایسی تلخی تھی جو اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

علی عادل شاہ بستر پر دراز ہو گیا۔ چاند بی بی نے اب کسی بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اپنے بستر پر چلی گئی۔

علی عادل شاہ کچھ دیر پہلے ہونے والے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ اسے امیر علی برید حاکم بیدر پر سخت غصہ تھا۔ وہ اس کا اتحادی تھا۔ علی عادل شاہ نے کئی معرکوں میں اس کی مدد کی تھی لیکن اب وہ اس کی اتنی سی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ کئی مرتبہ کی کوششوں کے بعد ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا اور اب تو اس نے صاف انکار کہلا بھیجا تھا۔ وہ ہر مسئلے کو چاند بی بی کے سامنے رکھتا تھا۔ وہ اتنی زیرک تھی کہ کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ لیتی تھی لیکن یہ بات ہی ایسی تھی کہ وہ اسے نہیں بتا سکتا تھا۔ بات یہ تھی کہ علی عادل شاہ نے کہیں سے سنا تھا کہ امیر علی برید کے پاس نہایت حسین و جمیل دو خواجہ سرا ہیں۔ علی عادل شاہ نہایت جمال دوست تھا۔ اسے خوب صورت خواجہ سراؤں اور غلاموں کو جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے جب سنا کہ امیر برید کے پاس دو خوب صورت خواجہ سرا ہیں تو اس نے اپنا ایک قاصد اس کے پاس روانہ کیا۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے پاس دو نہایت ہی حسین اور خوب صورت خواجہ سرا ہیں۔ تم فوراً ان خواجہ سراؤں کو میرے پاس روانہ کر دو۔“

اس کا خیال تھا کہ مثبت جواب ملے گا لیکن اس نے مختلف بہانے کر کے قاصد کو واپس بھیج دیا۔ اس کے بعد بھی ٹال مٹول سے کام لیتا رہا اور اس مرتبہ تو صاف انکار کر دیا۔

بے چینی اتنی بڑھی کہ علی عادل شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چاند بی بی اس کی بے چینی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر پوچھنے کی کوشش کی لیکن یہ بات ایسی تھی کہ علی عادل شاہ نے کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا اور یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا کہ وقت آنے پر اسے خود معلوم ہو جائے گا۔

صبح تک علی عادل شاہ طے کر چکا تھا کہ وہ ایک سفارت مرتضیٰ نظام شاہ بحری (چاند بی بی کا بھائی) والی احمد نگر کے پاس بھیجے گا اور اسے ”بیدر“ پر حملہ کرنے پر اکسائے گا۔

جب صبح ہوئی تو علی عادل شاہ نے اپنے ایک امیر کشور خاں کو طلب کیا۔ اصل بات پھر بھی چھپائی۔ اس سے صرف اتنا کہا کہ وہ مرتضیٰ شاہ کو صرف اتنا بتا دے کہ امیر برید سے ہمارا اتحاد ختم ہو گیا ہے۔ اب وہ آزاد ہے کہ بیدر پر حملہ کر دے۔ ہم امیر برید کا ساتھ نہیں دیں گے۔

کشور خاں کو اس پیغام پر حیرانی ہوئی۔

”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ اس طرح تو ہم اکیلے ہو جائیں گے۔“

”ہم کیوں اکیلے ہو جائیں گے؟“

”امیر بیدر سے ہمارا اتحاد ہے۔ مرتضیٰ نظام کو جونہی معلوم ہوگا کہ ہمارا اتحاد ختم ہو گیا، وہ نہ صرف بیدر پر حملہ آور ہوگا بلکہ بیجاپور کی طرف بھی بڑھے گا۔“

”اس کی یہ ہمت بھی نہیں ہوگی۔“

”وہ اپنے مطلب کے لیے رام راج سے اتحاد کر لے گا جو ہمارا قدیمی دشمن ہے۔“

”جب وہ وقت آئے گا تو اس وقت دیکھا جائے گا، فی الحال تو جو آپ سے کہا جا رہا ہے وہ کریں۔“

یہ انوکھی منطق کشور خاں کی سمجھ میں نہ آئی لیکن وہ اس حکم سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حکم کی تعمیل کی اور احمد نگر پہنچ گیا۔

مرتضیٰ نظام تو جیسے انتظار ہی میں بیٹھا تھا۔ اس نے نہ

صرف اس پیغام کو غور سے سنا بلکہ شکر گزاری کے طور پر عادل شاہ کی خدمت میں تحائف بھی روانہ کیے۔

کشور خاں واپس چلا آیا اور اس کے آتے ہی مرتضیٰ نظام نے بیدر پر حملہ آور ہونے کی تیاری شروع کر دی۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ مرتضیٰ نظام بیدر پر حملہ آور ہو گیا۔ اسے اب عادل شاہ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے اس نے کسی اور طاقت کو اپنے ساتھ ملانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بیدر کا محاصرہ کر لیا۔

امیر برید کو جیسے ہی مرتضیٰ نظام کے حملہ آور ہونے کی خبر ملی، وہ علی عادل شاہ سے مدد کا طالب ہوا۔ بس یہی وہ وقت تھا جب علی عادل شاہ کو اپنے آئندہ منصوبے پر عمل کرنا تھا۔ اس نے امیر برید کو لکھ بھیجا۔

''میں دو ہزار سواروں سے تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ وہ دو غلام تم میری خدمت میں روانہ کر دو جن کا میں نے مطالبہ کیا تھا۔''

امیر برید اب مجبور ہو گیا کہ اس کا مطالبہ مان لے۔

علی عادل شاہ نے دو ہزار سوار روانہ کر دیے۔ مرتضیٰ نظام نے جب علی عادل شاہ کی یہ عہد شکنی دیکھی تو خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

امیر برید نے دونوں خواجہ سراؤں کو اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔

''میں ہرگز تمہیں خود سے جدا نہ کرتا لیکن مجھے اپنی سلطنت بھی عزیز ہے۔ اگر تم دونوں علی عادل شاہ کے پاس نہ گئے تو وہ حملہ آور ہو جائے گا۔ تمہاری وفاداری کا تقاضا ہے کہ تم میری سلطنت بچا لو۔ میں بھی تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد تم دونوں کو کسی بہانے سے واپس بلا لوں گا۔''

دونوں خواجہ سرا مجبور تو ہو گئے لیکن نہایت ناگواری سے تیار ہوئے اور بیجاپور روانہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک خواجہ سرا نے اپنا خنجر اپنے ساتھ لے لیا اور ارادہ کر لیا کہ وہ موقع دیکھتے ہی علی عادل شاہ کا کام تمام کر دے گا۔

دونوں خواجہ سرا جب بیجاپور پہنچے اور حضور شاہ میں پیش ہوئے تو علی عادل شاہ ان کے حسن کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان کے حسن سے زیادہ اسے اپنی فتح پر ناز ہو رہا تھا کہ آخر اس نے امیر برید کو مجبور کر ہی دیا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ آئندہ اس کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ وہ بڑی بے چینی سے رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب رات ہوئی تو اتفاق سے اسی خواجہ سرا کو خلوت میں طلب کیا جو خنجر اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس خواجہ سرا نے موقع دیکھتے ہی خنجر علی عادل شاہ کے پیٹ میں اتار دیا اور صبح ہوتے ہی فرار ہو گیا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے بھی اسی میں عافیت جانی کہ نکل جائے لیکن پکڑا گیا۔ سب کو یہی شبہ ہوا کہ یہی تھا جس نے قتل کیا ہے لہٰذا اسی وقت قتل کر دیا گیا۔

علی عادل شاہ کی تجہیز و تکفین کے بعد اس کی جانشینی کا مرحلہ تھا۔ علی عادل شاہ کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے اس نے اپنے بھائی کے بیٹے ابراہیم کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ علی عادل کی بے وقت موت نے اسے تختِ شاہی پر بٹھا دیا حالانکہ اس کی عمر اس وقت محض دس برس کی تھی۔ یہ عمر ہرگز ایسی نہیں تھی کہ وہ امورِ سلطنت چلا سکتا۔ چاند بی بی کی دور اندیشی نے ایک نہایت زیرک اور ایماندار امیر کامل خاں دکنی کو اس کا اتالیق مقرر کر کے تمام امورِ سلطنت اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ پسِ پردہ وہ خود موجود تھی۔ کامل خاں دکنی پابند تھا کہ وہ ہر معاملے میں چاند بی بی سے مشورہ کرے۔ شہزادہ ابراہیم کی تعلیم و تربیت چاند بی بی کے ہاتھ میں تھی۔

رخصتی

ایک بچہ شادی میں رخصتی کے وقت اپنی ماں سے۔ ''امی دلہن تو بہت روتی ہے۔ دُلہا کیوں نہیں رو رہا؟''

ماں۔ ''بیٹا! دلہن گیٹ تک روئے گی اس کے بعد دُلہا قبر تک روئے گا۔''

☆☆☆

سسرال

ایک آدمی اپنی سسرال گیا۔ اس کی ساس نے پہلے دن اسے پالک کھلائی۔ دوسرے دن میتھی کھلائی۔ تیسرے دن اسے ساگ کھلا دیا۔ چوتھے دن اس سے پوچھا۔ ''بیٹا بتا آج کیا کھائے گا؟''

آدمی نے جواب دیا۔ ''مجھے کھیت دکھا دو میں چر آؤں گا۔''

☆☆☆

عزت

ہمیشہ ڈاکٹر کی عزت کرو۔ اس کی ذرا سی غلطی آپ پر مٹی ڈال سکتی ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

کامل خاں دکنی بدھ اور جمعے کے علاوہ ہر روز ابراہیم کو شاہی محل سے نکال کر دربار میں لاتا اور تمام لوگوں کو بادشاہ کے حضور میں آنے کا موقع دیتا۔

ابھی دو ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ کامل خاں کا ظرف جواب دے گیا۔ اقتدار کا نشہ سر چڑھ کر بولنے لگا۔ اس کے طور طریقوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے حکمراں ابراہیم عادل شاہ ثانی نہیں بلکہ وہ خود ہے۔ اپنی قوت پر اتنا نازاں ہوا کہ چاند بی بی کو بھی خاطر میں نہ لاتا۔ چاند بی بی کو اپنی یہ بے عزتی برداشت نہ ہوئی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ کامل خاں کو اس کے عہدے سے ہٹا دے گی۔ اس سے پہلے کہ اس کی قوت میں اضافہ ہو، وہ اس کی قوت کو مٹا دے گی۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا لیکن وہ بھی چاند بی بی تھی، کوئی عام خاتون نہیں تھی۔ اس نے ایک اور طاقتور امیر کشور خاں سے رابطہ کیا اور اسے یہ پیغام بھیجا۔

''کامل خاں دکنی اب منصبِ وکالت کے قابل نہیں رہا۔ میری خواہش ہے کہ یہ خدمت اب تم سنبھالو۔ جس طرح بھی ہو کامل خاں کو ٹھکانے لگاؤ۔ اس معاملے میں عجلت سے کام نہ لینا۔ اگر ذرا بھی تاخیر ہوگئی تو پھر کامل خاں کی قوت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جائے گی اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہوجائے گا۔''

چاند بی بی نے کشور خاں کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ کشور خاں اور کامل خاں دکنی کی پرانی دشمنی تھی۔ چاند بی بی کا پیغام ملتے ہی کشور خاں کو تو جیسے کامل خاں سے بدلہ لینے کی اجازت مل گئی۔ اس نے چار سو مسلح آدمیوں کو ساتھ لیا اور بیجاپور کے قصر کی طرف روانہ ہوا۔

کشور خاں نے قلعے کے اندر پہنچ کر قلعے کا دروازہ اندر کی طرف سے بند کرلیا اور قلعہ دار کو قید کرلیا۔ کامل خاں کو جب کشور خاں کی آمد اور نیت کا علم ہوا تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے شاہی حرم کی طرف بھاگا۔ اس کا خیال تھا کہ چاند بی بی اس کی جان کی حفاظت کرے گی لیکن جب چند وفاداروں کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ چاند بی بی کے اشارے سے ہی ہو رہا ہے تو اس نے ارادہ بدل دیا۔ اب اسے اپنی جان بچانے کے لیے قلعے سے باہر نکلنا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ قلعے کے دروازے پر کشور خاں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ شاہی محل کے پیچھے قلعے کی دیوار پر چڑھ گیا اور پیچھے خندق میں گرا اور تیرتا ہوا پار اتر گیا اور شہر میں داخل ہوگیا۔ اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا کہ وہ کامل خاں دکنی ہوسکتا ہے۔

کامل خاں دکنی قلعہ دُرک کی خندق کے قریب ایک مقام باغ دروازہ امام تک گیا اور پھر درختوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا حصارِ شہر پر جا پہنچا۔ یہ حصار بارہ گز اونچا تھا۔ حصار سے نیچے اترنے کے لیے اس نے یہ اہتمام کیا کہ اپنی پگڑی، شال اور کمربند کو ایک دوسرے سے باندھ کر ایک کمندسی بنالی اور اس کا ایک سرا دیوار کے کنگرے سے باندھ کر نیچے اتر گیا اور اسی پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں اپنے گھر پہنچ گیا جو شہر سے باہر تھا۔

ادھر کشور خاں نے کامل خاں کو تلاش کرنا شروع کیا۔ کشور خاں اور اس کے ساتھیوں کو یہ وہم بھی نہیں تھا کہ کامل خاں ایسی برق رفتاری سے کام لے کر محل سے فرار ہوجائے گا۔ پہلے تو انہوں نے قلعے ہی میں تلاش کیا۔ آخر معلوم ہوگیا کہ وہ حصار سے نیچے اترا ہے اور یقیناً اپنے گھر گیا ہوگا۔ کشور خاں نے ایک جماعت کو کامل خاں کے گھر کی طرف بھیجا کہ اسے گرفتار کرکے لایا جائے۔

کامل خاں کو معلوم تھا کہ کوئی نہ کوئی جماعت اسے گرفتار کرنے ضرور آئے گی۔ اس نے اپنی تمام دولت اور نقد رقم ساتھ لی اور سات آٹھ ساتھیوں کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ احمد نگر چلا جائے گا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی وہ کچھ دور ہی پہنچا ہوگا کہ کشور خاں کے آدمیوں نے اسے گرفتار کرلیا۔ اس خوف سے کہ کہیں اس کے ساتھی اسے بچانے کی کوشش نہ کریں، اس کا سرتن سے جدا کردیا اور اس کے تمام مال و اسباب کو لوٹ کر چلتے بنے۔

کامل خاں جیسے طاقتور امیر کا انجام یہ ہوگا، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ چاند بی بی نے کچھ ایسی مہارت سے پتے کھیلے کہ کامل خاں کی بازی الٹ گئی۔

کشور خاں کی بھیجی ہوئی جماعت کامل خاں کا کٹا ہوا سر لے کر پہنچی تو کشور خاں کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ اس نے فوراً یہ خبر چاند بی بی تک پہنچادی۔

''یہ سر دشمن کا نہیں دوست کا ہے۔ اپنی خوشی کو بھی چھپاؤ اور اس ''سر'' کو بھی۔'' چاند بی بی نے نہایت دانش مندی کا فیصلہ کیا۔ ''جب تک ہوسکے اس خبر کو چھپاؤ۔ جن لوگوں پر کامل خاں کے احسانات ہیں وہ اس کا بدلہ لینے ضرور اٹھیں گے اور ہماری سلطنت انتشار کا شکار ہوجائے گی۔''

''ملکہ عالیہ! کیا یہ خبر ایسی بھی ہے جسے چھپایا جاسکے؟''

"جھٹلایا تو جاسکتا ہے۔ اس سر کو کسی نامعلوم مقام پر دفن کرادو اور کامل خاں کو تلاش کرتے رہو۔ یہ تاثر دو کہ کامل خاں گرفتار نہیں ہوسکا۔ وہ ابھی تک مفرور ہے۔ کچھ لوگوں کو احمد نگر اور بیدر کی طرف بھی بھیجو تاکہ ان ریاستوں کے حکمران بھی یہی سمجھتے رہیں کہ کامل خاں مقتول نہیں مفقود الخبر ہے۔"

کشور خاں نے اس مشورے پر عمل کیا۔ اس کی جو جماعت کامل خاں کا سر کاٹ کر لائی تھی، اسے بھی تنبیہ کردی کہ وہ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں۔ مختلف ریاستوں کی طرف اپنے نمائندے بھی بھیجے اور یہ ظاہر کیا کہ کامل خاں کو تلاش کیا جارہا ہے اور اس کے ساتھ ہی تمام امورِ سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چاند بی بی کے مشورے کے مطابق بڑی مستقل مزاجی سے اپنے فرائض انجام دینے لگا۔

☆☆☆

ایک گھڑسوار احمد نگر کی حدود میں داخل ہوا۔ اس نے اپنا منہ سیاہ نقاب میں ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ شہر میں داخل ہوا اور ایک حویلی کے سامنے جاکر رک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ گھوڑے سے اترتا، چند مسلح سپاہیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

"اے، کون ہو تم اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

"مجھے عمر خاں سے ملنا ہے۔"

"اپنا نام بتاؤ۔"

"میں اپنا نام تمہیں نہیں بتاسکتا۔"

"کہاں سے چلے آرہے ہو؟"

"بیجاپور سے۔"

"جب نام نہیں بتاؤ گے تو ہم کیا بتائیں گے؟"

"اس سے کہنا تمہارا دوست آیا ہے۔"

"یہ کیا تعارف ہوا۔ دوست تو بہت سے ہوسکتے ہیں۔"

"وہ مجھے دیکھے گا تو خود پہچان لے گا۔"

یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوار ہرگز مطمئن نہیں ہوئے ہیں۔ پھر انہوں نے آپس میں مشورہ کرکے اسے حکم دیا کہ وہ گھوڑے سے نیچے اتر آئے۔ سوار نے گھوڑے سے نیچے چھلانگ لگادی۔

"ہم تمہاری تلاشی لیں گے۔"

"میری تلوار میرے ساتھ جائے گی۔ اس کے علاوہ میرے لباس کے اندر ایک خنجر بھی موجود ہے۔"

"ہوں...... اس کا مطلب ہے تم مسلح ہو۔"

"میں اتنا سفر طے کرکے آیا ہوں۔ غیر مسلح نہیں آسکتا تھا۔"

"تمہیں تلوار اور خنجر ہمارے حوالے کرنا ہوں گے۔"

"بے شک تم رکھ لو۔ اندر سے پوچھ کر مجھے واپس کردینا۔"

"ایسا ہی ہوگا۔"

"عمر خاں کو جاکر خبر کردو۔ یہ ضرور کہنا کہ آپ کا دوست بیجاپور سے آیا ہے۔"

ان سپاہیوں میں سے ایک اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ دروازہ کھلا اور وہ بے تحاشا آنے والے سے لپٹ گیا۔

"عمر خاں! اپنے آدمیوں سے کہو میری تلوار اور خنجر واپس کردیں۔"

"تم اندر تو آؤ۔ دونوں چیزیں تمہیں مل جائیں گی۔"

وہ سوار عمر خاں کے ہمراہ اندر چلا گیا۔

"اور سناؤ شہباز خاں کیسے آنا ہوا۔ مجھے یقین ہے کوئی اہم خبر ہوگی جو تمہیں یہاں لے آئی۔"

"کامل خاں دکنی قتل کرادیا گیا۔"

"ارے نہیں، یہ کب اور کیسے ہوگیا؟"

"اس نے جان بچانے کے لیے احمد نگر کا قصد کیا تھا مگر راستے ہی میں مارا گیا۔"

"مگر کیوں...... کس کے اشارے پر؟"

"اسے چاند بی بی نے کشور خاں کے ذریعے ٹھکانے لگادیا۔"

"مگر کیوں؟"

اس کے جواب میں شہباز خاں نے پوری تفصیل اس کے گوش گزار کردی۔

"کمال ہے، یہ خبر اب تک یہاں کیوں نہیں پہنچی۔"

"اس لیے کہ چاند بی بی نے اس خبر کو چھپانے کا حکم دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مرتضیٰ نظام تک یہ خبر پہنچے اور وہ اس کا انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔"

"اب جو بھی ہو، میں یہ خبر مرتضیٰ نظام شاہ تک ضرور پہنچاؤں گا بلکہ اپنے دوست کامل خاں کا بدلہ لینے کے لیے اسے بیجاپور پر حملہ کرنے کی ترغیب بھی دوں گا۔"

"تمہیں ترغیب دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ چاند بی بی اور مرتضیٰ نظام شاہ کے درمیان حالات پہلے ہی کشیدہ ہیں۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ چاند بی بی کامل خاں کے قتل میں ملوث ہے تو وہ اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکے گا۔ یہ تمہیں بھی معلوم ہے کہ چاند بی بی نے جو میری بے عزتی کی تھی، اس کا جواب یہی ہے کہ میں بیجاپور کی ہر خبر احمد نگر تک پہنچاؤں اور ذریعہ تم بنو۔"

"شکریہ دوست......!"

شہباز خاں یہ خبر پہنچا کر واپس ہوگیا اور عمر خاں مرتضیٰ نظام کے حضور حاضر ہوگیا۔ اسے محض خبر سانی تھی لیکن اس خبر میں اپنی جانب سے ایسا اضافہ کردیا کہ مرتضیٰ نظام کے ہوش اڑ گئے۔

"مجھے بیان کرتے ہوئے حجاب محسوس ہورہا ہے لیکن کیا کروں، حقیقت یہی ہے جو مجھ تک پہنچی ہے۔"

"عمر خاں! جو کہنا ہے کہو، ہم سننے کو تیار ہیں۔"

"آپ کو معلوم ہے کامل خاں دکنی کو قتل کرادیا گیا ہے؟"

"عمر خاں! تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔"

"یہ خبر ہم تک پہنچی کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ اس کے قتل کو چھپایا گیا ہے اور اس خبر کو چھپانے کا حکم دینے والی آپ کی ہمشیرہ چاند بی بی ہیں۔"

"وہ کیوں چھپائیں گی؟"

"اس لیے کہ کامل خاں کو آپ سے وفاداری کے جرم کی سزا دی گئی ہے۔ چاند بی بی کو یہ خوف تھا کہ آپ کامل خاں کے قتل کا بدلہ ضرور لیں گے۔"

"ہمیں تفصیل بتاؤ عمر خاں۔"

"چاند بی بی کو یہ گوارا نہیں ہے کہ احمد نگر پر آپ حکومت کریں۔"

"ہمیں معلوم ہے۔"

"انہوں نے کامل خاں کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی سپہ سالاری میں احمد نگر پر حملہ کردے۔ کامل خاں نے انکار کردیا۔ چاند بی بی نے اسے اپنی بے عزتی تصور کیا اور کشور خاں کے ذریعے اسے قتل کرادیا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ بیجاپور سے فرار ہوکر آپ کے پاس پناہ لینے احمد نگر آرہا تھا کہ کشور خاں نے تعاقب کرکے اسے راستے ہی میں ٹھکانے لگادیا۔"

"ہم کامل خاں کو پناہ نہ دے سکے لیکن خدا کی قسم ہم اس کا بدلہ ضرور لیں گے۔" مرتضیٰ نظام نے کہا۔

عمر خاں یہ چنگاری ڈال کر واپس آگیا۔

اس کے جاتے ہی مرتضیٰ نظام نے سپہ سالاروں اور امراء کا اجلاس طلب کیا۔

"آپ لوگوں نے سن لیا ہوگا کہ بیجاپور کا کامل خاں دکنی قتل کردیا گیا۔ یہ بیجاپور کا اندرونی معاملہ ہے لیکن کامل خاں ہماری وفاداری کے جرم میں قتل کیا گیا ہے۔ چاند بی بی نے اسے ہم پر حملہ کرنے کے لیے بھیجنا چاہا تھا۔ یہ حکم اس نے نہیں مانا۔ وہ قتل ہوگیا لیکن حکم ابھی باقی ہے۔ چاند بی بی یہی حکم اپنے دوسرے سپہ سالار کشور خاں کو بھی دے سکتی ہے بلکہ دے بھی دیا ہوگا لہٰذا ہم چاہتے ہیں اس سے پہلے ہم بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بجادیں۔"

تمام باحیثیت افراد نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور حملے کی تیاری ہونے لگی۔

☆☆☆

کشور خاں کو اطلاع ملی تھی کہ مرتضیٰ نظام شاہ کا سر نوبت بہزاد ملک ترک پندرہ ہزار سواروں کا لشکر لے کر عادل شاہی سرحد کے بعض پرگنوں کو فتح کرنے کے لیے آرہا ہے۔ اس نے اس خبر سے پہلے چاند بی بی کو آگاہ کیا اور پھر ابراہیم عادل شاہ ثانی کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ ابراہیم کی عمر اس وقت دس بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی ذہنی صلاحیت اپنی عمر سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے اس اطلاع کو نہایت سکون سے سنا اور گویا ہوا۔

"ہم پر فرض ہے کہ ہم اپنی سرحدوں کی حفاظت کریں۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ ملک ترک سے مقابلے کے لیے لشکر روانہ کیا جائے۔"

اس حکم کی وصولی کے بعد کشور خاں نے سبز محل میں چاند بی بی سے ملاقات کی۔ اس کی اجازت کی ضرورت اس لیے تھی کہ مرتضیٰ نظام شاہ اس کا بھائی تھا۔ چاند بی بی کا مشورہ بھی یہی تھا کہ صلح کا ہاتھ بڑھانے سے بہتر ہے کہ اپنا دفاع کیا جائے البتہ اس نے مسلمان ریاستوں کے حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی پر افسوس ضرور کیا۔

"جنوبی ہندوستان میں چار بڑی ریاستیں ہیں۔ ان میں سے تین مسلم ریاستیں ہیں صرف ایک بیجانگر ہندوؤں کے پاس ہے۔ اگر مسلم ریاستیں اتحاد کے ساتھ رہیں تو ہندو ریاست بھی مسلم ریاست میں تبدیل ہوجائے لیکن مسلم ریاستیں آپس میں دست و گریباں رہتی ہیں بلکہ اپنے ہم قوموں پر حملہ کرنے کے لیے ہندو راجا رام راج سے مدد مانگتے ہیں جبکہ ہندوؤں کا منصوبہ ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑواتے رہو۔ مرتضیٰ نظام بھی یہی نادانی کررہا ہے اور میں مجبور ہوں کہ اپنا دفاع کروں۔"

چاند بی بی کی تقریر ایسی جذباتی تھی کہ کشور خاں آبدیدہ ہوگیا۔

"میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا اور بیجاپور کی حفاظت کروں گا۔"

"مرتضیٰ نظام یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ بیجاپور پر ایک کم عمر لڑکا حکومت کررہا ہے۔ اسے یہ بتادو کہ یہاں چاند بی بی اور

کشور خاں بھی ہیں۔"
"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔"
کشور خاں نے تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد عین الملک، آتش خاں اور دوسرے حبشی امراء اخلاص خاں اور دلاور خاں وغیرہ کو ایک زبردست لشکر کے ساتھ بہزاد ملک ترک کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔
یہ ابراہیم عادل شاہ کے دورِ حکومت کی پہلی مہم تھی لہٰذا مسجدوں میں دعائیں مانگی گئیں۔ دکانداروں نے شہر کو...... ریشمی کپڑوں سے آراستہ کیا۔ ہندوستان کے دستور کے مطابق مٹی کے برتنوں میں روپے بھر بھر کر لشکر پر نچھاور کیے گئے۔
نہایت دھوم دھام سے یہ لشکر روانہ ہوا۔
یہ تمام امراء شاہ درک کے قریب پہنچے اور چند روز اس جگہ قیام کیا۔ طلایہ گردوں نے گھوم پھر کر معلوم کیا کہ نظام شاہی لشکر یہاں سے پانچ کوس کے فاصلے پر ٹھہرا ہوا ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی چلنے کی تیاری ہوئی اور گرد اڑائے بغیر آہستہ روی کے ساتھ فاصلہ طے ہونے لگا۔
جب بہزاد ملک کو عادل شاہی لشکر کی آمد کا علم ہوا تو اس نے اپنی فوج کو منظم و مرتب کیا اور جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔
بہزاد ملک نے حملے میں پہل کی لیکن جلد ہی اسے عادل شاہی لشکر کی قوت کا اندازہ ہوگیا۔ جب تک اس کا لشکر تازہ دم رہا وہ مقابلہ کرتا رہا لیکن پھر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا اور محض چند گھنٹوں کی جنگ کے بعد نظام شاہی لشکر اپنا مال و متاع چھوڑ کر فرار ہوگیا۔
جو امراء اس جنگ میں شریک تھے انہوں نے فتح نامہ بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ سارے شہر میں فتح کی خوشی منائی گئی۔ تمام کوچوں اور بازاروں میں شربت تقسیم کیا گیا۔ چاند بی بی نے کشور خاں کو حکم دیا کہ تمام امیروں کو خلعت عطا کیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔
اس فتح نامے کے ذریعے چاند بی بی کو معلوم ہوا کہ نظام شاہی مال و متاع میں چند ہاتھی بھی ہیں جو امراء کے ہاتھ لگے ہیں۔ یہ ہاتھی چونکہ اس کے بھائی کی مملکت کے تھے لہٰذا وہ انہیں شاہی اصطبل میں محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے کشور خاں کو حکم دیا کہ جو ہاتھی ہاتھ لگے ہیں، انہیں شاہی اصطبل میں داخل کرا دیا جائے۔
امرائے کبار کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ حکم چاند بی بی کی طرف سے دیا گیا ہے۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ کشور خاں نے اپنی طرف سے یہ حکم جاری کیا ہے لہٰذا حکم ملتے ہی تمام امراء جمع ہوئے اور کشور خاں کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے لگے۔
"یہی شخص کامل خاں کے قتل میں ملوث ہے اور اب ہمارے مال کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔"
"ہم اس کے ملازم نہیں ہیں کہ اس کا حکم مانتے پھریں۔"
"کشور خاں اپنی حیثیت کا غلط فائدہ اٹھا رہا ہے۔"
"یہ شخص اگر ہمارے سروں پر باقی رہا تو ہمیں اسی طرح ذلیل کرتا رہے گا۔"
"یہ شخص اس قابل نہیں کہ عہدے پر برقرار رہے۔ چاند بی بی کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جائے جس میں اس سے درخواست کی جائے کہ کشور خاں کو معزول کر کے مصطفیٰ خاں کو مقرر کیا جائے۔"
تمام تر بحث کے بعد اخلاص خاں نے جو بہت دیر سے خاموش تھا، اپنی رائے پیش کی۔
"بہزاد خاں ترک کی شکست کی خبر سن کر مرتضیٰ نظام ایک لشکر لے کر نکلا ہے تاکہ بیجاپور پر حملہ آور ہو لہٰذا فی الحال خاموش رہنا بہتر ہے۔ اچھا یہی ہے کہ مرتضیٰ نظام کے فتنے کو دبا کر خود پایۂ تخت پر حاضر ہوں اور چاند بی بی کی رائے کے مطابق اس معاملے کو طے کیا جائے۔"
تمام امراء اس پر متفق ہوگئے۔
کشور خاں کو کسی نہ کسی طرح معلوم ہوگیا کہ اس کی معزولی کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں اور اس کی جگہ مصطفیٰ خاں کی تعیناتی کی سازش تیار ہو رہی ہے۔ اسے کامل خاں دکنی یاد آگیا جس کے قتل کے بعد اسے یعنی کشور خاں کو اقتدار ملا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس گتھی کو کیسے سلجھایا جائے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر مصطفیٰ خاں کو راستے سے ہٹا دیا جائے تو یہ سازش خود بخود دم توڑ جائے گی۔
یہ سوچنا آسان تھا لیکن اس پر عمل کرنا آسان نہیں تھا۔ مصطفیٰ خاں کو قتل کرانے کے لیے چاند بی بی کی رضامندی اور تحریری حکم نامہ ضروری تھا۔ مصطفیٰ خاں کے خلاف کوئی ایسا جواز بھی نہیں تھا جسے بہانہ بنا کر اس کے قتل کے احکام پر دستخط لے لیے جاتے۔ اس نے بہت سوچ کر سلطنت کے بہت سے کام جمع کر لیے جن پر چاند بی بی کے دستخط لینے تھے۔ مختلف درخواستیں لکھیں اور چاند بی بی کی خدمت میں پہنچ گیا۔ ان درخواستوں میں ایک مصطفیٰ خاں کے قتل کا محضر نامہ بھی تھا۔ اس نے یہ سب درخواستیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ چاند بی بی اس پر نہایت بھروسا کرتی تھی۔ وہ ان درخواستوں پر بغیر پڑھے دستخط کرتی چلی گئی

اور یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ خود ان کاغذات پر شاہی مہر ثبت کردے۔

کشور خاں کی مٹھی میں مصطفیٰ خاں کے قتل کا فرمان دبا ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ یہ کام کس سے لینا ہے۔ اس نے یہ حکم نامہ اور ایک پیغام لفافے میں بند کر کے شاہی مہر کے ساتھ ایک امیر مرزا نور الدین کے پاس روانہ کردیا۔

یہ حکم نامہ جب مرزا کے ملاحظے میں آیا تو اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ابھر آئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ حیران بھی ہوا کہ یہ حکم نامہ اس کے پاس کیوں بھیجا گیا ہے کیونکہ مصطفیٰ خاں اس کا محسن تھا۔ پھر اس نے وہ لفافہ کھولا جو اس کے نام لکھا گیا تھا۔ اس میں یہ عبارت درج تھی۔

''مصطفیٰ خاں کو فوراً قتل کردو۔ اس کے بعد مصطفیٰ خاں کی تمام جاگیر اور مال و دولت کا مالک تمہیں بنا دیا جائے گا۔''

مرزا نور الدین محمد مشہدی تھا اور ایک لڑائی میں گرفتار ہوا تھا۔ پھر مصطفیٰ خاں کی عنایت شاہی سے امراء کے گروہ میں داخل ہوگیا تھا۔ اس طرح مصطفیٰ خاں اس کا محسن تھا لیکن اس عبارت کو پڑھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مصطفیٰ خاں کی جاگیر اور مال و دولت اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اس نے تمام احسانات کو بالائے طاق رکھ کر مصطفیٰ خاں کے قتل کا ارادہ کرلیا۔ کشور خاں کو پیغام بھیجا کام ہوجائے گا۔

مرزا نور الدین نے ایک شخص محمد امین کو اپنے پاس بلایا اور اس کے سامنے شاہی فرمان رکھ دیا۔ جب وہ اس فرمان کو پڑھ چکا تو اسے مرزا نور الدین نے شیشے میں اتارا۔

''مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مصطفیٰ خاں نے اہلِ قلعہ کو قتل کر کے کچھ غیر ذمے دار لوگوں کو ان کی جگہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ نیز اس کی خواہش ہے کہ بغاوت اور سرکشی سے کام لے کر بہت سی جاگیروں پر قبضہ کرلے۔ اس وقت تمہارا یہ فرض ہے کہ تم شاہی فرمان کے مطابق عمل کرو اور مصطفیٰ خاں سے بالکل نہ ڈرو۔ یاد رکھو اس قتل پر تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا کیونکہ تم شاہی فرمان پر عمل کرو گے۔

''اگر تم کامیاب ہوگئے تو تمہیں انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اتنی دولت ملے گی جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ یہ کام تم کس طرح کرو گے، یہ تم جانو اور ہاں، یہ بھی یاد رکھو کہ عمل نہ کرنے کی صورت میں عتابِ شاہی کے حقدار بھی ہوسکتے ہو۔''

انعام و اکرام کا لالچ اس کے دل میں آ ہی چکا تھا۔ سزا کا سن کر وہ ڈر بھی گیا۔ اس نے فوراً ہامی بھرلی۔ اب اسے محض یہ سوچنا تھا کہ مصطفیٰ خاں کے قتل کی کیا ترکیب ہو۔

محمد امین شام کے وقت قلعے میں داخل ہوا اور مصطفیٰ خاں کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ میں ایک انتہائی ضروری فرمان لے کر حاضر ہوا ہوں۔ مصطفیٰ خاں نے محمد امین کی بات پر اعتبار کرلیا اور اسے ایک عمدہ اور آرام دہ مکان میں ٹھہرا دیا۔

محمد امین نے مصطفیٰ خاں کو کہلوایا کہ اب رات ہوگئی ہے، میں شاہی فرمان صبح کے وقت دیوانِ عام میں پڑھ کر سناؤں گا۔

رات کو جب سب لوگ سو گئے تو محمد امین نے قلعے کے محافظوں کو شاہی فرمان دکھا کر مصطفیٰ خاں کے قتل پر راضی کرلیا۔ صبح کو جب مصطفیٰ خاں اپنے گھر سے نکلا تو ان ظالموں نے اسے قتل کردیا۔

جو لوگ اس قتل میں ملوث نہیں تھے، انہوں نے قاتلوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ محمد امین خاں بھی پکڑا گیا لیکن وہ مطمئن تھا اور بضد تھا کہ اس نے شاہی فرمان پر عمل کیا ہے۔

اس معاملے کی خبر چاند بی بی تک پہنچی تو وہ کسی شاہی فرمان سے بے خبر تھی۔ اس نے محمد امین کو طلب کیا۔ محمد امین نے پورا معاملہ صاف صاف بیان کردیا کہ کس طرح کشور خاں نے شاہی فرمان مرزا نور الدین تک پہنچایا اور پھر کس نے اسے مصطفیٰ خاں کے قتل پر مامور کیا۔ اس کا کہنا اب بھی یہی تھا کہ اس نے حضور کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ وہ ہر طرح سے بے قصور ہے۔

چاند بی بی کو قطعی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کس وقت مصطفیٰ خاں کے قتل کے احکام جاری کیے۔ اس نے وضاحت کے لیے کشور خاں کو بلایا۔

''آپ کو مصطفیٰ خاں سے کیا دشمنی ہوگئی تھی کہ اس بے قصور کے قتل کے احکام جاری کردیے؟''

''ملکہ عالیہ! میری کیا مجال کہ میں احکام جاری کرتا۔ مجھے مصطفیٰ خاں کی ان سازشوں کا علم ہوگیا تھا جو وہ سلطنت کے خلاف کر رہے تھے۔ اگر وہ سازشیں کامیاب ہوجاتیں تو سلطنت بیجاپور کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔ اس لیے میں نے اس کے قتل کی محض سفارش کی تھی۔ آپ اسے رد کرسکتی تھیں لیکن آپ نے قتل کے احکام جاری کردیے۔ میں نے تو آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے جس طرح ہمیشہ کرتا رہا ہوں۔''

''ہم دیکھنا چاہیں گے کہ ہم نے کیا حکم دیا تھا۔''

''میں نے وہ فرمان مرزا نور الدین کی خدمت میں روانہ کردیا تھا۔''

''وہ فرمان ہماری خدمت میں پیش کیا جائے۔''

کشور خاں نے وہ ''فرمان'' منگوالیا اور چاند بی بی کے سامنے پیش کردیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ دستخط اس کے تھے۔

اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ کشور خاں نے دھوکے سے اس پر دستخط کرالیے تھے۔ غلطی اسی کی تھی کہ اس نے بغیر پڑھے دستخط کردیے تھے مگر یہ بھی ثابت ہوگیا کہ کشور خاں نے اسے فریب دیا تھا اور اس کے بھروسے کا غلط فائدہ اٹھایا تھا۔

بیجاپور کے حالات ایسے نازک دور سے گزر رہے تھے کہ وہ کشور خاں جیسے طاقتور امیر سے ٹکرا جاتی لیکن اس دن کے بعد سے اپنے جذبات کو چھپا نہ سکی اور کشور خاں کو نہایت سخت الفاظ میں یاد کرنے لگی۔

اس نے فی الحال کشور خاں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا لیکن کشور خاں خائف ہوگیا تھا۔ اس نے ایک منصوبے کے تحت یہ مشہور کرنا شروع کردیا کہ وہ عادل شاہ کے مرنے کے بعد بیجاپور کی وفادار نہیں رہی ہے اور اپنے بھائی مرتضیٰ نظام کو سلطنت کے اہم رازوں سے آگاہ کرتی رہتی ہے اور اسے عادل شاہی سرحدوں پر قبضہ کرنے کے لیے اکساتی رہتی ہے۔ اسی کے ورغلانے پر بہزاد ملک ترک حملہ آور ہوا تھا۔

یہ ایسے سنگین الزامات تھے کہ جس نے بھی سنا انگشت بدنداں رہ گیا۔ مرتضیٰ نظام، چاند بی بی کا بھائی تھا اس لیے سب کو یقین بھی آگیا۔

جب کشور خاں نے یہ الزامات پھیلا کر بہت سے ہم نوا پیدا کرلیے تو اس نے آخری مہرے کے طور پر ابراہیم عادل کا انتخاب کیا اور چند امراء کے ساتھ اس کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس کے سامنے بھی کشور خاں نے ان الزامات کو دہرایا اور مشورہ دیا۔

''چاند بی بی احمد نگر میں اپنے بھائی مرتضیٰ کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ اگر اس پر گرفت نہ کی گئی تو بیجاپور کی سلطنت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ چاند بی بی کو کچھ عرصے کے لیے ستارہ کے قلعے میں بند کردیا جائے۔ جب نظام شاہی جھگڑوں سے چھٹکارا مل جائے اور صلح ہوجائے تو اسے شاہی محل میں واپس بلالیا جائے گا۔''

ابراہیم اپنی کم عمری کی وجہ سے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ تمام کاروبار امراء سرانجام دے رہے تھے۔ وہ بھلا کیا اختلاف کرتا۔ اس نے اس مشورے کو من وعن تسلیم کرلیا۔

کشور خاں نے چاند بی بی کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ حرم سرا سے باہر آکر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردے۔

چاند بی بی نے اس کے قاصد کے ذریعے کہلوایا۔

''تو ایک معمولی سا امیر تھا۔ میرے احسانات نے تجھے تارے سے مہتاب کردیا۔ اب تو اتنا عظیم ہوگیا کہ بیجاپور کی مالکہ کو گرفتار کرنے کی باتیں کررہا ہے۔ میرے شوہر سلطان عادل شاہ کے احسانات بھی بھول گیا؟''

''میں کسی احسان کو نہیں بھولا لیکن سلطنت کا مفاد مجھے عزیز ہے۔ میں ہرگز یہ گوارا نہیں کروں گا کہ آپ سلطنت کے راز اپنے بھائی تک پہنچائیں۔'' کشور خاں نے جواب میں کہلوا دیا۔

اس کی طرف سے بھی جواب آگیا۔

''ایک معمولی امیر مجھے گرفتار کرے یہ ممکن نہیں۔ قدیم خواجہ سرا میری حفاظت پر مامور ہیں۔ اگر تم نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی تو اس کے ذمے دار خود ہوگے۔''

کئی روز تک یہ کشمکش چلتی رہی۔ چاند بی بی کسی طرح حرم سرا سے باہر آنے کو تیار نہیں تھی۔ کشور خاں نے جب یہ دیکھا تو اس نے خواجہ سراؤں اور عورتوں کو شاہی محل میں بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ چاند بی بی کو زبردستی اٹھالائیں۔ یہ لوگ اندر گئے تو ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ چیخ پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہاتھا پائی سے کئی خواجہ سرا لہولہان ہوگئے لیکن بالآخر چاند بی بی کو جبراً شاہی محل سے نکال کر ایک پالکی میں بٹھادیا گیا اور یوں وہ قلعہ ستارہ میں لے جاکر نظربند کردی گئی۔

اس کام سے نمٹنے کے بعد اب اس کی یہ کوشش ہوئی کہ کسی طرح ان امراء کو اپنے حق میں ہموار کیا جائے جو اس کے خلاف ہوگئے تھے اور اس کی جگہ مصطفیٰ خاں کو متعین کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے ایک چھوٹے سالار میاں بدو کو جو اس کا مقرب خاص تھا، امرائے سرحد کا سپہ سالار مقرر کیا اور اسے ایک بہت بڑا لشکر ہاتھیوں اور گھوڑوں کے ساتھ دے کر شاہ درک کی طرف روانہ کیا اور اسے خاص ہدایت کی کہ جو امراء میرے خلاف ہوگئے تھے انہیں میرے حق میں کرنے کی کوشش کرے۔

میاں بدو نہایت جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس نے سرحد

پر پہنچتے ہی اندازہ لگالیا کہ وہ کون سے امیر ہیں جو کشور خاں کے خلاف سازش کرنے میں پیش پیش ہوں گے۔ اس کی نگاہ میں آنکش خاں اور عین الملک دو اہم امیر تھے۔ میاں بدو نے ان کی طرف دوستی اور خیر خواہی کا ہاتھ بڑھایا اور کشور خاں کی تعریفیں کرنا شروع کیں۔ انہیں یہ باور کرا دیا کہ کشور خاں انہیں بہت پسند کرتا ہے۔

''کشور خاں نے چلتے وقت مجھے خاص ہدایت کی تھی کہ آنکش خاں نہایت وفادار اور تجربہ کار امیر ہیں۔ تمہیں جو مشورہ لینا ہوان سے لینا۔''

یہی باتیں اس نے عین الملک سے کہیں اور دونوں کو مزید وعدے وعید کر کے کشور خاں کا بہی خواہ بنالیا۔

اسی دوران کشور خاں کی طرف سے میاں بدو کو پیغام ملا کہ امراء اپنی قوت پر بہت نازاں ہیں۔ میرا کوئی حکم ماننے کو تیار نہیں۔ بادشاہ کی اطاعت سے بھی کسی حد تک منحرف ہیں۔ جس طرح بھی ہو سکے تم انہیں قید کرلو اور شاہ درک کے قلعے میں نظر بند کردو اور ان کے گھوڑے اور ہاتھی بارگاہِ شاہی میں روانہ کردو۔

اس پیغام میں میاں بدو کو اپنی ترقی نظر آئی۔ اگر یہ امراء راستے سے ہٹ گئے تو وہ سپہ سالاری کے منصب پر فائز ہوسکتا ہے۔ اس نے امید خاں اور اخلاص کو اپنے گھر دعوت پر بلا کر گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔

اتفاق یہ ہوا کہ یہ امراء بھی آپس میں یہی طے کر رہے تھے کہ میاں بدو کو دعوت کے بہانے گھر بلا کر قید کرلیا جائے اور پھر پایۂ تخت پر پہنچ کر کشور خاں کا خاتمہ کیا جائے۔

یہ منصوبے طے ہوتے ہی اخلاص خاں نے یہ مشہور کیا کہ بیجاپور میں اس کے گھر لڑکے کی ولادت ہوئی ہے۔ اس کے ساتھی امراء نے اس پر زور دینا شروع کیا کہ اس خوشی میں وہ ضیافت کا اہتمام کرے۔ میاں بدو بھی ان کے ارادے سے بے خبر اخلاص خاں سے دعوت کا تقاضا کرنے لگا۔ اس نے میاں بدو کو بھی مدعو کیا۔ میاں بدو ان کے جال میں پھنس گیا۔

تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد دعوت کا دن مقرر کیا گیا۔ میاں بدو وہاں پہنچا تو اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ کھانے سے پہلے شراب کے دور چلے۔ میاں بدو جب نشے سے بے حال ہوگیا تو اسے گرفتار کرلیا گیا۔

میاں بدو کو گرفتار کرنے کے بعد ان لوگوں نے بیجاپور کا سفر اختیار کیا۔ اخلاص خاں چونکہ خود بھی حبشی تھا لہٰذا تمام حبشی امراء اور سالار اسے چاہتے تھے، وہ سب اس کے گرد جمع ہوگئے۔

یہ ساری کارروائی اتنی عجلت میں ہوئی کہ کسی کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ دوسری طرف جب کشور خاں کو ان حالات کا علم ہوا تو اس نے مقابلے کی تیاری شروع کردی۔ وہ اگرچہ ان حبشی امراء سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا تاہم ظاہری طور پر اس نے مقابلے کے لیے تیاری شروع کردی۔

اخلاص خاں اپنے دیگر حبشی سالار ساتھیوں کے ساتھ لشکر لے کر بڑی تیزی سے بیجاپور کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ جب کشور خاں کو اس بات کا پورا اندازہ ہوگیا اور علم ہوا کہ اخلاص خاں صرف ایک منزل پر بیجاپور سے دور ہے تو اس نے خوفزدہ ہو کر مقابلے سے ہاتھ اٹھالیے اور بادشاہ کو شکار کے بہانے شہر سے باہر لے گیا۔ بادشاہ اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کے سبب کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا، اس کے ساتھ ساتھ لگا رہا۔

شہر کے نواح میں ایک باغ تھا جہاں اس نے بادشاہ کو اتار دیا۔

''حضور! آج گرمی بہت ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ آج شکار کا ارادہ ملتوی کیا جائے۔ حضور شہر میں تشریف لے جائیں۔ میں ذرا شاہ پور کے بازاروں میں گھوم پھر آؤں اور اس کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا۔''

بادشاہ نے اس کی بات مان لی اور قلعہ واپس چلا گیا۔

کشور خاں چار سو سواروں اور بے شمار دولت کے ساتھ اپنے بال بچوں سے علیحدہ ہو کر احمد نگر کی طرف چلا گیا۔

احمد نگر کی حدود میں داخل ہونے کے بعد کشور خاں حبشیوں کے سالار اخلاص خاں کی گرفت سے تو بچ گیا لیکن یہاں پہنچتے ہی اس پر یہ انکشاف ہوا کہ یہاں کے لوگ بھی اسے ناپسند کرتے ہیں۔ کامل خاں دکنی اور مصطفیٰ خاں کے قتل کا ذمے دار اسی کو سمجھتے ہیں۔ یہاں کے حکمران بھی اس کے خلاف ہیں۔ اس کا یہاں رہنا دوبھر ہوجائے گا۔ وہ یہاں سے نکلا اور قطب شاہی سلطنت کے پایۂ تخت گولکنڈہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ موت اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ ایک شخص احمد نگر سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ گولکنڈہ پہنچنے سے پہلے ہی وہ شخص اس پر حملہ آور ہوا اور مصطفیٰ خاں کا انتقام لینے کے لیے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اخلاص خاں اپنے دیگر سالاروں کے ساتھ بیجاپور پہنچا۔ بادشاہ نے اس کا استقبال کیا اور اسے خلعتِ فاخرہ سے نوازا اور ملکی و مالی سب امور اخلاص خاں کے سپرد کردیے۔

اس نے اختیارات ملتے ہی چاند بی بی کو قلعہ ستارہ سے رہا کر کے واپس بیجاپور لانے کا حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔

چاند بی بی ایک مرتبہ پھر شاہی حرم سرا میں آ گئی۔

کچھ دنوں معاملات ٹھیک چلتے رہے لیکن پھر بدقسمتی کے سائے بیجاپور کے آسمان پر منڈلانے لگے۔ پہلے کامل خاں پھر کشور خاں اور اب اخلاص خاں اسی ڈگر پر چل پڑا۔ اس نے بھی رفتہ رفتہ چاند بی بی کے دل میں جگہ پیدا کر لی اور اس کے بل بوتے پر من مانی شروع کر دی۔ اسے یہ وہم ہو گیا تھا کہ غیر ملکی امراء کی وجہ سے اس کا اقتدار خطرے میں ہے۔ اس خیال کے پیشِ نظر اس نے سب سے پہلے افضل خاں شیرازی اور راسو پنڈت کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد اپنے منصب کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے فتح اللہ شیرازی، ابوالقاسم اور شاہ مرتضیٰ خاں کو بیجاپور سے نکال دیا۔ اس کے بعد اس نے دو بڑے سالاروں کو ساتھ ملا لیا۔ وہ امیر خاں اور دلاور خاں تھے اور ان کی مدد سے سلطنت کی مختلف مہمات کی انجام دہی میں مصروف ہو گیا۔ اس کی ان حرکتوں سے ایسی افراتفری پھیلی کہ اخلاص خاں بھی قابو نہ پا سکا۔

دوسری طرف کرناٹک کا راجا تنکاوری بھی بیجاپور کے حالات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا اور وہ اپنے لشکر میں بڑی تیزی سے اضافہ کر رہا تھا تاکہ کسی بھی مناسب موقع پر بیجاپور پر حملہ آور ہو کر اپنے لیے فوائد حاصل کر سکے۔

ان حالات میں جبکہ اخلاص خاں سب سیاہ و سفید کا مالک ہو چکا تھا، اسے ایک سالار عین الملک سے خطرہ محسوس ہوا۔ عین الملک اس وقت بیجاپور سے باہر تھا چنانچہ اس کا خاتمہ کرنے کے لیے اخلاص خاں نے اسے بیجاپور طلب کیا۔ عین الملک کو بھی اس کے آدمیوں نے باخبر کر دیا تھا کہ اخلاص خاں اس کی طرف سے اچھے ارادے نہیں رکھتا۔ وہ بیجاپور کے لیے روانہ ضرور ہوا لیکن پوری تیاری سے آیا۔

اخلاص خاں چند مقربین کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آیا۔

عین الملک نے جب دیکھا کہ اخلاص خاں کے ساتھ گنتی کے صرف چند لوگ ہیں تو اس نے فوراً حرکت میں آتے ہوئے اخلاص خاں سمیت سب کو گرفتار کر لیا۔ بازی ہی الٹ گئی۔ اخلاص خاں اسے گرفتار کرنا چاہتا تھا، الٹا وہ خود گرفتار ہو گیا۔

اس نے اخلاص خاں اور اس کے ساتھیوں کو پابہ زنجیر کیا اور ہاتھیوں پر بٹھا کر بیجاپور کے حکمراں ابراہیم عادل کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہوا۔ ابھی وہ اللہ نور نامی شہر کے دروازے تک پہنچا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ اخلاص خاں کی گرفتاری کی خبر بیجاپور تک پہنچ چکی ہے اور اس کا شدید ردعمل ہوا ہے۔ ایک سالار دستور خاں کو اس جرم میں قتل کر دیا گیا ہے کہ وہ عین الملک سے ملا ہوا ہے۔ یہ سن کر عین الملک بہت پریشان ہوا۔ اس نے گرفتار شدہ امراء کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور فوراً واپس ہو گیا۔ اس موقع پر مقصود نامی ایک غلام نے ایک جماعت کے ساتھ ان لوگوں کا مقابلہ کیا۔ یہ لوگ ابھی شہر سے باہر بھی نہ نکلے تھے کہ مقصود خاں کے ہاتھ وہ ہاتھی لگ گئے جن پر اخلاص خاں اور اس کے ساتھیوں کو عین الملک نے پابہ زنجیر کر کے بٹھا رکھا تھا۔ مقصود خاں نے ان ہاتھیوں کو روک لیا اور شہر سے باہر نہ جانے دیا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے عین الملک اپنی جاگیر کی طرف بھاگ گیا۔

اخلاص خاں بیجاپور روانہ ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

عین الملک نے بہت سے امراء اور سالاروں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اخلاص خاں اور اس کے ساتھیوں کے خلاف حرکت میں آنے کے لیے تیاری کرنے لگا۔ یہ خبریں سنتے ہی بیجاپور میں انتشار پھیل گیا۔

نظام شاہیوں کا سالار بہزاد ملک بیجاپور کی سرحد کے قریب ہی اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کیے ہوئے تھا اور حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ جونہی مناسب موقع ملے گا، بیجاپور کے علاقوں پر حملہ آور ہو جائے گا۔ یہ موقع اسے مل گیا تھا۔ عین الملک اور اخلاص کی دشمنی نے اس کی امیدیں سرسبز کر دی تھیں۔ وہ حرکت میں آیا اور سب سے پہلے قلعہ شاہ درک پر حملہ آور ہوا اور اسے اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس کے بعد اس نے قلعہ گلبرگہ پر بھی قبضہ کرنے کا ارادہ کر لیا لیکن اس میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس قلعے کے تھانے دار محمد آقا نے بڑی بہادری اور جرأت کا ثبوت دیا۔ اس نے ہر طریقے سے دشمن کی مدافعت کی۔ اسے معلوم تھا کہ بیجاپور میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے۔ اسی لیے وہاں سے کسی قسم کی مدد لینا مشکل ہے لیکن اس نے ہمت سے کام لیا اور نظام شاہیوں کو غالب نہ آنے دیا۔

نظام شاہ نے محمد آقا کو پھسلانے کی بہت کوشش کی۔ اسے آئندہ ترقی کی امیدیں دلائیں لیکن وہ تیار نہ ہوا کہ اپنے آقا سے غداری کرے۔ اس نے آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر کہہ دیا۔

''میرے آقا نے مجھ پر بھروسا کر کے یہ قلعہ میرے حوالے کیا ہے۔ میں اس کی عنایت سے بہت خوش ہوں۔ اگر آج میں بددیانتی سے کام لے کر یہ قلعہ آپ کے حوالے کردوں تو کل خدا اور خلقِ خدا کے سامنے میری جو تذلیل ہوگی، وہ بیان سے باہر ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھ سے اس قسم کی توقع نہ کی جائے اور مجھے اپنے آقا کا سچا وفادار سمجھا جائے۔''

محاصرے کو چار مہینے گزر گئے اور فتح کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو محاصرہ ختم کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔

''ہمیں محاصرے سے دست بردار ہو کر یہاں سے کوچ کر دینا چاہیے۔ اس وقت بیجاپور میں انتشار پھیلا ہوا ہے۔ اس محاصرے سے تو بہتر ہے کہ بیجاپور پہنچ کر کوئی ہنگامہ برپا کریں۔''

قلی قطب شاہ بھی ان لوگوں کے ساتھ آکر مل گیا تھا۔ اب طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔ یہ تمام لوگ لشکریوں کی زبردست جمعیت کے ساتھ روانہ ہوئے اور بیجاپور کے پاس پہنچ کر شہر کا محاصرہ کرلیا۔

پایۂ تخت میں اس وقت صرف دو تین ہزار لشکر خاصہ کے سوار موجود تھے۔ دشمنوں نے اپنے خیمے نصب کر دیے اور شہر کو فتح کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

باقاعدہ جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی لیکن چھوٹی چھوٹی جھڑپیں جاری تھیں۔

اس نازک وقت میں ابراہیم عادل کو عین الملک کی یاد آئی۔ اس نے اسے اور آنکش خاں کو مدد کے لیے طلب کیا۔ یہ دونوں خاص طور پر عین الملک، اخلاص خاں کی گرفتاری اور رہائی کے بعد سے ابراہیم عادل کی طرف سے خوف زدہ تھے انہوں نے اس دعوت کو اپنی معافی قرار دیا اور چھ ہزار سواروں کے ساتھ بیجاپور آگئے اور دروازہ اللہ نور کے قریب مقیم ہوگئے۔

عین الملک نے اخلاص خاں کو گرفتار کیا تھا اور چونکہ اخلاص خاں حبشی تھا لہٰذا تمام حبشی امراء اور جمعیت اس کے خلاف تھی۔ اس خطرے کو عین الملک نے بھی بھانپ لیا تھا لہٰذا وہ اندر ہی اندر احمد نگر کے لشکر میں شامل برار کے امیر امراء سید مرتضیٰ سے مل گیا۔ اس کے ذریعے ساز باز کی کہ نظام شاہیوں کو حملے سے باز رکھے۔

قلی قطب شاہ اور بہزاد ملک ترک نے صبح کے وقت قلعے پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ سید مرتضیٰ نے ایسا نہ کرنے دیا۔ عادل شاہیوں نے اس مہلت کا فائدہ اٹھایا اور راتوں رات قلعے کی اس شکستہ دیوار کو از سرِ نو تعمیر کرلیا جو بارش کی وجہ سے گر گئی تھی۔

بیجاپور میں سخت اندرونی انتشار تھا۔ سلطنت کے اکثر امراء و اراکین حبشیوں سے ناراض تھے اور ان کی کسی بات پر اعتماد نہ کرتے تھے جس کی وجہ سے سلطنت کا کام بری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ دشمن دروازے پر کھڑا تھا اور یہاں یہ خلفشار تھا۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے حبشیوں کا ایک وفد چاند بی بی کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

''ہم لوگ غلام ہیں اس لیے اراکینِ دربار اور اشراف ملک ہم سے آزردہ خاطر ہیں اور ہماری حکومت ناپسند کرتے ہیں۔ دشمن ہمارے سر پر کھڑا ہے اس لیے عادل شاہی خاندان کی بہتری اسی میں ہے کہ عنانِ حکومت اشراف اور عالی خاندان امراء کے سپرد کردی جائے تاکہ باہمی چپقلش اور فتنہ و فساد کا دروازہ بند ہوجائے۔''

چاند بی بی نے اس مشورے سے اتفاق کیا اور ایک نہایت بزرگ ہستی شاہ ابوالحسن کو میر جملہ مقرر کیا۔ شاہ ابوالحسن عہدہ سنبھالتے ہی دشمنوں کے دفع کی تدابیر میں مشغول ہوگئے۔ انہوں نے پہلی فرصت میں برار کے امیر امراء سید مرتضیٰ کے نام اپنے پرانے تعلقات کے پیشِ نظر خط لکھا۔

''ابراہیم عادل شاہ اپنی قوت، عسکری طاقت اور اقبال کے لحاظ سے دشمنوں سے بہت آگے ہے۔ اسے مغلوب کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ تم قطب شاہ اور بہزاد ملک کو اچھی طرح سمجھا دو کہ بادشاہ کی مختصر فوج کو دیکھ کر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں میں ممالکِ محروسہ سے بے شمار لشکری پایۂ تخت کے آس پاس جمع ہونے کے لیے یہاں چلے آئیں گے۔ برکی امراء جو علی عادل شاہ کے عہدِ حکومت میں خوف کی وجہ سے پایۂ تخت میں آتے ہوئے گھبراتے تھے اور بیجانگر چلے گئے تھے، انہیں طلبی کا شاہی فرمان بھجوایا جاچکا ہے اور وہ اس طرف آنے ہی والے ہیں۔ ایسی صورت میں تمہارا یہاں رہنا تو کیا، فرار ہونا بھی مشکل ہوجائے گا۔''

اس خط نے کام کر دکھایا۔ سید مرتضیٰ پہلے ہی قطب شاہ اور بہزاد ملک سے کبیدہ خاطر تھا۔ اس خط نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور وہ دل ہی دل میں عادل شاہیوں کا طرفدار ہوگیا۔ وہ ایک دن لشکر سے نکلا اور عین الملک کے

پاس پہنچ گیا اور اسے سمجھایا۔

"اپنے برابر کے لوگوں سے ناراض ہو کر اپنے آقائے ولی نعمت کے ساتھ غداری اور نمک حرامی کرنا شرفاء کا کام نہیں۔ تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اپنے بادشاہ کی مخالفت کرو اور اس کے دشمنوں کے ملازمین میں داخل ہو جاؤ۔ اس وقت بیجاپور میں حبشیوں کے ہاتھ اقتدار نہیں رہا۔ اب شاہ ابوالحسن تمام سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ تمہیں چاہیے کہ ان پر اعتماد کرو اور اپنے آقا کی اطاعت کا دم بھرو۔"

عین الملک اور آتش خاں نے اس مشورے کو موزوں سمجھا۔ انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ بادشاہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا اظہار کیا۔ اسی طرح دوسرے امراء بھی شاہ ابوالحسن کی تعیناتی کی خبر سن کر بیجاپور میں جمع ہونے لگے۔ برکی امراء بھی جوق در جوق آنے لگے۔

سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہوتے ہی سب سے پہلے برکی امراء نے دشمن کو سیدھے راستے پر لانا شروع کیا۔ دشمن کو ایسا تباہ و برباد کیا کہ اس کے لشکر میں قحط پڑ گیا۔ دشمن نے قلعہ شاہ درک کی طرح بیجاپور کے محاصرے سے بھی خفت اٹھائی اور صلح کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن ابراہیم عادل شاہ صلح کے لیے تیار نہ ہوا۔ دشمن نے جب یہ حالات دیکھے تو مقابلے کی تاب نہ رہی۔ بیجاپور کا محاصرہ ختم کر کے واپسی کا ارادہ کر لیا۔

یہاں سے دونوں فریقوں کے راستے جدا ہو گئے۔ قطب شاہ اپنے لشکر کے ساتھ گلبرگہ کی طرف چلا گیا تاکہ وہاں فتح و شادمانی کے ڈنکے بجائے۔ بہزاد ملک اور سید مرتضیٰ نے دوبارہ شاہ درک کی طرف جانے کی سوچی تاکہ اس علاقے کو فتح کر کے نظام شاہی سلطنت میں داخل کر لیں لیکن پھر راستے میں ارادہ تبدیل ہو گیا اور یہ لوگ احمد نگر کی طرف واپس لوٹ گئے۔

قطب شاہ البتہ اپنے ارادے پر ڈٹا رہا۔ اس نے اپنے ایک امیر کو ایک زبردست لشکر دے کر ابراہیم عادل شاہ کے ملک کے ایک حصے کو فتح کرنے کے لیے روانہ کیا اور خود گولکنڈہ واپس چلا گیا۔

ابراہیم عادل شاہ کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اس نے اخلاص کے مشورے سے دلاور خاں حبشی کو ایک لشکر کے ہمراہ دشمنوں کے مرکزی مقام گلبرگہ کی طرف روانہ کیا۔ دلاور خاں نہایت تیزی کے ساتھ سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا حریف کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے دشمن کے سر پر پہنچ کر بازارِ جنگ گرم کر دیا۔ طرفین میں تلواریں چلنے لگیں۔ معمولی سی جنگ کے بعد ہی قطب شاہی لشکر حواس باختہ ہو کر میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا۔ دلاور خاں حبشی فتح یاب ہوا۔

اس کامیابی کے بعد دلاور خاں کا سرِ غرور آسمانی سے باتیں کرنے لگا۔ اب وہ میر جملہ کے منصب پر فائز ہونے کے خواب دیکھنے لگا۔ کم ظرف تھا کہ اپنا ارادہ قلعہ درک کے تھانیدار حیدر خاں پر ظاہر بھی کر دیا۔ اسے آئندہ ترقی کے وعدوں سے اپنا ہم نوا بنا لیا اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے جلد از جلد بیجاپور کی طرف روانہ ہو گیا۔

بیجاپور پہنچ کر وہ شہر سے باہر ہی دروازہ اللہ پور میں قیام پذیر ہو گیا اور اپنے مخصوص مقربین کو اخلاص خاں کے پاس بھیجا اور گزارش کی کہ وہ اسے میر جملہ بنانے میں اس کی مدد کرے۔ دلاور خاں کو اس سے یہ توقع اس لیے تھی کہ اخلاص خاں بھی حبشی تھا۔

اخلاص نے اس کے جواب میں یہ پیغام بھیجا۔

"مجھے جب بھی موقع ملا، میں بادشاہ سے تمہارے متعلق گفتگو کروں گا اور پھر اجازت لے کر بارگاہِ سلطانی میں پیش کروں گا۔"

دلاور خاں نے اس کا یہ مطلب نکالا کہ اخلاص خاں ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ اس نے از خود کوئی قدم اٹھانے کی ٹھانی۔ اپنے بیٹوں، سات سو سواروں اور پندرہ ہاتھیوں کے ساتھ شہر میں داخل ہو گیا۔ وہ جلد از جلد قلعہ درک میں پہنچا جہاں بادشاہ مقیم تھا۔ اس نے بادشاہ کی خدمت میں حاضری دی لیکن نیت اخلاص خاں سے مقابلے کی تھی۔ اس نے قلعے میں اپنے بہی خواہوں اور ساتھیوں کو مناسب جگہوں پر متعین کر دیا۔

اخلاص خاں اس وقت بسترِ استراحت پر تھا۔ اس کی آنکھ کھلی اور تمام حالات کا علم ہوا تو فوراً تین چار ہزار سواروں کا لشکر ساتھ لیا اور قلعے کی طرف روانہ ہوا۔ دلاور خاں کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے قلعے کے دروازے بند کر لیے اور دشمن کی مدافعت کی تیاریاں کرنے لگا۔

طرفین میں زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ کبھی ایک کا پلہ بھاری ہو جاتا تو کبھی دوسرے کا لیکن جانی نقصان اخلاص خاں کا زیادہ ہوا۔ اسی کشمکش میں سورج ڈوب گیا۔ اخلاص خاں نے بلبل خاں کو قلعے کا محاصرہ کرنے پر مامور کیا اور خود گھر چلا آیا۔

بلبل خاں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور قلعے میں غلہ لے جانے کی راہیں مسدود کر دیں۔ اس نے کچھ ایسی ہمت و دلیری کا مظاہرہ کیا کہ خود دلاور خاں اس کی بہادری کا قائل

ہوگیا۔

جب اس محاصرے کو ایک ماہ گزر گیا تو دلاور خاں کو غذا کی قلت کا سامنا ہوا۔ اس نے چوری چھپے اپنا ایک آدمی بلبل خاں کے پاس بھیجا اور اسے خوب صورت وعدوں سے بہلا پھسلا کر اپنا حلیف بنالیا۔

بلبل خاں کا حال یہ تھا کہ وہ پہلے مصطفیٰ خاں کا ملازم تھا۔ اس کے قتل کے بعد اخلاص خاں کی ملازمت میں چلا آیا تھا۔ اس کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا کہ وفاداری تبدیل کرلے۔

اخلاص خاں کو اس کا علم ہوگیا۔ اس نے بلبل خاں کی جگہ ایک اور حبشی کو محاصرے پر مقرر کیا اور خود گھر میں بیٹھا رہا۔

اس کی یہ غفلت دیکھ کر خاصے کے لشکر کے اور بہت سے سپاہیوں نے بلبل خاں کا راستہ اپنایا اور وہ بھی اخلاص خاں کا ساتھ چھوڑ کر دلاور خاں سے جاملے۔

دلاور خاں کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اہلِ قلعہ کا لشکر بلبل خاں کی قیادت میں قلعے سے باہر نکلتا اور محاصرین کو نقصان پہنچا کر دوبارہ قلعے میں چلا جاتا۔ رسد کے راستے بھی کھل گئے اور اہلِ قلعہ کو قدرے سکون میسر ہوا۔

بلبل خاں نے اس موقع پر بڑی دانش مندی سے کام لیا۔ اس نے بہت سے امراء کو اخلاص خاں کا ساتھ چھوڑنے پر رضامند کرلیا۔ یہ امیر اس کے کہنے میں آکر اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے۔ اب اخلاص خاں اکیلا رہ گیا تھا لیکن پھر بھی اس کے پائے استقلال کو لغزش نہ ہوئی۔ اس نے بیجاپور سے چلے جانے کو اپنی توہین سمجھا اور اپنے گھر میں مقیم رہا۔ یہ اس کی سخت نادانی اور ضد تھی جس نے اسے نقصان پہنچایا۔ دلاور خاں کا غلبہ اب پوری طرح ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے قابلِ اعتبار سپاہیوں کو اخلاص خاں کے گھر بھیجا۔ ان سپاہیوں نے معمولی مزاحمت کے بعد اخلاص خاں کو گرفتار کرلیا۔ ایک نہایت طاقتور امیر زنجیروں میں جکڑا دلاور خاں کے سامنے کھڑا تھا۔

"میں نے تمہیں اس لیے نہیں بلایا کہ تمہیں معاف کردوں۔ بیجاپور جس بدنظمی کا شکار ہوا اس میں تمہارا قصور ہے۔ اس کی سزا تمہیں ضرور ملے گی۔"

"میرا مقدمہ بادشاہ کے حضور پیش کیا جائے یا ملکہ عالیہ چاند بی بی میری بے گناہی یا گناہ گاری کا فیصلہ کریں گی۔ تم کون ہوتے ہو۔"

"یہ سب ان کی مرضی ومنشا سے ہورہا ہے۔"

"میں کیسے یقین کرلوں؟"

دیاسلائی سے

ایک افسانہ نگار ایک رسالے کے ایڈیٹر کے پاس اپنا افسانہ لے کر گیا اور اسے بتایا کہ میں نے افسانے کو جس انجام تک پہنچایا ہے، یہ ذرا کمزور ہے۔ اسے بہتر انجام تک کس طرح پہنچایا جاسکتا ہے؟ ایڈیٹر نے افسانہ پڑھ کر جواب دیا۔ "دیاسلائی سے۔"

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

"میں تمہیں داخلِ زنداں کرنے کا حکم دے چکا ہوں۔ وہاں پہنچتے ہی تمہیں یقین آجائے گا۔"

"میں نے ماضی میں تم پر جو عنایات کی ہیں، کیا یہی اس کا صلہ ہے؟"

"میں نے اس کا صلہ دینے کے لیے ہی تمہیں خط لکھا تھا کہ مجھے میر جملہ بنوا دو لیکن تم شاید خود اسی فکر میں تھے۔ تم نے ٹال مٹول سے کام لیا ورنہ آج اس حال میں نہ کھڑے ہوتے۔"

"میں دل سے چاہتا تھا کہ تمہیں یہ منصب مل جائے۔ صرف وقت کے انتظار میں تھا۔"

"میں بھی وقت کے انتظار میں تھا۔ اب وہ وقت آگیا کہ میں تمہیں داخلِ زنداں کرسکوں۔ تمام امراء میرے ساتھ ہیں تمہیں کوئی بچانے نہیں آئے گا۔"

دلاور خاں نے داروغہ زنداں کو طلب کیا اور اخلاص خاں کو اس کے حوالے کردیا۔ زنداں کے وحشت ناک اندھیرے اس کے منتظر تھے۔ کامل خاں دکنی، کشور خاں، مصطفیٰ خاں کی موت کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

وہ تاریک زنداں میں بیٹھا آنے والے وقت کا انتظار کرتا رہا حتیٰ کہ ایک دن وہ آیا کہ زنداں کا دروازہ کھلا اور دو جلاد نما شخص اندر داخل ہوئے۔ آخر دلاور خاں کو اپنی غلطی کا احساس ہو ہی گیا...... اس نے دل میں سوچا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ اس کی رہائی کا پروانہ آگیا لیکن ہوا کچھ اور۔ ان جلادوں نے اسے پکڑ لیا اور اس کی دونوں آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر دیں۔ اس کی چیخوں سے زنداں گونج رہا تھا۔

کچھ دنوں بعد وہ اسی زنداں میں مرگیا۔

اخلاص خاں کے خاتمے کے بعد دلاور خاں بالکل آزاد تھا۔ اس نے نہایت چالاکی سے اپنے رشتے داروں کو بادشاہ کے مصاحبین میں شامل کردیا۔ اس کے چار بیٹے

تھے، اس نے ان چاروں کو بادشاہ کے اتنے قریب کردیا کہ وقت پڑنے پر جب چاہیں بادشاہ کا خاتمہ کردیں۔ بلبل خاں کو بھی منہ بولا بیٹا بنا کر اسے بھی طبقۂ امراء میں شامل کرلیا۔ جن لوگوں سے اسے خطرہ ہوسکتا تھا ان سب کو خارج البلد کردیا۔ غیر ملکیوں اور اس کے ہم قوم حبشیوں کے سوا اب کوئی قلعے میں نہیں تھا۔ ابراہیم عادل شاہ اس کے ہاتھوں کٹھ پتلی بننے پر مجبور تھا۔

شاہ ابوالحسن بھی جنہیں چاند بی بی نے میر جملہ بنایا تھا، دلاور خاں کے انتقام کا نشانہ بنے۔ انہیں معزول کرکے ایک قلعے میں نظر بند کردیا گیا۔ کچھ عرصے بعد ان کی آنکھوں میں سلائیاں پھروادیں اور بعد میں شہید کرادیا۔

سب سے زیادہ خطرہ چاند بی بی کی طرف سے ہوسکتا تھا۔ اس کی قوت کو بھی پہلے سے کہیں کم کردیا اور ایسا انتظام کیا کہ کوئی خیر خواہ یا ہمدرد اس کے پاس پھٹکنے نہ پائے۔

اب وہ خود مختار تھا۔ خوف کی فضا ایسی طاری کردی تھی کہ کوئی چوں بھی نہیں کرسکتا تھا۔

ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد چاند بی بی نے ایک ترکیب یہ نکالی کہ وہ احمد نگر جائے اور وہاں کے حکمراں اپنے بھائی مرتضیٰ نظام سے مدد کی طالب ہو۔ اس نے یہ سوچ تو لیا تھا لیکن قلعے سے نکلنا اور احمد نگر تک پہنچنا دشوار تھا۔ دلاور خاں اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اسے کبھی نہ نکلنے دیتا۔ پھر قدرت نے یہ سنہری موقع اسے دے دیا۔ مالابار کے راجاؤں نے عادل شاہی حکومت کو خراج دینا بند کردیا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ نے ان کی سرکوبی کے لیے دلاور خاں کو روانہ کیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی چاند بی بی اپنے چند محافظوں کے ساتھ احمد نگر روانہ ہوگئی۔ غالباً وہ کسی منصوبے کے تحت گئی تھی۔ اسی لیے وہ ابراہیم عادل کی بہن شہزادی خدیجہ سلطان کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کا بھائی مرتضیٰ نظام اپنی بہن سے نہایت اچھی طرح ملا۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ بیجاپور اور احمد نگر کی ریاستوں کے درمیان کوئی ناچاقی ہے۔ ماحول سازگار دیکھ کر چاند بی بی نے بیجاپور کے بگڑتے ہوئے حالات کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اس تذکرے میں دلاور خاں کا نام بار بار آرہا تھا۔

''اگر بیجاپور اور احمد نگر میں تعلقات خوشگوار ہوں تو چھوٹی طاقتیں سر اٹھانے کی جرأت نہ کریں۔ امراء جب ہمیں کمزور دیکھتے ہیں تو حاوی ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابراہیم عادل اپنی مجبوریوں کے تحت کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔ یہی حال رہا تو بیجاپور کی حکومت کسی اور کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ ارد گرد کے راجے مہاراجے دانت لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم دونوں آپس میں لڑتے رہے تو کوئی تیسرا فائدہ اٹھائے گا۔''

''یہ تو ابراہیم عادل کو سوچنا چاہیے۔ علی عادل شاہ نے بھی یہی نادانی کی تھی۔ یاد ہے، دو خواجہ سراؤں کے لیے اس نے امیر برید کی مدد کے لیے اپنا لشکر بھیجا تھا اور مجھے ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔''

''اب ماضی کریدنے کا کیا فائدہ۔ اب نہ علی شاہ اس دنیا میں موجود ہے نہ امیر برید۔''

''ابراہیم بھی انہی درختوں کی آبیاری کررہا ہے۔''

''میں نے کہا نا کہ وہ امیروں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے ورنہ وہ بھی صلح کا خواستگار ہے۔ میں اس سے چھپ کر نہیں، اس سے کہہ کر آئی ہوں۔''

''یہ قدم وہ خود بھی اٹھا سکتا تھا۔''

''وہ مجھے صرف چچی نہیں ماں کا درجہ دیتا ہے۔ اس نے مجھے ضامن بنا کر بھیجا ہے۔''

''تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ ہماری دشمنیاں رشتے داری میں بدل جائیں۔''

''کیا مطلب؟''

''میرے ساتھ جو خدیجہ سلطان آئی ہے، اسے آپ نے دیکھا؟ میں چاہتی ہوں تمہارے بیٹے میراں شاہ حسین سے اس کی شادی ہوجائے۔''

''اس سے کیا ہوگا؟ شادی تو تمہاری بھی علی عادل شاہ سے ہوئی تھی اور اسی نیت سے ہوئی تھی۔ انجام کیا ہوا؟ کشیدگی تو پھر بھی برقرار ہے۔''

''ضروری تو نہیں کہ یہ شادی بھی میری شادی کی طرح ثابت ہو۔''

''اگر ایسا ہے بھی تو ابراہیم کو آنا چاہیے تھا۔''

''آپ کو کیا ہوگیا ہے...... ریت رسمیں بھی بھول گئے؟ آپ لڑکے والے ہیں۔ رشتہ تو آپ کو مانگنا چاہیے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ وہ آپ کا دیا ہوا رشتہ رد نہیں کرے گا۔ اپنی بہن کا رشتہ آپ کے بیٹے سے کردے گا۔''

''دیکھ لو، اگر اس نے انکار کیا تو یہ تذلیل میں برداشت نہیں کرسکوں گا۔''

چاند بی بی کے کہنے سے اس نے ابراہیم عادل کو محبت آمیز خطوط روانہ کیے اور اپنے بیٹے میراں شاہ حسین کی شادی خدیجہ سلطان سے کرنے کی درخواست کی۔

ابراہیم نے یہ درخواست قبول کرلی۔ معزز امراء

وارا کین سلطنت احمد نگر آئے اور خدیجہ سلطان کی شادی کردی گئی۔

خدیجہ سلطان، میراں شاہ حسین کے محل میں داخل ہوگئی۔

اس شادی سے نمٹنے کے بعد ابراہیم عادل شاہ کو بھی شادی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چاند بی بی کی دانش مندی نے اس مرتبہ بھی اسے ایک راستہ دکھایا۔

''خدیجہ سلطان کی شادی نے احمد نگر سے ہمارے تعلقات کو بہتر بنا دیا ہے۔ اب آپ کو میں یہ مشورہ دوں گی کہ آپ محمد قلی قطب شاہ کی بہن سے شادی کرلیں۔ اس طرح قطب شاہیوں سے بھی ہمارے تعلقات اچھے ہوجائیں گے۔ کسی ایک سے بگڑی بھی تو دوسرا اس کی مدد کو نہیں آئے گا۔ یاد ہے جب بہزاد ملک نے بیجاپور کا محاصرہ کیا تھا تو قلی قطب شاہ اس کی مدد کے لیے آیا تھا۔ یہ شادی دونوں کے اتحاد کو توڑ دے گی۔ اگر کبھی مرتضیٰ نظام کی نیت خراب بھی ہوئی تو قطب شاہ آپ کے خلاف محاذ آزما نہیں ہوگا۔''

ابراہیم عادل نے اپنے چیدہ چیدہ امیروں سے مشورہ کیا حتیٰ کہ دلاور خاں نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ قلی قطب شاہ کے نام خطوط بھی لکھے گئے جن کا مثبت جواب آیا۔

ابراہیم عادل شاہ نے امرائے بیجاپور کی ایک جماعت کو اس مقصد کے لیے بھاگ نگر (حیدرآباد) کی طرف روانہ کیا۔ امرائے بیجاپور کا گروہ جب قطب شاہی علاقے میں پہنچا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا اور نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ شہر میں لایا گیا اور نہایت اعلیٰ درجے کے مکانات میں انہیں ٹھہرایا گیا۔

چند روز کی مہمانداری کے بعد شادی کی بات چیت شروع ہوئی۔ قطب شاہیوں نے ابراہیم کا پیغام قبول کرلیا اور جشنِ مسرت منعقد کرکے شہزادی کا عقد کردیا گیا۔

یہ خبر جب احمد نگر پہنچی تو وہاں کے سالار صلابت خاں کو یہ رشتے داری سخت ناگوار گزری اور مرتضیٰ نظام شاہ کی جانب سے اسے لکھ دیا۔

''اس عقد کے لیے ہم سے مشورہ نہیں کیا گیا لہٰذا اعلیٰ حضرت مرتضیٰ نظام شاہ سخت برافروختہ ہیں اور آپ کے خلاف کارروائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

قلی قطب شاہ اپنے باپ کی نصیحت کے مطابق خاندان نظام شاہی کا بہت ادب کرتا تھا لہٰذا اس نے اپنی بہن کو رخصت کرنے میں تامل کیا۔ ابراہیم کو لکھ بھیجا کہ پہلے مرتضیٰ نظام کی خفگی کو دور کرلیا جائے اس کے بعد رخصتی ہوگی۔

ابراہیم نے یہ تفصیل سنی تو سخت غصہ آیا۔ اس نے فوراً اپنے لشکر کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ جب تمام لشکری اور امراء جمع ہوگئے تو وہ شہر سے روانہ ہوا۔

دلاور خاں کی رائے کے مطابق عالم خاں نے نظام شاہی سرحد میں قدم رکھا اور قلعہ دنیر کے نواح میں قیام پذیر ہوا۔ عادل شاہی لشکر نے قلعے کو فتح کرنے کی تیاریاں شروع کردیں۔

مرتضیٰ نظام شاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس ہنگامے کا سبب

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

مرزا عمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

صلابت خاں ہے تو وہ برافروختہ ہوا اور اسے بلا کر پوچھا۔
''تو نمک حرام ہے یا نمک حلال......؟''
''میں حضور کا ایک ادنیٰ خیر خواہ غلام ہوں۔'' صلابت خاں نے کہا۔
''میں تیری بے اعتدالیوں اور نافرمانیوں سے تنگ آچکا ہوں لیکن پھر بھی میں تجھے گرفتار نہیں کر سکتا۔'' صلابت خاں نے نہایت عاجزی سے جواب دیا۔
''حضور! بس اتنا کریں کہ قید کے لیے قلعے کا تعین فرمادیں۔ میں خود اپنے آپ کو پابہ زنجیر کر کے اس قلعے میں قید ہو جاؤں گا۔''
مرتضیٰ نظام نے اسے قید کرنے کے لیے قلعہ دندراج تجویز کیا۔
صلابت خاں فوراً اپنے مکان پر پہنچا اور بادشاہ کی خواہش کی تکمیل میں مصروف ہوگیا۔ اپنے پیروں میں بیڑیاں ڈالیں، پالکی میں سوار ہوا اور قلعہ دندراج میں جا کر نظر بند ہوگیا۔ اس کی نظر بندی کے بعد مرتضیٰ نظام نے پیشوائی کا منصب قاسم بیگ کو عطا کیا اور اسے ہدایت کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو ابراہیم عادل سے صلح کرلی جائے۔
ابراہیم عادل شاہ نے جب دیکھا کہ مرتضیٰ نظام کا رویہ نہایت شریفانہ ہے، نیز قاسم بیگ نے بھی کئی پرخلوص خطوط ابراہیم کی خدمت میں روانہ کیے ہیں تو اس نے نظام شاہی سلطنت پر لشکر کشی کا خیال ترک کر دیا اور اپنی منکوحہ کو حاصل کرنے کے لیے قطب شاہی ملک کی طرف روانہ ہوگیا۔ قطب شاہیوں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ قلی قطب شاہ نے اس کی آمد کا مقصد معلوم ہوتے ہی اپنی بہن کو مع سامانِ جہیز اور دیگر گراں قدر تحفوں کے ابراہیم عادل کی خدمت میں پہنچا دیا۔
ابراہیم عادل شاہ نے اپنے تمام امراء اور درباریوں کو ہمشیرہ قلی قطب شاہ کے استقبال کے لیے روانہ کیا۔ اس کے بعد خود بھی روانہ ہوا اور اسے اپنے لشکر میں لے آیا۔
چار روز تک لشکر میں عیش و عشرت کا ہنگامہ بپا رہا۔ اس کے بعد بادشاہ نے قلعہ درک کا رخ کیا۔ یہاں شاہی خدمت گاروں نے جشن عروسی کا اہتمام کیا اور پورے ایک مہینے تک عیش و عشرت کی مجالس گرم رہیں۔ اس کے بعد بادشاہ نے پایۂ تخت کا رخ کیا۔

☆☆☆

صلابت خاں نظر بند ہو چکا تھا۔ اس کے منصب پر قاسم بیگ فائز ہوا تھا۔ قاسم بیگ نہایت ہی نیک طبع اور اعلیٰ کردار کا انسان تھا۔ کبھی کسی کو پریشان نہیں کرتا تھا اور ہر شخص سے محبت اور خلوص سے پیش آتا تھا۔ اس کی یہی شرافت اس کی کمزوری بن گئی۔ اکثر کم عقل اور پست مزاج لوگ سلطنت کے معاملات میں دخل دینے لگے اور صاحبِ اقتدار بن گئے۔ ان لوگوں نے امراء اور اراکین سلطنت پر طرح طرح کے الزامات لگائے۔ کچھ کو قید کیا، کچھ کو ملک بدر کر دیا۔ مرتضیٰ نظام کا حال یہ تھا کہ سلطنت کے کاموں میں قطعاً دلچسپی نہ لیتا تھا۔ اس نے ان رذیلوں کو راہِ راست پر لانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احمد نگر کے حالات روز بروز ابتر سے ابتر ہوتے گئے۔ خاندان نظام شاہی کی تمام رونق رخصت ہوگئی۔ سارا وقار خاک میں مل گیا۔
مرتضیٰ نظام کی دلچسپی سلطنت کے کاموں میں ویسے ہی کم رہ گئی تھی۔ سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ وہ ایک فاحشہ عورت ''فتو'' پر دل و جان سے عاشق ہوگیا۔ قصہ یہ ہوا کہ میر بہشتی نامی ایک شخص نے اس فاحشہ عورت کو اپنے گھر میں ڈال لیا تھا۔ ایک روز مرتضیٰ نظام کی سواری ادھر سے گزر رہی تھی۔ دریچے سے ایک عورت نے جھانکا۔ مرتضیٰ کی نظر اس پر پڑی۔ کوئی ایسی گھڑی تھی کہ دیکھتے ہی دل میں اتر گئی۔ فوراً سواری رکوائی۔ پوچھا اس مکان میں کون رہتا ہے؟ بتانے والوں نے بتایا۔ اس نے اپنے آدمیوں سے کہا اس گھر کی اچھی طرح پہچان کرلو۔ محل میں آیا تو بے قرار تھا۔ اس عورت کی صورت آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ بڑی مشکل سے ایک پہر گزارا ہوگا۔ ہزار چاہا کہ اسے بھلا دے۔ کیا خبر کسی شریف زادے کی بیوی ہو لیکن طبیعت تھی کہ اسی طرف مائل تھی۔ مجبور ہو کر اس مکان کے مالک کو بلالیا۔
''تمہارے ساتھ کون عورت رہتی ہے؟''
وہ شخص کہہ سکتا تھا کہ وہ میری بیوی ہے لیکن وہ ڈر گیا۔ وہ سمجھا بادشاہ کو سب کچھ معلوم ہوگیا ہے۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔
''حضور! وہ ایک فاحشہ عورت تھی۔ آپ کو بالکل ٹھیک معلوم ہوا ہے۔ میری اس سے ملاقات ہوگئی اور میں نے اسے گھر میں ڈال لیا۔ اب جو آپ حکم فرمائیں۔''
''تمہیں اسے چھوڑنا ہوگا۔''
''چھوڑ دوں گا۔''
''اسے میرے پاس پہنچا دو۔''
''اگر وہ تیار نہ ہوئی؟''
''میرے آدمی تیرے ساتھ جائیں گے اور اسے لے کر آئیں گے۔''

مرتضیٰ نظام نے اسے اپنے پاس بلوالیا اور سلطنت سے بے خبر ہو کر اس کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔

فتو نہایت چالاک عورت تھی۔ آتے ہی مرتضیٰ نظام کے حواس پر ایسا غلبہ حاصل کر لیا کہ اس کی مرضی کے بغیر وہ کوئی کام کرتا ہی نہیں تھا۔ چند ہی روز میں فتو کے تمام رشتے دار اہم عہدوں پر فائز ہو گئے۔ فتو کا بھائی اسمٰعیل مرتضیٰ نظام کا وکیل بن گیا۔ وکیل بنتے ہی اس نے طرح طرح کے ظلم وستم شروع کر دیے۔

فتو کے رشتے داروں اور خود فتو کو یہ احساس ستانے لگا تھا کہ مرتضیٰ نظام کے بعد اس کا بیٹا میراں حسین تخت پر بیٹھے گا۔ اگر کسی طرح اسے راستے سے ہٹا دیا جائے تو پھر بہ آسانی سلطنت پر ہمارا قبضہ ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ کوششیں ہونے لگیں کہ باپ بیٹے میں اختلافات پیدا کر دیے جائیں۔

وہ مرتضیٰ نظام کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھی تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ جب فتو نے دیکھا کہ مرتضیٰ کا ظرف چھلکنے لگا ہے، نشہ پوری طرح اپنا کام کر چکا ہے تو فتو نے اپنا کام شروع کر دیا۔

''میں سوچتی ہوں اگر آپ بادشاہ نہ رہے تو میرا کیا بنے گا۔ کیا مجھے پھر اسی موذی کے پاس جانا پڑے گا جہاں سے آپ مجھے لائے ہیں؟''

''بلبلِ نظام! میری بادشاہت کو کیا ہوا۔''

''دشمنوں کے منہ میں خاک۔ وہ یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ آپ کو تخت سے اتار کر آپ کے بیٹے کو بادشاہ بنا دیں۔''

''کس میں اتنی جرأت ہے جو یہ بات کہہ سکے۔''

''یہی تو میں سوچتی ہوں لیکن میرے بھائی اسمٰعیل نے تو مجھے یہی بتایا ہے۔''

''کہاں ہے اسمٰعیل......ذرا اسے بلاؤ تو۔''

''وہ اس وقت تو اپنے گھر گیا ہوا ہے پھر کسی وقت بلالوں گی۔ آپ خود اس سے پوچھ لیجیے گا۔''

فتو نے سوچا تھا کہ بادشاہ نشے میں ہے۔ یہ بات سن کر نہ جانے اسمٰعیل کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ صبح جب نشہ اتر جائے گا تو اسمٰعیل کو پیش کر دے گی۔

ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس قصے کو جانے دیا۔

صبح ہوئی تو مرتضیٰ نظام کو یاد بھی نہ رہا تھا کہ رات اس نے کتنی وحشت ناک خبر سنی تھی۔ جب فتو نے دیکھا کہ وہ کوئی ذکر ہی نہیں چھیڑ رہا اور اسمٰعیل کا نام تک اس کے ہونٹوں پر نہیں آ رہا ہے تو اس نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا۔

''بادشاہِ من! میرا بھائی اسمٰعیل آپ سے ملنے کی اجازت کا خواہاں ہے۔''

''مجھ سے مل کر کیا کرے گا؟ جو احکامات دینے ہیں تم خود دے دو۔''

''آپ کو یاد نہیں۔ آپ نے پچھلی رات خود ہی تو اسے بلوانے کو کہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے مکان پر گیا ہوا تھا۔''

''ہم نے کیوں بلوایا تھا؟''

''یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ کون سے دشمن ہیں جو آپ کے اقتدار کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''

''اوہ، ہاں۔ یاد آیا۔ باریابی کی اجازت ہے۔ اسے فوراً بلواؤ۔''

اجازت ملنے کی دیر تھی کہ اسمٰعیل حاضر ہو گیا اور ہاتھ باندھ کر اذنِ گویائی کا منتظر ہو گیا۔

''تم صرف وکیل ہی نہیں ہماری فتو کے بھائی بھی ہو اس لیے کھڑے رہنا تمہارے لیے مناسب نہیں۔ بیٹھ کر بات کرو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟''

اسمٰعیل بیٹھ گیا۔

''حضور کے عتاب سے محفوظ رہوں تو کچھ عرض کروں۔''

''اجازت ہے۔''

''مجھے کچھ معتبر لوگوں کی زبانی معلوم ہوا ہے......''

سنسنی پیدا کرنے کے لیے یہاں تک کہنے کے بعد وہ رک گیا۔

''کیا معلوم ہوا ہے؟''

''اراکینِ سلطنت نے یہ طے کیا ہے کہ آپ کو بادشاہت سے معزول کر کے شہزادہ میراں حسین کو تخت نشین کیا جائے۔''

یہ سنتے ہی مرتضیٰ نظام کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ اپنے بیٹے کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

فتو نے ایک مرتبہ پھر مکاری دکھائی۔ بادشاہ کا ارادہ مزید پختہ کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کا واویلا شروع کر دیا۔

''بادشاہِ من! پہلے تحقیق تو کر لیں۔ کیا خبر یہ خبر جھوٹی ہو۔ اللہ قسم مجھے تو بڑا دکھ ہوگا اگر شہزادے حضور قتل ہو گئے۔ پھر یہ بھی سوچتی ہوں کہ اگر یہ خبر سچ ہوئی تو کیا ہوگا۔''

''بس اب کسی تحقیق کی ضرورت نہیں۔'' پھر وہ اسمٰعیل سے مخاطب ہوا۔ ''میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس ناخلف کو گرفتار کر کے قتل کر دو۔ نہ وہ ہوگا نہ اراکین کے ارادے پورے ہوں گے۔''

اسمٰعیل تو دل سے چاہتا تھا کہ اسے یہ اختیار مل جائے

لیکن بعض امراء شہزادے کے وفادار بھی تھے۔ انہوں نے اسے ایسا روپوش کردیا کہ باوجود کوشش کے اسمٰعیل اسے گرفتار نہ کرسکا۔

مرتضیٰ نظام نے اب ایک اور چال چلی۔ اس نے قاسم بیگ کو طلب کیا اور بیٹے کی محبت کا دیوانہ وار اظہار کیا۔

''میں اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا ہوں اس لیے جلد از جلد شہزادے کو میرے حضور پیش کرو۔''

قاسم بیگ اس کی باتوں میں آگیا اور باپ کی محبت کا خیال کرتے ہوئے شہزادے کو قلعے سے نکالا اور پالکی میں بٹھا کر بادشاہ کے پاس روانہ کردیا۔

مرتضیٰ نظام پہلے تو بیٹے سے بڑی محبت اور مہربانی سے پیش آیا اور اسے بغداد نامی عمارت کے ایک حجرے میں ٹھہرایا مگر دوسرے روز اس نے شہزادے کو توشک اور لحاف میں لپیٹ کر حجرے کو نذرِ آتش کردیا اور دروازہ باہر سے بند کردیا۔

شہزادہ بہ مشکل توشک اور لحاف سے باہر نکلا۔ اس نے جب کمرے میں چاروں طرف دھواں ہی دھواں دیکھا تو پریشان ہو کر چیخنے لگا۔ فتحی خاں جو اس کا نگراں مقرر ہوا تھا، اسے رحم آگیا۔ بادشاہ نے اسے سخت ہدایت کی تھی کہ دروازہ ہرگز نہ کھولے لیکن اس نے دروازہ کھول دیا اور اسے بحفاظت قاسم بیگ کے حوالے کردیا۔

قاسم بیگ نے اسے فوراً دولت آباد روانہ کردیا۔ دو تین دن بعد مرتضیٰ نظام شاہ حجرے میں آیا تو اسے توقع تھی کہ کمرے میں شہزادے کی ہڈیاں ملیں گی لیکن وہاں نہ ہڈیاں تھیں نہ شہزادہ۔ بادشاہ نے اس سے باز پرس کی۔ فتحی خاں نے بہانہ بنایا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کی ہڈیاں بھی جل کر خاک ہوگئی ہیں۔''

بادشاہ کو یقین نہ آیا۔ اس نے سختی سے کام لیا تو فتحی خاں نے خوفزدہ ہو کر سچ اگل دیا۔

''میں نے شہزادے کو قاسم بیگ اور محمد تقی کے حوالے کردیا ہے۔''

مرتضیٰ نظام نے ان دونوں امیروں کو طلب کیا اور قلعے کے دروازے کے قریب ان سے دریافت کیا۔ ان دونوں نے شہزادے کی جان کے سامنے بادشاہ کے عتاب کی پروا نہ کی۔

''فتحی خاں نے شہزادے کو ہمارے حوالے ضرور کیا تھا لیکن وہ فرار ہوگیا۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔''

نظام شاہ نے ان دونوں امیروں کو قید کردیا اور امورِ سلطنت کی انجام دہی کا کام مرزا صادق کے سپرد کردیا۔

اب اس کی کوشش ہوئی کہ مرزا محمد صادق شہزادے کا کھوج لگائے اور اسے قتل کردے۔ اس نے بھی انکار کردیا۔ اسے بھی قید ہونا پڑا۔ نظام شاہ نے سلطان حسین شیرازی کو ''مرزا خاں'' کے خطاب سے نوازا اور پیشوائی کے منصب پر سرفراز کیا۔

مرزا خاں بظاہر نظام شاہ کا وفادار بنا رہا لیکن اندر ہی اندر یہ کوشش بھی کرتا رہا کہ کسی طرح نظام شاہ کو تخت سے اتار کر شہزادہ میراں حسین کو تخت پر بٹھا دے۔ یہ کام بڑی ذمے داری کا تھا اور بڑی حد تک مشکل بھی اس لیے اسے عادل شاہی امراء وارکینِ سلطنت کے مشورے کی ضرورت پڑی۔ مرزا خاں نے اپنا ایک قابلِ اعتماد قاصد دلاور خاں کے پاس روانہ کیا اور اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔ چونکہ مرزا خاں کا پیغام خاندان نظام شاہی کی بقا سے وابستہ تھا اس لیے بادشاہ نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کرلیا۔

اس پیغام کے جواب میں ابراہیم عادل شاہ نے احمد نگر کا سفر اختیار کیا۔ وہ آہستہ خرامی سے سفر طے کرتا ہوا احمد نگر کے قریب پہنچ گیا۔

نظام شاہ کو جب معلوم ہوا کہ ابراہیم عادل احمد نگر کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس نے مرزا خاں کو عادل شاہیوں کو روکنے کے لیے مقرر کیا۔ اسے کیا خبر تھی کہ مرزا خاں کی دعوت پر ہی عادل شاہی اس طرف آئے ہیں۔

مرزا خاں نے تمام امراء کو نظر بند کردیا اور ان کی جگہ اپنے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو مقرر کر کے نکلا اور ایک مقام ''دانورہ'' کے قریب مقیم ہوا۔

اس کے دانورہ میں مقیم ہوتے ہی بادشاہ کو شک ہوگیا تھا کہ اس کے مخبروں نے اطلاع دی کہ مرزا خاں تمام امیروں کے ہمراہ دولت آباد روانہ ہوگیا ہے۔ اس کا یہ ارادہ ہے کہ شہزادہ میراں حسین کو وہاں سے لا کر تخت پر بٹھا دے اور بعد ازاں احمد نگر کی طرف آئے۔

یہ سن کر مرتضیٰ نظام شاہ بہت پریشان ہوا۔ اردگرد جو امیر تھے ان سے مشورہ کیا۔ سب نے ایک ہی مشورہ دیا۔

''اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ صلابت خاں کو رہا کردیا جائے۔''

''اس کی رہائی سے کیا ہوگا؟''

''صلابت خاں کی حضور سے ملاقات کی خبر سن کر تمام ناراض امراء مرزا حسین سے الگ ہو کر آپ کے گرد جمع ہوجائیں گے۔''

بادشاہ نے یہ ارادہ کیا کہ وہ پالکی میں ''جنیر'' کی طرف روانہ ہو اور اثنائے راہ میں صلابت خاں سے ملاقات کرے۔ فتحی خاں جو مرزا حسین سے ملا ہوا تھا، اس موقع پر واویلا شروع کر دیا اور بادشاہ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔

''حضور! اس سفر سے باز رہیں۔ حضور جونہی احمد نگر سے باہر نکلیں گے تو لشکر خاصہ کے سپاہی آپ کو گرفتار کر کے شہزادے کے سپرد کر دیں گے۔''

بادشاہ کو اس کی باتوں پر یقین آ گیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ ''جنیر'' کی طرف نہیں جائے گا بلکہ قلعے میں رہ کر ہی صلابت خاں کی آمد کا انتظار کرے گا۔

جب تمام لوگوں کو اس ارادے کی خبر ہوئی تو بہت مایوس ہوئے اور ایک ایک کر کے دولت آباد کی طرف جانے لگے۔

مرزا حسین دولت آباد پہنچ ہی چکا تھا۔ وہاں کے قلعے سے شہزادے کو نکالا اور سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا احمد نگر پہنچ گیا۔ تمام اہالیانِ قلعہ قلعے سے باہر نکل کر مرزا خاں سے مل گئے۔ شہزادہ میراں حسین اور مرزا خاں ایک جمعیت کے ساتھ ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے قلعے میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد یہ لوگ عمارت بغداد میں جہاں بادشاہ رہتا تھا، داخل ہو گئے اور قتل و غارت گری شروع کر دی۔

شہزادہ میراں حسین باپ کے پاس پہنچ گیا اور اپنی تلوار کی نوک اس کے پیٹ پر رکھ دی۔

''جی چاہتا ہے کہ تلوار تمہارے پیٹ میں اتنے زور سے بھونک دوں کہ پیٹ کے دوسری طرف نکل آئے۔''

نظام نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔ ''اے مردود! اے عاق شدہ بیٹے! تیرا باپ اب چند روز کا مہمان ہے۔ تو اگر اس پر رحم کرے تو ٹھیک ورنہ جو تیرے جی میں آئے کر لے۔''

مرتضیٰ ان دنوں سخت بیمار تھا۔ موت کے کنارے کھڑا تھا لیکن شہزادے نے اس پر رحم نہ کھایا اور حکم دیا کہ بادشاہ کو حمام میں لے جایا جائے۔ حمام کا دروازہ بند کر کے گلخن میں انتہائی تیز آگ روشن کر دی جائے۔ حمام کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں اور اس تک پانی کی ایک بوند بھی نہ پہنچنے دی جائے۔

وہ اسی عالم میں حمام کے اندر مر گیا۔

ابراہیم عادل شاہ احمد نگر کے قریب ہی ٹھہرا ہوا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ مرزا خاں کی طرف سے پیغام ملتے ہی آگے بڑھے اور میراں حسین کو تخت نشیں کرا دے لیکن اسے جونہی اطلاع ملی کہ بدبخت بیٹے نے بوڑھے باپ کو قتل کرا دیا ہے تو اس نے ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا اور میراں حسین کو پیغام بھیجا۔

''میں لشکر لے کر اس طرف اس مقصد سے آیا تھا کہ حکومت کی باگ ڈور تمہارے سپرد کر دوں اور تمہارے باپ مرتضیٰ نظام کو کسی قلعے میں نظر بند کر دوں تاکہ تم پورے اطمینان کے ساتھ امورِ سلطنت انجام دے سکو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے خدا کا خوف دل سے نکال کر اپنے باپ کو تہ تیغ کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو مرتضیٰ نظام کو میرے سپرد کر دیا ہوتا یا اس بے چارے کو اندھا کر کے اس کے خوف سے نجات حاصل کر لی ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ اس مظلوم کا خون رنگ لائے گا اور تم خدا کے عذاب میں مبتلا ہو کر اپنے اعمال کی سزا پاؤ گے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اس وقت میں تم سے کوئی باز پرس کرنا نہیں چاہتا اور معاملے کو خدا پر چھوڑتا ہوں تاکہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں تمہارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ پیغام بھیجنے کے بعد ابراہیم عادل شاہ بیجاپور واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

مرتضیٰ نظام کے قتل اور میراں حسین کے تخت نشین ہونے کے بعد مرزا خاں سیاہ سفید کا مالک بن گیا۔ اس کا اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ اب وہ یہ سوچنے لگا کہ میراں حسین کو خلوت گزیں کر کے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے۔ سولہ سالہ میراں حسین نے بھی اس کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ شراب کے نشے میں لوگوں کے سامنے کھلے عام ایسے دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ یہ باتیں مرزا خاں تک بھی پہنچتی تھیں۔ غرض دونوں ایک دوسرے کی تاک میں لگے رہے۔ مرزا خاں نے اسے معزول کرنے کی ٹھان لی اور میراں حسین نے اسے ٹھکانے لگانے کا تہیہ کر لیا۔

میراں حسین نے اپنے رضاعی بھائی آتش خاں کے گھر ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں مرزا خاں کو بھی مدعو کیا گیا۔ مرزا خاں ایسے بہت سے سرد و گرم دیکھ چکا تھا، اسے کچھ شک ہوا۔ اس نے اس دعوت میں شریک ہونا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے اپنی جگہ آقا میر شیروانی کو بھیجنے کا بندوبست کیا۔ آقا میر شیروانی اس کا رازدار تھا اور بادشاہ اسے اپنا وفادار سمجھتا تھا۔ اسی کے ذریعے بادشاہ کی طرف کی خبریں مرزا خاں تک پہنچتی تھیں۔ اسے یہ بھی اچھی طرح سمجھا دیا کہ اسے کس وقت پہنچنا ہے اور کیا کرنا ہے۔

آقا میر اس وقت پہنچا جب میراں حسین کھانے سے

فارغ ہو چکا تھا۔ صاحبِ خانہ نے اس کے لیے الگ سے دسترخوان بچھایا۔ آقا میر نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور مرزا خاں کی ہدایت کے مطابق قے کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور مکان سے باہر نکل آیا۔

آتش خاں کے مکان سے آ کر قلعے کے باہر بادشاہ ایک باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ مرزا خاں اس کے پاس آیا اور عرض کیا۔ ''اس وقت آقا میر کی حالت تشویش ناک ہے۔ اگر حضور اس کی سابقہ خدمات کا خیال کرتے ہوئے عیادت کے لیے اس کے گھر تشریف لے چلیں تو اس مرنے والے کا دل بڑا ہو جائے گا۔'' بادشاہ نے مرزا خاں کی درخواست قبول کر لی اور دو تین ملازموں کے ساتھ قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔

قلعے میں اس وقت جو لوگ موجود تھے، وہ تمام کے تمام مرزا خاں کے حلیف تھے۔ مرزا خاں نے قلعے کا دروازہ بند کر دیا اور میراں حسین کو گرفتار کر لیا۔

اس کی گرفتاری کے بعد یہ فکر ہوئی کہ میراں حسین کی جگہ آخر احمد نگر کا حکمراں کس کو بنایا جائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ چاند بی بی کے باپ حسین نظام کے دوسرے بیٹے برہان شاہ یعنی مرتضیٰ نظام کے بھائی کے بیٹوں میں سے کسی ایک کو احمد نگر کا حکمران بنا دیا جائے۔

برہان شاہ کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام ابراہیم دوسرے کا اسمٰعیل تھا۔ مرزا خاں نے اسمٰعیل کو احمد نگر کے تخت کا مالک بنا دیا۔ اسمٰعیل کی عمر اس وقت صرف نو سال تھی۔

ایک مجلس منعقد کی گئی اور شہزادہ اسمٰعیل بن برہان نظام شاہ کی تخت نشینی کی رسم ادا کر دی گئی۔ ابھی تخت نشینی کی یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی ہی تھی کہ قلعے کے دروازے کے سامنے شور سنائی دیا۔ مرزا خاں نے چند اشخاص کو اس شور کا سبب دریافت کرنے کے لیے بھیجا۔ ان لوگوں نے واپس آ کر بتایا کہ ایک صدی منصب دار جمال خاں مہدوی مع دوسرے منصب داروں کے ساتھ قلعے کے دروازے پر کھڑا ہے۔

''ان کا مطالبہ کیا ہے؟'' مرزا خاں نے دریافت کیا۔

''وہ کہتے ہیں کئی دنوں سے ہم نے اپنے بادشاہ میراں حسین کو نہیں دیکھا۔ وہ کس حال میں ہے ہم فکرمند ہیں۔ ہمیں اس کے حضور حاضر ہونے کی اجازت دی جائے۔''

میراں حسین اب بادشاہ کب رہا تھا.... اس کے حضور حاضری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس واقعے کو چھپایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مرزا خاں نے نہایت متکبرانہ انداز میں پیغام بھجوا دیا۔

''میراں حسین اس قابل نہیں تھا کہ اسے بادشاہ رکھا جائے چنانچہ اسے معزول کر دیا گیا ہے اور اب ہم سب کا بادشاہ اسمٰعیل ہے۔ وہ ابھی باہر آ کر تم سب کا سلام قبول کرتا ہے۔''

جمال خاں اس پر بہت بگڑا۔ اس نے سارے شہر میں منادی کرا دی۔

''مرزا خاں اور دوسرے غریب امراء قلعے کے اندر جمع ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے میراں حسین کو قید کر لیا ہے اور کسی دوسرے شخص کو بادشاہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہم سب کو اپنی حفاظت کرنی چاہیے اور بے جا اقتدار و تسلط سے چھٹکارا پانا چاہیے ورنہ یاد رکھو کہ اہلِ دکن کے بیوی بچے غلام اور لونڈی بن جائیں گے۔''

اس منادی نے کام کر دکھایا۔ لوگ فوراً مسلح ہو گئے اور غول کے غول قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔ مرزا خاں نے عاقبت نااندیشی سے کام لیا اور سپاہیوں کی ایک جماعت جمال خاں کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں سے مقابلے کے لیے بھیجی۔ عوام کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے سامنے اس جماعت کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں چند افراد گنوا کر یہ جماعت قلعے کے اندر واپس آ گئی۔ مرزا خاں کو اب جمال خاں کی طاقت کا اندازہ ہوا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے نادانی کا مظاہرہ کیا۔ کسی قسم کی صلح کی طرف قدم اٹھانے کے بجائے اپنے لوگوں سے خطاب کیا۔

''دکنیوں کا یہ تمام شور شرابا محض میراں حسین کے زندہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اسے فوراً قتل کر دو تاکہ دکنی مایوس ہو کر لوٹ جائیں۔ جب میراں حسین نہیں ہوگا تو وہ کس کے لیے لڑیں گے۔ یہ ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔''

کئی غریب (غیرملکی) امیروں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن ایک امیر نے آگے بڑھ کر میراں حسین کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔ یہ کٹا ہوا سر قلعے کے دروازے پر برج کے اوپر لٹکا دیا اور بلند آواز میں دکنیوں کو مخاطب کیا۔

''تم لوگوں کا شور شرابا میراں حسین کے لیے تھا۔ اس کا سر حاضر ہے۔ اب تم لوگوں کو چاہیے کہ اسمٰعیل بن برہان نظام شاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لو جسے میں تخت نشیں کر چکا۔''

''ہم کیسے مان لیں کہ یہ سر میراں حسین کا ہے۔ اسے نیچے پھینکو تاکہ ہم اسے پہچان کر واپس چلے جائیں۔''

جمال خاں جانتا تھا کہ یہ سر میراں حسین کا ہے لیکن اس نے یہ ایک چال چلی تھی تاکہ اس کا سر اپنے قبضے میں کر کے مجمعے کو مزید اشتعال دلایا جائے۔

مرزا خاں کے ملازموں نے میراں حسین کا کٹا ہوا سر نیچے پھینک دیا۔ اپنے بادشاہ کی ایسی بے حرمتی دیکھ کر دکنیوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ہر طرف واویلا مچ گیا۔ لوگ بے تحاشا قلعے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ اسی دوران قلعے کے قریب سے ایک سو بیل گھاس اور چارے سے لدے ہوئے گزرے۔ جمال خاں کے حکم سے ان بیلوں کو گرفتار کرلیا گیا اور قلعے کے دروازے کے قریب کھڑا کرکے ان کو آگ لگادی گئی۔ چاروں طرف آگ پھیل گئی اور قلعے کے دروازے جل کر خاک ہوگئے۔ چاروں طرف انگارے ہی انگارے تھے۔ نہ کوئی اندر جاسکتا تھا، نہ باہر آسکتا تھا۔

اب مرزا خاں کی پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ قلعے میں ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ قلعے میں آگ نہیں پھیلی تھی لیکن باہر نکلنے کی راہیں مسدود تھیں۔ اسے اپنی جان کی ایسی فکر تھی کہ اسمٰعیل نظام شاہ کو بھی بھول گیا تھا جو قلعے میں نہ جانے کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ نو سالہ بچے کی حقیقت ہی کیا تھی۔

اسی بھاگ دوڑ میں رات ہوگئی۔ دروازے پر لگی آگ کی شدت کم ہوگئی تھی۔ مرزا خاں نے سپاہیوں اور امیروں کی ایک جماعت ساتھ لی اور قلعے سے باہر نکل آیا۔ ان سب لوگوں کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ ان میں سے بعض تو شہر ہی میں اور بعض مضافات شہر میں دکنیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

مرزا خاں "جنیر" کی طرف بھاگ گیا۔ چند روز تک اس کا کچھ پتا نہ چلا۔

دکنی اور حبشی قلعے کے اندر داخل ہوگئے اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا۔ میراں حسین کی لاش سر بریدہ پڑی تھی۔ اسے دفن کیا اور اسمٰعیل شاہ کو تخت پر بٹھایا۔

ابھی چار روز بھی نہیں گزرے تھے کہ مرزا خاں کو جنیر کے قریب سے گرفتار کرلیا گیا۔ جمال خاں کے حکم سے پہلے تو اسے گدھے پر سوار کرکے چاروں طرف گھمایا گیا اور بعد میں اس کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا گیا۔

احمد نگر کے شہروں اور قصبوں میں مسلسل خونریزی جاری تھی۔ اسمٰعیل شاہ تو بچہ تھا۔ سارا اقتدار جمال خاں کے ہاتھ میں تھا اور وہ میراں حسین کے طرفداروں کو چن چن کر مار رہا تھا۔

جب ان امور کی خبریں بیجاپور پہنچیں تو ابراہیم عادل شاہ نے نظام شاہی خاندان کو بچانے کا ارادہ کیا۔ اس لیے کہ اس کی بہن وہاں بیاہی گئی تھی اور میراں حسین اس کا بہنوئی ہی تو تھا۔ دوسرے یہ کہ چاند بی بی کا میکا تھا۔ نظام شاہی خاندان سے باہر کے کسی آدمی کے اقتدار کا سن کر وہ بھی بھڑک اٹھی تھی۔

احمد نگر میں ایسا انقلاب آیا تھا کہ شریف اور ذلیل میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ ملک کی حالت تباہی کے کنارے تک پہنچ گئی تھی۔ جمال خاں پورے ملک پر قابض تھا۔

ابراہیم، دلاور خاں کی رائے سے احمد نگر روانہ ہوا۔ بادشاہ نے بلبل خاں اور فوج کے دوسرے افسروں کے نام طلبی کے احکامات جاری کیے اور انہیں تاکید کی اس سے پہلے کہ میں نظام شاہی حدود میں داخل ہوں...... تمام امراء اپنے لشکروں کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوجائیں۔

☆☆☆

چاند بی بی اپنے کمرے میں تھی۔ کنیزیں اور باندیاں اس کے اردگرد کچھ کھڑی کچھ بیٹھی تھیں۔ اس کا دل بہلانے کے لیے لطیفے سنائے جارہے تھے، کہہ مکرنیاں کہی جارہی تھیں کہ ایک دم سے شور مچا۔ ابراہیم عادل شاہ حرم سرا میں داخل ہوا تھا اور اب اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تمام کنیزیں چڑیوں کی طرح اڑ گئیں۔ چاند بی بی اس کے استقبال کے لیے دروازے تک آئی۔ اتنی دیر میں ابراہیم دروازے تک آچکا تھا۔ اس نے خواجہ سراؤں کی جماعت کو جو اس کی حفاظت کے لیے ساتھ تھے، وہیں چھوڑا اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس کا آنا غیر معمولی تھا اس لیے چاند بی بی چونکنا ہوگئی تھی۔

"ابراہیم، میرے عزیز! کیسے آج چچی کی یاد کیسے آگئی؟"

"آپ کا کہنا بجا۔ سلطنت کے بکھیڑے اتنے ہیں کہ آپ کی یاد آتی ہے مگر آنا نہیں ہوتا۔"

"چشم ما روشن دل ما شاد۔ کہیے آپ کی چچی آپ کے لیے کیا کرسکتی ہے۔"

"چچی جان! اپنے چچا کے انتقال کے بعد ایک آپ ہی تو ہیں جن پر میں بھروسا کرسکتا ہوں۔ بہت سی باتیں آپ کے علم میں نہیں ہوں گی جنہیں بتانے حاضر ہوا ہوں۔"

"ہم گوش دل سے سن رہے ہیں۔"

"آپ کا احمد نگر ان دنوں سخت مصائب میں گھرا ہوا ہے۔ آپ کے برادر مرتضیٰ نظام کو قتل کردینے کے بعد جو خانہ جنگی شروع ہوئی تھی، اب تک جاری ہے۔ آپ کے دوسرے بھائی برہان نظام شاہ کے ایک بیٹے شہزادہ اسمٰعیل

کو تخت پر بٹھا دیا گیا تھا کیونکہ سالاروں کی چپقلش کے دوران میراں حسین بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ میرا ذاتی نقصان تھا لیکن اس کا جرم اتنا بڑا تھا کہ میں اس کی مدد کو پہنچ کر بھی لوٹ آیا تھا۔ اس نے اپنے باپ پر رحم نہ کھایا۔ اسے قید کر سکتا تھا لیکن اس نے اسے قتل کر دیا۔ اب اسمٰعیل نظام بھی اسی کشتی میں سوار ہے۔ ابھی بچہ ہے اس لیے جمال خاں کے رحم و کرم پر ہے۔ جمال خاں نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اب کوشش کرے گا کہ خاندان نظام کا خاتمہ کر دے۔''

''ابھی میرا دوسرا بھائی برہان نظام زندہ ہے۔ وہ قید میں تھا لیکن سنا ہے اب اس نے مرتضیٰ نظام کے قتل کے بعد رہائی حاصل کر لی ہے اور وہ اکبر کے پاس پہنچ گیا ہے۔ وہ ضرور آگے بڑھے گا۔''

''وہ اگر اکبر کی مدد سے آگے بڑھا تو شمالی ہند کا غلبہ دکن میں لازمی ہو جائے گا اور میں یہ نہیں چاہتا۔''

''پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''اسی کی اجازت آپ سے لینے آیا ہوں۔ میں احمد نگر کا رخ کر رہا ہوں تاکہ جمال خاں کے اقتدار کا خاتمہ کر سکوں اور کسی طرح برہان نظام کو وہاں پہنچا دوں۔''

''آپ پھر اپنے امیروں پر بھروسا کریں گے۔''

''میں اب کسی پر بھروسا نہیں کرتا۔ امیروں کو طلب ضرور کیا ہے لیکن میں خود ان کے ہمراہ جاؤں گا......''

''لیکن ایک شرط پر۔'' چاند بی بی نے اس کی بات کو کاٹا۔

''وہ کیا چچی جان۔''

''اسمٰعیل شاہ کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

''میری جنگ اسمٰعیل سے نہیں جمال خاں سے ہے۔''

''میں آپ کو اجازت دیتی ہوں۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔''

ابراہیم نے اس اجازت کے بعد بلبل خاں اور فوج کے دوسرے افسروں کے نام طلبی کے احکام جاری کیے اور انہیں تاکید کی کہ اس سے پہلے کہ بادشاہ نظام شاہی حدود میں داخل ہو، تمام امراء اپنے لشکروں کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔

ان احکامات کے بعد وہ خود بھی روانہ ہو گیا۔ جب شاہی سواری قلعہ شاہ درک کے قریب پہنچی تو بادشاہ نے دلاور خاں کے مشورے سے تقریباً ایک مہینے تک اس علاقے میں قیام کیا۔ اس دوران میں بلبل خاں کا لشکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر نہ ہوا۔ دلاور خاں نے سوچا کہ اگر بلبل خاں کا زیادہ انتظار کیا گیا تو جمال خاں اس دوران اور زیادہ قوت حاصل کر لے گا۔ اس نے ابراہیم عادل کو روانگی کا مشورہ دیا۔ ابراہیم عادل احمد نگر کی طرف روانہ ہوا۔

ابراہیم کی روانگی کے بعد اطلاع ملتے ہی جمال خاں بھی مقابلے کے لیے نکلا۔ ایک قصبے کے قریب دونوں لشکر آمنے سامنے آ گئے۔

اس سے پہلے کہ جنگ چھڑتی، برسات کی جھڑی لگ گئی۔ طرفین میں سے کسی نے بھی جنگ کی ابتدا نہ کی حتیٰ کہ بیس دن اسی عالم میں گزر گئے۔ اسی دوران جمال خاں تک یہ خبریں بھی پہنچنے لگیں کہ برہان نظام شاہ جو شہنشاہ اکبر کے پاس مقیم تھا، دہلی کی فوج کے ساتھ دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ وہ سخت پریشان ہوا اور مصلحت اسی میں سمجھی کہ کسی طرح ابراہیم سے صلح کر کے اسے یہاں سے رخصت کرے۔ اس نے چند آدمیوں کے توسط سے صلح کی درخواست کی۔

بلبل خاں جو مالابار کے راجاؤں سے خراج وصول کرنے نکلا ہوا تھا، ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس لیے ابراہیم عادل کو اپنے لشکر کی کمزوری کا بھی احساس تھا لہٰذا اس نے بھی مصلحت اسی میں سمجھی کہ صلح کر لی جائے۔ پھر بھی اپنا رعب قائم رکھنے کے لیے اس نے صلح کے مذاکرات کو طول دیا اور پھر اس شرط پر صلح ہوگئی کہ جمال خاں، ابراہیم کی بہن خدیجہ سلطان کو بادشاہ کے پاس روانہ کر دے گا۔

جمال خاں نے یہ شرط منظور کر لی اور فوراً خدیجہ سلطان کی پالکی مع 75 ہزار ہون ابراہیم کی خدمت میں روانہ کر دی۔

جس روز بادشاہ وہاں سے کوچ کرنے والا تھا، اسی روز بلبل خاں بھی اپنے لشکر کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا لیکن اب بلبل کا آنا بیکار تھا کیونکہ طرفین میں صلح ہو چکی تھی۔

دلاور خاں کو موقع مل گیا کہ وہ بلبل خاں کو بادشاہ کی نظروں میں ذلیل کرے۔ دلاور خاں نے بڑی نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور نہایت اہانت آمیز لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''جس بادشاہ کے حکم کے خلاف عمل کرنے کی آسمان کو بھی مجال نہیں ہے، تم نے کس طرح بادشاہ کے فرمان کو ٹالا۔ جب بادشاہ نے تمہیں طلب کیا تھا، تمہیں چاہیے تھا کہ تمام کام چھوڑ کر فوراً شاہی بارگاہ میں حاضر ہوتے۔''

بلبل خاں جو بادشاہ کی مہربانیوں پر اتراتا تھا، اس نے بھی ترخ کر جواب دیا۔

''بادشاہ کے قدموں کی خاک کی قسم! میں نے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ میں نے اپنی مرضی سے مالابار میں قیام نہیں کیا۔ میری کیا بساط ہے جو میں شاہی فرمان کی تعمیل نہ کروں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب مجھے شاہی فرمان ملا اس وقت میں کرناٹک میں تھا اور وہاں کے راجاؤں کو زیر کر کے خراج کی رقم وصول کرنے میں مصروف تھا۔ اگر میں خالی ہاتھ وہاں سے روانہ ہوجاتا یا وہ راجے فرمان کے مضمون سے واقف ہوجاتے تو میری ساری محنت ضائع ہوجاتی اور اتنی رقم خزانے میں داخل نہ ہوتی۔ ان وجوہ کی بنا پر کچھ عرصے تک میرا وہاں قیام ناگزیر تھا مگر دلاور خاں تم اپنی کہو۔ تم نے کیوں بلاوجہ بادشاہ کو تلنگانہ کے سفر کی زحمت دی جبکہ تمہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ مالابار کے لشکر کے بغیر کوئی مقصود ہاتھ نہ آئے گا۔ اگر تم پندرہ روز اور انتظار کر لیتے اور ہم سب مل کر نظام شاہی علاقے پر حملہ کرتے تو مجھے یقین ہے کہ احمد نگر کے بہت سے قلعے اور پرگنے عادل شاہی قبضے میں آجاتے۔

''اگرچہ شاہی بارگاہ میں میرا اتنا خیر سے پہنچنا بغیر معقول وجہ کے نہیں ہے مگر پھر بھی اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں اور اپنے نیک دل آقا سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے قدیم نمک خوار غلام کی خطا معاف کردے۔''

یہ جواب سن کر دلاور خاں کو غصہ تو بہت آیا لیکن بادشاہ کے سامنے کسی گستاخی کا مرتکب نہیں ہوسکتا تھا۔ اپنا غصہ بلبل خاں پر بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے بلبل خاں کا ہاتھ پکڑا اور بادشاہ سے درخواست کی۔

''بلبل خاں حضور کے خاندان کا پرانا نمک خوار ہے اس لیے اس کی خطا معاف کی جائے۔''

بادشاہ نے دلاور خاں کی درخواست قبول کی اور بلبل خاں کو خلعتِ فاخرہ سے نوازا۔

جب شاہی مجلس برخاست ہوئی تو دلاور خاں بلبل کو اپنے ساتھ لایا۔ بہت خاطر تواضع کی اور کہا۔ ''میں ایک بار تمہیں اپنی زبان سے بیٹا کہہ چکا ہوں۔ اگر سیاسی و ملکی امور میں تم سے سختی کے ساتھ پیش نہ آیا تو لوگ کہیں گے کہ میں اپنے بیٹے کی رعایت کرتا ہوں۔ اس لیے بادشاہ کے سامنے تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کی۔ تم کوئی خیال مت کرنا۔''

بلبل خاں سے معافی تلافی کر کے اسے مطمئن کردیا تاکہ وہ کسی شک وشبہے میں مبتلا نہ رہے اور اس پر پورا بھروسا کرتا رہے۔ دھوکا وہی کھاتا ہے جو بھروسا کر لیتا ہے۔

ابراہیم خاں سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا برہان پور پہنچا۔

دلاور خاں بلبل خاں کی خوشامد میں لگا ہوا تھا لیکن اس کی عظمت و شہرت سے دل ہی دل میں بہت زیادہ خائف تھا لہٰذا کچھ بے بنیاد الزامات لگا کر اسے نظر بند کردیا۔ اس پر بھی اس کی تشفی نہ ہوئی تو اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروادیں۔

بادشاہ کو اس کی حرکت بہت ناگوار گزری مگر وہ دلاور خاں کے سامنے بے بس تھا۔

☆☆☆

برہان شاہ (اسمٰعیل شاہ کا والد) جو مرتضٰی نظام شاہ کی قید سے فرار ہوکر شہنشاہ اکبر کی خدمت میں پہنچ گیا تھا، اسے جب احمد نگر کے حالات کا علم ہوا تو اس نے پہلے تو دہلی کی فوج لے کر دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، بعدازاں اپنی رائے بدل دی اور اکبراعظم سے عرض کیا۔

''میں اگر دہلی کی فوج کو اپنے ساتھ لے کر گیا تو احمد نگر کے امراء میرے خلاف ہوجائیں گے۔ وہ اسے دہلی کا دکن پر حملہ تصور کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں اکیلا ہی احمد نگر جاؤں اور امراء سے ساز باز کر کے اپنے موروثی ملک پر قبضہ کرلوں۔''

اکبر نے اس رائے سے اتفاق تو کیا لیکن ایک شرط بھی رکھ دی۔

''اگر تم اپنے ملک پر قبضہ کرلو تو پھر برار کا علاقہ ہمارے حوالے کردینا۔''

برہان اس وقت اپنے ملک پر قبضہ کرنے کے لیے ہر شرط منظور کرنے کو تیار تھا۔ یہ شرط بھی مان لی اور دکن کی طرف روانہ ہوگیا۔

شہنشاہ اکبر نے پرگنہ ہنڈیا برہان شاہ کو بطور جاگیر عنایت کی اور حاکم اسیر راجا علی خاں کے نام اس مضمون کا ایک فرمان بھیجا کہ برہان شاہ کی مدد میں کوتاہی نہ کی جائے۔

برہان شاہ سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا دکن کی سرحد پر پہنچا اور قصبہ ہنڈیا میں قیام پذیر ہوا۔ اس نے نظام شاہی علاقے کے زمینداروں اور سرداروں کو قول نامے روانہ کیے اور انہیں اپنی اطاعت کی ترغیب دی۔ ان زمینداروں نے برہان شاہ کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور

اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔
برہان شاہ نے سب سے پہلے برہان پور اور اسیر کے حکمران علی خاں کے مشورے سے خواجہ نظام استر آبادی کو احمد نگر کے سرحدی امراء کے پاس بھیجا۔
خواجہ استر آبادی نے لباس تبدیل کر کے قلندروں کا سا حلیہ بنالیا تاکہ احمد نگر کے امراء اور سرداران لشکر سے برہان شاہ کی مدد کا وعدہ لے۔ حلیہ اس لیے بدل لیا کہ پہچانا نہ جائے۔ خواجہ ان لوگوں کے پاس پہنچا اور اپنی آمد کا مقصد ظاہر کیا۔ احمد نگر کے امراء میں سے بعض نے برہان کی مدد کا وعدہ کیا۔ بعض نے انکار کر دیا۔
''جب نظام شاہی خاندان ہی کا ایک فرد تخت احمد نگر پر متمکن ہے تو ہم اس کا تختہ الٹنے کے لیے کسی اور کی مدد کیوں کریں؟''
جن امیروں نے مدد کا وعدہ کیا، ان میں جہانگیر خاں حبشی بھی تھا۔ وہ برار اور خاندیس کے قرب و جوار کے پرگنوں کا جاگیردار تھا اور جمال خاں کا جانی دشمن تھا۔
جہانگیر خاں، خواجہ نظام استر آبادی سے بے حد خوش اخلاقی سے پیش آیا اور اس کی بہت عزت کی۔ اس نے برہان نظام شاہ کے نام ایک خط لکھا اور اسے احمد نگر آنے کی دعوت دی۔ خواجہ استر آبادی کے چلے آنے کے بعد جہانگیر خاں نے اپنے ایک رشتے دار کو بہت سے قیمتی تحائف دے کر برہان نظام شاہ کے پاس بھیجا اور اسے جلد از جلد احمد نگر آنے کا پیغام دیا۔
اس کے وعدوں نے برہان شاہ کو ایسا خود فراموش کر دیا کہ وہ بڑے امن و احتیاط کے ساتھ محض گنتی کے چند سوار لے کر برار کی سرحد میں داخل ہوا اور جہانگیر خاں کی قیام گاہ کے قریب پہنچا۔ جہانگیر خاں نے وعدہ خلافی کی اور لڑائی کا ارادہ کیا۔ دونوں فریقین ایک دوسرے سے معرکہ آراء ہوئے۔ برہان شاہ کو شکست ہوئی۔ برہان شاہ بہ حال تباہ واپس ہنڈیا آ گیا۔
برار پہنچ کر اس نے حاکم اسیر راجا علی خاں کے نام ایک خط لکھ کر اسے تمام حالات سے آگاہ کیا اور جمال خاں کے ذریعے اپنے موروثی ملک پر قبضہ کرنے کے بارے میں اس سے مشورہ طلب کیا۔ راجا علی خاں کا جواب آیا۔
''اگر تم شہنشاہ اکبر سے عسکری مدد حاصل کرو گے تو دکن کے تمام فرماں روا تمہارے خلاف ہو جائیں گے اور جمال خاں کی مدد کریں گے۔ میرے پاس اتنی فوج نہیں ہے کہ میں جمال خاں سے جنگ کروں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ابراہیم عادل شاہ سے رجوع کرنا چاہیے۔ وہ تمہاری ضرور مدد کرے گا۔''
برہان نظام شاہ نے اس مشورے پر عمل کیا اور چند تیز رفتار قاصدوں کے ذریعے ابراہیم عادل شاہ کے نام خط روانہ کیا۔
مولف تاریخ فرشتہ یعنی محمد قاسم فرشتہ حال ہی میں ابراہیم عادل شاہ کی ملازمت میں آیا تھا۔ یہ قاصد فرشتہ کے مکان پر پہنچے کیونکہ ایک خط فرشتہ کے نام بھی تھا۔
''تمام راستے مسدود ہیں اور سارے راستوں پر دشمن کا قبضہ ہے اس لیے میں نے اپنے قاصدوں کو اس راستے سے روانہ کیا ہے۔ تم میرے وفادار، مخلص اور ہمدرد ہو۔ جس طرح بھی ممکن ہو یہ خط ابراہیم عادل شاہ کے ملاحظے کے لیے پیش کر دینا اور اس کا جواب جلد از جلد لے کر روانہ کرنا۔''
محمد قاسم فرشتہ ان قاصدوں کو لے کر دلاور خاں کے پاس پہنچا اور اس کے توسط سے ابراہیم عادل تک یہ خط پہنچا دیا۔ ابراہیم نے اس خط کو پڑھا اور اسی وقت برہان شاہ کی مدد کرنے کا عندیہ دے دیا۔ اس نے اسی وقت جواب لکھا اور قاصدوں کو روانہ کر دیا۔
بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نے برہان نظام کی مدد کرنے اور جمال خاں کا قلع قمع کرنے کے لیے ''شاہ درک'' کا سفر اختیار کیا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے برار کے امراء اور شرفاء کے نام خطوط روانہ کیے۔
جب راجا علی خاں اور برہان نظام نے ابراہیم کی شاہ درک آمد کا سنا تو ان دونوں نے ابراہیم کی خدمت میں خیر مقدمی خطوط روانہ کیے۔
''حضور کی آمد سے ہمیں جس قدر خوشی ہوئی ہے، دشمنوں کو اس بات کا اتنا ہی غم ہے۔ حضور کی لشکر کشی سے جو فوری نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ یہ ہے کہ برار کے امراء خصوصاً جہانگیر خاں حبشی اور اس کے ساتھی جلد از جلد ہم تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ احمد نگر سے چند قاصد آئے ہیں اور انہوں نے یہ اطلاع دی ہے کہ جمال خاں سفر کی تیاری کر چکا ہے اور اسمٰعیل شاہ کو ساتھ لے کر برار کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ اس وجہ سے امرائے برار اپنے علاقے کو چھوڑ کر حضور کی خدمت میں پہنچنے سے معذور ہیں۔ اگر آپ دو تین منزل اور آگے بڑھیں تو جمال خاں آپ کے ڈر سے احمد نگر سے نکلنے اور برار پر حملہ کرنے کا خیال ترک کر دے گا اور پھر امرائے برار آپ کی خدمت میں پہنچ جائیں گے۔''
ابراہیم شاہ نے اس مشورے کو صائب سمجھا اور اس پر عمل کرتے ہوئے شاہ درک سے رخصت ہوا اور برار کے سرحدی مقام داراسنگ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے برہان نظام شاہ اور راجا علی خاں کو پیغام بھیجا کہ میں نے تمہاری

رائے کے مطابق پیش قدمی کی ہے۔ اب تم لوگوں کا فرض ہے کہ فوراً برار کی سرحد پر پہنچ جاؤ اور امیروں کو بھی بلالو۔ میں بھی جمال خاں کی سرزنش کے بعد تم سے آملوں گا۔"

جمال خاں بھی نچلا نہیں بیٹھا تھا۔ بہادر بھی تھا اور ذہین بھی۔ اس نے دشمن کی دونوں جماعتوں کی تباہی کا منصوبہ بنایا اور برار کے سپہ سالار سید احمد الملک کو خط لکھا۔

"آس پاس کے تمام فرماں روا مجھے تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مردانگی کا یہ تقاضا ہے کہ تم امرائے برار کو سنبھالے رکھو اور انہیں برہان نظام شاہ کے ساتھ ساز باز نہ کرنے دو، نیز برہان کو برار میں داخل نہ ہونے دو۔ راجا علی خاں تمہاری مخالفت کرے گا، تم اس کی پروا نہ کرنا۔ تم اس کے ساتھ باقاعدہ جنگ کرکے اسمٰعیل نظام شاہ کی وفاداری و بہی خواہی کا ثبوت دینا۔ اس کے بعد عنقریب ہی دلاور خاں سے صلح کرکے میں بھی تمہاری طرف آؤں گا۔"

جمال خاں نے اس توقع کے ساتھ کہ دلاور خاں اور ابراہیم کے تعلقات اچھے نہیں ہیں، دلاور خاں کے نام ایک خط لکھا اور اُن سے صلح کی درخواست کی۔ اس نے اس خط میں نہایت پُرزور اندازِ بیان اختیار کیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد دلایا تھا کہ تم نے بلبل خاں کی آنکھیں نکلوا دی تھیں، اس باعث ابراہیم کے دل میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں رہی ہے۔ وہ کسی بھی وقت تمہیں پاؤں کے کانٹے کی طرح نکال پھینکے گا اس لیے اس کے لیے لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن دلاور خاں نے صلح کی درخواست ٹھکرا دی۔

جمال خاں نے دلاور خاں کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد خزانے کے منہ کھول دیے اور روپے کی مدد سے ایک زبردست لشکر تیار کرلیا۔ اسمٰعیل کو ساتھ لیا اور جنگ کے ارادے سے برار کے سرحدی مقام داراسنگ کی طرف روانہ ہوا جہاں ابراہیم ٹھہرا ہوا تھا۔

جمال خاں، عادل شاہی لشکر سے سات کوس کے فاصلے پر جاکر ٹھہر گیا۔ اس نے صلح کی بات چیت کے لیے ایک مرتبہ پھر دلاور خاں کے پاس قاصد روانہ کیے۔ دلاور خاں نے اس مرتبہ بھی صلح کے سلسلے میں گفتگو کرنے سے انکار کردیا۔

ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ دلاور خاں کے چند ساتھیوں نے اس تک یہ بے سروپا خبر پہنچائی کہ جمال خاں صلح کی طرف سے ناکامی کے بعد اتنا عاجز آگیا ہے کہ اب فرار کے راستے ڈھونڈ رہا ہے اور یہ سوچ رہا ہے کہ اپنے ہم خیال ساتھیوں کا ایک گروہ لے کر میدانِ جنگ سے فرار ہوجائے اور ایک جنگل میں جاکر چھپ جائے۔

دلاور خاں نے کسی تحقیق کے بغیر اس خبر پر یقین کرلیا اور جمال خاں کا تعاقب کرکے گرفتار کرنے کا ارادہ کرلیا۔ یہ خبر بے بنیاد تھی لیکن حالات نے ایسا رخ اختیار کرلیا کہ سچ ثابت ہوگئی۔ ہوا یہ کہ جمال خاں کا ایک امیر اس سے ناراض ہوکر لشکر سے نکلا اور برہان نظام شاہ کے پاس پہنچ گیا۔ جمال خاں کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے سمجھا کہ اب اس کے تمام امیر اسی طرح ایک ایک کرکے دشمن سے جاملیں گے۔ اسے اپنی جان کی بھی فکر ہوئی۔ اس نے فوراً اپنی قیام گاہ سے کوچ کیا اور ایک ایسی جگہ چلا گیا جو پانی اور پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی۔

دلاور خاں کے جاسوسوں نے اسے یہ اطلاع فراہم کردی۔ وہ لازماً یہ سمجھا کہ پچھلی خبر صحیح تھی۔ جمال خاں نے بھاگنے کے ارادے سے کوچ کیا ہے۔

دلاور خاں ایسا سرشار ہوا کہ ابراہیم کو بتانا بھی ضروری نہ سمجھا اور بیس ہزار سواروں کو ساتھ لے کر جمال خاں کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے پاس سامانِ جنگ کافی ہے یا نہیں۔ جب وہ اپنے دشمن سے تین چار کوس کے فاصلے پر رہ گیا تو اسے دور ہی سے خیمے دکھائی دیے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ خیمے کس کے ہیں۔ اس کے ساتھی بھی اسی کی طرح لاعلم تھے۔ اس نے صورتِ حال جاننے کے لیے مخبروں کو بھیجا۔ وہ جو خبر لائے اس نے دلاور خاں کے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔ مخبر یہ خبر لائے تھے کہ یہ نظام شاہی فوج کے خیمے ہیں۔ جمال خاں حفاظت کی غرض سے یہاں چلا آیا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ جمال خاں فرار نہیں ہوا ہے، محض جگہ بدل لی ہے۔

دلاور خاں سے ایک اور غلطی ہوئی۔ وہ چاہتا تو... بہ آسانی واپس ہوسکتا تھا لیکن اس کے غرور نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ اسی جگہ لنگر انداز ہوگیا۔

اس نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جب وہ لشکر جو اس کے پیچھے روانہ ہوا تھا، اس کے پاس پہنچ جائے تو وہ دشمن سے جنگ کرے۔

لشکر سے پہلے بادشاہ کا ایک قاصد اس کے پاس پہنچ گیا۔ بادشاہ نے پیغام بھیجا تھا کہ چونکہ تم نے جنگ کی تیاری پوری طرح نہیں کی ہے اس لیے آج کے دن جنگ نہ کرنا۔ جب تم اچھی طرح تیاری کرلو تو دشمن کو چھیڑنا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو نقصان اٹھاؤ گے۔

اس کا غرور ایک مرتبہ پھر اس کے راستے میں حائل

ہوگیا۔ اس نے شاہی قاصد سے کہا۔
"تم میری طرف سے بادشاہ سے کہنا کہ میں بہت جلد جمال خاں کو گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں لا رہا ہوں۔ زنداں کا انتخاب خود فرمالیں کہ اسے کہاں رکھنا ہے۔"
اس کے بعد جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ اپنے خستہ حال لشکر کو اس جگہ سے ہٹایا اور دشمن کے سامنے ڈٹ گیا۔ اس نے پانچ چھ ہزار ترک سپاہیوں کو دشمن کے پیچھے متعین کر دیا تاکہ نظام شاہی امراء اپنے ہاتھیوں اور خزانوں کو میدانِ جنگ سے باہر نہ لے جاسکیں۔
جمال خاں نے جب دیکھا کہ فرار کے تمام راستے بند ہیں تو اس نے بھی لڑائی کا ارادہ کیا اور دلاور خاں کے سامنے آگیا۔
طرفین میں زبردست لڑائی ہونے لگی۔ جب لڑائی اپنے عروج پر پہنچی تو عادل شاہی امراء عالم خاں اور عین الملک نے آپس میں ملاقات کی اور دلاور خاں کی شکست کو یقینی سمجھ کر راہِ فرار اختیار کرنے کی صلاح کی۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ بادشاہ دلاور خاں سے بہت زیادہ ناراض ہے۔ اس نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر جنگ شروع کی ہے، اب نتیجہ خود بھگتے گا۔ وہ میدانِ جنگ سے نکلے اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔
ان امیروں کے چلے جانے کے بعد دلاور خاں بے سہارا ہوگیا۔ دونوں امیروں کے ماتحت لشکر بھی اسی وقت میدان چھوڑ گئے تھے۔
جمال خاں بھی دیکھ رہا تھا کہ دلاور خاں پر کیا بیت گئی۔ اس نے دو سو سواروں کی جمعیت لی اور دلاور خاں پر حملہ کر دیا۔ اب دلاور خاں نے میدان میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور سات اشخاص کے ہمراہ راہِ فرار اختیار کی۔
دلاور خاں کو اپنے جاسوسوں کی زبانی معلوم ہوا کہ عالم خاں اور عین الملک فرار ہو کر بادشاہ کے پاس داراسنگ کی طرف جا رہے ہیں تاکہ دلاور خاں کی تباہی و بربادی کا سامان کریں۔ یہ سنتے ہی اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار ایسی بڑھائی کہ عین الملک اور عالم خاں کے پہنچنے سے پہلے ہی داراسنگ پہنچ کر بادشاہ کے حضور حاضری دے دی۔ دشمن کے تعاقب کا خوف تھا اس لیے دلاور خاں نے بادشاہ کو ساتھ لیا اور شاہ درک کی طرف روانہ ہوگیا۔ تمام رات سفر کرنے کے بعد صبح کے وقت وہ منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔
جمال خاں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلد اور ایسی شاندار فتح نصیب ہوگی۔ اسے معلوم تھا کہ دلاور خاں فرار ہو کر داراسنگ کی طرف گیا ہوگا جہاں بادشاہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ بھی پہلی فرصت میں داراسنگ آیا تھا لیکن ظاہر ہے دلاور خاں بادشاہ کو لے کر وہاں سے جا چکا تھا۔ جمال خاں وہیں ٹھہر گیا۔
بادشاہ کے شاہ درک پہنچ جانے کے بعد تمام عادل شاہی امراء اور فوجی سردار بھی شاہ درک میں جمع ہو گئے تھے۔
بادشاہ کے بھیجے ہوئے خطوط کام دکھا رہے تھے۔ برار کے امراء بادشاہی حکم کے مطابق برہان نظام شاہ کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ راجا علی خاں حاکم اسیر بھی برہان نظام کا حلیف بن چکا تھا۔ یہ سب مل کر احمد نگر پر حملہ کرنے والے تھے۔ جمال خاں کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اس نے داراسنگ میں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا اور برار کی طرف چل دیا۔ گویا جنگ پر آمادہ ہوا۔
اس خبر سے گھبرا کر راجا علی خاں نے ابراہیم عادل شاہ کو خطوط لکھے اور مدد کی درخواست کی۔ عادل شاہیوں کو جمال خاں کے ہاتھوں شکست ہو چکی تھی لہٰذا شکست کے اس داغ کو دھونے کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ ابراہیم عادل نے آٹھ ہزار ترکی سپاہیوں کو اپنے لشکر سے جدا کر کے جمال خاں کے تعاقب میں روانہ کر دیا جو برار کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ترکی لشکر کو ہدایت کی۔
"جلد از جلد دشمن کے پاس پہنچ کر تمام راستوں کو مسدود کر دو۔ کوئی ضرورت کی چیز مثلاً غلہ اور چارا وغیرہ اس کے پاس پہنچنے نہ پائے۔ نیز دشمن کو اس انداز سے ترک کرو کہ برہان نظام اور راجا علی خاں بڑی آسانی سے غالب آسکیں۔"
اس لشکر کے چلے جانے کے بعد بادشاہ نے ایک دریا کے کنارے خیمے لگانے کا حکم دیا اور یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ یہاں چند روز قیام کرنے کے بعد آگے بڑھے گا۔ دلاور خاں نے اس کی مخالفت کی۔
"یہ جو آپ کر رہے ہیں جنگی حکمتِ عملی کے خلاف ہے۔ آپ کو یہاں سے فوراً روانہ ہونا چاہیے۔ آپ نہیں جاتے تو میں یہاں سے خود نکل جاؤں گا۔"
بادشاہ کو اس کی یہ گستاخی سخت ناگوار گزری۔ وہ اس کی گستاخیاں برداشت کرتا چلا آرہا تھا۔ دلاور خاں اتنی طاقت پکڑ چکا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔ تمام امراء اس کے تابع فرمان تھے۔ بادشاہ ان سے کوئی مدد نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ کسی مناسب وقت پر دلاور خاں سے خود نمٹ لے گا۔
دلاور خاں سمجھ رہا تھا کہ بات ٹل گئی لیکن بات ٹلی نہیں تھی۔
ابراہیم عادل کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگا کہ کسی طرح دلاور خاں سے پیچھا چھڑایا جائے۔ وہ کسی امیر پر بھروسا

نہیں کرسکتا تھا کہ سب کے سب دلاور خاں سے ملے ہوئے تھے۔ اس وقت بھی وہ اسی فکر میں تھا کہ اس کا ایک ہندو ملازم جو اس کی والدہ کی ملازمت میں رہ چکا تھا اور اب اس کے پاس تھا، حاضر ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ایک خیال اس کے دل میں بجلی کی طرح کوندا۔ ''اس شخص کو لشکر میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔''

''مادھولال! تم میرا ایک کام کردو۔''

''حضور کے لیے جان بھی حاضر ہے۔''

''ایک خط میں تمہیں دے رہا ہوں۔ اسے لے کر عین الملک کے پاس چلے جاؤ اور جو جواب وہ تمہیں دے، وہ مجھ تک پہنچادو۔''

''آپ مجھے اتنی عزت دے رہے ہیں۔ میں یہ کام ضرور کروں گا۔''

ابراہیم نے وہ خط مادھولال کے حوالے کردیا جس میں دلاور خاں سے بیزاری کی تفصیل بیان کی ہوئی تھی۔ اس نے خط کے جواب میں لکھا۔ ''اگر حضور دلاور خاں سے اسی قدر بیزار ہوگئے ہیں تو ہم جاں نثاروں کو حکم دیا جائے کہ اسے جلد از جلد ٹھکانے لگادیا جائے۔''

یہ خط کتابت جاری رہی اور منصوبے بنتے رہے۔ معاملہ دلاور خاں جیسے طاقتور امیر کا تھا اس لیے نہایت احتیاط سے کام لیا جارہا تھا۔ پھر مادھولال کے توسط سے بادشاہ اور عین الملک کے درمیان یہ طے ہوا کہ آدھی رات کے وقت جبکہ دلاور خاں سو رہا ہو، عین الملک لشکر میں چلا جائے۔ اس کے بعد عین الملک، آنکش خاں اور علی خاں کو ساتھ لے کر دلاور خاں پر حملہ کردے۔

حملے والی رات بادشاہ اپنی قیام گاہ سے باہر نکلا اور ایک غلام کو حکم دیا کہ وہ خاصہ کا ایک گھوڑا لے آئے۔ یہ غلام گھوڑا لینے گیا۔ جلوداروں کے سردار نے گھوڑا دینے سے انکار کردیا۔ ''دلاور خاں کے حکم کے بغیر گھوڑا نہیں دیا جاسکتا۔'' غلام نے یہ سنتے ہی جلودار کے منہ پر تھپڑ مارا۔ اب جلودار سمجھ گیا کہ معاملہ دگرگوں ہے اور اس نے فوراً کئی گھوڑے لاکر حاضر کردیے۔

بادشاہ اور اس کے کئی غلام ان گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ الیاس خاں سرنوبت نے جب بادشاہ کو سوار ہوتے دیکھا تو دوڑا ہوا آیا۔

''حضور! یہ وقت باہر جانے کا نہیں۔ آخر اس تیاری کی وجہ کیا؟''

''یہ موقع گفتگو کا نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔ معاملہ خود بخود تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔'' بادشاہ نے کہا۔ الیاس خاں اپنے سپاہیوں کے ساتھ جن کی تعداد سو سے بھی کم تھی، بادشاہ کے ساتھ ہولیا۔ بادشاہ بڑے لشکر سے الگ ہوکر عین الملک کی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔

بادشاہ کے سراپردہ سے باہر آتے ہی خاصہ کے سپاہی فوراً مسلح ہوگئے۔ یہ لوگ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان لوگوں کی تعداد تین ہزار تھی۔

ابراہیم عادل عین الملک کے لشکر کے قریب پہنچا تھا کہ دلاور خاں کے مخبروں نے یہ خبر دلاور خاں تک پہنچادی۔ دلاور خاں اسی وقت جنگ کے ارادے سے تیار ہوا اور سورج نکلنے کے وقت تک بادشاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ دلاور خاں کو توقع تھی کہ لشکر خاصہ کے سپاہی اور دیگر امراء پہلے کی طرح بادشاہ کی اطاعت سے منحرف ہوکر اس کے ساتھ مل جائیں گے۔ کوئی اور ملے نہ ملے، عین الملک نے غداری کی۔ جب بادشاہ نے عین الملک کو حکم پہنچایا کہ وہ دلاور خاں کی مدافعت کرے۔ عین الملک بظاہر تو بادشاہ کے فرمان کی اطاعت کے لیے نکلا لیکن خفیہ طور پر دلاور خاں کے پاس یہ پیغام بھی بھجوادیا۔

''بادشاہ اچانک ہمارے پاس آگیا ہے اور ہم لوگ مجبوراً اس کی اطاعت کا دم بھر رہے ہیں۔ تم بے فکر ہوکر بادشاہ کو اپنے ساتھ لو اور اپنی جگہ واپس جاؤ۔ ہماری طرف سے بے فکر رہو ہم تمہاری راہ میں حائل نہیں ہوں گے۔''

یہ پیغام ملتے ہی دلاور خاں نے اپنی فوج کو تو کچھ فاصلے پر چھوڑا اور خود پانچ سو سواروں کے ساتھ بادشاہ کے سامنے آیا اور عرض کیا۔

''آپ کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ رات کے وقت سراپردۂ شاہی سے باہر نکلتے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ کسی نے آپ کے کان بھر دیے ہوں گے میرے خلاف۔ میں ان چھوٹی موٹی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ اس وقت یہی بہتر ہے کہ آپ میرے ساتھ واپس روانہ ہوں۔''

بادشاہ کے لیے اس کا یہ طرزِ تخاطب نہایت گستاخانہ تھا۔ وہ بلند آواز میں پکارا۔ ''اس گستاخ کو کون سزا دینے کے لیے تیار ہے؟'' یہ سنتے ہی اوزبک خاں نامی لشکر خاصہ کا ایک سپاہی آگے بڑھا۔ اس نے دلاور خاں پر تلوار کا ایک وار کیا اگرچہ یہ ضرب کاری نہیں تھی۔ دلاور خاں نے اپنا گھوڑا پیچھے ہٹالیا۔ اوزبک خاں نے تلوار کا ایک اور وار کرنا چاہا۔ اسی وقت دلاور خاں کا گھوڑا بدک گیا۔ دلاور کے لشکر کے ایک مہابت نے فوراً اپنا ہاتھی دلاور اور اوزبک کے درمیان لاکر

کھڑا کر دیا تاکہ دلاور خاں کسی دوسرے گھوڑے پر سوار ہوجائے۔ بس یہ موقع بہت تھا۔ بادشاہی رعب ایسا تھا کہ دلاور کے لشکر کا کوئی سپاہی اس کی مدد کے لیے آگے نہ بڑھا لہٰذا وہ بھاگ اٹھا۔ بادشاہ کے لشکر نے اس کا تعاقب کیا لیکن وہ کسی جگہ قیام کیے بغیر ہی احمد آباد بیدر پہنچ گیا۔

بادشاہ کو معلوم تھا کہ دلاور خاں بیدر پہنچ کر خاموش نہیں بیٹھے گا بلکہ بیجاپور کے خلاف سازشوں کا جال بچھائے گا لیکن وہ اسی پر خوش تھا کہ اسے دلاور خاں کی چیرہ دستیوں سے نجات مل گئی۔

☆☆☆

جمال خاں کے تعاقب میں روانہ ہونے والا عادل شاہی لشکر اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ جمال خاں سخت پریشان تھا لیکن ابھی حواس اس کے قابو میں تھے۔ وہ راستہ طے کرتا ہوا ''رونکر'' گھاٹ پر پہنچا۔ برہان شاہ کے آدمیوں نے گھاٹ کا راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ جمال شاہ ایک دوسرے راستے سے برہان شاہ کی طرف بڑھا۔ یہ راستہ بہت ہی مشکل اور پیچیدہ تھا۔ یہاں پانی بھی بہت کم تھا اور ہوا انتہائی گرم تھی۔ سپاہیوں کا برا حال تھا۔ بہت سے تو یہ طے کر رہے تھے کہ آگے بڑھنے کے بجائے واپس لوٹ جائیں۔ اسی اثنا میں یہ خبر ملی کہ تین کوس کے فاصلے پر ایک جگہ ہے جہاں پانی بکثرت ہے۔ جمال خاں فوراً اس راستے کی طرف بڑھا لیکن معلوم ہوا کہ برہان شاہ اور علی خاں نے پہلے ہی اس مقام کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ جمال خاں کے لشکریوں کی حالت بہت ہی خراب ہوگئی۔ انہوں نے یہ رات پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے ہوئے جنگل میں گزاری۔ صبح ہوئی تو پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ انہیں اطلاع ملی کہ قریب ہی ایک نخلستان ہے اور وہاں پانی بکثرت ہے۔ یہ لوگ بھاگ کے وہاں گئے۔ تھوڑا سا پانی ہاتھ لگا جو جانوروں اور انسانوں کے کام آیا۔

اب جمال خاں تنگ آچکا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ فیصلہ کن معرکے کے لیے آگے بڑھے گا۔ فتح یا شکست سے بے پروا ہو کر آگے بڑھا اور وہ فاصلہ طے کر لیا جو اس کے اور برہان شاہ کے درمیان حائل تھا۔ اپنی قوت پر نازاں ہو کر مقابلے پر آگیا۔

دونوں لشکروں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ جمال خاں کے لشکر نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور دشمن کو پسپا کر دیا۔ قریب تھا کہ فتح حاصل ہوتی، اچانک ایک تیر جمال خاں کے ماتھے پر لگا اور وہ گھوڑے سے گر پڑا۔ یہ حال دیکھ کر اس کے چند نامور امیروں نے میدان جنگ میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اسمٰعیل نظام کو لے کر بھاگ گئے۔

برہان شاہ نے فراریوں کا تعاقب کیا۔ بھاگنے والے یاقوت خاں اور خداوند خاں حبشی کو اس نے گرفتار کر لیا اور ان دونوں کے سرتن سے جدا کر دیے۔ سہیل خواجہ سرا، اسمٰعیل نظام کو لے کر بھاگے چلا جارہا تھا۔ اس نے جو یہ حال دیکھا تو اسمٰعیل نظام کو ایک قصبے میں چھوڑا اور خود بیجاپور کی طرف بھاگ گیا۔

اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ برہان شاہ کے امراء نے سہیل کا پیچھا چھوڑ دیا اور اسمٰعیل نظام کو اس کے باپ برہان نظام کے پاس لے آئے۔

ابراہیم دلاور خاں کے قضیے سے نمٹنے کے بعد برہان نظام کی مدد کے لیے برار کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ اسے برہان کی فتح اور جمال خاں کے قتل کی اطلاع ملی۔ اس نے اسی مقام سے برہان نظام شاہ کو تہنیت نامہ ارسال کیا اور خود بیجاپور کی طرف لوٹ گیا۔

☆☆☆

ابراہیم نظام شاہ نے دلاور خاں کے بغیر سرزمین بیجاپور پر قدم رکھا تو سب سے پہلے اسے اپنے بھائی اسمٰعیل کی یاد آئی جسے دلاور خاں حبشی نے بلگوان کے قلعے میں قید کر دیا تھا۔ دلاور خاں کے خوف سے وہ اپنے بھائی کو رہا نہ کرسکا تھا۔ اب اس نے ایک خاص درباری کو شہزادہ اسمٰعیل (ابراہیم عادل کا بھائی) کے پاس بھیجا اور اسے یہ پیغام دیا۔

''میں اب تک تمہارے دیدار سے محروم ہوں۔ میں کچھ ایسا مجبور ہوا تھا کہ تمہیں نہ دیکھ سکا۔ تم اصل حالات سے پوری طرح باخبر ہو۔ اس لیے مجھے کچھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب اس وقت تم یہ کرو کہ اس قلعے میں عیش و عشرت سے زندگی گزارو۔ جب سلطنت کے چند اہم اور ضروری کام طے پا جائیں گے تو میں تمہیں اپنے پاس بلالوں گا۔''

شہزادہ اسمٰعیل نے اپنے بھائی کی محبت کی پروا نہ کی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ دلاور خاں درمیان سے ہٹ گیا ہے تو ہنگامہ پروری کی ترغیب سے بادشاہ کی مخالفت پر اتر آیا اور تاج و تخت کی تمنا انگڑائیاں لینے لگی۔ اس نے علم بغاوت بلند کیا اور کھلم کھلا مخالفت پر اتر آیا۔ ابراہیم کو جب ان حالات کا علم ہوا تو شہزادہ اسمٰعیل کے نام ایک نصیحت آمیز خط لکھا۔

''مجھے تمہاری مخالفانہ کارروائیوں کا علم ہوا ہے۔ تم اگر یہ روش چھوڑ دو تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا ورنہ تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔ خداوند تعالیٰ جس کو سلطنت و تخت سے سرفراز

کرتا ہے وہ ایسے ہنگاموں سے کبھی نہیں ڈرتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ملک دکن کا بہترین حصہ میرے قبضے میں ہے اور یہاں کے تمام باشندے اور امراء دل وجان سے میرے فرماں بردار ہیں۔ تم اپنے ارادے سے باز آجاؤ۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں معرکہ آرائی میں تمہیں نقصان اٹھانا پڑے۔“

ابراہیم عادل نے یہ خط اپنے ایک قابلِ اعتماد امیر شاہ عالم کے ہاتھ روانہ کیا۔ شاہ عالم یہ خط لے کر بلگوان پہنچا۔ شہزادہ اسمٰعیل خط پڑھ کر سیدھے راستے پر نہ آیا۔ اس نے شاہ عالم کو قید کر کے بادشاہ کو ہتک آمیز جواب لکھ بھیجا اور پھر بغاوت اور خروج کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے برہان نظام شاہ کے پاس ایک قاصد روانہ کیا اور اس سے مدد کا طالب ہوا۔ برہان نظام شاہ کے پاس سے مثبت جواب آیا۔

”اگر تمہارا کام مناسب اور ٹھیک طریقے سے انجام پائے تو تم بیجاپور کے بڑے بڑے امیروں کو آئندہ کے دل خوش کن وعدوں سے اپنا بنالو خصوصاً عین الملک سے گہرے مراسم پیدا کرو۔ اگر یہ امیر تمہارا حلیف بن گیا تو دوسرے امراء بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔“

شہزادے نے اس سے اور آتش خاں سے تعلقات پیدا کیے اور ان دونوں کو اپنا ساتھی بنالیا۔ عین الملک نہایت ہوشیار امیر تھا۔ اس نے کوئی فوری قدم اٹھانے سے گریز کیا اور یہ چاہا کہ معاملہ طول کھینچے اور اسمٰعیل بلگوان کو اپنا دارالسلطنت بنا کر اپنے نام کا خطبہ وسکہ جاری کرے تاکہ ایک ہی سلطنت میں دو حکمرانوں کی حکومت قائم ہو جائے چنانچہ اس نے شہزادے کو یہ پیغام بھیجا۔

”جب سلطنت کی تمام مہمات انجام پا جائیں گی تو میں چند امراء کے ساتھ آپ کے پاس آجاؤں گا۔“

جب ابراہیم کو شاہ عالم کی بابت علم ہوا تو وہ بہت طیش میں آیا اور فوراً الیاس خاں سرنوبت کو ایک زبردست فوج کے ساتھ قلعہ بلگوان کی طرف بھیجا۔

الیاس خاں نے بلگوان پہنچ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ بادشاہ عین الملک اور شہزادے کے خفیہ تعلق سے بے خبر تھا۔ اس نے عین الملک کو بھی بلگوان کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ اس نے ظاہری طور پر اس قلعے کا محاصرہ کر لیا لیکن چوری چھپے اہلِ قلعہ کو غلہ اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھیجتا رہا۔ بادشاہ کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے عین الملک کی طلبی کا فرمان جاری کر دیا۔

”تمہیں معلوم ہے ان دنوں سب سے اہم مسئلہ قلعہ بلگوان کی فتح ہے۔ تم چونکہ سپہ سالار ہو اس لیے اس سلسلے میں تم سے مشورہ کرنا ہے لہٰذا تم جلد سے جلد شاہی بارگاہ میں پہنچ جاؤ۔“

عین الملک نے نہایت چندہ پیشانی سے شاہی فرمان کا استقبال کیا اور جلد سے جلد پایۂ تخت کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ بادشاہ مطمئن رہے۔

ابراہیم نے اپنا دربار وسیع پیمانے پر آراستہ کیا۔ تمام امراء اور عسکری دائیں بائیں کھڑے ہوئے۔ شان وشوکت کا یہ عالم دیکھ کر عین الملک سہم گیا۔ اس نے تین چار جگہ زمین کو بوسہ دیا اور بعد ازاں شاہی خدمت میں حاضر ہوا اور تخت شاہی کو چوم کر بادشاہ کے حکم کے مطابق اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

عین الملک خوف زدہ تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا راز بادشاہ پر کھل گیا ہے اس لیے اس سے باز پرس کی جائے گی لیکن اس کے برخلاف اسے خلعت فاخرہ، کمر بند، خنجر مرصع، اسپ تازی اور ایک چابک سے نوازا۔ اس کے بعد چند ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے اس کی جاگیر پر واپس جانے کی اجازت مل گئی۔

عین الملک نے ابراہیم کے حسن سلوک کی پروانہ کی۔ بادشاہ کی نرمی کو کمزوری سمجھا۔ اپنی جاگیر پر پہنچ کر بھی چوری چھپے شہزادہ اسمٰعیل کی مدد کرتا رہا۔

اس کے بعد اس نے ابراہیم کی کھلے عام مخالفت شروع کر دی۔ قرب وجوار کے حاکموں کو خطوط لکھے اور انہیں شہزادہ اسمٰعیل کی اطاعت کی ہدایت کی۔ اس نے احمد نگر کے نئے والی برہان نظام شاہ کو بھی نہایت زوردار خط لکھا۔ اس نے لکھا۔

”تمام قلعے اور قصبے شہزادہ اسمٰعیل کے قبضے میں آگئے ہیں اور اس علاقے کے تمام امراء اور پایۂ تخت کے سارے معزز اشخاص نے شہزادے کی وفاداری کا عہد کر لیا ہے۔ سب لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ شہزادے کے سر پر چتر شاہی رکھ کر بیجاپور کا سفر اختیار کیا جائے لیکن یہ عظیم اقدام آپ کی اعانت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ کامیابی کے بعد ہم بطور شکریہ شاہ درک اور شولاپور کے قلعے اور تمام سرحدی پرگنے آپ کی نذر کریں گے۔“

برہان نظام شاہ کے پاس جب یہ خط پہنچا تو اس نے ابراہیم عادل شاہ کے تمام احسانات کو بالائے طاق رکھ کر شہزادے کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ بس پھر کیا تھا، اب کسی مصلحت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنا وہ لشکر واپس بلا لیا جو الیاس خاں کی مدد کے لیے بلگوان بھیجا تھا۔ الیاس خاں خوف زدہ ہو گیا اور ابراہیم سے اجازت لیے بغیر ہی

بیجاپور واپس آ گیا۔ بادشاہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ الیاس خاں بھی دشمن سے مل گیا ہے۔ بادشاہ نے اسے گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔

اب وقت تھا کہ وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتا۔ اس نے آنکش خاں کو جسے وہ اپنا منہ بولا بیٹا کہتا تھا، خط لکھ کر ہدایت کی کہ لشکر جمع کرے اور برہان نظام شاہ کے آنے کے بعد اس کی ہمراہی میں قلعہ بلگوان پہنچ جائے۔

آنکش خاں نے دس ہزار سواروں اور بیس ہزار پیادوں کا ایک زبردست لشکر جمع کر لیا اور اپنی قوت کے نشے میں سرشار ہو کر برہان نظام کی آمد کا انتظار کیے بغیر بلگوان روانہ ہو گیا۔ بلگوان پہنچ کر شہزادے سے ملاقات کی اور برہان نظام کی آمد کی امید میں شہزادے کے سر پر چتر شاہی رکھ دیا۔

ابراہیم عادل کو جب یہ خبریں پہنچیں تو اس نے حمید خاں کو سرِ لشکر مقرر کیا اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیا۔ امراء اور منصب دار بھی اس کے ساتھ تھے۔

حمید خاں ابھی ایک مقام عساپور پہنچا تھا کہ عین الملک اور اس کے ساتھیوں نے اسے شہزادہ اسمٰعیل کی اطاعت کی دعوت دی۔ حمید خاں نے ویسا ہی کیا جیسا کہ ابراہیم عادلؔ نے کہا تھا۔ حمید خاں نے دشمنی کا شائبہ تک نہ ہونے دیا۔ اس نے باغیوں کی بڑی عزت کی اور عین الملک کو کہلا بھیجا کہ میں تم لوگوں سے لڑائی کے لیے نہیں آیا ہوں۔ میرا ارادہ شہزادہ اسمٰعیل کی اطاعت ہے۔ اگر شہزادہ، برہان نظام کی آمد سے پہلے ہی قلعے سے باہر نکل کر چتر شاہی کو اپنے سر پر سایہ فگن کرے تو میں اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اظہارِ اطاعت کروں۔

عین الملک اس کے فریب میں آ گیا۔ برہان نظام شاہ قلعہ پرندہ کے قرب و جوار تک پہنچ چکا تھا۔ وہ حمید خاں کو باتوں میں الجھا کر کچھ وقت گزار سکتا تھا لیکن اس نے شہزادے کو ساتھ لیا اور قلعے سے باہر نکل آیا۔

ایک بڑے میدان میں عین الملک اور حمید خاں کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں اس نے عین الملک کو مزید مطمئن کر دیا۔

''میں ابراہیم کے حکم پر یہاں چلا تو آیا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں بھی تمہاری طرح اس کے خلاف ہو چکا ہوں۔ اب ہم دونوں مل کر شہزادہ اسمٰعیل کو تخت پر بٹھائیں گے۔''

''ہم دونوں ہی کیوں...... برہان نظام شاہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ قلعہ پرندہ تک پہنچ چکا ہے۔ بس پہنچنے ہی والا ہوگا۔''

اس بے وقوف نے یہ بھی بتا دیا کہ برہان نظام شاہ کتنے فاصلے پر ہے۔ اب حمید خاں کو جو کچھ کرنا تھا، جلدی کرنا تھا۔ اس نے اپنے توپچیوں کو اشارہ کیا اور شہزادے کے لشکر پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ عین الملک نے فرار ہونا چاہا لیکن سہیل خاں خواجہ سرا کے حملے نے اس کے لشکر کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ عین الملک زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑا۔ سہیل خاں نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اس کے بعد سہیل خاں نے شہزادے کے لشکر کا رخ کیا۔ شہزادے نے آنکش خاں کے پاس پہنچنے کا ارادہ کیا تاکہ ان دونوں کے ساتھ برہان نظام شاہ کی خدمت میں حاضر ہو۔ شہزادہ اسمٰعیل پر شراب کا نشہ طاری تھا۔ اس لیے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے وہ زمین پر گر گیا۔ سہیل خاں کے سپاہیوں نے فوراً اسے گرفتار کر لیا۔

شاہی ملازموں نے عین الملک کا سر بیجاپور روانہ کیا۔ بیجاپور میں اس کا سر رسی سے باندھ کر لٹکا دیا گیا۔ تمام لوگ اسے دیکھنے کے لیے دور دور سے آئے۔ ایک ہفتے تک یہی عالم رہا۔

شہزادہ اسمٰعیل کو سلحداروں کے سردار خان جی نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد تمام امرائے عادل شاہی بیجاپور پہنچے اور انہوں نے بارگاہِ شاہی میں حاضری دی۔ اسی روز عین الملک کے سر کو ایک توپ کے دہانے پر رکھ کر اڑا دیا گیا۔

برہان نظام شاہ عادل شاہیوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے قلعہ پرندہ تک آ گیا تھا کہ اس نے یہ تمام واقعات سنے تو سخت پریشان ہوا۔ اب اس کا وہاں رکنا یا آگے بڑھنا بے سود تھا۔ وہ احمد نگر واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

دلاور خاں اب تک احمد آباد بیدر میں تھا اور وہاں سازشوں کے جال بچھا رہا تھا۔ احمد نگر میں برہان نظام کی حکومت آ چکی تھی۔ دلاور خاں کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ برہان نظام شاہ شہزادہ اسمٰعیل کا حلیف بن کر اس کی تخت نشینی کے لیے قلعہ پرندہ تک گیا ہے۔ پھر اسے یہ معلوم ہوا کہ اسمٰعیل کے قتل کے بعد وہ احمد نگر لوٹ گیا ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ بیجاپور اور احمد نگر کے درمیان ٹھن گئی ہے۔ یہ معاملہ دب گیا ہے لیکن کسی وقت پھر اٹھے گا۔ اسی موقع پر برہان نظام کو حلیفوں کی سخت ضرورت ہوگی۔ یہی سوچ کر وہ احمد نگر پہنچ گیا اور برہان نظام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسے اپنے حالات اور ارادوں سے آگاہ کیا۔ دشمن کا دشمن

بھی دوست ہی ہوتا ہے۔ برہان نظام نے دلاور خاں کی مدد کا وعدہ کرلیا اور اس نے اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ بیجاپور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرسکتا ہے۔ برہان نظام نے اسے منصب وجاگیر سے سرفراز کیا۔ اس جاگیر کی آمدنی سے وہ لشکر کی فراہمی میں مشغول ہوگیا۔

ابراہیم عادل شاہ کو جب خبر ہوئی کہ دلاور خاں بیدر سے احمد نگر آگیا ہے، برہان نظام نے اسے منصب وجاگیر سے نوازا ہے اور اب وہ بیجاپور پر حملہ کرنے کی تیاری کررہا ہے تو اسے سخت غصہ آیا۔ وہ پریشان تو نہیں ہوا تھا لیکن آزردہ ضرور ہوا۔ اسے دلاور خاں پر نہیں، برہان نظام پر غصہ آرہا تھا جس نے اس کے دشمن کو نہ صرف پناہ دی بلکہ اس کی مدد پر آمادہ ہوا۔ اس نے اپنا غصہ ایک خط میں اتارا اور اس خط کو برہان نظام تک پہنچا دیا۔

''دوستانہ مراسم کا تقاضا یہ ہے کہ آپ دوست دشمن میں امتیاز کریں اور میرے دوستوں کو اپنا دوست اور میرے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھیں۔ آپ ہر معاملے میں میرا ساتھ دیں تاکہ باہمی رفاقت اور زیادہ ہو۔ مجھے انتہائی تعجب ہے کہ آپ نے میرے ایک نمک حرام ملازم دلاور خاں کو منصب اور جاگیر دی ہے۔ ساتھ ہی اسے ایک ممتاز عہدے پر متعین کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان تعلقات کا خیال رکھیں گے جو میرے اور آپ کے درمیان چلے آرہے ہیں اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو میری دل شکنی کا باعث ہو۔''

یہ پیغام سن کر برہان شاہ سخت غصے میں آیا۔ اسے واقعی دوست اور دشمن میں امتیاز نہ رہا اور اس پیغام کے جواب میں نازیبا اور سخت باتیں کہیں۔

اس کی طرف سے نازیبا جواب آنے کے بعد ابراہیم عادل بھی محتاط ہوگیا اور اس نے ہر صورت میں برہان نظام کو اپنے سامنے زیر کرنے کا تہیہ کرلیا۔ ابراہیم عادل نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اپنے ایک قاصد کو احمد نگر...... بھیجا اور برہان نظام کو یہ پیغام دیا کہ بیجاپور کے تین سو ہاتھی احمد نگر والوں کی طرف ہیں لہٰذا وہ ہاتھی بلاتاخیر واپس کردیے جائیں۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو بڑا نقصان اٹھائیں گے۔

دلاور خاں جیسا جری جس کی بہادری کی شہرت پورے دکن میں پھیلی ہوئی تھی، اس کے پاس آگیا تھا۔ وہ اس پیغام کو کیا خاطر میں لاتا۔ اس کا غصہ مزید بڑھ گیا۔ اس کی ہوس ملک گیری پاؤں پھیلانے لگی۔ اب تک تو وہ محض یہ ارادہ کیے ہوئے تھا کہ دلاور خاں کی مدد کرے گا لیکن اب اس نے براہِ راست بیجاپور پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے فوراً لشکر کی فراہمی کا حکم دیا۔ دلاور خاں اور اپنے دوسرے سالاروں کو ساتھ لے کر عادل شاہی علاقے میں داخل ہوگیا۔

عادل شاہ، برہان کو کوئی اہمیت نہ دیتا تھا۔ اس نے پروا بھی نہیں کی۔ بیجاپور میں مقیم رہا جبکہ برہان نے دریائے بیورہ کے کنارے منگسرہ کے مقام پر قیام کیا۔ وہ اس صورتِ حال سے سخت پریشان ہوا کہ ابراہیم عادل اس سے مقابلے کے لیے اب تک بیجاپور سے کیوں نہیں نکلا۔ اس نے دلاور خاں اور دوسرے امراء سے مشورہ کیا کہ اب کیا قدم اٹھایا جائے۔ دلاور خاں نے مشورہ دیا۔

''بیجاپور کے علاقوں میں جہاں تک ہم پہنچ چکے ہیں، یہاں ہی قیام کیا جائے اور یہاں ایک مستحکم قلعہ تعمیر کیا جائے تاکہ قلعے کو اپنی پشت پر رکھ کر نہ صرف ابراہیم عادل کا مقابلہ کیا جائے بلکہ اس کے علاقوں میں دور تک ترک وتاز کرتے ہوئے اپنے لیے فوائد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔''

برہان نظام نے یہ مشورہ مان لیا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ برہان شاہ نے تجربہ کار معماروں اور کاریگروں کو دریائے بیورہ کے پار ایک قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ شاہی معماروں نے بڑی مستعدی سے کام شروع کیا اور قلعے کو جلد از جلد تیار کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

ابراہیم عادل نے مصلحتاً بیجاپور سے کوئی فوج نظام شاہی لشکر کی سرکوبی کے لیے روانہ نہ کی لہٰذا یہ لوگ بڑے اطمینان کے ساتھ قلعے کی تعمیر میں مصروف رہے البتہ ان پر نگاہ پوری طرح رکھی ہوئی تھی۔

قلعہ تعمیر ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ برسات کا موسم آگیا اور یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں دریا کا پانی چڑھ کر قلعے اور لشکر کے درمیان حائل نہ ہوجائے اور اس سے فائدہ اٹھا کر عادل شاہی فوج قلعے پر قبضہ نہ کرلے۔ برہان شاہ نے نامکمل قلعے پر دروازے لگائے اور حصار کو توپوں وغیرہ سے مستحکم کیا اور برسات کے دوران قلعے کو مکمل کرنے کا ارادہ کرلیا۔

دلاور خاں کے غرور نے ایک مرتبہ پھر اسے آواز دی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ابراہیم عادل اور اس کے سالار مقابلے پر آتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔ اگر اس موقع پر وہ بیجاپور پہنچ کر اپنی کوتاہیوں کی معافی طلب کرے اور برہان شاہ سے مقابلے کے لیے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کرے تو وہ یقیناً مجھے معاف کردے گا اور پھر میں پہلے کی طرح سیاہ سفید

کا مالک بن کر بیجاپور میں رہ سکوں گا۔ اس خیال کے پیش نظر اس نے عادل شاہ سے قول نامے کی درخواست کی تاکہ پورے اطمینان کے ساتھ وہ بیجاپور جائے۔

ابراہیم عادل تو پہلے ہی اس کی تلاش میں تھا اور چاہتا تھا کسی طرح وہ اس کے ہاتھ لگ جائے لہٰذا اس نے فوراً قول نامہ روانہ کردیا۔

دلاور خاں اس کے دام میں پھنس گیا اور بیجاپور پہنچ گیا لیکن اس کی بدقسمتی کہ یہاں اس کے حق میں حالات وہ نہیں تھے جس کی اسے امید تھی۔ وہ تو بڑی خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے بڑی برق رفتاری سے بیجاپور پہنچا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ جونہی بیجاپور پہنچے گا، شاندار انداز میں اس کا استقبال کیا جائے گا۔ پہلے کی طرح اسے لشکریوں کا سالار اعلیٰ بنا کر دوسرے سالاروں کو اس کا ماتحت کردیا جائے گا لیکن ہوا یہ کہ وہ جیسے ہی بیجاپور میں داخل ہوا اسے گرفتار کرلیا گیا۔ وہ چیختا رہ گیا کہ بادشاہ نے اسے قول دیا تھا لیکن سہیل خاں نے بادشاہ کا حکم نامہ دکھادیا جس میں تحریر تھا کہ دلاور خاں کو گرفتار کرلیا جائے۔

اسے گرفتار کرکے ایک قلعے میں نظر بند کردیا گیا۔

اس کی گرفتاری کے بعد ابراہیم عادل شاہ نے دشمن کی طرف توجہ دی۔ اس نے اپنے سالاروں کو طلب کیا اور ان کے سامنے تمام صورتِ حال رکھی۔

''میرے عزیز ساتھیو! یہ بات آپ سب پہلے سے جانتے ہیں کہ برہان نظام نے ہماری مملکت کے اندر ایک قلعہ تعمیر کرنا شروع کردیا ہے تاکہ اس میں اپنی طاقت کو جمع کرکے ہمارے علاقے کے اندرونی حصوں تک پہنچے۔ ہم اب تک اس لیے خاموش رہے کہ شاید برہان نظام اپنے اس اقدام پر کسی وقت پچھتائے اور واپس لوٹ جائے۔ ہمارے خاموش رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برہان نظام کے ساتھ دلاور خاں ملا ہوا تھا اور ہم یہ سمجھتے تھے کہ دلاور خاں ہی اسے یہاں تک لایا ہے لیکن اب تو دلاور خاں اس کے ساتھ نہیں بلکہ ہماری قید میں ہے۔ برہان نظام اب بھی قلعے کی تعمیر سے باز نہیں آیا بلکہ اب تو یہ خبریں آرہی ہیں کہ وہ قلعے کو زیرِ تعمیر چھوڑ کر ہماری جانب بڑھنے والا ہے۔

''اس خطرے سے تو خیر ہم نمٹ ہی لیں گے۔ ایک اور خطرہ بھی ہمارے سر پر کھڑا ہوا ہے۔ وہ خطرہ ہے کرناٹک کے حکمراں راجا تنکناوری کی طرف سے۔ مخبروں کے مطابق تنکناوری اب اپنے دو لشکروں کے ساتھ ہمارے خلاف حرکت میں آنے کے درپے ہے۔ ایک لشکر کی کمانداری ہندیہ نائک کرے گا اور دوسرے لشکر کی کمانداری وسواس رائے کرے گا۔ ہندیہ نائک دریائے کرشنا اور تنگ بھدرا کے سنگم کی طرف سے ہماری طرف بڑھے گا جبکہ وسواس رائے وجے نگر کی طرف سے آنے والی شاہراہ سے ہمارے علاقوں میں داخل ہونے کی کوشش کرے گا۔ میرے عزیزو! اس صورتِ حال میں اب تم لوگ بتاؤ ہمیں کس طرح اور کس ردِعمل کا اظہار کرنا چاہیے۔''

تمام سالاروں نے آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے لیے صرف ایک دن کی مہلت طلب کی۔ ان سالاروں میں سہیل خاں، رومی خاں، الیاس خاں، حمید خاں کے علاوہ امراء بھی شامل تھے۔

اگلا دن گزارنے کے بعد قصر شاہی کے اسی وسیع کمرے میں موجود تھے جہاں ابراہیم عادل اجلاس طلب کیا کرتا تھا۔

سہیل خاں نے تمام لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے عرض کیا۔

''ہم سب نے مل کر دونوں قوتوں سے نمٹنے کے لیے جو منصوبہ بندی کی ہے، اس کے مطابق ہمارا مقابلہ تین قوتوں سے ہے۔ ایک قوت برہان نظام، باقی دو قوتیں تنکناوری کی ہیں لہٰذا ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں بھی تین لشکر تیار کرنا ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کردیں۔ ایک حصہ رومی خاں کی کمانداری میں دے دیا جائے۔ الیاس خاں کو اس کا نائب مقرر کرکے ان دونوں کو برہان نظام کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیج دیا جائے۔ دوسرا حصہ میرے پاس ہوگا اور حمید خاں میرے ساتھ ہوں گے۔ ہم پہلے تو دونوں اکٹھے بیجاپور سے نکلیں گے لیکن راستے میں کسی معقول جگہ پہنچ کر دو حصوں میں تقسیم ہوجائیں گے۔ حمید خاں وسواس رائے کا راستہ روکے گا تاکہ وہ پیش قدمی نہ کرسکے۔ میں اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ دریائے کرشنا کے سنگم کا رخ کروں گا۔ وہاں میں ہندیہ نائک سے ٹکراؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں اسے بھاگنے پر مجبور کردوں گا۔ اس کے فرار کے بعد میں حمید خاں کی مدد کو پہنچ جاؤں گا۔ میں وسواس رائے کی پشت پر ہوں گا اور حمید خاں سامنے۔ اس طرح ہم اسے گھیر کر ماریں گے۔ اس کے بعد ہمارا مشترکہ لشکر برہان نظام کو اپنے علاقوں سے نکالنے میں کامیاب ہوجائے گا۔''

ابراہیم عادل نے اس منصوبہ بندی پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ سب وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور لشکر کی

ترتیب و تقسیم کا کام انجام دیا۔ انہیں دوسرے دن نکلنا تھا۔

☆☆☆

ہندیہ نائک دریائے تنگ بھدرا کے اس مقام پر آیا جہاں دریائے کرشنا اس میں آکر گرتا تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے دریائے تنگ بھدرا عبور کیا اور اس شاہراہ پر آگیا جو بیجاپور کی طرف جاتی تھی۔ اس نے اس شاہراہ پر دو میل کا سفر طے کرلیا تھا لیکن اس کی راہ روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ بڑا خوش ہوا لیکن اس کی خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ اس کے سالار ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس لیے کہ سامنے کی طرف سے سہیل خاں اپنے لشکر کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔

ہندیہ نائک کچھ دیر کے لیے پریشان ضرور ہوا تھا لیکن یہ دیکھ کر مطمئن بھی ہوگیا کہ دشمن کے لشکر کی تعداد اس سے بہت کم ہے۔ اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ وسواس رائے کا لشکر بس آتا ہی ہوگا۔ اسے کیا خبر تھی کہ حمید خاں وسواس رائے کا راستہ روکے کھڑا ہے۔

ہندیہ نائک خوشی میں اتنا بے قابو ہوا کہ وقت گزارنے کے بجائے فوراً حملے میں پہل کردی۔ دونوں لشکر گتھم گتھا ہوگئے۔ شروع میں ہندیہ نائک کا پلہ بھاری تھا لیکن کچھ ہی دیر میں اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مسلمانوں نے اس شدت سے حملہ کیا کہ میدان میں دشمن کی لاشوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

ہندیہ نائک ایسا بددل ہوا کہ میدانِ جنگ سے بھاگ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے اپنے چھوٹے سالاروں کو اشارہ دیا۔ یہ اشارہ ملتے ہی ہندیہ نائک کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔

سہیل خاں نے دریا کے کنارے تک اس کا پیچھا کیا اور پھر پلٹ آیا۔ اب اسے اس مقام پر پہنچنا تھا جہاں حمید خاں، وسواس رائے کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

اس نے برق رفتاری سے سفر طے کیا اور وسواس رائے کی پشت پر پہنچ گیا۔ حمید خاں اب تک دفاعی جنگ لڑ رہا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ سہیل خاں آگیا ہے تو جارحانہ حملے شروع کردیے۔ وسواس رائے اس دوطرفہ حملوں کی تاب نہ لاسکا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

حمید خاں اور سہیل خاں نے اس بڑی کامیابی کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اب ہمیں شمال میں احمد نگر کے علاقوں کی طرف کوچ کرنا چاہیے تاکہ الیاس خاں اور رومی خاں کی مدد کریں۔

☆☆☆

سہیل خاں اور حمید خاں جس وقت بیجاپور سے ہندیہ نائک اور وسواس رائے کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلے تھے، اسی وقت رومی خاں اور الیاس خاں بھی برہان نظام کا مقابلہ کرنے کے لیے بیجاپور سے نکلے تھے۔

ان امیروں نے نوتعمیر شدہ قلعے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور اپنا چھ ہزار کا لشکر دریا کی دوسری طرف اتارا اور حکم دیا کہ پار اترتے ہی لوٹ مار اور تباہی و بربادی کا ایسا بازار گرم کیا جائے کہ نظام شاہیوں کے لیے اطمینان کا سانس دوبھر ہوجائے۔ یہ گویا ایک طرح کی چھاپا مار جنگ تھی۔ مقصد یہی تھا کہ سہیل خاں کی آمد کا انتظار کیا جائے، اس کے بعد باقاعدہ جنگ کی جائے۔

عادل شاہیوں نے دشمن کو بہت پریشان کیا۔ برہان شاہ یہ صورتِ حال دیکھ کر بہت غصے میں آیا۔ اسے اپنے امیروں پر قطعی بھروسا نہ تھا۔ رات کے وقت وہ دشمن کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا اور صبح ہوتے ہی وہاں پہنچ گیا۔ عادل شاہیوں نے جب دشمن کی فوج کو دیکھا تو وہ اس جگہ سے کوچ کرگئی اور دریا کو پار کرکے الیاس خاں کے پاس پہنچ گئی۔ اتفاق سے اسی وقت دریا میں طغیانی آگئی اور برہان شاہ دریا کو پار نہ کرسکا۔ اسی جانب سے توپوں کے ذریعے گولے داغے لیکن اس کے سوا کہ غصہ اترتا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور وہ اپنی جگہ واپس آگیا۔

دو چار روز بعد دریا کی طغیانی کم ہوئی تو الیاس خاں اور رومی خاں نے اپنے لشکر سے چند ہزار سپاہی پھر دریا کے پار بھیجے۔ ان سپاہیوں نے پہلے کی طرح پھر چھاپا مار کارروائیاں شروع کردیں۔ آخرکار نوبت یہ آگئی کہ برہان شاہ کے لشکر میں قحط کے آثار پیدا ہونے لگے۔ برہان نے نوتعمیر قلعے کو اسد خاں ترک کے حوالے کیا۔ بہادر اور جواں ہمت سپاہیوں کے ایک گروہ کو قلعے کے اندر چھوڑا اور خود نظام شاہی حدود میں آگیا تاکہ غلہ اور دیگر سامانِ ضرورت بہ آسانی حاصل کیا جاسکے۔

اسی دوران ان کے مخبروں نے یہ اطلاع دی کہ سہیل خاں اور حمید خاں مدد کے لیے آنے ہی والے ہیں۔ ابھی تک رومی خاں اور الیاس خاں دریا عبور کرکے احمد نگر کے علاقوں میں داخل ہونے میں کسی قدر پس وپیش سے کام لے رہے تھے۔ اس خبر کو سنتے ہی انہوں نے تہیہ کرلیا کہ دریا کو پار کرکے برہان نظام کے علاقوں پر لشکر کشی کردیں گے اور پھر انہوں نے ایسا ہی کیا۔ دوسری طرف برہان نظام بھی ابراہیم عادل شاہ کے لشکر پر جان لیوا ضرب لگانے کے لیے اپنے سالاروں کو ایک جگہ جمع کرنے لگا۔ اس نے برار کے

امیرالامراء نور خاں کو جو بہادری میں اپنی مثال آپ تھا، کئی دوسرے امیروں اور لشکریوں کے ہمراہ عادل شاہی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے پاس بلالیا۔

اب یہ اتفاق تھا یا برہان شاہ کی بدقسمتی کہ جس دن نور خاں پہنچا اسی دن سہیل خاں اور حمید خاں بھی الیاس خاں اور رومی خاں سے آ کر مل گئے۔

نور خاں کے آنے کے بعد برہان نظام کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس نے مقابلے کی تیاری کی اور اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ وسطی حصے میں وہ خود رہا، دائیں پہلو پر برار کا نور خاں اور بائیں حصے پر اپنے ایک سالار شجاعت خاں کی سرکردگی میں رکھا۔ اسی طرح عادل شاہیوں نے بھی اپنی صفوں کو ترتیب دیا۔

برہان شاہ نے اپنے لشکر کی تعداد کے زعم میں حملے کی ابتدا خود کی۔ جوابی کارروائی کرتے ہوئے سہیل خاں اور اس کے ساتھیوں نے بھی تاخیر نہیں کی۔ دونوں لشکر خوف ناک انداز میں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اس موقع پر برار کے امیرالامراء نور خاں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ برہان نظام کے ساتھ مل کر اپنی فتح مندی کو کامیاب بنائے لیکن سہیل خاں نے اس کی کسی چال کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ سہیل خاں نے یہ ٹھان رکھی تھی کہ وہ جنگ کے دوران پیش قدمی کرتے ہوئے نور خاں کے مقابل ہوجائے گا اور اسے ہر صورت میں موت کے گھاٹ اتارے گا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا داؤ چلتا، اس کے ایک عام لشکری اعتماد خاں شوستری نے ایسا بے خطا نیزہ مارا کہ اس کی پیشانی میں چھید ہوگیا اور وہ اسی وقت ہلاک ہوگیا۔

برہان نظام اپنے ساتھ برار کے نور خاں کو اس لیے لایا تھا کہ اس کی وجہ سے کامیابی یقینی ہوجائے گی لیکن یہاں تو جنگ شروع ہوتے ہی پانسا پلٹ گیا۔ نور خاں گھوڑے سے گر کر زمین پر پڑا ہوا تھا اور دوسرے گھوڑے اس کی لاش کو پامال کررہے تھے۔ یہ حال دیکھ کر برہان نظام کے لشکر میں بددلی پھیل گئی۔ سہیل خاں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے حملوں میں پہلے کی نسبت زیادہ شدت پیدا کی۔ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ برہان نظام کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بچے کھچے لشکر کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ عادل شاہیوں نے دشمن کے ڈیڑھ سو ہاتھی اپنے قبضے میں کرلیے۔

برہان نظام نے جب دیکھا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جارہا تب اپنے لشکر کے ساتھ ایک محفوظ جگہ اس نے پڑاؤ کرلیا۔ ساتھ ہی وہاں قیام کے دوران اسے ایک کمک بھی مل گئی جو اس کے مرکزی شہر سے آئی تھی۔ اس سامان میں انگنت خیمے اور خوراک کا سامان تھا۔ چنانچہ وہاں خیمے نصب کیے گئے اور برہان نظام نے وہاں عارضی دارالحکومت بنالیا۔ وہ یہاں رہ کر جائزہ لینا چاہتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

وہ دشمن کی فکر میں لگا ہوا تھا اور اس طرف سے بے خبر ہوگیا تھا کہ خود اس کے امیر اس ذلت آمیز شکست کے بعد اس کے خلاف ہوگئے ہیں اور اندر ہی اندر اسے معزول کرکے اس کے بیٹے اسمٰعیل کو تخت پر بٹھانے کی سازش کر رہے ہیں۔ اسے بالآخر اس سازش کا علم ہوگیا۔ اس نے کامل خاں وغیرہ کو سخت سزا دی۔ ان سزاؤں سے اس نے دیگر امراء کو بھی اپنے خلاف کرلیا۔ ان خلاف ہونے والوں میں مقرب شاہی یوسف خواجہ سرا بھی تھا جو حسن و جمال میں اپنی مثال آپ تھا۔ خواجہ سرا بادشاہ کے بہت نزدیک تھا اور اس پر بادشاہ کو شک بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ کچھ سالاروں نے اس سے رابطہ کیا۔

''برہان شاہ نے اپنے کاموں سے احمد نگر کی ذلت ورسوائی کا سامان کیا ہے۔ اگر اس کے پاس طاقت وحوصلہ نہ تھا تو اس نے کیوں بیجاپور سے جنگ مول لی لہٰذا یہ اس قابل نہیں کہ احمد نگر کی حفاظت کرسکے۔ اسے قتل کرکے اس کی جگہ اس کے بیٹے کو حکمران بنانا چاہیے۔''

برہان نظام کو اس کی بھی خبر ہوگئی لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ یوسف خواجہ سرا ایسا کرسکتا ہے۔ وہ اسے آزمانے کے لیے نیند کا بہانہ کرکے خواب گاہ میں گیا۔ یوسف بھی خنجر ہاتھ میں لے کر خیمے میں آگیا۔ برہان شاہ نے اسے دیکھ لیا اور چھلانگ لگا کر اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا لیکن برہان کو اس سے اتنی محبت تھی کہ اس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا بلکہ اس واقعے سے ایسی چشم پوشی کی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

یہ سازشیں سر اٹھاتیں اور نہ جانے کیا رنگ اختیار کرتیں کہ برہان کا ایک امیر راجا علی خاں آگے بڑھا اور تمام حالات بادشاہ کے آگے رکھ کر اس سے درخواست کی کہ وہ بیجاپور والوں سے صلح کرلے۔ اسی میں عافیت ہے۔

''مجھے تمہاری بصیرت پر اعتماد ہے لیکن سہیل خاں صلح کی بات چیت کو آگے نہیں بڑھنے دے گا۔ ابراہیم عادل اس کے کہنے میں ہے لہٰذا وہ کوئی کردار ادا نہیں کرسکے گا۔''

''یہ خدشہ ہمیں بھی ہے لیکن ہماری مملکت میں دو آدمی ایسے ہیں جن کے تعلقات بیجاپور والوں سے بہت اچھے

ہیں۔ اگر انہیں کام میں لایا جائے تو سہیل پر دباؤ پڑسکتا ہے۔ ایک مصطفیٰ خاں اور دوسرا عبدالسلام۔''

''مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''

''بس ہمیں آپ کی اجازت کی ضرورت تھی۔ ہم آج ہی ان دونوں کو بیجاپور روانہ کرتے ہیں۔''

یہ دونوں امیر بیجاپور گئے اور ابراہیم عادل کے حضور حاضر ہوئے۔ صلح کی بات چیت چلی تو پہلے تو ابراہیم نے انکار کردیا اور صاف کہہ دیا کہ فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا لیکن جب بہت زور دیا گیا تو وہ اس شرط پر تیار ہوا کہ برہان نظام نے ہمارے علاقے میں جس قلعے کی تعمیر شروع کی تھی وہ اس قلعے کو مسمار کرے اور پھر واپس اپنے مرکزی شہر کی طرف چلا جائے۔

ان دونوں امیروں نے یہ شرط تسلیم کرلی اور ابراہیم عادل سے درخواست کی۔

''مناسب ہوگا اگر آپ اپنے کسی امیر کو ہمارے ساتھ کردیں تاکہ اس کی موجودگی میں قلعہ مسمار کیا جائے۔ پھر کسی شک کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔''

بادشاہ نے اس تجویز کو پسند کیا اور شاہ نواز خاں شیرازی کو عادل شاہی امیروں کے ہمراہ روانہ کردیا۔

برہان نظام شاہ نے نواز خاں کا نہایت پرتپاک استقبال کیا۔ چند روز اسے اپنی مہمانی میں رکھا اور پھر اس کی موجودگی میں نیا تعمیر ہونے والا قلعہ مسمار کیا گیا۔

قلعہ مسمار ہونے کے بعد شرط کے مطابق برہان نظام احمد نگر کی طرف چلا گیا۔

اس صلح کے بعد بظاہر یوں لگتا تھا کہ دونوں مملکتوں کے درمیان اب کوئی تنازعہ کھڑا نہیں ہوگا لیکن کچھ ہی دن گزرے تھے کہ برہان نظام نے ایک اور سازش میں خود کو ملوث کرلیا اور ایک مرتبہ پھر حالات وہیں جاکر کھڑے ہوگئے جہاں سے شروع ہوئے تھے۔

ابراہیم عادل شاہ کا بھائی اسمٰعیل جسے بغاوت کے الزام میں ابراہیم عادل نے قلعہ بلگوان میں قید کردیا تھا، کسی نہ کسی طرح آزادی حاصل کرکے بلگوان کے قلعے سے بھاگا اور برہان نظام کے پاس پہنچ گیا اور اس سے اپنے بھائی ابراہیم کے خلاف مدد طلب کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ بیجاپور پر قبضہ کرنے کے بعد نو لاکھ ہون، دو سو ہاتھی اور قلعہ شولاپور برہان شاہ کو دے دے گا۔

یہ سنتے ہی اس کے وہ تمام زخم تازہ ہوگئے جو بیجاپور والوں نے اس کے دل پر لگائے تھے۔ یہ انتقام لینے کا اچھا موقع تھا اور... مدد کرنے کے صلے میں انعام الگ مل رہا تھا۔ اس نے وعدہ کرلیا۔ وہ اپنا لشکر لے کر نکلا۔ اسمٰعیل کو بھی خبر کردی کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ آرہا ہے۔ وہ اس کا قلعہ پرندہ کے قریب انتظار کرے۔

جب وہ قلعہ پرندہ کے قریب پہنچا تو ایک وحشت ناک خبر نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ اسے معلوم ہوا کہ اسمٰعیل کا ٹکراؤ ابراہیم عادل کے کچھ دستوں کے ساتھ ہوا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اسمٰعیل عادل مارا گیا۔ برہان شاہ پریشان و خستہ حال واپس احمد نگر آگیا۔

ابراہیم عادل شاہ کو خبر ہوگئی تھی کہ برہان نظام نے اس کے بھائی اسمٰعیل کو مدد دینے کا وعدہ کیا تھا اور اپنا لشکر لے کر قلعہ پرندہ تک آبھی گیا تھا چنانچہ اس نے سرحدی امیروں کو حکم دے دیا کہ وہ نظام شاہی مملکت میں داخل ہوکر تباہی و بربادی کا بازار گرم کریں۔

برہان نظام کو جب خبر ہوئی تو وہ مزید پریشان ہوا۔ جانتا تھا کہ اس میں اکیلے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر صلح کے لیے ہاتھ بڑھا سکتا تھا لیکن پھر ایک غلط قدم اٹھایا۔ اپنے ایلچی راجا کرناٹک تنکناوری کے پاس بھیجے اور یہ معاہدہ کیا کہ ابراہیم عادل کو گھیر کر مارا جائے۔ ایک طرف تو تنکناوری عادل شاہی علاقے پر حملہ کرے اور وہاں کے قلعے پر قبضہ ہوجائے اور دوسری طرف سے برہان شاہ حملہ آور ہوکر قلعہ شولاپور کو قبضے میں لے لے۔

تنکناوری ابھی ابراہیم عادل کے ہاتھوں شکست کو بھولا نہیں تھا۔ اسے جو یہ سہارا ملا تو وہ فوراً تیار ہوگیا۔

برہان شاہ نے مرتضیٰ انجو کو سپہ سالار مقرر کیا اور اسے دوسرے امیروں کے ساتھ روانہ کیا۔ وہ خود ان دنوں سخت علیل تھا اس لیے ان کے ساتھ نہ جاسکا لیکن یہ وعدہ ضرور کیا کہ وہ صحت یاب ہونے کے بعد براری امراء کے ساتھ اس طرف آئے گا۔

اس معرکے میں بھی نظام شاہی لشکر کو شکست ہوئی۔ برہان شاہ کو جب اس شکست کی اطلاع ہوئی تو وہ سخت آزردہ ہوا۔ بیمار تو پہلے ہی تھا، اب اس منحوس خبر نے اسے اس حد تک کمزور کردیا کہ بستر سے لگ گیا۔ حکیموں نے جواب دے دیا۔ اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے بڑے بیٹے ابراہیم کو ولی عہد مقرر کردیا اور وصیت کردی۔

''برہان نظام کے بعد ابراہیم احمد نگر کا حکمراں ہوگا۔''

اس اعلان کے ساتھ ہی احمد نگر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ برہان نظام کے دو بڑے سالار تھے۔ ایک مرتضیٰ

خاں انجو، دوسرا اخلاص خاں۔ اخلاص خاں کی یہ خواہش تھی کہ اسمٰعیل ولی عہد مقرر ہو لہٰذا جب اسے ابراہیم کی ولی عہدی کی خبر ملی تو اسے بہت افسوس ہوا۔

دونوں سالاروں کے درمیان ٹکراؤ ہوا۔ اخلاص خاں پسپا ہو کر قلعہ پرندہ کی طرف بھاگ گیا۔ اسی دوران برہان شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا ابراہیم تخت نشین ہوا اور میاں منجوی وکیل سلطنت کے عہدے پر فائز ہوا۔

☆☆☆

ابراہیم عادل شاہ نے اپنے ہم نام احمد نگر کے نئے حکمران ابراہیم نظام کے نام تہنیت کا پیغام بھیجا جو اس بات کی علامت تھی کہ اس نے احمد نگر کے نئے حکمران کو تسلیم کر لیا ہے اور اب دونوں مملکتوں کے درمیان کوئی تنازع کھڑا نہیں ہوگا۔ کرناٹک کا راجا ہمیشہ اس تاک میں لگا رہتا تھا کہ کب دونوں مملکتیں نبرد آزما ہوں اور کب اسے بیجاپور پر حملہ کرنے کا موقع ملے۔

کرناٹک کے راجا تنگناوری کو یہ موقع جلد ہی مل بھی گیا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اخلاص خاں ابراہیم نظام کے حق میں نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہے۔ واضح طور پر دو گروہ کام کر رہے ہیں۔ ایک گروہ کا سربراہ اخلاص خاں ہے، دوسرا گروہ میاں منجوی کے زیر اثر کام کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر تنگناوری نے اخلاص خاں سے رابطہ کیا اور اسے ابراہیم عادل سے جنگ کرنے پر اکسایا۔

''مہاراج! احمد نگر کے حالات اتنے بگاڑ دو کہ ابراہیم عادل دخل اندازی کرنے پر مجبور ہو جائے اور ہمیں موقع مل جائے کہ پہل اس نے کی تھی۔ میں تمہارا پورا ساتھ دوں گا۔''

اخلاص خاں چونکہ حبشی تھا اس لیے اس نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ دکنیوں اور حبشیوں میں جنگ کی صورت پیدا ہو گئی۔ حبشی امراء نے اس علاقے کے عادل شاہی ایلچیوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ابراہیم عادل نے بذاتِ خود ان نافرمان اور بدکردار امیروں کا قلع قمع کرنے کا ارادہ کیا اور ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ ہوا۔

احمد نگر میں آپس کے اختلافات نے پھر ایک تنازع کھڑا کر دیا۔ اخلاص خاں کی رائے تھی کہ لشکر جمع کر کے سرحد پر ہی ابراہیم عادل شاہ کے لشکر کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ میاں منجوی کو یہ رائے پسند نہ آئی۔ اس کا کہنا تھا کہ مسلسل انتشار اور افراتفری کی وجہ سے لشکر کی تنظیم و ترتیب ناکارہ ہے لہٰذا اس وقت ہمیں ابراہیم عادل سے صلح کرنی چاہیے۔

اخلاص خاں اپنی رائے پر اڑا ہوا تھا۔ ابراہیم نظام بھی اخلاص خاں کا طرفدار تھا چنانچہ اخلاص خاں نے لشکر تیار کیا اور شاہ درک کے علاقے کی طرف پیش قدمی کی۔

ابراہیم عادل شاہ کوچ کرتا ہوا، بھمن علی نامی مقام پر پہنچا۔ یہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد شاہ درک کی طرف روانہ ہوا۔ ابراہیم عادل کا خیال تھا کہ اگر احمد نگر کے امیروں نے سلامت روی سے کام لیا اور لڑائی نہ کی تو ان کی خطاؤں کو معاف کر کے دوستانہ مراسم ازسرنو پیدا کیے جائیں۔ اسی لیے وہ بہت آہستہ چل رہا تھا۔ روزانہ صرف ایک میل کا فاصلہ طے کرتا تھا۔ اس تاخیر کا یہ مقصد تھا کہ نظام شاہیوں کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع مل جائے۔

اسی طرح سست روی سے فاصلہ طے کرتا ہوا ابراہیم عادل شاہ، شاہ درک کے مقام پر پہنچ گیا۔ اخلاص خاں اور دیگر امراء نے بھی جو ابراہیم نظام شاہ پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے، جنگ کی تیاری کے بعد عادل شاہی سرحد کے قریب پہنچ گئے اور ان راجاؤں کو جو عادل شاہی حکومت کے اطاعت گزار تھے خود مختاری پر اکسایا اور قصبوں دیہاتوں کی بربادی پر اکسایا۔ اب ابراہیم عادل کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنے امیروں سے خطاب کیا۔

''ہم لاکھ نرمی سے کام لیتے ہیں لیکن حبشی اور دکنی غلاموں کی فطرت انہیں راہ راست پر آنے سے روکتی ہے لہٰذا اب یہ ضروری ہے کہ ہم لوگ ان مفسدوں کو راہ راست پر لانے کے لیے تلوار اٹھائیں۔ ان کے علاج کا اب کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔ میں تمام سرداروں اور افسروں کو حکم دیتا ہوں کہ فوراً لشکر تیار کر کے دشمن کے مقابلے پر آ جائیں۔ تم بہرصورت یہ کوشش کرنا کہ جنگ کے بجائے صلح سے مقصد پورا ہو جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھنا کہ اگر دشمن اپنی حد سے آگے بڑھے اور ہمارے علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو اسے پوری جواں مردی سے تباہ کر دینا۔''

اس نصیحت کے پیشِ نظر جب ابراہیم نظام شاہ اپنی سرحد پر پہنچا تو بیجاپور کے سالار حمید خاں نے جارحیت کے بجائے مدافعت کی صورت اختیار کی۔ اس کا ارادہ صرف یہ تھا کہ ابراہیم نظام کو وہیں روک دے جہاں وہ ہے۔ اس موقع پر ابراہیم نظام کے امیر میاں منجوی نے حمید خاں کو پیغام بھجوایا۔

''ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ کم از کم آج کے دن معرکہ آرائی سے باز رہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس دوران

موقع پا کر بادشاہ کو نشیب و فراز سے آگاہ کریں اور اسے واپس احمد نگر لے جائیں۔''

اس کے جواب میں حمید خاں سامنے سے ہٹ گیا اور ایک کوس کے فاصلے پر جا کر مقیم ہو گیا۔

ابراہیم نظام شاہ نے اسے حمید خاں کی بزدلی سمجھا اور جنگ کا آغاز کر دیا۔ حمید خاں یہ سوچے ہوئے تھا کہ ایک دن کی مہلت مانگی گئی ہے۔ اس اچانک حملے نے اسے بوکھلا دیا۔ اس نے مقابلہ کیا لیکن وقتی طور پر اسے پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ پھر ایک قدرتی عمل تھا جس نے عادل شاہیوں کو فتح سے ہمکنار کر دیا۔

میدانِ جنگ میں بہت آتش بازی کی گئی تھی اس لیے دھوئیں کی وجہ سے زمین و آسمان تاریک ہو گئے تھے۔ ہوا کا رخ عادل شاہی فوج کی طرف تھا۔ شاہی میسرہ اس دھوئیں میں بری طرح گھر گیا۔ سپاہیوں کا اپنی جگہ ٹھہرنا مشکل ہو گیا لہٰذا وہ بھاگنے لگے۔ یہ دیکھ کر احمد نگر والوں نے بیجاپور والوں پر شدت سے حملہ کر دیا۔ ایک تو دھواں دوسرے یہ حملہ۔ عادل شاہی لشکر بالکل مغلوب ہو گیا اور میدانِ جنگ سے بھاگنے لگا۔ ابراہیم نظام شاہ جو اپنے تحفظ کی خاطر اپنی فوج کے پیچھے چھپا ہوا تھا، جب عادل شاہی لشکر کو منتشر دیکھا تو سامنے آ گیا اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ چند عادل شاہی امراء ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ابھی تک لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا اور کسی موقع کے انتظار میں تھے۔ ان کی نظر جب ابراہیم نظام شاہ پر پڑی تو آگے بڑھے۔ ابراہیم نظام کے ساتھیوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

''ہم لوگ تعداد میں پانچ سو سے زیادہ نہیں، ان امراء کے ساتھ ایک ہزار ہیں اور سب تازہ دم ہیں، بہتر ہے کہ ہم لوگ اس وقت ان سے جنگ نہ کریں۔''

ابراہیم نظام فتح کے نشے میں چور تھا۔ اس نے ساتھیوں کی بات نہ مانی۔ تلوار نیام سے نکالی اور حملہ آور ہو گیا۔ اسی وقت ایک تیر مخالف سمت سے چلا اور ابراہیم نظام کو آ کر لگا۔ وہ اس کی تاب نہ لا سکا اور وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔

جو دکنی اور حبشی امراء غارت گری میں مصروف تھے، انہوں نے جو اپنے بادشاہ کے قتل کی خبر سنی تو وہ بھی جیتی ہوئی بازی چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ گئے۔

اس فتح عظیم کی خبر جونہی بیجاپور پہنچی، ابراہیم عادل شاہ کو بے حد خوشی ہوئی لیکن ابراہیم نظام شاہ کی موت کا افسوس بھی ہوا۔ اس نے اسی وقت اپنی فوج کے سرداروں کے نام

بھاری بوجھ

ایک صاحب کو مذاق کرنے کی عادت تھی۔ ایک دن انہوں نے اپنے دوست کو خط لکھا کہ میں خیریت سے ہوں فکر مت کرنا۔ چند دن بعد ان صاحب کو ایک پارسل ملا جسے چھڑانے کے لیے کافی پیسے ادا کرنے پڑے۔ یہ پارسل اسی دوست نے بھیجا تھا۔ کھولنے پر پارسل سے ایک بھاری پتھر برآمد ہوا جس کے ساتھ ایک پرچی تھی۔ پرچی پر لکھا تھا۔ ''تمہارے تندرست ہونے کی اطلاع سن کر میرے ذہن سے فکر کا اتنا بھاری بوجھ اتر گیا۔''

گدھا

ایک صاحب کتے کو زنجیر سے باندھ کر لے جا رہے تھے کہ ایک راہ گیر نے سوال کیا۔ ''کیوں صاحب! اس گدھے کو کہاں لے جا رہے ہیں؟''

انہوں نے کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ گدھا نظر آتا ہے؟''

راہ گیر نے کہا۔ ''معاف کیجیے، میں یہ سوال کتے سے کر رہا تھا۔''

یہ حکم جاری کیا کہ وہ اس بات کا پورا پورا خیال رکھیں کہ نظام شاہی ملک تباہ و برباد نہ ہو اور نہ ہی یہاں کی رعایا کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے۔ تمام اراکینِ دولت اور سردارانِ لشکر اس علاقے سے بیجاپور کی طرف چلے جائیں کیونکہ اب یہاں عادل شاہی لشکر کا قیام حریف کے لیے باعثِ پریشانی ہوگا۔

تمام اراکین سلطنت اور امرائے عادل شاہی شاہ درک میں ابراہیم کے گرد جمع ہوئے۔ بادشاہ نے ہر ایک کو انعام و اکرام سے نوازا۔ اس کے بعد وہ بیجاپور واپس آ گیا۔

☆☆☆

ابراہیم نظام شاہ کے قتل ہوتے ہی میاں منجوی اپنے لشکر سے نکلا اور اپنے مخلص ساتھیوں کے ساتھ نہایت برق رفتاری سے احمد نگر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے مقتول بادشاہ ابراہیم نظام کے شیر خوار بیٹے کو جیر کے قلعے جونہ میں نظر بند کرا دیا اور احمد نامی ایک لڑکے کو جس کا تعلق نظام شاہی خاندان سے بتایا جاتا تھا تخت پر بٹھا دیا۔ قلعے اور خزانے پر قبضہ کر لیا اور تمام معاملات اپنی گرفت میں کر لیے۔

چاند بی بی بیجاپور میں چیختی رہ گئی کہ تخت کا حق دار ابراہیم کا بیٹا بہادر شاہ تھا، اس کی حق تلفی ہوئی ہے۔

☆☆☆

ابھی بیجاپوری لشکر بیجاپور روانگی کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ مخبروں کی اطلاع آ گئی۔ بیجاپور اور احمد نگر کے تنازع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کرناٹک کے راجا تنکناوری نے بیجاپور کے سرحدی قلعے بنکاپور پر قبضہ کرلیا ہے۔ یہ وہ قلعہ تھا جس کے تحفظ کے لیے سہیل خاں اور رومی خاں گئے تھے۔ احمد نگر کے حالات کو دیکھتے ہوئے ابراہیم عادل نے انہیں حمید خاں کی مدد کے لیے بلالیا تھا۔ سہیل خاں کی غیر موجودگی نے تنکناوری کو یہ موقع دے دیا کہ وہ قلعے پر قابض ہو گیا۔

سہیل خاں نے اپنا قاصد بیجاپور کی طرف دوڑایا۔ اسے یہ خبریں ابراہیم عادل تک پہنچا کر کرناٹک کے راجا پر حملہ آور ہونے کی اجازت حاصل کرنی تھی۔

اجازت آنے تک انہوں نے اپنا لشکر ترتیب دیا اور اجازت آتے ہی وہ اپنے قلعے کو واگزار کرانے کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

بہت کم ایسا ہوتا تھا مگر آج ایسا ہوا تھا کہ چاند بی بی نے ابراہیم عادل شاہ کو شاہی حرم سرا میں ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ ابراہیم یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ چاند بی بی اس سے کیا بات کرنا چاہتی ہے۔ طرح طرح کے اندیشے اس کے دل میں پیدا ہو رہے تھے لیکن وہ یہ بھی نہیں کرسکتا تھا کہ نہ جائے۔ وہ پالکی میں سوار ہوا اور ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔

ابراہیم نے پہلی نظر میں یہ دیکھا کہ چاند بی بی سخت فکرمند دکھائی دے رہی ہے۔ چاند بی بی نے اس کے پہنچتے ہی تمام ملازماؤں کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کوئی ایسی بات کرنا چاہتی ہے جس کے لیے تخلیہ ضروری ہے۔ گفتگو میں پہل خود ابراہیم نے کی۔

''میں آپ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ یہ مملکت میری نہیں آپ کی ہے۔ اگر میری جانب سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو سرزنش کیجیے۔''

''آپ نے غلط سمجھا۔ اپنی فکرمندی کا باعث میں خود ہوں یا احمد نگر کے حالات۔ میں نے احمد نگر کے حالات دیکھتے ہوئے بھی آپ کی بہن کی شادی اپنے بھتیجے سے کرادی اور وہ بیوہ ہو گئی۔ اب حال یہ ہے کہ احمد نگر کے تخت پر اسے بٹھا دیا گیا ہے جو قطعی حکمرانی کا حق دار نہیں۔ ابراہیم نظام کا بیٹا بہادر شاہ جنیر کے قلعے میں نظر بند ہے۔ یہ صورت حال میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ میں احمد نگر کے حالات سنوارنے کے لیے احمد نگر جانے کا ارادہ کر چکی ہوں۔''

''میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ یہ قدم نہ اٹھائیں۔ وہاں امراء کے دو گروہ کام کر رہے ہیں۔ آپ یقیناً ایک گروہ کی حمایت فرمائیں گی۔ دوسرا گروہ آپ کا دشمن ہو جائے گا۔ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ احمد شاہ کو تخت پر بٹھانے کا ذمے دار میاں منجو ہے جو نہایت طاقتور امیر ہے۔ اس سے آپ نہیں لڑسکیں گی۔ اب آپ کا میکا بھی بیجاپور ہے اور سسرال بھی یہی ہے۔''

''احمد نگر میرے باپ کی مملکت ہے، اسے میں امراء کے ہاتھوں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے تو آپ کو صرف یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ میں آج ہی احمد نگر کا رخ کر رہی ہوں۔''

''سہیل خاں سپہ سالار چند مہمات کے سلسلے میں بیجاپور سے باہر ہے۔ لشکر بھی اس کے ساتھ ہے۔ اسے آنے دیجیے پھر احمد نگر کو بھی دیکھ لیا جائے گا۔''

''مجھے لشکر کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف اس لیے احمد نگر جا رہی ہوں کہ میری موجودگی امراء کو من مانی کرنے سے روکے گی۔ ہاں، اگر کبھی ضرورت پڑی تو میں آپ کو اپنی مدد کے لیے بلاسکتی ہوں۔ اس وقت تو فوج کے چند دستے مجھے احمد نگر تک لے جانے کے لیے کافی ہوں گے۔''

ابراہیم عادل نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ احمد نگر روانہ ہو گئی۔

وہ جب وہاں پہنچی تو حالات نہایت ابتر دیکھے۔ احمد نگر کی پوری طاقت دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک حصے کی کمانداری میاں منجو کر رہا تھا، دوسرے حصے کا سربراہ اخلاص خاں تھا اور دونوں میں سخت کشمکش جاری تھی۔ میاں منجو نئے حکمران احمد شاہ کے حق میں تھا اور اخلاص خاں، ابراہیم نظام کے شیر خوار لڑکے بہادر شاہ کے حق میں تھا۔ چاند بی بی بھی یہی دعویٰ لے کر احمد نگر آئی تھی۔

میاں منجو کی طاقت کو دیکھتے ہوئے اخلاص خاں نے بھی احمد شاہ کو بادشاہ تسلیم کرلیا تھا۔ چاند بی بی کے آتے ہی یہ تحقیق شروع ہو گئی کہ احمد شاہ کا تعلق نظام شاہی خاندان سے ہے بھی یا نہیں۔ تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ یہ شخص خاندان نظام شاہی کا فرد نہیں۔

اس تحقیق کے بعد بھی میاں منجو کا اصرار ہوا کہ یہی احمد شاہ تاج و تخت کا مالک رہے گا جبکہ اخلاص خاں اور دوسرے امراء کو یہ ندامت ہوئی کہ انہوں نے احمد شاہ کو اپنا بادشاہ کیوں تسلیم کرلیا۔ انہوں نے چاہا کہ اسے معزول

کر کے بہادر شاہ بن ابراہیم نظام کو تخت نشین کر دیا جائے۔

اخلاص خاں اور دوسرے امراء نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ اب جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میاں منجوی کو شکست دے کر ہی احمد شاہ کو معزول کیا جاسکتا ہے۔

اخلاص خاں نے اپنے گروہ کو جمع کیا اور میاں منجوی کے سامنے آگیا۔ میاں منجوی نے احمد شاہ کو برج کے اوپر بٹھایا اور چتر شاہی اس کے سر پر سایہ فگن کر دیا۔ اس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ احمد نگر کا بادشاہ اب احمد شاہ ہی ہوگا۔ جس کے سر پر تاج رکھ دیا ہے، اسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ساتھ ہی اپنے ایک سالار میاں حسن کو سات سو سواروں کے ساتھ اخلاص خاں کے مقابلے پر بھیجا۔ میاں حسن اس مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور قلعے میں واپس آگیا۔ اخلاص خاں کے آدمیوں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

اپنی قوت میں مزید اضافہ کرنے کے لیے اپنے ایک معتبر آدمی کو دولت آباد کے حاکم کے پاس بھیجا اور اسے حکم دیا کہ آہنگ خاں اور حبشی خاں کو احمد نگر بھیج دے۔ یہ دونوں سالار برہان شاہ کے زمانے سے دولت آباد کے قلعے میں قید تھے۔ دولت آباد کے حاکم نے ان دونوں سالاروں کو واپس بھیج دیا۔ اس دوران اخلاص خاں نے اپنے آدمی اس قلعے کی طرف بھیجے جہاں بہادر شاہ قید تھا کہ اسے رہا کرالے اور تخت نشین کرادے لیکن وہاں کا قلعہ دار میاں منجوی کا طرفدار تھا۔ اس نے بہادر شاہ کو رہا کرنے سے انکار کر دیا۔

اس طرف سے انکار ہونے پر حبشی امیروں نے ایک اور چال چلی اور ایک مجہول النسب لڑکے کو شاہی خاندان کا فرد قرار دے کر اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا اور ملک میں اس کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا۔

یہ صورتِ حال میاں منجوی کے لیے پریشان کن تھی۔ اس نے اخلاص خاں پر قابو پانے کے لیے عجیب وغریب فیصلہ کر ڈالا۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ احمد نگر کے کسی حکمراں پر وقت پڑتا تھا تو وہ اردگرد کے کسی حکمراں سے مدد طلب کرتا تھا یا ابراہیم عادل شاہ کو پکارتا تھا مگر میاں منجوی نے اکبر بادشاہ کے بیٹے شہزادہ مراد کے نام خط لکھا اور اسے احمد نگر آنے کی دعوت دی۔ شہزادہ مراد کی نیت مدد کرنے کی نہیں تھی بلکہ وہ دکن فتح کرنے کے خیال سے چل پڑا۔

ابھی شہزادہ مراد احمد نگر پہنچا نہیں تھا کہ احمد نگر میں حالات نے کروٹ بدلی اور معاملات میاں منجوی کے حق میں چلے گئے۔ اخلاص خاں کے گروہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ اخلاص خاں کے کچھ ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ کر میاں منجوی سے جا ملے۔ اس غیبی امداد سے میاں منجوی بے حد خوش ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ بڑی تعداد میں جنگجو اور لشکری اخلاص خاں کا ساتھ چھوڑ کر اس کے ساتھ آملے ہیں اور ایک بڑا لشکر اس کے پاس جمع ہوگیا ہے تو وہ اس لشکر کو لے کر قلعے سے باہر نکلا اور اخلاص خاں سے ٹکرا گیا۔ اس کی طاقت اب اتنی ہوگئی تھی کہ ایک معمولی سے ٹکراؤ کے بعد ہی اس نے اخلاص خاں کو شکست دے دی اور اس نے جس شخص کو بادشاہ بنایا تھا، اسے گرفتار کر لیا۔ اب اس نے مخالف گروہ پر پوری طرح قابو پالیا تھا۔ اسے اس کے مقصد میں کامیابی مل چکی تھی۔ اب شہزادہ مراد کو اپنے سر پر مسلط کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی لیکن خط لکھا جا چکا تھا۔ مخبروں نے جب یہ اطلاع دی کہ شہزادہ تیس ہزار کے لشکر کے ساتھ احمد نگر کے قریب پہنچ چکا ہے تو اس کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ خود اس گڑھے میں گر چکا تھا جو اس نے دوسروں کے لیے کھودا تھا۔ اس نے اس گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں اپنے سالاروں سے مشورہ کیا۔ وہ اپنے ہی ملک پر دوسروں کو حملے کی دعوت دے چکا تھا۔ اب اس کا علاج ڈھونڈ رہا تھا۔ سالاروں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ قلعے کی حفاظت اپنے کسی سالار کے سپرد کرے اور خود لشکر کی فراہمی کے لیے ابراہیم عادل اور قطب شاہ سے مدد کا طالب ہو۔ میاں منجوی نے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے ایک سالار انصار خاں کو قلعے کا محافظ مقرر کیا اور بادشاہ احمد شاہ کو ساتھ لے کر قلعے سے نکل گیا۔ چاند بی بی اس وقت قلعے ہی میں تھی۔ اس نے چاند بی بی سے بھی گفتگو کی لیکن وہ اس کا ساتھ دینے پر تیار نہ ہوئی۔ اس نے اسے قلعے ہی میں چھوڑا اور خود تیزی سے سفر کرتا ہوا بیجاپور کی سرحد پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں سے اس نے کچھ قاصد ابراہیم عادل کی طرف روانہ کیے اور احمد نگر کی مدد کرنے کی التجا کی اور کچھ قاصد قطب شاہی سلطنت کی طرف روانہ کیے۔

☆☆☆

چاند بی بی قلعے کی محافظ بن کر بیٹھی ہوئی تھی لیکن جانتی تھی کہ اصل محافظ تو انصار خاں ہے جسے میاں منجوی قلعہ سپرد کر کے گیا ہے۔ اگر دشمن حملہ آور ہوگیا تو انصار خاں اس کی ایک نہیں سنے گا اور قلعہ دشمن کے سپرد کر دے گا۔ وہ میاں منجوی کا آدمی ہے لہٰذا کسی وقت بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ میاں منجوی تو اپنی جان بچا کر نکل گیا ہے۔ اسے یہ دکھ نہ ہوگا کہ احمد نگر کسی اور کے قبضے میں چلا گیا لیکن مجھے تو ہوگا کیونکہ یہ میرے باپ کی مملکت ہے۔ میں انصار خاں کی موجودگی

میں اس مملکت کو بچانے کے لیے آزاد نہیں ہوں۔ حکم میرا نہیں انصار خاں کا چلے گا۔ قلعے کے دروازے میرے حکم سے نہیں انصار خاں کے حکم سے کھلیں گے۔ جب تک انصار خاں زندہ ہے وہ اپنی مرضی کے فیصلے نہیں کر سکتی۔ تو کیا انصار خاں کو راستے سے ہٹا دیا جائے؟ یہ خیال آتے ہی وہ کسی ایسے آدمی کے بارے میں سوچنے لگی جو نہایت رازداری سے انصار خاں کو ٹھکانے لگا دے۔ بہت سوچنے کے بعد اس کے ذہن میں محمد خاں کا نام گونجا۔ یہ شخص مرتضیٰ نظام شاہ کے دایہ زاد محب اللہ کا بیٹا تھا۔ چاند بی بی نے محمد خاں سے رابطہ کیا اور اسے طلب کر لیا۔

محمد خاں کا خاندان شروع ہی سے احمد نگر کے شاہی خاندان کا تابع اور فرماں بردار چلا آ رہا تھا۔ وہ فوراً خدمت میں حاضر ہو گیا۔

''محمد خاں! تمہارے خاندان سے جو ہمارے روابط ہیں انہی کے پیشِ نظر میں نے تمہیں بلایا ہے۔ کیا تم احمد نگر کی بھلائی کے لیے میرا ایک کام کر سکتے ہو؟''

''میری بہن! روابط کا اظہار بھی کرتی ہو، مجھ پر بھروسا بھی کرتی ہو اور کام کے لیے میری اجازت بھی طلب کرتی ہو۔ آپ تو مجھے یہ حکم دیں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور بس...... میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میری جان بھی احمد نگر اور آپ پر قربان ہے۔''

''مجھے یہی امید تھی لیکن کام بتانے سے پہلے کچھ باتیں بتانا ضروری ہیں۔''

''فرمایئے۔''

''تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ میاں منجوی انصار خاں کو قلعے کا محافظ بنا کر خود قلعے سے چلا گیا ہے۔ اب اگر شہزادہ مراد حملہ آور ہوتا ہے تو یہ شخص قطعی مدافعت نہیں کرے گا اور نہ ہی میاں منجوی کے سوا کسی کا حکم مانے گا۔ قلعہ فتح ہو گیا تو الزام مجھ پر آئے گا لہٰذا میں چاہتی ہوں......''

''انصار خاں کو قتل کر دیا جائے۔'' محمد خاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میرا منشا یہی تھا اور یہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔''

''میں حاضر ہوں۔''

''ہاں، ایک بات اور...... یہ بات کسی کو نہیں معلوم۔ صرف تمہارے سامنے انکشاف کر رہی ہوں۔ میں نے کچھ لوگوں کو قاصد بنا کر بیجاپور بھیجا ہے۔ وہ ابراہیم عادل شاہ سے استدعا کریں گے کہ وہ احمد نگر والوں کی مدد کرے اور مغلوں سے ان کی جان چھڑائے۔ میں چاہتی ہوں اس مدد کے آنے سے قبل انصار خاں اس دنیا میں نہ رہے تاکہ قلعہ پوری طرح میرے ہاتھ میں ہو۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ آج کا دن شام میں تبدیل نہیں ہوگا کہ انصار خاں کے قتل کی خبر آپ کو مل جائے گی۔'' محمد خاں نے اجازت مانگی اور چاند بی بی سے رخصت ہو گیا۔

محمد خاں نے سوچنے کا وقت بھی نہیں لیا۔ چاند بی بی کے پاس سے اٹھ کر سیدھا قلعہ دار انصار خاں کی طرف گیا اور موقع پاتے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہ خبر جونہی چاند بی بی تک پہنچی، اس نے مقتول ابراہیم نظام شاہ کے بیٹے بہادر شاہ کے نام کا غائبانہ خطبہ پڑھوا دیا۔

یہ خطبہ پڑھا ضرور گیا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ دشمن نے دروازہ کھٹکھٹایا اور احمد نگر میں داخل ہو گیا۔

یہ حالات میاں منجوی تک بھی پہنچ رہے تھے اور اخلاص خاں تک بھی جو اس وقت دولت آباد میں مقیم تھا۔ میاں منجوی تو لشکر جمع کرنے میں مشغول تھا لیکن اخلاص خاں نے جواں مردی کا ثبوت دیا اور دولت آباد سے دس ہزار سواروں کا لشکر لے کر احمد نگر روانہ ہوا۔ شہزادہ مراد نے چھ ہزار تجربہ کار سواروں کو اس کے مقابلے پر روانہ کیا۔

گنگا کے کنارے دونوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں دکنیوں کو شکست ہوئی اور مغل کامیاب ہوئے۔

اس شکست کو دیکھتے ہوئے چاند بی بی نے آہنگ خاں کو پیغام بھیجا کہ جلد از جلد سواروں کا لشکر لے کر قلعے کی حفاظت کے لیے پہنچے۔

وہ اس وقت میاں منجوی کو بھی پیغام بھیج سکتی تھی لیکن وہ اس سے ناراض تھی۔ میاں منجوی کی حالت یہ تھی کہ عادل شاہی سرحد کے قریب لشکر جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی بہرحال آہنگ خاں نے چاند بی بی کی پکار سنی اور احمد نگر کی طرف روانہ ہوا (وہ اس وقت سرحد کے قریب کہیں پڑاؤ کیے ہوئے تھا) مغل لشکر قلعے کو محصور کیے ہوئے تھا۔ آہنگ خاں قلعے میں پہنچتا کیسے؟ اس نے احمد نگر کے قریب پہنچ کر مخبروں کو شہر میں بھیجا کہ ایسی جگہ تلاش کر کے آئیں جہاں مغل سپاہی نہ ہوں۔

مخبر نے آ کر خبر دی۔

''حصار کی مشرقی جانب دشمن کے خیمے موجود نہیں اور دشمن حصار کی اس جانب سے بالکل غافل ہے۔'' یہ سن کر آہنگ خاں بہت خوش ہوا اور جہاں ٹھہرا ہوا تھا وہاں سے کوچ کر کے قلعے کی طرف بڑھا۔

آہنگ خاں کی بدقسمتی کہ اس کے مخبر کے روانہ ہوتے

ہی شہزادہ مراد جائزہ لینے کے لیے نکلا۔ اس نے جب دیکھا کہ مشرقی حصہ بالکل خالی ہے تو اس نے نئے احکامات جاری کر دیے۔ صلاح مشورے کے بعد وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین لشکر متعین کر دیے۔ خان خاناں کے ماتحت دو سو سوار کیے گئے۔ ذرا فاصلے پر دولت خاں کو چار سو سواروں کے ساتھ رکھا گیا اور اس سے ذرا فاصلے پر دولت خاں کے بیٹے کو چار سو سواروں کے ساتھ بٹھا دیا۔ مشرقی سمت جواب تک خالی تھی، وہاں بارہ سو لشکری متعین ہو گئے۔

آہنگ خاں اس صورتِ حال سے قطعی بے خبر تھا لہٰذا لشکر کو ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا اور صرف تین ہزار لشکریوں کے ساتھ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے اسے شہر پناہ میں داخل ہونا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی صورتِ حال اس کے سامنے آ گئی۔ اب حملہ آور ہونے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ حملہ کرتے وقت وہ اس لیے بھی مطمئن تھا کہ یہاں صرف دو سو سوار اسے نظر آئے۔ یہ دراصل وہ مقام تھا جہاں خان خاناں متعین تھا۔ خان خاناں آہنگ خاں کے تین ہزار کے لشکر کو دیکھ کر عبادت خانے کی چھت پر چڑھ گیا اور حریف پر تیر پھینکنے لگا۔

آہنگ خاں اس صورتِ حال سے بھی بے خبر تھا جو اب سامنے آئی۔ دولت خاں جو قریب ہی متعین تھا، وہ بھی اپنے چار سو لشکریوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دولت خاں کا بیٹا پیر خاں بھی حرکت میں آیا اور چھ سو کا لشکر لے آیا۔ آہنگ خاں کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔

اب چاند بی بی کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ اس نے جسے اپنی مدد کے لیے بلایا تھا، وہ شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ چاند بی بی نے اپنے میکے کو آواز دی۔ ابراہیم عادل پہلے ہی وعدہ کر چکا تھا کہ جب بھی اسے آواز دی جائے گی وہ لبیک کہے گا۔ اس نے اسی وقت اپنے سالار سہیل خاں کو طلب کیا۔

"میں احمد نگر کے حالات پر نظر رکھے ہوئے تھا اور اسی امید میں تھا کہ حالات پلٹا کھائیں گے۔ کوئی نہ کوئی صورت چاند بی بی کے حق میں نکل آئے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ آج پھر کچھ قاصد آئے ہیں اور چاند بی بی نے ہم سے مدد طلب کی ہے۔ میں اس مہم پر تمہیں بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"میں آپ کے فیصلے سے متفق ہوں۔"

"تو پھر آنے والی شب کو تم ایک لشکر لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔"

ابراہیم عادل شاہ نے پچیس ہزار کا لشکر اس کے سپرد کیا اور وہ شاہ درک کی طرف روانہ ہو گیا۔ میاں منجوی تو اسی انتظار میں تھا اور سرحد پر ہی بیٹھا تھا، وہ بھی سہیل خاں کے ساتھ آ کر مل گیا۔

محمد قلی قطب شاہ کی طرف سے مہدی قلی ترکمان بھی تلنگانہ کے پانچ چھ ہزار سپاہی لے کر آ گیا اور سہیل خاں کے لشکر کے قریب ہی خیمہ زن ہو گیا۔

مغلوں کو بھی یہ اطلاع مل گئی کہ دکنی لشکر متحد ہو گئے ہیں۔ شہزادے نے اپنے امیروں سے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں مشورہ کیا۔ بہت بحث و مباحث کے بعد یہ طے پایا کہ جب تک دکنی لشکر یہاں پہنچے، ہمیں یہیں قیام کر کے حصار کی دیوار کو مسمار کرنے کی کوشش کرنی..... چاہیے۔ شہزادے کو یہ رائے پسند آئی اور اس نے نقب لگانے کا حکم دے دیا۔ اہلِ قلعہ کو اس ارادے سے بے خبر رکھنے کے لیے آنے جانے کا راستہ بند کر دیا گیا اور نقب لگانے کا کام پوری مستعدی سے شروع کر دیا گیا۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو ان نقبوں میں بارود رکھ کر پتھر اور چونے سے انہیں مضبوط کر دیا گیا۔ دوسرے دن ان نقبوں میں آگ لگائی جانی تھی کہ پھر ایک معجزہ ہو گیا۔ خواجہ محمد خاں شیرازی جو مغلوں کے لشکر میں تھا، اس کو اہلِ قلعہ کی حالت پر بہت ترس آیا۔ وہ رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اہلِ قلعہ کے پاس گیا اور انہیں تمام حالات سے باخبر کر دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ کس کس مقام پر نقبیں لگائی گئی ہیں۔ چاند بی بی کے حکم سے اہلِ قلعہ زمین کھودنے اور شیرازی کے بتائے ہوئے حصۂ دیوار میں شگاف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ دن نکلنے تک دو نقبوں کا سراغ لگایا جا سکا۔

شہزادہ مراد نے قلعے کے گرد مسلح فوج متعین کر دی۔ مغلوں کا ارادہ تھا کہ جونہی دیوار میں شگاف پیدا ہو، وہ قلعے کے اندر داخل ہو جائیں۔

اہلِ قلعہ سب سے بڑی نقب کو کھود کر اس کا بارود نکال رہے تھے۔ اسی دوران مغلوں نے اس نقب کو آگ لگا دی۔ قلعے کی دیوار پچاس گز تک ٹکڑے ہو کر ٹوٹ گئی۔ جو لوگ نقب کے قریب کام کر رہے تھے، ان کے پرخچے اڑ گئے۔ چاروں طرف کہرام بپا ہو گیا۔ بڑے بڑے امیر اس افتاد سے گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

چاند بی بی نے اطلاع ملتے ہی بہادری کا ثبوت دیا۔ پردے کو بالائے طاق رکھا اور مسلح ہو کر باہر نکل آئی اور وہاں پہنچی جہاں دیوار میں شگاف ہوا تھا۔ وہ امیر جو بھاگ کھڑے

ہوئے تھے، وہ اس کی جرأت دیکھ کر وہاں پہنچ گئے۔
مغل فوج اس انتظار میں تھی کہ دوسری نقبوں کو بھی آگ لگے تو وہ حملہ کریں جبکہ دوسری نقبوں کا بارود پہلے ہی نکال لیا گیا تھا۔
بس یہ وقفہ بہت تھا۔ اہلِ قلعہ نے موقع پاکر توپوں، بندوقوں اور دوسرے آلات سے اس شگاف کو مستحکم کر دیا۔
مغلوں نے جب دیکھا کہ دوسری نقبوں کو آگ نہیں لگ رہی ہے تو انہوں نے اس شگاف پر حملہ کر دیا جو پہلی نقب کے پھٹنے سے پیدا ہوا تھا۔ اہل قلعہ نے مغل لشکر پر آتشیں گولوں کی بارش کر دی۔ یہ سلسلہ شام تک جاری رہا۔ مغل لشکر کھلے میدان میں تھا اس لیے اس کا بے انتہا نقصان ہوا۔ لاشوں کے انبار لگ گئے۔ اس قدر نقصان کے بعد شہزادہ مراد کو پیچھے ہٹنا پڑا۔
جنگ تھمی تو اہلِ قلعہ کو موقع مل گیا۔ مستعد معماروں نے رات بھر میں گرنے والی دیوار کو پھر سے برابر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنا ایک قاصد سہیل خاں کی طرف روانہ کیا۔
''احمد نگر کی حالت بہت بری ہو رہی ہے۔ فی الفور احمد نگر والوں کی مدد کو پہنچو۔''
یہ قاصد روانہ ہوا ہی تھا کہ مغلوں کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ اسے پکڑ کر خان خاناں کے پاس لے گئے۔
''کیا لے کر جا رہے تھے اور کہاں جا رہے تھے؟''
''چاند بی بی کا خط ہے جو انہوں نے سہیل خاں کے نام لکھا تھا۔''
''یقیناً یہ لکھا ہوگا کہ ہماری مدد کو پہنچو۔''
''شاید یہی لکھا ہو۔ میں نے خط پڑھا نہیں۔''
''ہمیں دکھاؤ۔''
قاصد نے وہ خط خان خاناں کے سامنے رکھ دیا۔ اس خط کے مضمون سے واقف ہونے کے بعد خان خاناں نے بھی ایک خط تحریر کیا۔
''ہم کب سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ جلد آؤ تاکہ یہ قصہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو۔'' یہ خط بھی قاصد کے حوالے کر دیا گیا۔
سہیل خاں کو جس وقت یہ خطوط ملے، اسی وقت وہ اپنی قیام گاہ سے نکل کھڑا ہوا۔
مغلوں کے لشکر میں قحط کے آثار پیدا ہو چکے تھے لہٰذا جب انہوں نے سہیل خاں کی آمد کی خبر سنی تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس وقت یہی بہتر ہے کہ چاند بی بی سے اس شرط پر صلح کر لی جائے کہ برار کا علاقہ مغلوں کو دے دیا جائے۔

اس شرط پر صلح کی بات چیت آگے بڑھی۔ پہلے تو چاند بی بی نے انکار کر دیا لیکن بالآخر یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ موجودہ حالات میں جنگ کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اس شرط پر صلح کر لی گئی۔
شہزادہ مراد اپنے لشکر کو لے کر دولت آباد کے راستے سے برار کی طرف روانہ ہو گیا۔
دو تین روز بعد سہیل خاں، احمد نگر پہنچ گیا۔ یہاں منجوی بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے حسب سابق احمد شاہ کو احمد نگر کے تخت پر بٹھانے کا ارادہ کیا۔ آہنگ خاں نے احمد شاہ کو قلعے سے باہر نکال دیا۔ میاں منجوی کو بھی قلعے میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔
اس موقع پر ممکن ہے کوئی فتنہ کھڑا ہوتا کہ ناگاہ ابراہیم عادل نے اپنے مشہور امیر مرتضیٰ خاں دکنی کو چار ہزار سواروں کے ساتھ احمد نگر بھیجا اور میاں منجوی کو پیغام دیا۔
''اس فتنہ انگیز زمانے میں جنگ وجدال کا ارادہ کرنا ملک کی تباہی کا راستہ ہے۔ تم جلد از جلد سہیل خاں کے ہمراہ بیجاپور پہنچو تاکہ باہمی غور وفکر کے بعد کوئی قدم اٹھایا جائے۔''
میاں منجوی نے حکم کی تعمیل کی اور بیجاپور پہنچ گیا۔ ابراہیم عادل کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ احمد شاہ نظام شاہی نسل سے نہیں ہے۔ اس نے احمد شاہ کو اپنے امراء کے گروہ میں داخل کر لیا۔ میاں منجوی کو بھی امراء کی صف میں شامل کر لیا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ یہ دونوں احمد نگر سے دور رہیں اور چاند بی بی کے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو۔
چاند بی بی نے بہادر شاہ کے نام کا خطبہ وسکہ جاری کیا اور اس کی کم سنی کی وجہ سے اس کے دایہ زاد محمد خاں کو پیشوائی کے منصب پر فائز کیا۔
احمد نگر کی بدقسمتی نے پھر ایک راستہ ڈھونڈ لیا۔ محمد خاں نے کچھ عرصے بعد ہی پر پرزے نکالے۔ اپنے رشتے داروں اور بہی خواہوں کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کر کے انہیں قوی بنایا۔ ان کے بل بوتے پر خود بھی خود مختارانہ انداز میں کام کرنے لگا۔ ہر وہ کام کرنے لگا جس سے چاند بی بی کے اقتدار میں کمی واقع ہو۔ آہنگ خاں اور شمشیر خاں جیسے نامی گرامی امراء کو نظر بند کر دیا۔ دوسرے امراء نے جب یہ حال دیکھا تو وہ اپنے بچاؤ کی خاطر ادھر ادھر بھاگ گئے۔
چاند بی بی نے ایک مرتبہ پھر اپنی سسرال کو آواز دی اور عادل شاہ کو پیغام بھیجا۔
''اس پر آشوب زمانے میں جبکہ ایک طاقتور دشمن ہماری تباہی و بربادی کے لیے مستعد ہے، ہمارے ملک کے

امراء ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دے رہے ہیں اور ہر لمحہ ایک نیا ہنگامہ بپا کررہے ہیں۔ اگر آپ نے اس طرف توجہ نہ دی تو ملک کا باقی حصہ بھی مغلوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔''

ابراہیم عادل شاہ نے دوسری بار چاند بی بی کی مدد کا وعدہ کیا اور اپنے سپہ سالار سہیل خاں کو حکم دیا کہ احمد نگر جائے اور چاند بی بی کی خواہش کے مطابق عمل کرے۔

سہیل خاں نے اڑان بھری اور ایک لشکر لے کر احمد نگر پہنچ گیا۔ محمد خاں اس کے حملے کی تاب کیسے لاسکتا تھا۔ وہ بھاگ کر قلعے میں پناہ گزیں ہوگیا۔ چاند بی بی قلعے سے باہر آگئی تھی۔ سہیل خاں نے اس سے مشورے کے بعد قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

دن پر دن گزرتے جارہے تھے۔ محاصرے کی طوالت اور شدت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ قلعے کے اندر ضروریاتِ زندگی کا سامان بھی ختم ہوتا جارہا تھا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے محمد خاں نے اسی غلطی کو دہرایا جو اس سے پہلے میاں منجو سے سرزد ہوئی تھی۔ اس نے اکبری امیر خان خاناں سے مدد طلب کی۔

یہ وہی محمد خاں تھا جس کے ذریعے چاند بی بی نے قلعہ دار انصار خاں کو قتل کرایا تھا اور اب بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ اسی وفاداری کا مظاہرہ کرے گا لیکن اقتدار کی بھوک کبھی نہیں مرتی۔ اس نے احسانات کا بدلہ اس طرح چکایا کہ خان خاناں کو مدد کے لیے پکارلیا مگر یہ بھول گیا کہ چاند بی بی قلعے سے گئی ہے، اس کے وفادار اب بھی یہاں موجود ہیں۔ یہی وفادار حرکت میں آئے اور محمد خاں کو گرفتار کرکے چاند بی بی کی خدمت میں پیش کردیا۔ چاند بی بی نے اسے معزول کردیا اور آہنگ خاں کی نظر بندی ختم کرکے اسے محمد خاں کی جگہ منصب پیشوائی پر فائز کیا۔

سہیل خاں کو خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کرکے واپسی کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

سہیل خاں احمد نگر سے روانہ ہوکر دریائے گنگا کے کنارے راجاپور کے نواح میں پہنچا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ مغلوں نے وعدہ خلافی کرکے قصبہ پاتری کو بھی جو برار میں شامل نہیں ہے، اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔ اس نے پیش قدمی روک دی اور ابراہیم شاہ کے نام ایک خط روانہ کیا جس میں یہ تمام حالات درج کیے۔

چاند بی بی اور آہنگ خاں کو بھی اس کا علم ہوچکا تھا لہٰذا انہوں نے بھی اپنے قاصد بیجاپور بھیجے اور عادل شاہ سے اصرار کیا کہ وہ قصبہ پاتری سے مغلوں کو نکال باہر کرے۔

ابراہیم عادل شاہ کے پاس جب یہ عریضے پہنچے تو اس نے سہیل خاں کو مغلوں سے معرکہ آرائی کرنے کا حکم دیا۔ قطب شاہ نے بھی ایک لشکر بھیج دیا۔ احمد نگر سے بھی سات ہزار سواروں کا ایک لشکر برار کی طرف روانہ ہوا۔

سہیل خاں نے قصبہ سون پت میں پہنچ کر قیام کیا اور لشکر کی ترتیب و تنظیم کی طرف توجہ کی۔

مغل سالار خان خاناں نے دریائے گنگا کے کنارے دکنی فوج کے سامنے خیمے لگائے لیکن پندرہ روز اپنی جگہ سے حرکت نہ کی اور پھر اچھی طرح سوچ سمجھ کر وہ دکنیوں کے سامنے آگیا۔ معمولی سی جنگ کے بعد قطب شاہی اور نظام شاہی لشکر اس مقابلے کی تاب نہ لاسکے اور میدان جنگ سے فرار ہوگئے لیکن سہیل خاں ڈٹا رہا اور مہارت سے لڑا۔ اس کے لشکر نے ایسی مہارت کا مظاہرہ کیا کہ سارے لشکر کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ مغل یہ صورتِ حال دیکھ کر ایسے پریشان ہوئے کہ میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے اور شاہ پور پہنچ گئے جہاں شہزادہ مراد پناہ گزیں تھا۔

حالات ایسے دگرگوں ہوگئے تھے کہ شہزادہ مراد کے امراء اسے دکن کی حدود سے باہر نکال لے گئے لیکن خان خاناں ایک قلیل جماعت کے ساتھ اسی جگہ مقیم رہا۔

خان خاناں اور سہیل خاں ایک دوسرے سے بہت کم فاصلے پر تھے لیکن دونوں کو ایک دوسرے کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ یہ پراسرار لاعلمی ختم ہوئی تو دونوں نے اپنی اپنی حفاظت کا بندوبست کیا اور صبح ہوتے ہی مقابلے پر آگئے۔ دونوں میں لڑائی ہوئی۔ سہیل خاں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور وہ شاہ درک کی طرف فرار ہوگیا۔

☆☆☆

آہنگ خاں کے دل میں یہ بات کھٹکتی رہی تھی کہ محمد خاں نے جو اسے نظر بند کیا تھا، اس میں چاند بی بی کا ہاتھ تھا۔ اب جو سہیل خاں کو شکست ہوئی تو اس کا جذبۂ انتقام جاگ اٹھا۔ اس نے چاہا کہ بہادر شاہ کو اپنے قبضے میں کرکے چاند بی بی کو کسی قلعے میں نظر بند کردیا جائے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس پر عمل کرتا، چاند بی بی کو خبر ہوگئی۔ اس نے بہادر شاہ کی حفاظت کا بندوبست کیا اور آہنگ خاں کو قلعے میں آنے جانے سے روک دیا۔

ابراہیم عادل شاہ ایک مرتبہ پھر حرکت میں آیا۔ اس نے اپنے امیروں کو احمد نگر بھیجا کہ اس قبضے کو ختم کرائے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ شہزادہ مراد اور

خان خاناں کے درمیان کشیدگی اتنی بڑھی کہ اس نے خان خاناں کو اکبر کے پاس بھیج دیا اور اس کی جگہ ابوالفضل کو دکن کا سپہ سالار مقرر کیا۔

آہنگ خاں کو جب معلوم ہوا کہ خان خاناں دکن سے چلا گیا ہے تو اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی قوت میں اضافہ کرنا چاہا۔ دریائے گنگا زوروں پر تھا اور مغلوں کی غیر موجودگی اسے فائدہ پہنچا سکتی تھی۔ وہ ایک قریبی قصبے ''بشیر'' کی طرف بڑھا کہ وہاں پہنچے اور مغلوں کا یہ علاقہ ان سے چھین لے۔

وہاں کے حاکم شیر خواجہ نے آہنگ خاں کا مقابلہ کیا لیکن زخمی ہو کر قلعہ بشیر میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہو گیا۔ شہزادہ مراد اس کی مدد کو کیسے آتا کہ شاہ پور میں بیمار پڑا ہوا تھا اور پھر اس کے انتقال کی خبر آ گئی۔

ادھر حاکم بشیر شیر خواجہ نے اکبر کو خط کے ذریعے دکنیوں کے غلبے سے آگاہ کیا اور شیخ ابوالفضل کی شکایت لکھی کہ یہ سب اس کی غفلت کی وجہ سے ہوا۔

اکبر کو اب احساس ہوا کہ دکن کی سپہ سالاری کے لیے خان خاناں سے موزوں شخص کوئی اور نہیں۔ اس نے خان خاناں کو دوبارہ بحال کر کے دکن کی طرف روانہ کر دیا اور اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ دانیال کو اس کے ساتھ روانہ کیا۔

یہ دونوں روانہ ہوئے تھے اور ابھی دکن کی سرحد پر ہی تھے کہ ابوالفضل کی درخواست پر خود اکبر آگرہ سے دکن کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں پہنچ کر اس کے سارے ارمان جیسے پھول کی طرح کھل اٹھے۔ اسے معلوم ہوا کہ آہنگ خاں اور چاند بی بی کے درمیان ٹھنی ہوئی ہے تو اس کے منصوبے ہی کچھ اور ہو گئے۔ اس نے خود تو قلعہ اسیر کا محاصرہ کر لیا اور خان خاناں کو احمد نگر کی طرف روانہ کیا۔ شہزادہ دانیال بھی اس کے ساتھ تھا۔

آہنگ خاں پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ قلعے کے باہر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے مغلوں کے ارادے سے خوف زدہ ہو کر عجیب غداری کا کام کیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ چاند بی بی سے مدد طلب کر کے جنگ کرتا، اس نے اپنے تمام سامان کو آگ لگائی اور خود جنیر کی طرف بھاگ گیا۔

مغل امیروں نے کسی مزاحمت کے بغیر قلعہ احمد نگر کا محاصرہ کر لیا۔

چاند بی بی نے اپنے ایک سالار حبیا خاں کو طلب کیا۔

''تم دیکھ رہے ہو قلعہ فتح ہونے کے قریب ہے اور ہم بے بس ہیں۔ یہ سب امراء کی نااتفاقی سے ہوا ہے۔ میں کب تک ابراہیم عادل کو آواز دیتی رہوں جبکہ ہم آپس ہی میں متفق نہیں۔ اکبر بادشاہ خود دکن کی طرف آیا ہے۔ اب قلعے کو فتح ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

حبیا خاں نے جواب میں کہا۔ ''اب تک جو ہوا اس کا غم کرنا بے کار ہے۔ یہ فرمائیے اب کیا قدم اٹھانا ہے۔ جو آپ کا حکم ہو گا اس پر عمل کیا جائے گا۔''

''میری یہ رائے ہے کہ ہمیں قلعہ شہزادہ دانیال کے سپرد کر کے اپنی عزت اور جان بچانی چاہیے۔ اس کے بعد جنیر کی راہ لینی چاہیے اور وہاں پہنچ کر خداوند تعالیٰ سے مدد کا انتظار کرنا چاہیے۔''

یہ سننا تھا کہ حبیا خاں نے چیخ چیخ کر اہلِ قلعہ کو جمع کر لیا۔

''چاند بی بی نے شہزادہ دانیال سے ساز باز کر لی ہے اور قلعہ اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

نااتفاقی کے تابوت میں آخری کیل اس کے سالار نے ٹھونک دی۔ اس نے چاند بی بی کی مصلحت کو غداری کے رنگ میں پیش کر کے اہل قلعہ کو مشتعل کر دیا۔ وہ حرم سرا میں داخل ہو گئے۔ چاند بی بی قلعے سے نکلنے کی تیاری کر رہی تھی۔ ابھی ہتھیار بھی نہیں باندھے تھے کہ مقابلہ کرتی۔ ان ''اپنوں'' نے اسے نہایت بے رحمی سے قتل کر دیا۔

نقبوں میں رکھی بارود ایک دھماکے سے پھٹی اور قلعے کی دیوار گر گئی۔ اب چاند بی بی نہیں رہی تھی کہ اپنی سسرال کو آواز دیتی۔

مغل اندر آ گئے۔ شہزادہ دانیال نے دکنیوں کو گرفتار کر لیا اور خزانے پر قبضہ کر لیا۔ کم سن بہادر شاہ کو گرفتار کر کے اکبر کے پاس برہان پور بھیج دیا۔ اسے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا۔

ابراہیم عادل شاہ تک یہ تمام واقعات پہنچے تو وہ ایک سرد آہ بھر کے خاموش ہو گیا۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ احمد نگر کو بچا لے لیکن اب تو اس کی اپنی خود مختاری خطرے میں تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دکن کی خود مختاری مغلوں کے ہاتھوں پامال ہونے والی ہے۔

آپس کی نااتفاقی یہی رنگ دکھاتی ہے۔

ماخذات

تاریخ فرشتہ۔ طبقات اکبری۔ منتخب التواریخ۔ مغلیہ دور حکومت

چور مچائے شور

تنویر ریاض

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے... ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری جیسی مثالیں ہر دور میں کچھ لوگوں پر پوری اترتی رہی ہیں... وہ ایک ایسا دیدہ دلیر چور تھا جو جس تھالی میں کھا رہا تھا بڑی بے باکی سے اسی میں سوراخ کرتا رہا مگر... آخر کب تک... ایک دن نہ صرف سوراخ بلکہ اس کے فرار کا ہر رستہ بند ہو گیا کیونکہ... بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مناتی... ایک نہ ایک دن تو شامت آہی جانی تھی۔

بہت پیار سے چال چلنے والے ایک شاطر کی بدحالی کا دلفریب نقشہ

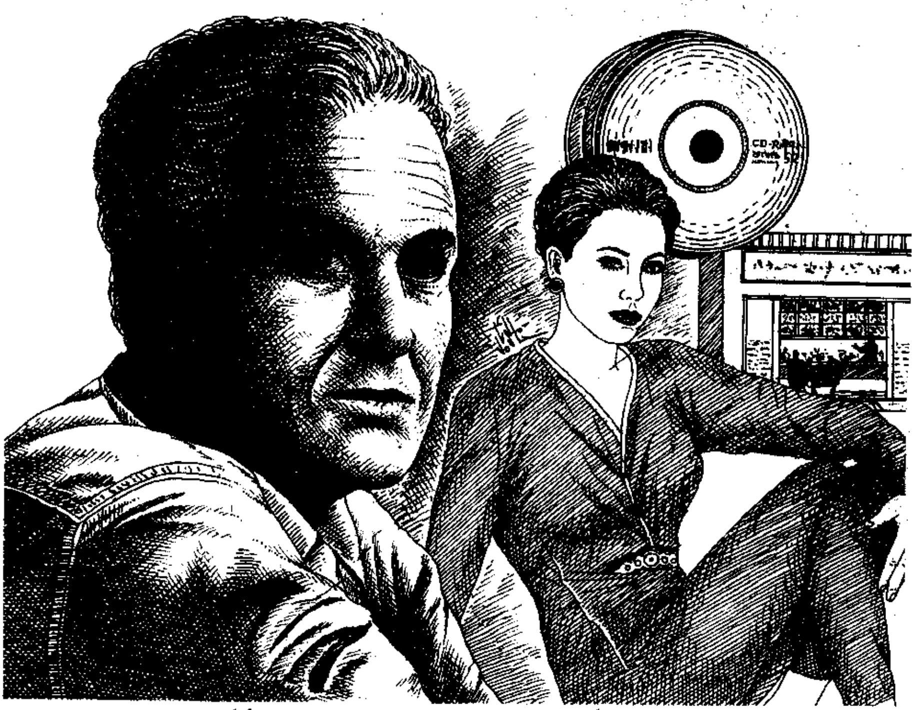

میرا لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن جب وہ مجھ سے الجھ گیا تو مجھے بھی اپنے دفاع پر مجبور ہونا پڑا چنانچہ جیسے ہی اس نے مجھے گھونسا مارنا چاہا، میں تیزی سے گھوما۔ میں نے پہلے ہی اپنا بایاں ہاتھ چہرے کے آگے کرلیا تھا۔

دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑی اور اس کا بازو موڑنا شروع کردیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا بازو نیچے کرتا یا اپنی پوزیشن تبدیل کرتا، میں نے اپنی کلائی تیزی سے اوپر کی جس سے اس کی کہنی کے جوڑ پر زور پڑا اور اس کا پٹھا اتر

گیا۔ میں نے فوراً اس کا بازو چھوڑ دیا کیونکہ وہ بری طرح چلا رہا تھا۔

میں نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ میری کوئی بات نہیں سن رہا تھا اور زمین پر بیٹھ کر مسلسل روئے جارہا تھا جبکہ میں پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ اس سے لڑنا نہیں چاہتا لیکن وہ اپنی طاقت کے زعم میں مجھ سے بھڑ گیا۔

میں نے اس کی قمیص کی جیب سے سیل فون نکالا اور ایمبولینس کے لیے فون کرنے لگا۔ گو کہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ اسے ایمرجنسی روم لے کر جاؤں لیکن مجبوری تھی کیونکہ وہ اس حالت میں نہیں تھا کہ خود گاڑی چلا سکے۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب مجھے کسی کا پیچھا کرنے کے لیے کہا گیا اور میں خالی ہاتھ واپس آگیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ میں مطلوبہ شخص کو فاسٹ فوڈ جوائنٹ کی پارکنگ لاٹ میں تلاش کروں۔ وہ واقعی وہاں موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا اور انگلی سے اپنی کار کی چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی جبکہ اسے کار سے اتر کر فاسٹ فوڈ ریسٹوران میں آنا تھا لیکن وہ مجھے چکما دے کر چلا گیا اور میں کچھ بھی نہ کرسکا۔

جب میں نے اپنے باس اور ڈون رک انویسٹی گیشن کے پارٹنر رک کو یہ بات بتائی تو اس نے الٹا مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرایا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے تمہیں ملازمت کیوں دی۔ لوگ تمہیں ایک میل دور سے دیکھ لیتے ہیں۔ تم ایک عام آدمی بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ مجھے مجبوراً کہنا پڑ رہا ہے کہ تم ہمیں بہت مہنگے پڑ رہے ہو۔“

یہ اتنی پرانی بات نہیں تھی کہ میں اسے بھول جاتا لہٰذا میں نے سوچا کہ آج کا واقعہ زیادہ سنگین نوعیت کا ہے اور اگر میں دفتر واپس گیا تو بہت باتیں سننے کو ملیں گی لہٰذا جب ایمبولینس اس شخص کو لے کر چلی گئی تو میں نے بھی گاڑی کا رخ ٹپ ٹاپ ٹیپ کی طرف کر دیا جو میرا دوسرا گھر تھا۔ یہ بات نہیں کہ میں بہت زیادہ پینے والا شخص ہوں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ رات کے کھانے کے بعد صرف ایک گلاس سرخ مشروب سے شغل کر لیتا ہوں۔ ٹپ ٹاپ میں زیادہ وقت گزارنے کی وجہ وہاں کی پرکشش بارٹینڈر رلوئس تھی۔ اس کا رنگ گندمی اور بال سیاہ تھے کیونکہ اس کا باپ فرانسیسی اور ماں عرب تھی۔ اسی لیے اس کی شخصیت میں دونوں قوموں کی خصوصیات نظر آتی تھیں۔ اس جیسی اسمارٹ عورت کے لیے یہ کام مناسب نہیں تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ ایک ٹیچر کی تنخواہ میں وہ اپنے نوعمر بیٹے کی پرورش نہیں کرسکتی۔ اس لیے اسے آمدنی میں اضافے کے لیے یہ جز وقتی ملازمت کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ دوپہر کی شفٹ میں کام کرتی تھی۔ لہٰذا میں ان لوگوں کے بے ہودہ جملوں کا عادی ہوگیا تھا جو اپنے دن تاریک کمروں میں گزارتے ہیں۔ آہستہ آہستہ مشروب کے گھونٹ لیتے اور ٹیلی ویژن دیکھ کر بے ہودہ انداز میں چلاتے ہیں۔ وہاں آنے والے مستقل گاہکوں نے مجھے نظرانداز کرنا شروع کر دیا تھا البتہ ان میں سے کچھ کا رویہ اب بھی جارحانہ تھا۔

نئے آنے والے عام طور پر دو طرح کا ردعمل ظاہر کرتے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے میری سروس پر شکریہ ادا کرتے یا پھر میرا مذاق اڑاتے۔ میں اپنے بارے میں ”ہے اسٹمپی“ کے الفاظ کئی مرتبہ سن چکا تھا۔ مجھے اس وقت بھی برا نہیں لگا جب ایک شخص نے مجھے ایک بازو والا آوارہ گرد کہہ کر بلایا۔ اس روز میں نے بغیر آستینوں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر نظرانداز کر دیا کہ شاید اس کے دماغ میں کوئی کیڑا کلبلا رہا ہے۔

ایسے لوگوں سے نمٹنا بہت مشکل تھا جو مجھے جنگ سے آیا ہوا سابق فوجی سمجھتے تھے۔ میری خواہش ہوتی کہ ان کے لیے کچھ کرسکوں اور انہیں بڑی حیرت ہوتی جب انہیں یہ معلوم ہوتا کہ میں کس طرح اپنے ایک بازو سے محروم ہوگیا تھا۔ میں ٹرین سے پھسل کر گرا اور میرا بازو اس کے پہیوں کے نیچے آگیا۔ اس وقت میں بارہ سال کا تھا۔ میں نے اپنے بے وقوف دوستوں کے ساتھ اچھل کر سوار ہونے کی کوشش کی تھی۔ جب میں ٹرین سے گرا تو میرا دایاں بازو کہنی سے دو انچ اوپر کٹ گیا۔ میرے اعصاب کو بھی نقصان پہنچا اور بازو کا بقیہ اوپری حصہ بے ہنگم طریقے سے لٹکا ہوا نظر آنے لگا۔ بعض اوقات میں اسے حرکت دیتا تو یوں لگتا کہ وہ میرے نہیں بلکہ اپنے دماغ سے کام کر رہا ہے۔

مجھے اپنے آپ کو قائل کرنے میں ایک سال لگ گیا کہ دایاں بازو ضائع ہونے کے بعد اپنے اندر تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ میں نے پہلے ہی کچھ مشقیں شروع کر دی تھیں۔ میں اپنا بایاں ہاتھ استعمال کرتا تھا۔ اس لیے چھوٹے چھوٹے کام جیسے دانتوں میں برش کرنا بھی مشکل، پیچیدہ اور بعض صورتوں میں خطرناک ہوگئے۔ مثال کے طور پر پتلون کی زپ کھولنا بند کرنا۔ میں نے تیرہ سال کی عمر میں اسکول سے آنے کے بعد جم جانا شروع کر دیا۔ میں

اپنے نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے بائیں بازو اور کندھے پر زور دیے رہا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں عام لوگوں سے زیادہ وزن اٹھانے لگا۔ جب سترہ سال کا ہوا تو اپنے خالی ہاتھ سے سیب اور پھلیوں سے بھرے ہوئے ڈبے توڑنے لگا۔ گو کہ میرے دائیں بازو نے جھولنا ختم کر دیا تھا لیکن وہ میرے لیے ایک کند اوزار کے مانند تھا، جس کا مجھے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی بھی لڑکی کسی ایسے مرد کے ساتھ ڈیٹ پر جانا پسند نہیں کرے گی جس کا ایک ہاتھ نہ ہو لہٰذا میں نے کبھی مہذب بننے یا کسی کو چھونے کی کوشش نہیں کی لیکن لوئس مجھ سے جس طرح پیش آتی تھی، اس پر میں خدا کا شکر ہی ادا کر سکتا ہوں۔

اس نے میرے سامنے فالسے کا شربت لا کر رکھا اور میرے ہاتھ کو نرمی سے دباتے ہوئے بولی۔ ''آج میرے دوست کا کیا حال ہے؟''

''بہتر ہے۔ میں ایک کام میں پھنسا ہوا ہوں۔ مجھے ایک اور بے وفا شوہر کا تعاقب کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کا پیچھا کرتے ہوئے تین دن ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ میں ایسے کاموں سے تنگ آ چکا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ ایجنسی جا کر ڈون اور رک سے بات کروں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ان لوگوں سے کیوں چپکے ہوئے ہو؟ تمہارے پاس تعلیم اور تجربہ ہے۔ تم اپنی سراغ رساں ایجنسی کھول سکتے ہو۔''

''یقیناً...... اور تم میری سیکریٹری بن سکتی ہو پھر تمہیں اپنی خوب صورت ٹانگیں دکھانے کے لیے اسکرٹ پہننا پڑے گا۔''

''مجھے خطرہ ہے کہ میری خوب صورت ٹانگوں پر ابھری ہوئی رگیں نظر آئیں گی۔ البتہ ہم اپنی ایجنسی کا نام ''قانون کے لمبے ہاتھ'' رکھ سکتے ہیں۔''

ایک احمق شخص بار کے سرے پر کھڑا ہوا لوئس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لہٰذا وہ وہاں سے چلی گئی۔ لوئس پہلی عورت تھی جس سے میں نے محبت کی۔ گو کہ میرے دوسری عورتوں سے بھی تعلقات رہے لیکن محبت کسی سے نہیں ہوئی۔ شاید اسی لیے میں ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی حساس ہو گیا تھا۔ کالج کے زمانے میں بھی ایسا ہی رہا۔ جی ہاں، میں کالج بھی گیا تھا اور کرمنل جسٹس، میرا خاص مضمون تھا۔ پتا نہیں میں نے یہ مضمون کیوں منتخب کیا جبکہ جانتا تھا کہ مجھے پولیس میں ملازمت نہیں مل سکتی۔ میں نے کچھ لڑکیوں سے ڈیٹنگ بھی کی۔ زیادہ تر لڑکیوں سے میرے روم میٹ نے تعارف کروایا۔ رون سیاہ فام تھا اور اس نے اپنی دیوار پر سیاہ فام ہیروز کے پوسٹر لگا رکھے تھے۔ ہر روز جب میں کلاس میں جانے کے لیے صبح کو بیدار ہوتا تو صرف اپنے آپ کو ایک انسان سمجھتا لیکن اس کی سوچ مختلف تھی۔ وہ خود کو سفید فام معاشرے میں سیاہ فام سمجھتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ نہیں سمجھتا کہ اپنے محدود نظریات کی وجہ سے وہ غیر ضروری طور پر حساس ہوتا جا رہا ہے۔

اس نے کہا۔ ''میرے دوست! یہ معاملہ صرف اپنی حفاظت کا ہے۔ پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ رنگ مختلف ہونے کے باوجود ہم سب بھائی ہیں لیکن ایک روز پولیس والے نے مجھے اپنے باپ کی نئی وولوو چلاتے ہوئے دیکھ لیا اور مجھے صرف سیاہ فام ہونے کی بنا پر روکا گیا۔ اس واقعے سے مجھے بہت تکلیف پہنچی لہٰذا مجھے یہ رویّہ اختیار کرنا پڑا۔''

میں نے اپنا جوس ختم کیا اور لوئس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''آج رات ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میری ڈیوٹی سات بجے تک ہے لیکن میں گھر جا کر لباس تبدیل کرنا چاہوں گی۔ تم مجھے آٹھ بجے لینے کے لیے آ جانا۔''

☆☆☆

جب میں واپس آیا تو ڈون ایجنسی میں اکیلا تھا۔ لہٰذا میں اس کے دفتر میں چلا گیا اور اسے آج ہونے والی لڑائی کے بارے میں بتا دیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ نہ تو وہ شخص اور نہ ہی پولیس میرے بارے میں جانتی ہے۔

''لیکن تم نے ایمبولینس کو بھی فون کیا تھا؟''

''ہاں لیکن میں نے اسی کا فون استعمال کیا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں اس کیس سے الگ کر کے کسی اور کی ڈیوٹی لگا دیتے ہیں۔''

رک اور ڈون ابھی تک ستر کی دہائی کے کرداروں جیسی حرکتیں کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ اکیلے میں اچھا سپاہی اور برا سپاہی والا کھیل کھیلنے لگے۔ ڈون ہمیشہ اچھا سپاہی بنتا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ اس طرح کے کام تمہارے لیے مناسب ہیں۔ تم اس بطخ کی طرح لگتے ہو جو پانی سے باہر آ گئی ہو۔'' وہ ہمیشہ اس طرح کی مثالیں دیا کرتا تھا۔

''میں نے تمہارے لیے ایک دوسرا کام دیکھا ہے۔'' اس نے فائلوں کے ڈھیر میں سے ایک فائل نکالی اور مجھے پکڑاتے ہوئے بولا۔ ''ہم بیٹ ہاؤس کی بات کر رہے

ہیں جو ویسٹ کوسٹ پر اسٹورز کی بہت بڑی چین ہے۔ وہ سی ڈی، ڈی وی ڈی اور کتابیں فروخت کرتے ہیں۔ تم اس کیس فائل کو دیکھو۔''

میں نے فولڈر کھولا اور کمپنی کے دیے ہوئے نوٹس پڑھنے لگا۔ ان کے ویسٹ وڈ اسٹور میں سکڑنے کا مسئلہ تھا۔ یہ اصطلاح اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب چیزیں غائب ہو رہی ہوں۔ بیٹ اسٹور کی انتظامیہ اس کا الزام ان لوگوں کو دے رہی تھی جو دکانوں سے چیزیں چراتے ہیں۔ اس کی روک تھام کے لیے انہیں سیکیورٹی گارڈز کی ضرورت تھی۔ میں نے فائل ڈون کی میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ''یہ سراغ رسانی نہیں ہے۔ تم سیکیورٹی کے کسی آدمی کو بھیج دو۔ میں سیکیورٹی گارڈ نہیں سراغ رساں ہوں۔''

''درست......'' ڈون نے کہا۔ ''لیکن تم وہ کام بھی ڈھنگ سے نہیں کر رہے۔ میں بیٹ ہاؤس کی انتظامیہ سے بات کرتا ہوں۔ تم سیکیورٹی گارڈ کے روپ میں سراغ رسانی ہی کرو گے۔ تمہیں سادہ لباس پہن کر اسٹور میں گشت کرنا ہوگا۔ تم یہ ظاہر کرو گے کہ اسٹور کی سیکیورٹی پر مامور ہو لیکن درحقیقت تمہیں مشتبہ لوگوں پر نظر رکھنا اور چوروں کو پکڑنا ہوگا۔ یہ بھی ایک طرح سے سراغ رسانی ہی ہے۔''

یہ آئیڈیا مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ میں تصور میں اپنے آپ کو روتے ہوئے نوعمر چوروں کو کالر سے پکڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''کیا تمہارے پاس اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ڈون نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''شکر کرو کہ اس وقت رک یہاں نہیں ہے۔''

☆☆☆

میں لوئس کو اس کے پسندیدہ ریستوران موسو اینڈ فرینک گرل میں لے گیا جو بنیادی طور پر سیاحوں کے لیے تھا لیکن اب اس نے ایک ادارے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کھانے کے بعد ہم اس کے چھوٹے سے بنگلے پر چلے گئے جو وادی کے باہر واقع تھا۔ لوئس کا نوعمر بیٹا نہ جانے کیوں مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ پہلے میں سوچا کرتا کہ شاید اسے اپنے باپ کی کمی محسوس ہوتی ہے لیکن جب میں نے ایک دفعہ اسے اپنی جیپ کے ٹائر کاٹتے ہوئے دیکھا تو فیصلہ کر لیا کہ اس کی نفرت کے بارے میں نہیں سوچوں گا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اس وقت وہ گھر پر نہیں تھا۔

تھوڑی دیر ڈرنک کرنے کے بعد وہ مجھے اپنے بستر پر لے گئی۔ ہم دو سال سے ساتھ تھے لیکن وہ اب بھی مجھے بہت کچھ بتاتی رہتی تھی۔ شاید اس کی وجہ میری معذوری تھی لیکن اس نے مجھے کبھی اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ میں نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے خوشی ہوگی اگر یہ رفاقت مستقل ہو جائے۔''

''ہم اس دور سے گزر چکے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی جب تک رابرٹ کہیں چلا نہ جائے۔ اگلے سال اس کا اسکول ختم ہو جائے گا اور یقین کرو، میں چاہ رہی ہوں کہ وہ کالج میں چلا جائے۔''

''اس طرح وہ تم سے بہت دور چلا جائے گا۔''

''تم مجھے کسی ایک کی طرف داری پر مجبور نہ کرو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ میرا بیٹا ہے۔ تم ہار جاؤ گے۔''

اسی وقت ہم نے بیرونی دروازہ۔۔ زور سے بند ہونے کی آواز سنی۔ ایک منٹ بعد وہ بیڈروم کے دروازے پر لاتیں مار رہا تھا۔ اس نے گستاخانہ لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میری ماں کے کمرے سے نکلو اور اپنی کار ڈرائیو وے سے ہٹاؤ۔ مجھے اپنی گاڑی گیراج میں کھڑی کرنی ہے۔''

لوئس چلائی۔ ''رابرٹ......!''

''اسے کچھ مت کہو۔ میں چلا جاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

بیٹ ہاؤس میں میرا پہلا دن اتنا ہی بُرا گزرا جیسا کہ میں نے تصور کیا تھا۔ میں اسٹور کھلنے کے آدھ گھنٹے بعد ہی وہاں پہنچ گیا تھا اور اسٹور منیجر جیسن سے اپنا تعارف کروایا۔ وہ سنجیدہ، سمجھ دار اور منہ پھٹ انسان تھا۔ اس نے فوراً ہی مجھے اسٹور کے قاعدے قانون بتانا شروع کر دیے۔

''تم میرے دوسرے ملازمین کی طرح چائے اور کھانے کا وقفہ کرو گے۔ مجھے نتائج چاہئیں اس لیے ناکارہ آدمی کی ضرورت نہیں۔ میرے اعتراض کے باوجود انتظامیہ نے ملازمت دی ہے۔ اس کے باوجود تمہیں میرے قوانین پر عمل کرنا ہوگا۔ پہلا اصول یہ ہے کہ تم تمام چوروں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دو۔ مجھے ان کے رونے اور گڑگڑانے کی پروا نہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ بوڑھی خواتین، نوعمر بچے یا بے گھر آوارہ گرد پس ہوں۔ انہیں سزا ملنی چاہیے۔ اصول نمبر دو، کوئی شخص بھی ہم پر غلط ہاتھ ڈالنے کا دعویٰ نہ کرے۔ تمہیں انتظار کرنا ہوگا کہ وہ

اسٹور سے نکل کر بیرونی دروازے سے چار پانچ فٹ دور ہوں تب تم ان کا سامنا کرو اور خدا کے واسطے انہیں ہاتھ مت لگانا جب تک وہ بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔'' اس نے میرے بازو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر انہیں پکڑنا بھی پڑ جائے تو کوئی تکلیف مت دینا۔''

اسٹور میں گشت کرنے کے علاوہ میں سیلز فلور کے اوپر لگے ہوئے قدآدم آئینے اور منیجر کے دفتر میں رکھے ہوئے مانیٹر سے بھی گاہکوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔ یہ مانیٹر اسٹور میں لگے ہوئے کئی کلوز ڈسرکٹ ٹی وی کیمروں سے منسلک تھا۔ اس کے علاوہ مجھے دو بڑے محدب عدسوں کی سہولت بھی حاصل تھی جن کی مدد سے متصل بغلی راستوں کے کونوں میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ اتنے بھرپور انتظامات کے ہوتے ہوئے اسٹور سے چیزوں کا چوری ہونا ایک معما تھا۔

اس روز میں نے صرف ایک شاپ لفٹر کو پکڑا۔ وہ ایک نوعمر لڑکی تھی۔ جب میں اسے بریک روم میں اس چھوٹی سی میز پر لے کر آیا جسے میں اپنی دفتری میز کے طور پر استعمال کررہا تھا تو وہ مسلسل روئے جارہی تھی اور گڑگڑا کر التجائیں کررہی تھی۔ وہ سہ پہر کا وقت تھا اور جیسن اسٹور میں نہیں تھا کیونکہ اسے شام کو آکر اسٹور بند کرنا ہوتا تھا۔ اس لیے وہ لنچ کے فوراً بعد گھر چلا گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کو تھوڑی ڈانٹ ڈپٹ اور ڈرا دھمکا کر چھوڑ دیا جائے۔ میں نے اپنے اور اس کے لیے بریک روم کی وینڈنگ مشین سے سوڈے کی بوتلیں نکالیں اور اسے سمجھانے لگا کہ اگر اسے چوری کے الزام میں پولیس کے حوالے کردیا تو اس کے مستقبل پر اس کا اثر پڑے گا۔ پھر میں نے اسے پڑھنے اور دستخط کرنے کے لیے ایک معاہدہ دیا کہ وہ آئندہ کبھی چوری نہیں کرے گی۔ یہ میری اپنی اختراع تھی اور اسے بڑی ہوشیاری سے تیار کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ چوری ایک جرم ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس سے کاروبار کو جو نقصان ہوتا ہے، اسے وہ چیزوں کی قیمتیں بڑھا کر اور اپنے ملازمین کو کم تنخواہ دے کر پورا کرتے ہیں۔ اس طرح میں چوری کرکے دوسرے گاہکوں اور اسٹور کے ملازمین کا نقصان کررہی ہوں۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ آئندہ کبھی کسی دکان سے چوری نہیں کروں گی۔'' اس صفحے کے نیچے لڑکی کے نام اور اس کے گھر کے فون نمبر کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی۔

اس کاغذ کو پڑھتے ہوئے لڑکی کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ابھی تک اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جب وہ پڑھ چکی تو میں نے اسے قلم پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم سمجھ گئیں کہ کس کاغذ پر دستخط کررہی ہو؟''

اس نے اپنا نام اور فون نمبر لکھا پھر دستخط کرنے کے بعد میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں میں سمجھ گئی۔ کیا اب گھر جاسکتی ہوں؟''

''ایک منٹ۔'' میں نے شناختی کارڈ سے اس کے دستخط ملائے اور گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ آنسرنگ مشین سے اس کے نام اور نمبر کی تصدیق ہوگئی۔ میں نے اس کا شناختی کارڈ واپس کیا اور اسے لے کر اسٹور سے باہر آگیا جہاں پارکنگ لاٹ میں اس کے دوست اس کا انتظار کررہے تھے۔ وہ ان کی کار میں سوار ہوگئی اور مجھے دیکھ کر چلائی۔ ''جہنم میں جاؤ ٹنڈے۔'' تب مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوگئی۔ وہ اتنی معصوم نہیں تھی جتنی نظر آرہی تھی۔

دوسرے دن جیسن کو جب معلوم ہوا کہ میں نے شاپ لفٹر کو پولیس کے حوالے نہیں کیا تو وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے غصے سے میرے چہرے کے سامنے انگلی لہرائی اور چلاتے ہوئے بولا۔

''ہم نے کل ہی اس بارے میں بات کی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تمام چوروں کو پولیس کے حوالے کیا جائے۔ یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ چوری کرنا جرم ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جو بھی ہمارے یہاں چوری کرے، اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ اگر تم ایسا نہیں کرسکتے تو میں تمہارے مالکان کو فون کرتا ہوں کہ وہ تمہاری جگہ کسی ایسے شخص کو بھیجیں جو ہمارے کہنے پر عمل کرسکے۔ کیا تم میری بات سمجھ گئے؟''

''ہاں۔''

''ہاں، کیا......؟''

اسے میرا ہاں، کہنا برا لگا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ میں جی جناب، کہوں لیکن اس روز میں نے آدھی آستین کی قمیص پہن رکھی تھی اور وہ میرے بازوؤں کے مسلز دیکھ رہا تھا جنہیں میں جان بوجھ کر پھلا اور سکیڑ رہا تھا۔ میں نے بہت پہلے یہ تکنیک ایجاد کی تھی۔ وہ منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی دفتر سے باہر نکل گیا۔

بیٹ ہاؤس نے حال ہی میں وینائل ریکارڈز کا ذخیرہ کرنا شروع کیا تھا۔ اس طرح کے ریکارڈ سی ڈی اور ڈیجیٹل ڈاؤن لوڈ سے پہلے کے زمانے میں سنے جاتے تھے۔ مجھے یہ ریکارڈز اس لیے بھی پسند تھے کہ اس طرح مجھے البم کے کور پر آرٹ ورک دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ میں بیٹلز کے ریکارڈز کے ایک بکس کو ٹٹول رہا تھا کہ میں نے

ایک آدمی کو چمڑے کے بریف کیس کے ساتھ دیکھا۔ اس نے بہت عمدہ تراش کا نیلی دھاریوں والا سوٹ پہن رکھا تھا جس کے ساتھ سفید قمیص اور فالسئی رنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی۔ شاید میں اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا اگر وہ اپنا بریف کیس گھٹنے پر رکھ کر اس کی چٹخنی نہ کھول رہا ہوتا۔ وہ کیمرے کے نزدیک نہیں تھا لیکن اوپر لگے ہوئے آئینے میں اس کی نقل و حرکت نظر آرہی تھی۔ وہ اپنے بریف کیس میں ڈی وی ڈی رکھ رہا تھا۔ زیادہ تر سی ڈی اور ڈی وی ڈی کے پیکٹ پر سنسر ٹیپ لگا ہوتا ہے اور اگر کیشیر اس ٹیپ کو ناکارہ نہ بنائے تو مرکزی دروازے سے گزرتے ہوئے بزر بج جائے گا۔ میں سوچ رہا تھا کہ بریف کیس والا اس بزر سے بچ کر کیسے نکلے گا۔

جب اس نے بریف کیس بند کیا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا لیکن نہ جانے کس طرح میرا پاؤں پھسلا اور میں زمین پر گر پڑا لیکن میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی اور سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ اتنی دیر میں وہ دروازے تک پہنچ چکا تھا اور بزر بجنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے اسے سڑک پر پکڑ لیا۔ اس کی بی ایم ڈبلیو کنورٹیبل فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے بریف کیس پسنجر سیٹ پر پھینکا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میں نے چلا کر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے کار تیزی سے آگے بڑھائی اور ایک منی وین سے ٹکرا دی۔

دونوں گاڑیاں کھڑی ہو گئیں۔ ان کے انجن بند ہو گئے تھے اور سڑک پر پانی کے ساتھ تیل بھی بہہ رہا تھا۔ فضا میں پیٹرول کی بو پھیل گئی تھی لہٰذا میں نے سوچا کہ فائر ڈیپارٹمنٹ کو فون کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ سڑک پر پھیلا ہوا تیل آگ پکڑ لے۔ بریف کیس کار کے فرش پر گر گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ دونوں ڈرائیوروں میں سے کسی کو چوٹ نہیں آئی تھی لیکن منی وین کی پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی نوجوان عورت کا سر دروازے سے ٹکرایا تھا جس سے اس کی ایک آنکھ پر معمولی زخم آیا تھا۔ میں نے اپنے سیل فون سے پولیس اور ایمبولینس کو فون کیا۔ جب اس شخص نے اپنا بریف کیس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ میرا تعلق اسٹور سیکورٹی سے ہے۔ وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر رونے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے گزشتہ روز والی لڑکی یاد آگئی جس نے رونے کی اداکاری کر کے مجھے بےوقوف بنایا تھا۔

میں نے اس کا نام، پتا اور ڈرائیونگ لائسنس کا نمبر نوٹ کر کے لائسنس اسے واپس کر دیا کیونکہ اسے حادثے کی رپورٹ درج کروانے کے لیے اس کی ضرورت پیش آتی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ پولیس والوں سے نمٹ کر اسٹور آئے اور میں اس کا بریف کیس لے کر واپس بریک روم میں آگیا۔ اس نے چار ڈی وی ڈیز چرائی تھیں اور وہ سب جون وائن کی فلموں کی تھیں۔ شاید اسے انہیں فروخت کر کے کچھ ڈالرز مل جاتے۔ اس کے علاوہ اس کے بریف کیس میں بیورلی ہلز کے ایک پلاسٹک سرجن ڈاکٹر روگن کے بھی بہت سارے پمفلٹ پڑے ہوئے تھے اور میں نے یہی نام اس کے ڈرائیونگ لائسنس میں بھی پڑھا تھا۔ ایک پمفلٹ پر اس کی تصویر بھی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اسٹور سے چیزیں چرانے والا ایک ڈاکٹر تھا۔ بظاہر یہ ایک نفسیاتی مسئلہ معلوم ہو رہا تھا۔ ایسا شخص ڈی وی ڈی کی چوری کیوں کرے گا۔ پکڑے جانے پر اس کی پریشانی سمجھ میں آرہی تھی۔ اگر بات پھیل جاتی تو اس کی ساکھ کو نقصان پہنچتا۔

دوسری طرف مجھے بھی تنبیہ کر دی گئی تھی کہ اسٹور میں چوری کرنے والے کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے ورنہ میری ملازمت ختم ہو سکتی تھی اور میں یہ خطرہ کسی صورت مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ مجھے ذاتی اخراجات کے علاوہ مکان کے کرائے اور بلوں کی ادائیگی کے لیے بھی رقم درکار تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں انہی پولیس والوں کے پاس جا کر شکایت کرتا جو کار کے حادثے کی اطلاع ملنے پر وہاں آئے تھے۔ اس کے بجائے میں نے بریف کیس کو جیسن کی میز کے نیچے رکھ دیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ جیسن دوپہر میں سونے کے لیے گھر جا چکا تھا۔ اس نے یہ وتیرہ بنا لیا تھا کہ شام کو اسٹور خود بند کرتا حالانکہ کوئی بھی شفٹ سپروائزر یہ کام کر سکتا تھا۔ میں نے اس کے لیے ایک پرچہ چھوڑ دیا جس میں بریف کیس کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ وضاحت بھی کر دی کہ ٹریفک حادثے کا جائزہ لینے والے پولیس آفیسر ڈاکٹر روگن کی چوری کا کیس لے کر کاغذی کارروائی نہیں بڑھانا چاہتے تھے۔ اس لیے جب وہ اپنا بریف کیس لینے آئے تو جیسن پولیس کو فون کر دے۔ بہرحال ڈاکٹر روگن اس روز واپس نہیں آیا۔

☆☆☆

جب میں شام کو گھر واپس جا رہا تھا تو میرے سیل فون پر لوئس کا فون آگیا۔ وہ مجھے ڈنر پر مدعو کر رہی

تھی۔ میں نے گھر جا کر لباس تبدیل کیا اور لوئس کے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ وہ کھانا بنا رہی تھی کیونکہ میں نے بیرونی دروازے سے داخل ہوتے ہی لہسن کی بو سونگھ لی تھی۔ اب میں ڈور بیل بجانے یا دروازے پر دستک دینے کا محتاج نہیں تھا کیونکہ وہ ایک ماہ قبل اپنے گھر کی ایک اضافی چابی مجھے دے چکی تھی لیکن اس روز میں نے پہلی بار اس کا استعمال کیا جس پر مجھے بعد میں افسوس بھی ہوا جب میں نے لوئس اور رابرٹ کو کچن میں کسی بات پر بحث کرتے ہوئے سنا۔

''میں اس کے ساتھ ڈنر کرنا نہیں چاہتا بلکہ میں تو یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ میرے گھر آئے۔''

''یہ میرا گھر ہے۔'' لوئس نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ ہمارا گھر ہے۔ بہرحال وہ میرا مہمان ہے اور ڈنر کے لیے آرہا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ تم دونوں کے درمیان کیا مسئلہ ہے اور میں یہ امید کرتی ہوں کہ تم ہمارے ساتھ کھانا کھانے کے علاوہ اپنا رویّہ بھی بہتر رکھو گے۔''

میں نے رابرٹ کا جواب نہیں سنا اور باہر جا کر دروازہ بجایا۔ ایک منٹ بعد لوئس دروازے پر آئی اور مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی۔ ''تم نے گھنٹی کیوں نہیں بجائی؟''

''اوہ ہاں۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ یہ خوشبو کیسی ہے؟''

''اندر آؤ...... ابھی معلوم ہوجائے گا۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

کھانے کے دوران لوئس مسلسل کوشش کرتی رہی کہ رابرٹ ہماری گفتگو میں شامل ہوجائے لیکن وہ خاموش بیٹھا اپنی پلیٹ میں کانٹے سے کھانے کو اِدھر اُدھر کرتا رہا۔ اس دوران اس نے کوئی بات نہیں کی جبکہ میں اور لوئس اپنے اپنے کام کے بارے میں ایک دوسرے کو بتاتے رہے۔ میں نے اسے ڈاکٹر کے بریف کیس کا قصہ سنایا اور جب میں نے اپنی بات ختم کی تو رابرٹ بالآخر بول پڑا۔

''تمہارے باس نے کہا تھا کہ شاپ لفٹرز کو پولیس کے حوالے کردیا جائے۔ اس کے بجائے تم نے اسے جانے دیا۔ لگتا ہے وہ آدمی بہت امیر تھا اور تم ایسے لوگوں سے بہت جلدی مرعوب ہوجاتے ہو۔ اسے چوری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ مزید کہا۔

''کاش میں کل صبح ہیڈ ہاؤس جاسکتا جب تم باس کے سامنے وضاحت پیش کررہے ہوگے۔ تمہیں اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا ہوگی۔''

لوئس نے کہا۔ ''بس کرو رابرٹ...... بہت ہوگیا۔''

رابرٹ نے اپنی کرسی پیچھے کی اور میز سے اٹھ گیا۔ اس کی پلیٹ میں کھانا اسی طرح رکھا ہوا تھا۔ ''یہ لڑکا واقعی مجھ سے بہت نفرت کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔

لوئس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ صرف پریشان ہے۔ اسے اپنا باپ یاد آتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں کسی اور کو اس کی جگہ دینے کی کوشش کررہی ہوں۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے جواب میں کیا کہوں۔ لہٰذا ایک بار پھر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوگیا لیکن میں بھی اپنا کھانا ختم نہ کرسکا۔ شاید میرے منہ کا ذائقہ خراب ہوگیا تھا۔

☆☆☆

رابرٹ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دوسرے روز صبح مجھے واقعی جیسن کے سامنے گڑگڑانا پڑ گیا۔

''تمہارا شاپ لفٹر کل واپس پلٹ کر نہیں آیا۔'' جیسن نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس اس کے بارے میں مکمل معلومات ہیں۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہوگا کہ پولیس کے پاس شکایت درج کرواتے وقت یہ معلومات انہیں فراہم کردیں۔''

''یہ کام کل ہی ہونا چاہیے تھا۔'' اس نے بریف کیس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی پولیس اسٹیشن جاؤ اور اس کا خیال رکھنا۔ اس بار کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔ میری تمہارے باس رک سے مختصر بات ہوئی ہے اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر مجھے تم سے مزید پریشانی ہوئی تو وہ تمہیں فارغ کردے گا۔''

میں نے پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے راستے میں رک کو فون کیا تاکہ جیسن کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کرسکوں اور رک کا جواب سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں اس کنٹریکٹ کو کھونے کا نقصان برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر ہم نے ویسٹ وڈ کی برانچ میں اچھی کارکردگی دکھائی تو وہ ہمیں لاس اینجلز کے تمام اسٹورز کی سیکیورٹی دے دیں گے جس میں پاس وینا کا سب سے بڑا اسٹور بھی شامل ہے۔ میں نے پہلے ہی ڈون سے کہا تھا کہ تمہیں یہ ذمے داری نہ دی جائے۔''

''میں اس اسٹور میں کام کرنے والا واحد شخص نہیں ہوں۔ تم نے ایوننگ شفٹ میں سیکیورٹی کی ذمے داری کسے دی ہے؟''

”کسی کو نہیں۔“

”کیوں؟ رات میں بھی اسٹور سے چیزیں چوری ہوتی ہیں۔“

”جیسن کو شام میں سیکیورٹی نہیں چاہیے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ خود رات میں نگرانی کر سکتا ہے۔“

”یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔“

”ہاں۔ میں نے بھی اس سے اس معاملے پر ایک گھنٹے سے زیادہ بحث کی تھی۔ بہر حال اب یہ تمہاری ذمے داری ہے۔ تمہیں ایک مہینے کے اندر اسٹور کے نقصان کو نمایاں حد تک کم کرنا ہے ورنہ ہمارے ہاتھ سے یہ کنٹریکٹ نکل جائے گا اور تم بھی اس ملازمت سے فارغ ہو جاؤ گے۔“

پولیس اسٹیشن پر کافی رش تھا۔ جب میں واپس آیا تو جیسن دوپہر میں سونے کے لیے گھر جا چکا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ بقیہ دن سکون سے گزرے گا۔ میں بریک روم میں چلا گیا۔ وینڈنگ مشین سے سوڈے کی ایک بوتل خریدی اور اسے لے کر منیجر کے کمرے میں چلا گیا تاکہ سوڈا پینے کے دوران مانیٹر پر نظر رکھ سکوں۔ فلور پر بہت زیادہ لوگ نہیں تھے اور میری شفٹ ختم ہونے میں صرف آدھا گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔ اس لیے میں اپنے آپ کو کافی بہتر اور پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اچانک میں نے مانیٹر پر دیکھا کہ ایک لڑکا اپنی کمر کے پیچھے لٹکے ہوئے تھیلے میں سی ڈی ڈال رہا تھا۔ اس نے ہڈ والی نیلے رنگ کی سویٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ میں سیلز فلور کی جانب لپکا اور دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے بیگ کو سینسر سے گزارا، فوراً ہی کاؤنٹر کے پیچھے لگا ہوا بزر بجنے لگا۔ دونوں کاؤنٹر کلرک چلّائے اور اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے بھی جواب میں چلّاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے دیکھ لیا ہے۔“

جب تک میں اس کے قریب نہیں پہنچا، وہ لڑکا اپنی جگہ کھڑا رہا پھر اس نے اپنا ہڈ ہٹایا، مجھے دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرایا اور باہر کی جانب چل دیا۔ وہ رابرٹ تھا۔ میں اس کے پیچھے گیا تو وہ فٹ پاتھ پر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔

”ہے...... ہینڈی مین۔“ اس نے آواز لگائی۔ ”میں یہاں ہوں۔“

”تم نے کیا سوچ کر یہ حرکت کی؟“ میں نے غصے سے کہا اور اس کا بیگ پکڑ لیا۔

”اب کیا چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”دیکھو رابرٹ! یہ پاگل پن ہے۔ کیا تم جیل جانا چاہتے ہو؟“

”میں صرف تمہیں پریشان کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے یونہی جانے دو گے تو تمہاری نوکری چلی جائے گی اور اگر پولیس کے حوالے کرتے ہو تو میری ماں سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اگر میں جیل چلا گیا تو اس کا اثر میرے مستقبل پر پڑے گا۔ میری پڑھائی ختم ہو جائے گی اور مجھے کوئی نوکری بھی نہیں دے گا۔ اس کی ساری ذمے داری تم پر آئے گی اور وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ تم اس کے دوست ضرور ہو لیکن میں اس کا بیٹا ہوں اور خونی رشتہ سب سے مضبوط ہوتا ہے۔“

میں دم بخود کھڑا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ پہلے سوچا کہ اسے جانے دوں اور جیسن سے کہہ دوں گا کہ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ لوگوں کے ہجوم میں غائب ہو گیا لیکن اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ دونوں کاؤنٹر کلرک اور دیگر ملازمین ہمیں دیکھ رہے تھے اور وہ یقیناً حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں شاپ لفٹر کو پکڑنے اور اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے اس سے باتیں کیوں کر رہا ہوں۔ میں نے رابرٹ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ دیکھی، میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔

”تم مجھ سے کیوں نفرت کرتے ہو؟ میری وجہ سے تمہارے والدین میں طلاق نہیں ہوئی بلکہ ان کے درمیان بہت پہلے علیٰحدگی ہو گئی تھی۔ اس وقت تو میں تمہاری ماں سے ملا بھی نہیں تھا۔“

”تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”نہیں۔ میں صرف سمجھانا چاہ رہا ہوں۔ میں تمہاری ماں کو چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی ہے۔ میں تمہارے باپ کی جگہ لینے کی کوشش نہیں کر رہا اور نہ ہی میں نے تمہارے ساتھ باپ جیسا رویّہ رکھا۔ میں صرف تمہارا دوست بننا چاہتا ہوں۔“

”کوشش کر لو لیکن میں تمہیں اپنا باپ یا دوست نہیں بنانا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری اور میری ماں کی زندگی سے چلے جاؤ۔ یہ مت پوچھنا کہ کیوں؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا کہوں۔ میں نے اس کے ہاتھ سے بیگ لیا اور اس میں سے سی ڈی نکالنے کے لیے کھولنے لگا لیکن وہ اس طرح ڈیزائن کی گئی تھی کہ اس کو کھولنے کے لیے دونوں ہاتھ استعمال کرنا پڑتے۔ وہ میری ناکامی پر ہنسنے لگا لہٰذا میں نے بیگ اپنے کندھے پر لٹکایا اور واپس جانے کے لیے مڑتے ہوئے بولا۔ ”دفع

ہوجاؤ۔"

"ٹھیک ہے لیکن میں کل کچھ مزید سامان چوری کرنے آؤں گا۔ اگر اس وقت تک تمہاری ملازمت باقی رہ گئی تو...... کیونکہ جب تمہارے باس کو معلوم ہوگا کہ تم نے ایک اور چور کو جانے کا موقع دے دیا تو وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

وہ مسکرایا اور کھڑکی سے جھانکتے ہوئے لوگوں کو ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔ میں اندر گیا اور رابرٹ کے تھیلے میں سے سی ڈی نکال کر ٹرالی میں رکھ دیں۔ وہاں سے اسٹور کا کوئی ملازم انہیں شیلف میں رکھ دیتا۔ میرے جانے کا وقت ہوگیا تھا۔ میں نے کوٹ اٹھایا اور گھر کے لیے روانہ ہوگیا۔

رابرٹ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دوسرے روز جیسن نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور میرے سامنے ہی رک کا نمبر ملا کر فون مجھے پکڑا دیا۔ رک نے مجھے ڈھیروں باتیں سنائیں اور ملازمت سے برطرف کردیا۔ میں اپنی کار میں سوار ہوکر سانتا مونیکا چلا گیا اور دن کا بقیہ حصہ ساحل پر بیٹھ کر سمندر کی لہروں کو دیکھنے میں گزار دیا۔

☆☆☆

لوئس نے مجھے ہفتے کی شب ڈنر پر مدعو کیا۔ پروگرام کے مطابق میں نے دوپہر کی شفٹ ختم ہونے پر اسے شپ ٹاپ سے لیا اور ہم ڈنر کے لیے اس کے منتخب کردہ ریستوران میں چلے گئے۔ لوئس نے اس روز رنگین پھول دار اسکرٹ اور آسمانی بلاؤز پہن رکھا تھا۔ کھانا بہت مزے دار تھا۔ میں اسے رابرٹ کی چوری کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کیا۔ تاہم گفتگو کا وہ حصہ گول کر گیا جو میرے اور رابرٹ کے درمیان ہوئی تھی۔

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں نے اس بارے میں بہت سنجیدگی سے سوچا ہے اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس نفرت کی وجہ اس کا باپ ہے۔ وہ بچپن سے ہی اسے اپنا آئیڈیل سمجھتا تھا۔ میرے لیے طلاق لینے کا فیصلہ بہت مشکل تھا لیکن جب وہ مجھے چھوڑ کر سان ڈیاگو چلا گیا تو میں کیا کرتی۔ اس سے رابرٹ کو بہت تکلیف ہوئی۔"

"رابرٹ اب بھی اپنے باپ سے ملتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"ہاں۔ مہینے میں دو بار ویک اینڈ پر۔ اس تک جانے میں دو گھنٹے لگتے ہیں لیکن رابرٹ اب بھی یہی سمجھتا ہے کہ اسے باپ سے دور کردیا گیا ہے۔"

"لیکن......"

لوئس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "رابرٹ ناراض ہے۔ اسے ہمیشہ یہ تکلیف دہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا باپ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ پہلے وہ مجھے اس کا ذمے دار سمجھتا تھا لیکن پھر تھامسن اور میں نے اسے سمجھایا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے اس کے باپ کو گھر چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا مگر اب بھی اس کے دماغ میں کوئی بات ہے تو اسے نکال دینا چاہیے۔ میں اس کی دیکھ بھال کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ رہتی ہوں لیکن وہ اپنے باپ پر غصہ نہیں کرتا۔ کافی عرصے تک وہ اپنے ٹیچرز سے بدتمیزی کرتا رہا اور کئی بار اسے سزا ملی بلکہ ایک مرتبہ تو اسے اسکول سے نکالنے کی نوبت آگئی تھی جب اس نے اپنے ٹیچر پر ہاتھ اٹھایا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ ہر ایک سے نفرت کرتا ہے؟"

"یونہی سمجھ لو...... بہرحال اب وہ پڑھائی میں دلچسپی لے رہا ہے بلکہ گزشتہ برس تو اس کے بہت اچھے نمبرز آئے تھے۔ کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس میں یہ تبدیلی کب آئی؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"جب ہم دونوں نے ملنا شروع کیا۔ تم پہلے آدمی ہو جس کے ساتھ میں ایک سے زیادہ مرتبہ ڈیٹ پر گئی۔"

"واقعی؟"

لوئس میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔ "ہاں...... پہلے اور آخری۔ بہرحال تم میرے معیار پر پورا اترتے ہو اور اس کے باپ کی جگہ لے سکتے ہو لیکن رابرٹ تم سے نفرت کرتا رہے گا جب تک وہ اپنے باپ سے ناراض ہے۔"

"بہت خوب۔" میں نے کہا۔ "بہرحال میرے لیے یہ مایوس کن ہے۔"

کھانے کے بعد میں نے لوئس کو اس کے گھر پر چھوڑا۔ اگلے ویک اینڈ پر رابرٹ اپنے باپ سے ملنے جارہا تھا۔ لہٰذا ہم دونوں ایک ساتھ رات گزار سکتے تھے۔ میں نے لوئس کی ہنڈا اکارڈ ڈرائیووے میں کھڑی دیکھی تو مجھے ایک خیال سوجھا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ تم ایک ہفتے کے لیے مجھ سے کار بدل لو۔ میں بیسٹ ہاؤس کے منیجر کو چیک کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری کار پہچانتا ہے۔"

"کیا تم اس کا تعاقب کرو گے؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

اس روز صبح سے ہی بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے ہر چیز صاف اور نکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں بیٹ ہاؤس سے ایک بلاک کے فاصلے پر لوئس کی کار کی پسنجر سیٹ پر بیٹھا دوربین لگائے اسٹور کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہلے روز میں نے گاڑی سڑک سے آدھے بلاک کے فاصلے پر کھڑی کی اور جب جیسن دوسرے ملازمین کے ساتھ اسٹور بند کر کے باہر آیا تو میں سیٹ کے نیچے دبک گیا تاکہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ اس کے بعد میں نے ایک بلاک بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ فاصلے پر گاڑی پارک کرنا شروع کر دی۔ جیسن کی ایک عادت سے مجھے تجسس ہوا۔ میں نے پہلی رات ہی نوٹ کیا تھا کہ بیٹ ہاؤس کو مقفل کرنے اور اپنی کار تک جانے کے بعد وہ بلاک کے گرد ایک چکر لگاتا ہے اور اسٹور کے سامنے سے گزرتے ہوئے کار کی رفتار کم کر لیتا ہے۔ میں نے اس کا تعاقب نہیں کیا لیکن اس منظر کو دیکھنے کے بعد مجھے تجسس ہوا کہ کیا وہ بعد میں بھی یہ عمل دہرائے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ ہر رات کو اسٹور کے دروازے کو مقفل کرتا اور دوسرے ملازمین کے جانے کے بعد اپنی کار میں بلاک کے گرد ایک چکر لگاتا۔

میں نے اس کی نگرانی جمعرات کی رات سے شروع کی تھی اور اب بدھ آ گیا تھا۔ اب بھی بارش کی وجہ سے ہلکی سی کہر تھی اور سڑک گیلی ہو رہی تھی۔ اسی بوندا باندی میں جیسن اور دوسرے لوگ باہر آئے اور اسٹور کے ملازمین اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگے لیکن جیسن گزشتہ رات کی طرح اپنی کار تک گیا اور بلاک کے گرد چکر لگایا البتہ اس بار اس نے اسٹور کے بیرونی دروازے کے سامنے گاڑی کھڑی کر دی پھر وہ اسٹور کے دروازے کا تالا کھول کر اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی دو منٹ بعد ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں گتے کا ایک ڈبا اٹھایا ہوا تھا۔ اس نے کار کی ڈکی کھول کر وہ ڈبا اس میں رکھ دیا اور دوبارہ اسٹور میں چلا گیا۔ میں نے نائن الیون کو فون کیا اور چلتا ہوا اس کی کار کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا جب وہ دوسرا ڈبا لے کر آیا تو میں اس کی کار کے عقبی حصے پر جھکا ہوا تھا۔

''میں نے سب دیکھ لیا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ بالکل بھی نہیں گھبرایا اور پُرسکون لہجے میں بولا۔ ''تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان ڈبوں میں صفائی کا سامان ہے جو میں ریسٹ روم کی صفائی کے لیے گھر سے لایا تھا۔ وہ بہت گندے ہو رہے تھے اور اسٹور میں بلیچ ختم ہو گیا تھا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے دوسرا ڈبا بھی ڈکی میں رکھ دیا۔ پھر وہ اس طرح جھکا جیسے ڈبے کے لیے جگہ بنا رہا ہو لیکن میں اسے ٹائر کھولنے والی سلاخ نکالتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ جیسے ہی اس نے وہ سلاخ میرے سر کی طرف گھمائی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس طرح بھینچا کہ اس کا انگوٹھا چیخ گیا۔ اس نے ایک ہلکی سی چیخ ماری اور لوہے کی سلاخ زمین پر گر گئی۔ میں نے اسے لات مار کر دور کر دیا لیکن اس نے لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنی کار وہیں چھوڑ کر پیدل ہی چل پڑا۔ وہ ایک بلاک سے بھی کم فاصلے پر تھا کہ دو پولیس کاریں وہاں آ کر رکیں۔

میری نہ صرف یہ کہ ملازمت بحال ہو گئی بلکہ میں نے ایجنسی کے ساتھ اپنی ملازمت کی شرائط بھی دوبارہ طے کیں۔ بیٹ ہاؤس سے سامان غائب ہونے کی وجہ خود جیسن تھا۔ ہر شام جب وہ اسٹور بند کرتا تو اس پر لازم تھا کہ وہ الارم کمپنی کو فون کرے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے پاس اسٹور سے نکلنے اور دروازوں کو مقفل کرنے کے لیے تین منٹ ہوتے تھے۔ اس کے بعد الارم چالو ہو جاتا۔ جس دن اسے سامان چوری کرنا ہوتا تو وہ دوسرے لوگوں پر یہی ظاہر کرتا کہ وہ الارم کمپنی کو فون کر رہا ہے جبکہ درحقیقت وہ اپنی گرل فرینڈ کو فون کر رہا ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ اسٹور میں واپس آتا۔ چوری کا سامان گاڑی کی ڈکی میں رکھتا اور اس کے بعد وہ اسٹور کو تالا لگا کر گھر چلا جاتا۔ وہ کبھی سیکیورٹی کیمروں کی زد میں نہیں آیا کیونکہ وہ ہمیشہ جانے سے پہلے انہیں بند کر دیتا تھا۔

رک اور ڈون نے خود مجھ سے کام پر آنے کی درخواست کی۔ بیٹ ہاؤس کی انتظامیہ کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ وہ اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے پورے علاقے کے اسٹوروں کی سیکیورٹی کا ٹھیکا ڈون رک کو دے دیا اور مجھے اس کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس طرح میری تنخواہ بھی بڑھ گئی بلکہ ہر اسٹور کی آمدنی سے کمیشن بھی ملتا ہے۔ مجھے بہت زیادہ سفر کرنا پڑ رہا ہے اور جب لوئس کے پاس وقت ہو تو وہ بھی میرے ساتھ ہوتی ہے۔ چند روز قبل میں ٹسکون اسٹور کے معائنے کے لیے گیا تو لوئس اور رابرٹ بھی میرے ساتھ تھے۔ رابرٹ یونیورسٹی آف ایری زونا دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اس روز میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ اب وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتا۔ اسے یقین آ گیا ہے کہ میں واقعی ہرفن مولا ہوں۔

میرا نام ولیم گورڈن ہے۔ میری عمر اس وقت چھیالیس سال ہے اور میں گزشتہ دس سال سے ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ عموماً شام پانچ بجے میں دفتر چھوڑ دیتا ہوں لیکن کبھی اگر کوئی اہم کام پڑ جائے تو سات آٹھ بھی بج جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں فون کر کے اپنی بیوی کو یہ ضرور بتا دیتا ہوں کہ دفتر سے اٹھ کر کلب چلا جاؤں گا اور کھانا وہیں کھاؤں گا۔

یہ ایک ایسی ہی شام تھی جب مجھے دیر تک کام کرنا پڑا۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے پکاڈلی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ سڑک پار کر کے جیسے ہی میں نے فٹ پاتھ پر قدم رکھا، میرے داہنے پیر کو کسی دبیز نرم چیز سے ٹھوکر لگی۔ جب میں نے اس چیز

فریب آرزو

ابوالفرح ہمایوں

فریب کی صورت ہزار... مگر مقصد صرف ایک ہی ہوتا ہے... دھوکا اور صرف دھوکا... وہ بھی ایک ایسی ہی آرزو دل میں بسا بیٹھا تھا جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا کیونکہ وہ اپنے ایام جوانی کو اپنی مٹھی میں قید رکھنا چاہتا تھا اور وہ فریب اتنا دلفریب تھا کہ اسے تمام عمر اپنے جال میں ہی مقید رکھا حتیٰ کہ زندگی کی رعنائیوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

بے بنیاد حقیقتوں کے مکروفریب اور ڈھلتی عمر کی خوفناک بے بسی

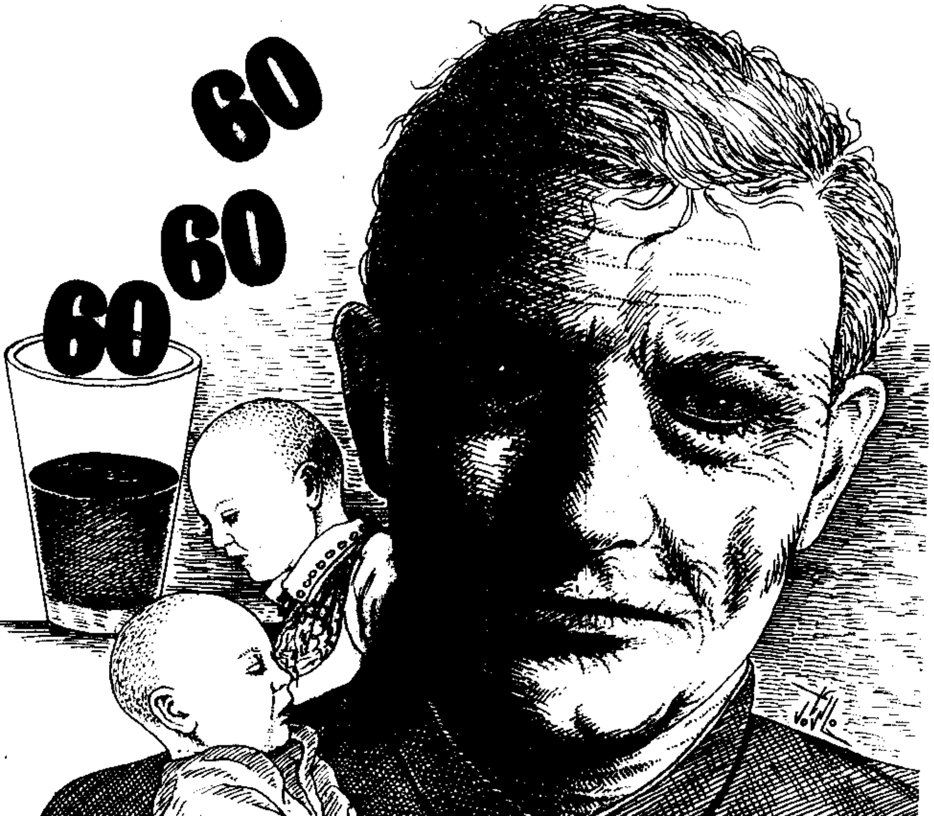

کو اٹھا کر دیکھا تو وہ ایک پرس تھا اور اچھی طرح بھرا ہوا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد میں نے اپنی دریافت کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس میں دس پاؤنڈ کے ایک سو نوٹ اور سو پاؤنڈ کے پچاس نوٹ موجود تھے اور پھر فوراً ہی میری نظر ایک وزیٹنگ کارڈ پر پڑی۔ کارڈ پر نام اور پتا درج تھا۔ ''مسٹر رابرٹ اسمتھ۔ کوئین مینشن، بے فیر۔'' آگے فون نمبر بھی موجود تھا۔

کلب پہنچ کر میں نے فون نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ایک نرم و لطیف آواز آئی۔ ''میں رابرٹ اسمتھ بول رہا ہوں۔ فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

میں نے اسے پرس کے بارے میں بتایا اور کہا کہ کل میں آپ کی امانت بھجوا دوں گا۔ لیکن جواب میں رابرٹ نے التجا کی کہ میں ابھی آ کر اس سے مل لوں۔ شاید وہ براہِ راست میرا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ محبت آمیز درخواست.... ٹھکرا نہ سکا اور اس کے گھر کی جانب چل پڑا۔

رابرٹ نے میرا استقبال انتہائی پرتپاک انداز میں کیا اور سیدھا ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ یہ کمرا نفاست اور خوش ذوقی کا مظہر تھا اور اس بات کا آئینہ دار تھا کہ مالکِ مکان کس قدر پاک اور اعلیٰ و ارفع خیالات رکھتا ہے۔

میں نے رابرٹ کی شکل صورت اور شخصیت کا بغور جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ درمیانہ قامت اور قدرے فربہ جسامت کا عام آدمی تھا۔ کلین شیو، گھنے اور ہلکے سبزی مائل بال، عمر تقریباً ساٹھ برس ہوگی۔ مجموعی طور پر تو اس کی شخصیت میں کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں عجیب سا جادو یا مقناطیسیت پوشیدہ تھی۔ چہرے پر تحمل، رحم دلی، فکر و تردد اور کھلنڈرے پن کے جذبات بیک وقت مچل رہے تھے۔ علاوہ ازیں ایسی ذہانت اور متانت چھائی ہوئی تھی جو اعلیٰ حسب نسب کے تجربہ کار اور ذہین افراد میں پائی جاتی ہے۔

مجھے اپنے چہرے کا اس قدر بغور جائزہ لیتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور پھر وہ آہستہ سے گویا ہوا۔ ''میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ اگر اجازت دو تو شروع کروں؟''

اور میرے حسین تصورات کا محل دھڑام سے نیچے آن گرا۔ ناگواری کا ایک شدید احساس میرے دل میں ابھرا۔ ''کیا یہ شخص اندر سے اتنا ہی بودا ہے؟ ایک عمر رسیدہ اور ناکارہ آدمی...... جس کے پاس اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ اجنبیوں کو پکڑ پکڑ کر اپنی گزشتہ زندگی کا کوئی احمقانہ اور فرسودہ واقعہ سنایا کرے۔'' میں خود اپنے آپ سے شرمندہ ہو گیا اور انتہائی بے دلی سے کہا۔ ''مجھے گھر جانے کی جلدی ہے۔ آپ کی کہانی پھر کبھی سہی۔''

رابرٹ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''صرف ایک منٹ۔'' اس نے پرس کو ہاتھ میں لے کر میرے سامنے لہرایا۔ ''یہ پہلا اتفاق نہیں ہے کہ مجھ سے کوئی پرس گم ہو گیا ہو۔ میں اب تک تین پرس گم کر چکا ہوں، لیکن تم وہ پہلے شخص ہو جس نے میری چیز مجھے لوٹائی ہے۔ کیا تم جاننا نہ چاہو گے کہ اس میں کیا راز پوشیدہ ہے؟'' اور پھر فوراً ہی اس نے ایک دوسرا غیر متعلق سا سوال داغ دیا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، میری عمر کیا ہوگی؟''

اس سوال سے مجھ پر ایک بجلی سی گر پڑی۔ میں یوں دم بخود سا رہ گیا، گویا کسی نے یکدم میرا تمام خون نچوڑ لیا ہو۔ ضرور اس بوڑھے کے جسم میں کوئی بدروح سرایت کر گئی ہے۔ خوف و دہشت کی ایک لہر میرے ہوش و حواس پر چھا گئی۔

میں نے بہ مشکل اپنی ہمت کو مجتمع کیا اور کہا۔ ''میرا خیال ہے تمہاری عمر ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔''

''میری عمر اس وقت ایک سو بیس سال ہے۔'' رابرٹ نے میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' اور پھر میری ذہنی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''اچھا، اب تم گھر جاؤ...... لیکن کیا کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا پسند کرو گے؟'' میرے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار دیکھ کر وہ تیزی سے بولا۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اپنے اس فیصلے پر پچھتانا نہیں پڑے گا۔ میرے سینے میں بہت سے راز دفن ہیں اور میں جو کہانی تمہیں سنانے والا ہوں، وہ ایک لاجواب اور ناقابلِ یقین کہانی ہے۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''آؤ! میں تمہیں باہر تک چھوڑ آؤں۔''

میرے منہ سے اطمینان کا سانس خارج ہوا۔ 'کل فون پر معذرت کر لوں گا۔' میں نے دل میں سوچا اور رابرٹ کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑا۔

''میں عموماً آٹھ بجے کھانا کھا لیتا ہوں لیکن بہتر ہے کہ تم سات بجے تک آ جاؤ۔ کچھ گپ شپ بھی رہے گی۔'' رابرٹ نے کہا۔

نہ جانے کیوں میں رابرٹ کی دعوت مسترد نہ کر سکا اور دوسرے دن میرے قدم خود بخود اس کے گھر کی جانب اٹھ گئے۔ شاید کھانے کے لالچ نے میرے خوف پر قابو پا لیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے تسلیم کیا کہ واقعی یہ ایک لاجواب دعوت تھی۔ ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد رابرٹ

مطلب کی بات پر آ گیا۔ ’’اب پہلے میری کہانی سنو۔ اس کے بعد بتاؤں گا کہ اس کہانی کو سنانے کے لیے میں نے تمہارا انتخاب کیوں کیا۔‘‘

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ شاید مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے یا مجھ پر کوئی سحر طاری تھا۔ رابرٹ نے میرے چہرے کا جائزہ لیا اور میری خاموشی کو نیم رضامندی سمجھتے ہوئے اپنی کہانی سنانا شروع کی۔ ’’آج سے ٹھیک ایک سو بیس سال قبل میں پیدا ہوا۔ عمرِ عزیز کے ساٹھ سال تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا، سوائے اس کے کہ چالیس سال کی عمر میں، میں نے شادی کر لی۔ ہماری شادی بے حد کامیاب رہی جس کی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں کو ہی بچے پسند نہیں تھے۔ ہم دونوں دنیا کے بکھیڑوں سے آزاد تھے لہٰذا خوب سیر و تفریح رہتی۔ اس دوران مجھے اپنے شوق کی تکمیل بھی مقصود ہوتی۔ میرا شوق کتابیں جمع کرنا ہے مگر کسی خاص موضوع پر نہیں۔ میرا معیارِ انتخاب صرف عجیب وغریب، خوفناک اور ہولناک قسم کی تصویریں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کی جلد کسی جانور کی کھال یا کسی درخت کی چھال وغیرہ کی ہو تو وہ بھی مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ سولہویں صدی میں چمڑے کی جلد کی بنی ہوئی کتابیں کافی تعداد میں نظر آنے لگی تھیں جو رفتہ رفتہ ناپید ہو گئیں۔ یہ جلدیں بے انتہا خوب صورت اور کبھی کبھی خوفناک نقش و نگار سے مزین ہوتی تھیں۔ مجھے جو کتاب ملی، وہ بھی ایسی ہی ایک نادر چیز تھی۔ اس کے گرد پوش پر کسی جانور کی انتہائی باریک کھال منڈھی ہوئی تھی۔ یہ کتاب 1519ء میں شائع ہوئی اور اس پر کوئی نام یا عنوان نہیں تھا۔ اندرونی اوراق میں ’’ایک ساحرہ کی کارگزاری‘‘ لکھا ہوا نظر آیا۔ مزید تشریح کے طور پر تحریر تھا...... ’’سفید اور کالے جادو کے واقعات، جن کو پڑھ کر آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔‘‘ میرا اگرچہ ان فضول باتوں پر اعتقاد نہیں تھا لیکن پھر بھی میں پڑھتا چلا گیا۔ یوں تو بہت سی باتیں دلچسپی اور خوف سے بھرپور تھیں لیکن آگے چل کر جو صفحہ میرے ہاتھ لگا اس کی تحریر نہایت دلکش تھی۔ ’’دورِ شباب یقینی طور پر واپس۔ وہ نسخہ جو ماہرینِ طب بھی نہ پا سکے۔ کھوئی ہوئی جوانی دوبارہ حاصل کیجیے۔‘‘ جس وقت کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس وقت میری عمر ساٹھ سال ہو چکی تھی اور ظاہر ہے مجھے اس نسخے میں بے پناہ کشش محسوس ہوئی۔ میرے اعصاب تن گئے اور میں نے اس نسخے کو ازبر کر لیا۔ وہ فارمولا مجھے آج بھی یاد ہے لیکن میں تمہیں بتاؤں گا نہیں۔‘‘ وہ میری طرف دیکھ کر استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

’’کافی دیر گزر چکی ہے۔ میرے خیال میں کافی کا ایک اور دور ہو جائے۔‘‘ وہ جلد ہی کافی بنا کر لے آیا۔ شاید وہ ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرنے کا عادی تھا۔ ’’اور اب جو کچھ میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں، اسے سن کر شاید تمہیں میرے صحیح الدماغ ہونے پر شک ہونے لگے لیکن میری گزارش ہے کہ خاموشی اور توجہ سے میری بات سنتے رہو۔ اس فارمولے کو تیار کرنے میں مجھے چھ ماہ لگ گئے۔ کئی اجزا دور دراز سے منگوانے پڑے اور ان کا تناسب بنانے میں بھی کافی عرق ریزی کرنی پڑی۔ کشید کیا ہوا یہ عرق صرف بارہ اونس تھا۔ رات کو سوتے وقت میں نے پورا گلاس نوش کر لیا۔ میں نے اپنی بیوی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن یہ میری سنگین کوتاہی تھی جس کا خمیازہ مجھے برسوں بھگتنا پڑا۔ دوا نے میرے حلق میں ایک تیز جلن پیدا کر دی اور پیٹ کے اندر جا کر بھی خوب طوفان مچایا۔ یوں لگ رہا تھا گویا آنتیں بار بار کٹ رہی ہوں۔ میں درد کی شدت سے بے حال ہو رہا تھا۔ چند منٹوں کے بعد یہ قیامت خیزی گزر گئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد مجھے گہری نیند آ گئی۔ دوسری صبح جب میری آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر میری امیدوں پر اوس پڑ گئی کہ میرے جسم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جوانی اور شباب کا دور دور تک کوئی پتا نہ تھا اور میری شکل پر وہی نحوست برس رہی تھی جو گزشتہ کئی سالوں سے چلی آ رہی تھی۔ میں نے اپنی ضعیف الاعتقادی پر ہزار بار لعنت بھیجی اور جادوگروں اور نیم حکیموں کو خوب برا بھلا کہا۔ دفتر جانے کے لیے غسل کیا اور دوسرا سوٹ پہن لیا۔ جلدی میں ضروری کاغذات پہلے والے سوٹ میں ہی رہ گئے۔ میں عموماً ٹیکسی میں دفتر جایا کرتا ہوں لیکن اس روز ہوا اس قدر خوش گوار چل رہی تھی کہ میں نے پیدل ہی جانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی میں چند ہی قدم گیا تھا کہ مجھے شدید چکر آ گیا اور میں سڑک پر گر پڑا۔

’’اب میں ان واقعات کو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہوں جو میری بے ہوشی کے دوران پیش آئے۔ خیال رہے کہ جو کچھ میں بیان کر رہا ہوں، وہ صرف میرے زورِ تخیل کا نتیجہ ہیں۔ مجھے فوراً سینٹ جارج اسپتال لے جایا گیا۔ شناختی کاغذات موجود نہ ہونے کی صورت میں اسپتال والوں نے پولیس کو اطلاع دے دی اور پولیس کا ایک سپاہی میری حفاظت پر مامور کر دیا گیا۔ یہ تین بجے رات کا وقت تھا۔ نرس اپنے معمول کے راؤنڈ پر تھی کہ اچانک ایک گھنٹی

گھٹی سی چیخ سن کر وہ ٹھٹک سی گئی۔ یہ میری آواز تھی۔ اس نے تیزی سے میرے بستر کا رخ کیا اور دیکھا کہ کپڑوں کے اندر پھنسا ہوا کوئی ننھا منا سا جسم ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ وہ چیخ یہیں سے برآمد ہوئی تھی جسے سن کر وہ دم بخود رہ گئی۔ نرس نے تیزی سے تمام کپڑے ہٹائے اور ایک نوزائدہ بچے کو برآمد کرلیا۔ اس بستر پر جو عمر رسیدہ شخص پہلے سے موجود تھا، وہ اب غائب تھا۔ دراصل یہ بچہ وہی بوڑھا آدمی تھا جو شباب حاصل کرنے کی حرص میں دوبارہ بچہ بن گیا تھا۔

''آگے کے حالات کا تم خود بھی اندازہ لگا سکتے ہو۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ اخبار والوں نے عجیب وغریب کہانیاں گھڑلیں اور عوام میں تجسس کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن یہ راز کوئی نہ جان سکا کہ اس بستر پر جو بوڑھا لایا گیا تھا، وہ کہاں چلا گیا اور یہ نوزائدہ بچہ کہاں سے نازل ہوگیا۔ حقیقت میرے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ واقعی عام زندگی میں ایسا ہونا ممکن نہیں، مگر یہ معجزہ ہوچکا تھا۔

''نو دن تک اسپتال میں ایک حشر کا منظر برپا رہا... لیکن آہستہ آہستہ لوگ اس واقعے کو فراموش کرتے چلے گئے۔ اب ذرا اس بات پر بھی غور کرو کہ اس دوران میری بیوی پر کیا گزری ہوگی۔ خوف، دہشت، امید اور ناامیدی کی کیفیت نے اس کے رات دن کا چین وسکون چھین لیا تھا لیکن اس کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے کہ ان حالات میں بھی اس کے ہوش وحواس قائم رہے اور اس نے مختلف اقدامات کے ذریعے پولیس اور عدالت میں ثابت کردیا کہ وہی گم شدہ شخص اس کا شوہر تھا جو شاید اس دنیا کو چھوڑ گیا تھا۔ دوسرا مثبت قدم جو اس نے اٹھایا، وہ یہ تھا کہ فوراً اس نامعلوم اور نوزائدہ بچے کو گود لے لیا اور اپنے شوہر کے نام پر اس کا نام رابرٹ اسمتھ جونیئر رکھ دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ بچہ اپنے بارے میں کچھ جانتا تھا؟ کیا اسے معلوم تھا کہ وہ کون ہے اور رابرٹ اسمتھ سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ نہیں...... لڑکے کو یقیناً کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ رابرٹ اسمتھ کو ان باتوں کا احساس اس وقت ہونا شروع ہوا جب وہ چودہ سال کی عمر کو پہنچا اور سولہ سال کی عمر میں حافظے کی بازیابی مکمل ہوچکی تھی۔ اسے اپنی گزشتہ زندگی کا ایک ایک لمحہ یاد آگیا۔''

رابرٹ اسمتھ نے دلچسپ اور شگفتہ پیرائے میں مزید بتایا۔ ''میری بیوی جسے اب میں ''ممی'' کہنے لگا تھا، نے دوسری شادی نہیں کی۔ عدالت کے ذریعے اس نے میرے بقایا جات وصول کرلیے۔ میری انشورنس کی خطیر رقم بھی اسے مل چکی تھی۔ اپنی پہلی زندگی میں، میں ایک کفایت شعار شخص تھا اور میں نے کافی رقم پس انداز کررکھی تھی۔ میری یہ دوراندیشی رابرٹ اسمتھ جونیئر کے لیے کافی مفید ثابت ہوئی۔ اب وہ ایک امیر آدمی تھا اور اسے ہر طرح کی سہولت حاصل تھی۔

''جب میری عمر چالیس سال ہوئی تو میری ''ماں'' کا انتقال ہوگیا۔ وہ میرے لیے اتنا کچھ چھوڑ گئی تھی کہ میں تمام عمر عیش وآرام کے ساتھ گزار سکتا تھا اور...... میرے عزیز دوست! اب میں تمہیں یہ کہانی سنانے کا اصل مقصد بیان کرتا ہوں۔ میرے خیال میں زندگی کا اصل لطف ساٹھ سال کی عمر تک ہی محدود ہے۔ چنانچہ چند ماہ قبل میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب مجھے تجدید شباب کی طرف توجہ کرلینی چاہیے۔ میں نے تمام دوائیں منگوا کر ان کا عرق کشید کرلیا ہے اور اب میں عمل کرنے کے لیے بالکل تیار بیٹھا ہوں۔ ان دنوں ذرا اس مسئلے پر غور وفکر کررہا ہوں کہ پچھلی بار جب میں نے یہ دوا استعمال کی تھی تو اپنے مستقبل کا تحفظ نہیں کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے نہایت مشکل... زندگی گزارنی پڑی۔ اب میں وہی غلطی دہرانا نہیں چاہتا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی ایمان دار اور راست باز انسان کو تلاش کروں۔ وہ ایمان دار شخص میری تمام دولت رابرٹ اسمتھ دی تھرڈ کے نام پر کسی بینک میں جمع کرادے اور اٹھارہ سال کی عمر تک میری سرپرستی کی ذمے داری برداشت کرے۔ سن بلوغت کو پہنچتے ہی وہ سب کچھ میرے حوالے کرکے الگ ہوجائے گا۔ چنانچہ اس راست باز انسان کو تلاش کرنے کے لیے میں نے ایک حکمت عملی تیار کی۔ اسی حکمتِ عملی کے تحت تمہیں وہ پرس ملا اور مجھے وہ عظیم شخص مل گیا جس کی مجھے تلاش تھی۔''

''مسٹر رابرٹ! کیا تم خود اعتمادی کے نشے میں غلط انتخاب تو نہیں کر گئے؟'' ایک طویل اور دلچسپ کہانی سننے کے بعد میں نے پہلی بار زبان کھولی۔

رابرٹ نے میری جانب یوں بے چارگی سے دیکھا گویا میری عقل پر ماتم کررہا ہو۔ ''تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ بٹوے والی رقم تو کوئی خاص نہیں تھی لیکن ایک خطیر رقم کے لیے کسی کے بھی دل میں بے ایمانی آسکتی ہے۔'' مجھے اثبات میں سرہلاتے دیکھ کر وہ پھر بول اٹھا۔ ''تمہارا خیال کافی حد تک درست ہے لیکن دنیا میں کچھ ایسے اصول پرست اور ایمان دار لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں دنیا کی تمام دولت بھی نہیں خرید سکتی...... اور مسٹر گورڈن! میں بلاجھجک

دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ بھی انہی عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں۔'' اس نے بے حد احترام سے میرے ہاتھ دبائے اور بولا۔ ''ایک سوبیس سالہ زندگی اور تجربے کی بنیاد پر میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے تمہیں دل سے پسند کرلیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ زندگی بھر ہم دونوں اچھے دوست بن کر رہیں۔'' میں خوش ہوا اور ابھی جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ رابرٹ نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے بچے ہیں؟''

میں خوش دلی سے مسکرایا۔ ''تین چار دنوں میں ہمارے پہلے بچے کی آمد آمد ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں جلد گھر جانے کے لیے بے چین ہوں۔''

''اوہ۔ یہ تو بڑی خوش آئند بات ہے۔'' رابرٹ نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ ''گویا اب مجھے تیسری بار پیدا ہونے کے لیے جلدی کرنی پڑے گی۔'' گویا اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس بار ہمارے یہاں پیدا ہوگا۔ ''اب دو بچے، یعنی کہ دو بھائی یا دو بھائی بہن ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوں گے۔ میں عاجزی کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنا بیٹا بنالو۔ میں تمہیں اچھا خاصا معاوضہ دوں گا۔''

میرا دماغ کھولنے لگا۔ معاوضے کی بات کرکے گویا اس نے میرے خلوص اور دوستی کے جذبے کی توہین کی تھی۔ غصے کی شدت سے میرا حلق خشک ہونے لگا اور میں صرف تھوک نگل کر رہ گیا۔

رابرٹ میرے جذبات سے بے خبر اپنی کہے جارہا تھا۔ ''اب تمہیں اگلے مرحلے کے بارے میں سمجھاتا ہوں۔ تم بحیثیت ایک دوست کے مجھے اپنے گھر لے جاؤ گے اور وہیں قیام کرنے کی پیشکش کروگے۔ رات کو میں وہ شباب آور دوا استعمال کرلوں گا اور اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں میری تیسری زندگی شروع ہوجائے گی۔ تم اپنی بیوی کو تمام بات بتاکر اس سے اجازت لے لو۔ اگلی زندگی میں وہ میری ماں ہوگی اور میرے لیے قابلِ احترام بھی۔ میری پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے جو رقم تم مناسب سمجھتے ہو، وہ میں تمہیں فی الفور ادا کردوں گا، اس کے ساتھ پچاس ہزار پاؤنڈ تمہارا انعام۔ تمہارے بچے کے تمام اخراجات بھی میرے ذمے۔ جب میری عمر اٹھارہ سال ہوجائے گی تو تم میری تمام دولت میرے حوالے کردو گے اور خود علیحدہ ہوجاؤ گے۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے زبان کھولنی چاہی لیکن رابرٹ نے فوراً ہی میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ابھی تم گھر جاؤ اور اپنی بیوی سے مشورہ کرلو۔ کل صبح فون کرکے ہاں یا نہ میں جواب دے دینا۔''

میں خاموشی سے اٹھ کر گھر چلا آیا۔ بیوی میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ میں نے جب اسے رابرٹ کی داستان سنائی اور اس کی خواہش سے آگاہ کیا تو میری امید کے برعکس، وہ بچوں کی طرح خوش ہوکر تالیاں بجانے لگی۔ یقیناً وہ یہ معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی کہ اچھا بھلا ساٹھ سالہ بوڑھا کیسے دوبارہ بچہ بن جاتا ہے۔ اس نے فوراً مجھے رابرٹ کی پیشکش منظور کرلینے پر مجبور کردیا اور خوشی سے بے قابو انداز میں بولی۔

''ڈارلنگ! ہمارے بیٹے ڈیوڈ کو بھی ایک ساتھی مل جائے گا اور دونوں کو تنہائی محسوس نہیں ہوگی۔'' گویا اسے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ ایک بیٹے کی ماں بننے جارہی ہے اور اس نے نام بھی طے کرلیا تھا۔ ''ہماری مالی مشکلات بھی ختم ہوجائیں گی۔''

رقم کا معاملہ میرے لیے بھی پُرکشش تھا۔ میں نے صبح ہوتے ہی رابرٹ کو اثبات میں جواب دے دیا اور شام کو اسے اپنے ہمراہ گھر لے آیا۔ رات کا کھانا ہم نے اکٹھے کھایا اور پھر رابرٹ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تیسرے دن سہ پہر چار بجے وہ معجزہ رونما ہوگیا اور ٹھیک دو گھنٹے بعد ہمارا فرزند ارجمند ڈیوڈ بھی آن دھمکا۔ دونوں واقعی جڑواں بھائی لگتے تھے۔ ہر چیز میں اس قدر مماثلت تھی کہ میں تو میں...... ان کی ماں بھی ان کی پہچان میں غلطی کرجاتی تھی۔

اسی مشابہت اور مماثلت نے میرا سارا منصوبہ چوپٹ کرکے رکھ دیا۔ سوچ بچار میں وقت گزرتا چلا گیا اور میں یہ فیصلہ نہ کرپایا کہ میرا اپنا بیٹا کون ہے اور پرایا کون۔

آج میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے سوچ لیا تھا کہ رابرٹ کا قصہ پاک کرکے اس کی تمام دولت اپنے قبضے میں کرلوں گا۔ رابرٹ اسمتھ نے اپنی ایک سوبیس سالہ زندگی میں جو تجربہ حاصل کیا تھا، وہ یقیناً اچھا خاصا ہوگا لیکن وہ مجھے پہچاننے میں غلطی کرگیا۔

میں اسی کشش و پنج میں مبتلا تھا کہ کہیں غلطی سے اپنے ہی بیٹے کو ہلاک نہ کرڈالوں کہ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ''جب رابرٹ سولہ سال کی عمر کو پہنچے گا، تب اس کی یادداشت بھی واپس آجائے گی اور میرا مخمصہ دور ہوجائے گا۔ سب سے پہلے تو میں زبردستی اس سے وہ شباب آور نسخہ حاصل کروں گا اور پھر سوچوں گا کہ اب کیا کرنا چاہیے کیونکہ تجدید شباب میرا بھی حق ہے۔''

نواں حصہ

رنگ آسماں

اے۔آر۔راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کران کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اتراکہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیالیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیاکیونکہ ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک وخون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق ومغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

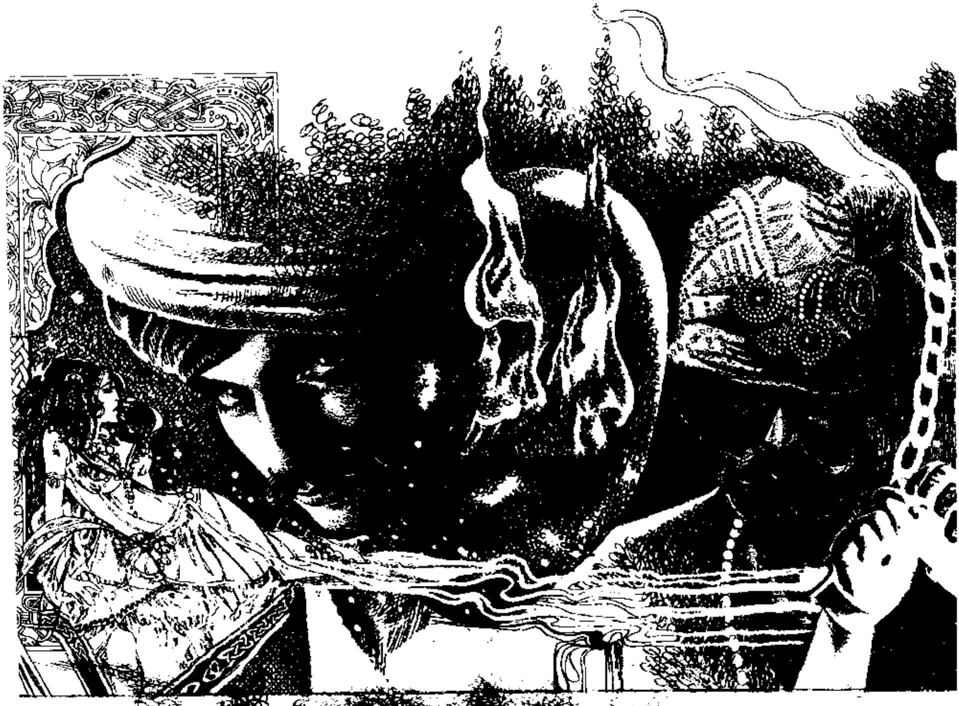

گذشتہ افسانے کا خلاصہ

یہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہِ شالیہ کے گھنے جنگلوں اور سنگلاخ پہاڑیوں کی دلکش وادیوں میں ایک مختصر قافلہ محوِ سفر ہے۔ اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ، وضع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسراریت اور جستجو اسے لندن سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ اس قافلے میں اس کی نیلی آنکھوں والی جوان اور حسین بیٹی ریتا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً تجسس پسند اور مہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اوباش بھتیجا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن گارشیا بھی ساتھ ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور امجد خان، ادھیڑ عمر خانساماں میاں بیوی نندو اور شانتا کے علاوہ ایک بانکا سجیلا کڑیل نوجوان شوکت حسین بھی اس قافلے میں شامل ہے۔ یہ جنرل مائیکل شا کے سائیس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شوکت عرف شوکی، ریتا کو دل بیٹھا ہے مگر مزاجاً گھمنڈی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عناد ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ روا رکھے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس مہم جوئی کے دوران ایک پراسرار بستی کا کھوج لگاتا ہے۔ کوہِ شالیہ کی تین خودمختار ریاستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں معروف ہیں اور انہی سازشوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے پانچ مسلم اور جری جانباز گوریلوں کا گروپ اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی ریحان ہے جو فوج آزادی کے سپہ سالار جنرل شمیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارودی ماہر کہا جاتا ہے۔ دوسرا احسان جامو، جو کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذاتِ خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروہ "کاروانِ مجاہد" کہلاتا ہے۔ باقی دو ساتھی شرجیل اور قیصر شاہ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔ غاصب فرنگیوں کو شبہ تھا کہ منتشر مسلم باغی گروہ کوہِ شالیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنا سکتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو یکجا کر سکیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا "سلسلۂ تسلط" کوہِ شالیہ کی ان تینوں قابلِ ذکر ریاستوں تک دراز کرنا بھی تھا۔ لہٰذا مکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھیلتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے ریاست ناگرہ کے مہاراجا چندر گپتا کی طرف بہ ظاہر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور پھر مشترکہ طور پر باقی دو ریاستوں تریپال اور پالن پور کے خلاف عسکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ عسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جاسکے۔ تریپال میں مسلم نواب شہباز خان اور پالن پور میں مہاراجا مہندر سنگھ گدی نشین ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔ مہارانی نجو بائی اپنے بیٹے ایش کمار کو ولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتا کی پہلی اور مرحومہ بیوی کے بطن سے تھا۔ مہارانی نجو بائی کی ایک جواں سال خوبصورت بیٹی سونجا بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار کو راستے سے ہٹانے اور اپنے بیٹے ایش کمار کا راستہ صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہاپجاری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔ بدری ناتھ جس کا اپنا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بدری ناتھ اپنے پجاریوں کے ذریعے ہنری برنارڈ کو قتل کرا دیتا ہے۔ مہارانی نجو بائی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ملوا دیتی ہے۔ تاہم گلاس کی تبدیلی کے بعد زہر ملا دودھ مہاراجا چندر گپتا پی لیتا ہے اور پرتاب کمار کے بجائے وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پرتاب کمار راجا بن جاتا ہے اور قتل کی تحقیقات کرواتا ہے۔ شک نجو بائی پر ہوتا ہے تاہم پرتاب نجو بائی کو سزا نہیں دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ادھر علی تریپال پہنچتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے تاہم اپنے بارے میں بتانے پر اور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر انسپکٹر اسے نواب کے بھائی سراج کے پاس لے جاتا ہے۔ تاہم وہ نواب شہباز سے ملاقات کرنے کا کہہ کر سراج سے اپنی جان چھڑاتا ہے مگر راستے میں کچھ لٹیرے پولیس کی گاڑی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے نکلتا ہے اور نواب شہباز کے پاس پہنچ کر انہیں فرنگیوں کی سازش سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر اریبہ کے ہاتھوں فرنگی افسر بروجر کا قتل ہو جاتا ہے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ شوکی اینڈ کمپنی کے خیموں میں آگ لگ جاتی ہے اور امجد خان، نندو بابا اور شانتا جل کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ آگ پراسرار بستی کے عجیب و غریب لوگ لگاتے ہیں تاہم ریتا انہیں رام کر لیتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ لوگ ان کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بدری ناتھ ایک انگریز لڑکی کی بلی چڑھا دیتا ہے۔ ماریا کا خنجر ایک لڑکی بالی کے پاس ہوتا ہے جو بدری ناتھ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ پرس رام اسے سمجھاتا ہے کہ وہ خنجر ان کے لیے مصیبت بن سکتا ہے مگر وہ اس کی بات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ راجا پرتاب کمار اریبہ کو بری کر دیتا ہے جس کے باعث وہ انگریزوں سے دشمنی پال لیتا ہے۔ ادھر بچھو رام ماریا کے باپ کرنل اینڈرسن کو خبر دیتا ہے کہ اس کی بیٹی کے غیاب میں مندر کے پجاریوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ کرنل اینڈرسن اسے پکی معلومات حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے تاکہ وہ ان پر چڑھائی کر سکے۔ بچھو رام نجو بائی کو یہ خوش خبری سناتا ہے کہ بہت جلد وہ تخت و تاج کے مالک بننے والے ہیں مگر وہ نہیں جانتا کہ نجو بائی کینہ پرور مادہ مکڑی کی طرح اسے ہڑپ کرنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

ناگرہ کے آسمان پر جنگ کے سیاہ بادل مزید گہرے ہونے لگے تھے۔

راجا پرتاب کمار کے خط کا جواب ابھی تک نہیں پہنچا تھا لیکن ریاست تریپال پور سے نواب شہباز خان کا خط ضرور آگیا جسے فوراً راجا پرتاب کمار کو پیش کر دیا گیا۔ وہ اس خط کے مضمون اور نواب شہباز کی باتوں سے پورے طور پر

اتفاق کرتا تھا۔

راجا پرتاب کمار نے فوراً یہ خط اپنے مشیر سترام داس کو دکھایا اور مشورہ طلب کیا۔

''ستر ام داس! اس خط کو غور سے پڑھو...... کیا یہ ہمارے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتا؟ ہمیں اس کا کیا جواب دینا چاہیے، تر۔پال کے نواب صاحب کو......؟''

ستر ام داس نے ایک نظر راجا پرتاب پر ڈالی اور اس نے فوراً ہی راجا کے چہرے سے مترشح، بیک وقت اطمینان اور جوش کی سی کیفیات تاڑ لیں۔ اس نے وہ خط غور سے پڑھا اور بولا۔

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تر۔پال پور کے نواب کا خط آپ کے خیالات اور ان خدشات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے، جب اس فرنگی ٹولے کی یہاں آپ سے ایک اہم نشست کے سلسلے میں آمد ہوئی تھی۔ آپ کے چہرے کی طمانیت بتاتی ہے کہ آپ خود بھی یہی چاہتے تھے کہ کوہ شالیہ کی تینوں ریاستیں متحد ہو کر فرنگیوں کی کسی بھی جنگی جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔ دوسری جانب آپ کے چہرے کا جوش یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ اس کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار بھی ہیں۔'' اتنا کہہ کر ستر ام داس کچھ سوچتے ہوئے انداز میں ذرا چپ ہو رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی اس نے مطلب کی بات کہنی ہے۔

راجا پرتاب کمار اپنے گھاگ مشیر کی بات پر مسکرایا تھا۔ بولا۔

''ہمیں خوشی ہے کہ تر۔پال اور پالن پور کی ریاستیں بھی فرنگیوں کے اس غاصبانہ عزائم سے واقف ہیں۔ تو کیا ہمیں اب نواب شہباز خان کو اپنے مثبت جواب سے ترنت آگاہ کر دینا چاہیے؟''

''جی ہاں!'' ستر ام داس نے کہا۔ ''لیکن...... ایک شرط کے ساتھ......''

''کیسی...... شرط......؟'' راجا پرتاب...... نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''نواب...... شہباز اور...... مہاراجا مہندر سنگھ کو پابند کرنا ہوگا کہ وہ اپنی افواج مع بڑے اسلحے (توپیں وغیرہ) کے ناگرہ بھیجیں کیونکہ ہماری ریاست کی حدود، کوہ شالیہ کی داخلی سمتوں پر پڑتی ہیں۔ اس لیے فرنگیوں کی جنگی جارحیت کا سب سے پہلے ہمیں سامنا کرنا پڑے گا۔ دوسری شرط یہ ہوگی کہ اس متحدہ افواج کے سیناپتی درجۂ اول میں ہمارا کہلائے گا، باقی دوم ان کا، کیونکہ جغرافیائی اہمیت اور اعتبار سے ہم ان شرائط کا حق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں مذکورہ دونوں ریاستوں کے جوابات سے ترنت آگاہ کیا جائے۔ بہ صورت دیگر ہم اپنی حکمت عملی ترتیب دینے میں حق بہ جانب ہوں گے، جو فرنگیوں کے ساتھ جنگ اور صلح، دونوں صورتوں میں ہو سکتی ہے۔''

راجا پرتاب کمار اپنے مشیر کی بات پر اش اش کر اٹھا۔ اس نے فوراً اپنا جوابی پیغام نواب شہباز خان کو بھجوا دیا جس میں نواب شہباز اور مہاراجا مہندر سنگھ، دونوں سے مثبت جواب طلب کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے دیوان خاص کا رخ کیا۔ وہاں جا کر وہ ایک آرام دہ نشست پر آنکھیں موند کے بیٹھ گیا اور رینا کے متعلق سوچنے لگا۔

اسے ایک طرف جہاں رینا سے مل کر خوشی ہوئی تھی، وہیں اب وہ متفکر بھی نظر آنے لگا تھا۔ رینا کو اور اس کے ساتھیوں کو وہ دوبارہ راج محل لانے کے ممکنہ اسباب پر غور کر رہا تھا۔

جب وہ رینا سے ملا تھا تو اس کا دل بے اختیار اسے راج محل لے آنے کو مچل رہا تھا لیکن پھر یہاں حالات کو دیکھتا تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ جب وہ اس معاملے میں خود کو زیادہ بے بس اور بے قرار محسوس کرتا تو اس کے دل و دماغ میں روایتی راجاؤں جیسی ہٹ دھرمی عود کر آنے لگتی کہ وہ ریاست کا ایک مطلق العنان راجا ہے۔ کون تھا جو اس کے آگے بولنے کی جرأت کرتا لیکن اب تو...... ایک گمبھیر مسئلہ اور بھی آن کھڑا ہوا تھا۔ ایک طرف رینا نے خود راج محل آنے سے انکار کر دیا تھا تو دوسری طرف ریاست پر فرنگیوں کی طرف سے ممکنہ یلغار کا بھی خطرہ موجود تھا۔

اس یلغار کا راجا پرتاب کو اسی وقت یقین ہو گیا تھا جب راج محل سے جنرل مائیکل شا نے اپنے متعین فوجی بھی واپس بلا لیے تھے۔ اب کوئی فرنگی راج محل میں تو کیا ریاست ناگرہ میں بھی موجود نہ تھا۔ حالانکہ جہنم واصل لیفٹیننٹ بروجر کا نائب جان پارکر، اریبہ اور شاہ زمان کے پیچھے لگا ہوا تھا مگر جنرل شا کا حکم نامہ ملتے ہی وہ اپنے ساتھیوں سمیت راج محل اور ریاست ناگرہ سے کوچ کر گیا تھا۔

یوں راجا پرتاب کمار کو دو محاذوں کا سامنا تھا۔ ایک میدانِ جنگ تھا تو دوسرا راہِ الفت...... اس نے دونوں راستوں پر ہی قدم رکھ دیا تھا۔

اس نیلی آنکھوں والی معصوم اور حسین صورت فرنگن دوشیزہ رینا کے متعلق سوچتے سوچتے اچانک اس کے ذہن میں ایک جھما کا سا ہوا۔

دو...... نام اس کے ذہن میں ابھرے تھے۔ایک رابرٹ اور دوسرا گارشیا...... اس نے ان دونوں بہن بھائی کے رویے سے یہ بات صاف محسوس کی تھی کہ وہ...... اس کی تائید وحمایت میں پیش پیش تھے۔اس نے فوراً ایک ترکیب سوچی اور اپنے ایک رازدار ملازم کو اچھی طرح سمجھا کر راکاشی وادی کی طرف روانہ کردیا۔یہ ملازم دوگھوڑوں کی ''ڈاک گاڑی'' میں سوار تھا جس کے پیچھے ایک اضافی گھوڑا بندھا ہوا دوڑ رہا تھا۔

اس ملازم کو یہ ڈاک گاڑی رینا کے پاس چھوڑ کر اور دونوں بہن بھائی کو ایک پیغام دے کر اضافی گھوڑے پر واپس لوٹ آنا تھا۔موسم کو دیکھتے ہوئے راجا پرتاب نے رینا، راس کے ساتھیوں کے لیے کچھ گرم کپڑے بھی ڈاک گاڑی میں رکھوا دیے تھے۔

یہ ملازم راکاشی بستی پہنچا اور بستی والوں نے (رینا کے خطاب کے بعد راکاشی والوں نے اب خود کو دنیا کی نظروں سے چھپانا چھوڑ دیا تھا اور معذوری کے باوجود وہ اب عام انسانوں کی طرح زندگی گزارنے لگے تھے) اسے رینا کے جھونپڑے تک پہنچا دیا۔

اس وقت دور برف پوش چوٹیوں پر شام کی ملگجاہٹ اترنے لگی تھی اور یخ بستہ ہوائیں چلنا شروع ہوگئی تھیں۔

اس قاصد نما ملازم نے رینا سے ملاقات کی پھر اس نے رابرٹ اور گارشیا کو راجا پرتاب کا پیغام دیا کہ جس وقت بھی اس کی ضرورت محسوس ہو، وہ اس ڈاک گاڑی میں راج محل آسکتے ہیں، ان پر کوئی پابندی نہیں۔ یہ کہہ کر وہ لوٹ گیا۔

رابرٹ اور گارشیا نے ایک بار پھر رینا کو گھیر لیا۔شوکی بھی وہیں تھا۔وہ بھی اب رابرٹ کے مستقل مخاصمانہ رویّے پر ضدی اور ڈھیٹ ہوگیا تھا۔بے شک وہ رینا کی وجہ سے تھوڑا بہت خیال کرلیتا تھا لیکن اب وہ رابرٹ کی کسی بھی ایسی ویسی بات پر چپ نہیں رہتا تھا۔

جیسے ہی اس گھڑسوار قاصد نے واپسی کی راہ پکڑی، اس نے ان دونوں بہن بھائی کے چہروں سے ہویدا ہوتی بے چینی کو فوراً بھانپ لیا۔اس نے ان دونوں کو بار بار معنی خیز اور دزدیدہ نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے پایا تھا۔ رینا سوچ میں محو تھی۔رابرٹ اور گارشیا، شاید تنہائی چاہتے تھے۔مطلب، شوکی باہر چلا جائے... جب ان کی دال نہیں گلی تو اچانک رابرٹ نے رینا کا ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے کہا۔

''رینا! آؤ تھوڑا باہر ہواخوری کرتے ہیں۔گارشیا! تم بھی آجاؤ۔''

''نہیں...... میرا دل نہیں چاہ رہا باہر جانے کو...... باہر ٹھنڈ بھی پڑ رہی ہے۔'' رینا نے کہتے ہوئے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔شوکی نے کن انکھیوں سے گارشیا کو رابرٹ کی طرف دیکھتے پایا، اس نے بھائی کو کوئی مخصوص اشارہ کیا تھا۔

رابرٹ نے کچھ نہیں کہا،تب ہی گارشیا،شوکی کی طرف متوجہ ہوئی اور نہایت ملتجی لہجے میں بولی۔

''شوکی پلیز...... میرے ساتھ ذرا باہر چلو، مجھے نجانے کیوں یہاں گھبراہٹ سی ہورہی ہے۔'' اب تو شوکی کو ان کی چالبازی کا یقین ہوگیا۔وہ سوچنے لگا کہ آخر ان دونوں بہن بھائی نے اسے کیا بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔

''اپنے بھائی کو لے جاؤ، مس رینا کا کہنا درست ہے۔باہر سردی پڑ رہی ہے اور مجھے ہلکا ہلکا فلو محسوس ہورہا ہے۔'' اس نے دیکھا کہ گارشیا کا منہ بن گیا مگر رابرٹ کا تو غصے سے چہرہ ہی سرخ ہوگیا۔وہ ایک دم جارحانہ انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے سخت لہجے میں اس سے بولا۔

''یہ تمہاری ڈیوٹی ہے، جاؤ میری سسٹر کو ذرا باہر لے جاؤ۔''

''میری ڈیوٹی صرف مس رینا کے حکم کی پابند ہے۔'' شوکی نے اس بار رینا کی ہدایت کے مطابق کوئی تیکھا ردعمل دکھائے بغیر آرام سے جواب دیا تھا، اگرچہ یہ بھی تخاطب کو تپا دینے والا ہی ایک انداز تھا۔

ایسے میں گارشیا نے فوراً مکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مداخلت کی اور رینا سے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

''پلیز...... رینا سسٹر! شوکی سے کہہ دو نا! میں بھائی کو ضرور لے جاتی مگر اسے ٹھنڈ سے الرجی ہوجاتی ہے دمہ ہونے لگتا ہے بے چارے کو......شاید یہاں کے جنگلاتی اور نباتاتی ماحول کا اثر ہے۔''

''لیکن......ابھی تو تھوڑی دیر پہلے مسٹر رابرٹ، مس رینا کے ساتھ باہر جانے پر بضد تھے؟''

شوکی استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوہو......شوکی! تم تو بلاوجہ بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتے ہو۔'' گارشیا زچ ہوکر بولی۔

''برادر رابرٹ تو......رینا کو الجھا الجھا اور اداس سا دیکھ کر ایسا کہہ رہے تھے۔''

چلتر باز گارشیا کا یہ داؤ ٹھیک بیٹھا، کیونکہ اگلے ہی

لمحے ریناان دونوں سازشی بہن بھائی کی مکاری جانے بغیر پاس بیٹھے شوکی کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی اور بہت دھیرے سے بولی۔

''کیا واقعی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں.....تو میں چلی جاتی ہوں۔''

شوکی نے دانت بھینچ لیے۔ناچار کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''نہیں، میں ہی چلا جاتا ہوں، ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے.....'' پھر وہ بیزاری اور کچھ ناگواری نظروں سے گارشیا کی طرف دیکھ کر دانت پیسنے کے انداز میں بولا۔

''چلو.....!''

گارشیا کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ تھی۔شوکی سر جھٹکتا ہوا جھونپڑے سے باہر آ گیا۔

باہر واقعی سردی تھی۔راج محل سے بھیجے گئے گرم کپڑے کام آرہے تھے۔گارشیا نے سمور کا لیڈیز کوٹ، مفلر اور لانگ بوٹ پہنے ہوئے تھے۔شوکی نے بھی لانگ کوٹ پہنا ہوا تھا۔وہ گارشیا سے کئی قدم پیچھے تھا۔

''کہاں مرنا ہے تم نے.....'' بالآخر شوکی نے چڑ کر اس سے پوچھا۔گارشیا اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی، برا منائے بغیر میٹھی مسکان سے ترکی بہ ترکی بولی۔

''تمہاری بانہوں میں.....''

''زیادہ رومینٹک ہونے کی ضرورت نہیں.....'' شوکی نے رکھائی سے کہا۔

''بتاؤ مجھے کہاں جانا ہے؟''

''اس طرف.....'' گارشیا نے اس کے قریب آ کر بڑے لبھانے والے انداز میں ایک پہاڑی پتھر کی طرف اشارہ کیا۔

''چلو مرو ادھر پھر.....اور سنو..... مجھ سے ذرا فاصلے پر ہی رہنا۔آج کل میں بہت غصے میں ہوں۔'' شوکی نے تنک کر کہا اور پہاڑی پتھر کی طرف چل پڑا۔

گارشیا اس کے پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی۔اس پہاڑی پتھر کے عقب میں جنگل نظر آتا تھا، جہاں سرِ شام ہی رات کے اندھیاروں کا گمان ہوتا تھا۔

شوکی اس بڑے سے پہاڑی پتھر کے پاس آ کر رک گیا۔اچانک وہ بدکا۔کسی نے پیچھے سے اس کی کمر کے گرد اپنی مرمریں بانہیں حمائل کر دی تھیں۔وہ مڑا تو گارشیا اس سے جیسے فدا ہونے کے انداز میں لپٹی جارہی تھی۔

''کیوں اتنی نفرت کرتے ہو مجھ سے تم؟ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔پلیز، یہ ظلم مت کرو، خود سے دور مت کرو مجھے۔بے شک شادی نہ کرو مجھ سے مگر میرے قریب تو رہا کرو۔شاید میں کبھی تمہارا دل جیتنے میں کامیاب ہو جاؤں۔''

گارشیا کی اس حرکت پر شوکی کو غصہ تو بے حد آیا مگر اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے اس کی بانہوں کا حصار بڑی بے دردی سے توڑا اور اسے تھوڑا خود سے پرے دھکا دے دیا۔گارشیا چند قدم پیچھے کو لڑکھڑا گئی۔

''گارشیا! میں نے تمہیں وارن کیا تھا کہ میرے قریب مت آنا۔میں تم سے نفرت نہیں کرتا، مگر محبت بھی مجھے تم سے کبھی تھی اور نہ کبھی ہوگی۔'' شوکی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔''اب تک میں نہیں بولتا تھا مگر اب تمہاری اور تمہارے اس مغرور بھائی کی حرکتوں کی وجہ سے کھلے عام اعتراف کرتا ہوں کہ..... ہاں..... مجھے صرف اور صرف..... رینا سے محبت ہے اور وہی میری پہلی اور آخری محبت ہے، سمجھیں تم.....؟ اب تمہارے اندر ذرا بھی غیرت اور شرم ہوگی نا.....تو تم میرا پیچھا چھوڑ دوگی۔''

شوکی کے منہ سے آج پہلی بار یہ اعتراف سن کر گارشیا کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔شوکی کے یہ جملے گارشیا کے لیے واقعی ''فیصلہ کن'' ثابت ہوئے۔اس کا تھوڑی دیر پہلے مسکراتا ہوا حسین چہرہ اب ایک زخمی ناگن کی صورت میں نظر آنے لگا تھا۔اس کی آنکھیں بے شک بھیگی ہوئی تھیں مگر اب ان میں جیسے خون سا رستا محسوس ہونے لگا تھا۔چہرہ بھی اسی رنگ میں نظر آنے لگا تھا۔تب ہی وہ اسی انداز و لہجے میں شوکی سے بولی۔

''شوکت.....! اگر یہ بات ہے تو سن لو..... میں بھی تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔تم نے مجھ پر رینا کو ترجیح دی ہے نا.....تو ٹھیک ہے پھر..... میں بھی جب تک زندہ ہوں رینا کو تم بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔''

یہ تہدید کرنے کے بعد وہ غصے اور طیش سے پاؤں پٹختی ہوئی واپس جھونپڑے کی طرف لوٹ گئی۔

شوکی چند ثانیے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے جاتا دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر وہ بھی جھونپڑے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

اریبہ اور شاہ زمان سخت بے چینی کا شکار تھے، اس کا سبب علی ریحان تھا۔وہ اس کی واپسی یا اس کی طرف سے کسی خیریت کی اطلاع کے بغیر ناگرہ سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔

''علی بھائی کو ناگرہ سے گئے کافی دن بیت چلے ہیں، لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی ؟''
اریبہ متفکر لہجے میں بولی۔ وہ اور شاہ زمان اس وقت اوپری منزل کے ایک کمرے میں باہر گلی کی طرف کھلنے والے چوبارے کے قریب فرشی نشستوں پر بیٹھے قہوہ پی رہے تھے، باہر سرد شام اتری ہوئی تھی۔ ماحول پر سکوت طاری تھا۔
نیچے بڑے سے صحن میں ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ شاہ زمان نے یہ گھوڑا راجا پرتاب کمار سے خصوصی درخواست کے بعد ہی حاصل کیا تھا اور راجا پرتاب کمار نے اپنے شاہی اصطبل خانے سے انسانی ہمدردی کے ناتے اسے گھوڑا دلوا دیا تھا۔
''اللہ کے حکم اور فضل سے علی یقیناً خیریت سے ہی ہوگا۔'' شاہ زمان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ وہ ...... نہ صرف بالکل خیریت سے ہوگا بلکہ اپنے مشن میں بھی کامیاب رہا ہوگا۔''
''زمان ......! کیا ہم نے یہاں اتنا عرصہ رہتے ہوئے اپنا مشن پورا کرلیا ہے؟'' اریبہ نے کسی قدر سوچ کر زمان سے پوچھا تو وہ اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔
''کیوں نہیں ...... تم نے اپنی جان کئی بار خطرات میں ڈال کر ہی اس مہم کو اب تک کامیابی سے ہمکنار کررکھا ہے۔ جس کے نتیجے میں علی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی جانب کوچ کرسکا تو دوسری طرف لیفٹیننٹ بروجر کا خاتمہ ہوا۔ میں نے تو سنا ہے کہ راجا پرتاب نے راج محل میں تعینات باقی فرنگیوں کو بھی نہ صرف بھگا دیا ہے بلکہ ...... اس نے گزشتہ دنوں آئے ہوئے فرنگیوں کے ایک بڑے ٹولے کو بھی خبردار کردیا ہے کہ وہ کوہ شمالیہ کی طرف جنگی جارحیت کا اب سوچیں بھی نہیں۔''
''اوہ ...... کیا واقعی ایسا ہے؟ تمہیں کیسے پتا چلا......''
اریبہ نے یک دم خوش ہوکر کہا۔
''تم کیا سمجھتی ہو جان کہ راج محل سے نکلنے کے بعد میں یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں ؟'' شاہ زمان نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہاری ان کٹھن حالات میں قربانیوں کے نتائج کا تو پتا لگانا ہی تھا، نئے راجا (پرتاب کمار) کی یہ اچھی عادت ہے کہ وہ ایسی باتوں کو صرف اپنے محل تک محدود نہیں رکھتا۔ عام لوگوں تک بھی اس کی رسائی ہوجاتی ہے۔ ادھر ادھر بہ ظاہر آوارہ گردی کرتے ہوئے میں عام لوگوں میں گھل مل کر ان باتوں کا پتا چلا لیتا ہوں۔''
اریبہ کے حسین چہرے پر سکون سا پھیل گیا اور شاہ زمان اسے خوش اور مطمئن دیکھ کر مسکرا دیا۔
اچانک نیچے دروازہ کھٹکانے کی آواز ابھری۔ دونوں چونک پڑے۔
''یہ کون ہے؟'' اریبہ ایک دم زمان کی طرف دیکھ کر بولی اور وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر یک بیک اٹھا اور چوبارے سے ہوکر باہر کھلنے والے دریچے کی طرف بڑھا۔ نیچے جھانکا تو ایک گھڑسوار شخص کو دیکھا۔
''کون ہے؟'' اریبہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر شاہ زمان نے وہیں سے ہاتھ کے اشارے سے اسے دریچے کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔ بولا۔
''کوئی گھڑسوار ہے۔ شاید راج محل سے آیا ہے۔''
''دل ...... لیکن انہیں کیا معلوم کہ ہم یہاں ہیں ؟''
اریبہ نے پریشانی سے کہا۔
''یہی الجھن مجھے بھی ہے۔ تم ٹھہرو، میں نیچے جاکر پوچھتا ہوں۔'' شاہ زمان نے کہا اور پلٹا۔
نیچے آکر اس نے دروازہ کھولا اور غور سے گھڑسوار کی طرف دیکھا۔
''کون ہو بھائی ؟ کس سے ملنا ہے ؟'' شاہ زمان نے پوچھا۔ باہر گلی میں سناٹا تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ گھڑسوار نیچے اترا اور بہ غور شاہ زمان پر ایک نظر ڈالنے کے بعد پوچھا۔
''یہ مکان شمائل کا ہے؟''
شاہ زمان بری طرح چونکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے؟ شمائل کے ذکر پر وہ پریشان سا ہو گیا تھا۔
''ہاں ! یہ شمائل کا ہی مکان ہے، مگر تم کون ہو......؟''
اچانک اریبہ کی آواز ابھری۔ وہ شاہ زمان کے عقب سے نمودار ہوئی تھی۔ ان دونوں کا ہی یہ خیال تھا کہ کہیں یہ گھڑسوار شمائل کا ہی کوئی رشتے دار نہ ہو۔
''تم شاید اریبہ ہو اور ...... یہ تمہارا ساتھی شاہ زمان ہے۔'' گھڑسوار نے غور سے اریبہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو دونوں ہی ہک دک سے رہ گئے۔
''مجھے اندر آنا چاہیے۔ میں تریپال پور سے آیا ہوں، تمہارے ساتھی علی ریحان کا ایک پیغام لے کر......''
اس کے یہ بتانے کی دیر تھی کہ دونوں نے بے اختیار سکون کی سانس لی اور فوراً اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ پھر اسے لے

کراوپر آ گئے۔

اریبہ اس کے لیے گرما گرم قہوہ لے آئی۔

''شکریہ...... میرا نام محمد شفیع ہے۔'' قہوے کی چسکی لے کر اس نے کہا اور پھر ساری بات انہیں بتادی۔ اریبہ اور شاہ زمان یہ سن کر دم بخود سے رہ گئے۔ انہیں خوشی تھی کہ ان کی مہمات کامیابی سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔ تاہم شاہ زمان نے پوچھا۔

''لیکن تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ......''

''بہت آسانی سے......'' محمد شفیع مسکرا کر بولا۔ ''مجھے علی نے سب بتا رکھا تھا کہ میں کیسے اور کن حالات میں تم سے ملاقات کر سکتا ہوں۔ اس نے مجھے تمہارے حلیے وغیرہ سے بھی اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔ میں نواب شہباز خان کا خط لے کر ہی آیا تھا، وہیں مجھے پتا چلا کہ بھوپت اور اس کی بیوی مینا کو راج محل سے رخصت کر دیا گیا ہے۔ علی کو یقین تھا کہ تم دونوں شائل کے مکان کا ہی رخ کرو گے۔ میں یہاں کا پتا پوچھتے ہوئے پہنچ گیا۔''

محمد شفیع نے اپنی کتھا ختم کی اور قہوے کی پیالی بھی...... پھر آخر میں بولا۔ ''کوہ شالیہ پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے ہیں۔ علی نے تم دونوں کو فوراً تریپال پہنچنے کا کہا ہے۔ سب سے زیادہ جنگ کا خطرہ ناگرہ کو ہے، کیونکہ یہ ریاست، کوہ شالیہ کے دو بڑے داخلی راستوں پر ہے، اسی لیے جلدی یہاں سے نکل چلو...... مجھے تمہیں ساتھ لانے کا ہی حکم ملا ہے۔''

وہ بات ختم کر کے خاموش ہو گیا۔ شاہ زمان اور اریبہ دونوں ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے تاہم یہی طے پایا کہ صبح تڑکے یہاں (ناگرہ) سے تینوں کوچ کر جائیں گے۔

اگلے دن اریبہ منہ اندھیرے ہی اٹھ گئی۔ وضو کر کے اس نے نمازِ فجر ادا کی اور سگھڑ عورتوں کی طرح ناشتا بنانے لگی۔ ساتھ ہی اس نے زادِ راہ کے لیے بھی تھوڑا بہت اضافی بنا لیا تھا۔

اس کے بعد اس نے شاہ زمان اور مہمان محمد شفیع کو بھی جگا دیا۔ سب نے ناشتا کیا اور خاموشی سے اپنے گھوڑوں پر روانہ ہو گئے۔

محمد شفیع اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور شاہ زمان دوسرے گھوڑے پر تھا، جبکہ اریبہ اس کے پیچھے بیٹھی تھی۔

کوہ شالیہ کی حدود عبور کرتے ہی انہوں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔

کبھی رکتے کبھی چلتے کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد یہ لوگ بالآخر تریپال پہنچ گئے۔ وہاں علی ریحان ہی نہیں بلکہ نواب شہباز خان اور ان کا بیٹا اقبال خان بھی ان کے بے چینی سے منتظر تھے۔ بالخصوص نواب صاحب ان تینوں سے ہی متاثر تھے، اب جبکہ علی نے خاور حیات (شہید) کا مشن بھی اپنے ذمے لینے کی بھرپور حامی بھر لی تھی تو جب سے نواب صاحب اور بھی ان کے قدردان ہو گئے تھے۔

نواب صاحب اور ان کے بیٹے اقبال خان نے اریبہ اور شاہ زمان کا بڑا پرتپاک استقبال کیا تھا۔ علی اور شاہ زمان تو ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔ اریبہ نے سکون کی سانس لی تھی۔ وہ بھی بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ ''علی بھائی'' کہتے ہوئے اس کی جانب سلام کرنے بڑھی تھی۔ علی نے پیار سے ''بہنا'' کہہ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور اس کے سر پر دستِ شفقت بھی پھیرا تھا۔ نواب صاحب نے بھی اسے یہی شفقت دی اور شاہ زمان بالخصوص اریبہ کو خراجِ تحسین بھی پیش کیا۔

علی اور شاہ زمان نے کھلے دل کے ساتھ اریبہ کی بہادری کی تعریف کی تھی۔ اس کی کتھا سننے کے بعد نواب صاحب بھی اس بہادر عورت سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے تھے۔

اسی دن ان کی آمد کی خوشی میں پری محل میں زبردست دعوت کا اہتمام ہوا اور غریبوں میں بھی کھانا تقسیم کیا گیا۔

علی نے چند دنوں میں ہی یہاں رہتے ہوئے محسوس کر لیا تھا کہ نواب شہباز خان بڑے سخی دل اور غریب نواز انسان تھے۔ ان کی ریاست میں ناگرہ کے مقابلے میں زیادہ خوش حالی تھی لیکن یہ حقیقت بھی علی کے علم میں آئی تھی، بلکہ اس کا تلخ تجربہ بھی ہوا تھا کہ...... نواب صاحب اپنے چھوٹے بھائی سراج خان کی وجہ سے کچھ پریشان اور فکرمند رہتے تھے۔ وہ دل کے ہمدرد انسان تھے، ورنہ جتنا ان کا اثر رسوخ تھا ریاست میں اگر وہ اپنی نوابوں والی روایتی حیثیت اور طاقت کا استعمال کرتے تو سراج خان جیسے بدطینت انسان کو بہت پہلے ہی ریاست سے کوچ کرنا پڑ جاتا۔

وہ اس کی ''حرکتوں'' کو نظر انداز کیے ہوئے تھے لیکن علی ریحان کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس پر بھی نواب صاحب کو بے حد غصہ آیا تھا۔ اس بار انہوں نے باہم صلح مشورے سے اپنے چھوٹے بھائی کو سختی کے ساتھ تادیب کرنے کا پختہ ارادہ کر رکھا تھا لیکن موجودہ حالات کی چلتی ہوئی مخدوش ہواؤں کا رخ دیکھتے ہوئے نواب شہباز ذرا سوچ میں پڑ گئے تھے، تاہم علی نے واشگاف

الفاظ میں نواب شہباز پر واضح کر دیا تھا کہ سراج خان فرنگیوں کا پٹھو بنا ہوا ہے، اگر اس کے ساتھ اسی طرح کا ہمدردانہ رویہ رکھا گیا تو یہ غداری کے مترادف ہوگا۔

کیونکہ یہ حقیقت دوسرے لوگوں تک خود سراج خان کی زبانی پہنچ چکی تھی کہ وہ انگریزوں کا خیر خواہ تھا اور قبائلی ریاستی امور میں وہ ان کی مداخلتِ بے جا کو جائز قرار دیتے ہوئے درونِ خانہ ان کے ہاتھوں کو مضبوط کر رہا تھا۔

نوابِ شہباز خان... بلاشبہ علی ریحان کی اس بات سے مکمل اتفاق کرتے تھے اگر موجودہ گمبھیر مسئلہ اچانک نہ ابھرتا تو وہ بلاتاخیر سراج کے خلاف کارروائی کرتے، تاہم انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے بلا کر سختی سے تادیب کریں گے اور جہاں تک ممکن ہوا وہ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتیں گے۔ تاہم انہوں نے فوری طور پر اپنے بھائی سراج خان کو اپنے علاقے تک محدود رہنے کے احکامات جاری کر دیے تھے۔

یہ پانچوں کھانا وغیرہ کھانے کے بعد قہوہ پی رہے تھے اور سر جوڑ کر آئندہ کی حکمتِ عملی پر غور کر رہے تھے۔ اس بار علی، شاہ زمان اور اریبہ کو بیک وقت دو اہم مہمات کا سامنا تھا۔ پہلی مہم خاور حیات شہید کی تھی، جس کی موت کے بعد وہ ادھوری رہ گئی تھی۔ دوسری مہم فرنگیوں کی طرف سے متوقع حملے کا منہ توڑ جواب دینا تھا۔

''اس مہم کو میں نے سر کرنے کے لیے پہلے ہی بیڑا اٹھا رکھا ہے۔'' علی نے پُرعزم لہجے میں کہا تو شاہ زمان بولا۔

''علی! تم ایک بارود کی ماہر ہو، تمہاری یہاں ضرورت زیادہ ہے۔ سی ہاک نامی اس جہاز کی تباہی میرے ذمے لگا دو... میں انشاء اللہ اس مہم کو بہت جلد کامیابی سے ہمکنار کر کے یہاں پہنچ جاؤں گا۔''

''مجھے کیوں نظرانداز کر دیا تم نے شاہ زمان؟'' اریبہ نے سنجیدہ لہجے میں شاہ زمان کی طرف شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اس خطرناک مہم میں اکیلے نہیں جاؤ گے، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

علی پریشان سا ہو گیا لیکن اسے شاہ زمان کی بات سے اختلاف بھی نہ تھا۔ وہ جنگی حکمت عملی کے تحت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، نہ صرف یہ بلکہ اس کی بات کو نواب شہباز اور اس کے بیٹے اقبال نے بھی درست قرار دیا تھا۔

علی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بالآخر یہی طے پایا کہ...... شاہ زمان اور اریبہ ہی اس مہم کے لیے مناسب تھے کیونکہ انہوں نے راج محل والی مہم کو بھی بڑی جانفشانی اور دلیری کے ساتھ پورا کیا تھا۔

اس کے علاوہ ...... قاصد محمد شفیع نے نواب شہباز کو ناگرہ کے راجا پرتاب کمار کا بھی پیغام دے دیا تھا۔

یوں وقت کی نزاکت اور ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے تینوں ریاستوں کے والیان نے ایک دوسرے کے ساتھ پیغامات وغیرہ کی ترنت ترسیل کو ممکن بنانے کے لیے ......مشترکہ طور پر قاصد گھڑسواروں کا ایک تیز رفتار ٹولا تیار کیا تھا۔ نیز اسی پالیسی کے تحت ...... جنگی مخبروں کا بھی ایک گروپ بنا کر دلی روانہ کر دیا گیا تھا، جو غاصب فرنگیوں کی جارحیت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ ان کی طرف سے ''گرین سگنل'' ملتے ہی کوہ شمالیہ کی اتحادی افواج فوراً حرکت میں آجاتی۔ تاہم ابھی اپنے اپنے طور پر مذکورہ تینوں ریاستوں نے اپنی افواج کو جنگ کے لیے تیار کر رکھا تھا۔

تاہم دلی سے خبریں آنے لگی تھیں کہ فرنگی بڑی مکاری اور خاموشی کے جنگی حکمت عملی تیار کرنے میں مصروف ہے۔ البتہ ابھی تک کوئی حتمی صورتِ حال واضح نہیں ہو سکی تھی۔

اریبہ اور شاہ زمان اس نئی مہم کے لیے خاصے پرجوش نظر آرہے تھے۔ شاہ زمان میں اب اریبہ کو کسی مہم سے روکنے کی جرأت نہیں تھی۔ اس کا جذبہ ہی ایسا سوا ہو چلا تھا کہ اریبہ کبھی بھی اب ایسی مہمات سے پیچھے نہیں ہٹتی تھی۔ وہ علی اور زمان سے مسکرا کر صاف کہتی تھی کہ یہ ان کی صحبت کا ہی تو اثر ہے، وہ دونوں بے اختیار مسکرا کر رہ جاتے تھے۔

بہرکیف...... اریبہ اور شاہ زمان دوسرے دن ہی مہم پر نکلنے کے لیے کمربستہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ ضروری تیاری کے بعد شاہ زمان اور اریبہ دو گھوڑوں کی بگھی میں سوار ہو کر بمبئی (ممبئی) روانہ ہو گئے۔ دونوں باپ بیٹے، نواب شہباز خان اور اقبال خان نے اچھی طرح سے اس مہم کے بارے میں راہنمائی کر دی تھی۔

چنانچہ شاہ زمان اور اریبہ کو ان کے نئے مشن کی کامیابی و کامرانی کی ڈھیروں دعاؤں کے سائے تلے تریپال سے رخصت کر دیا گیا۔

ان دو دنوں میں بھی علی کو حویلی میں محسوس ہوتا رہا تھا کہ کوئی دو آنکھیں مسلسل اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ زمان اور اریبہ کی آمد پر وہ ان جاسوس آنکھوں کو عارضی طور پر فراموش کر بیٹھا تھا لیکن اس سہ پہر میں جب نواب شہباز اپنے بھائی سراج خان کی طرف اپنا ایک قاصد روانہ کرنے کا حکم دے رہے تھے تو علی کو کسی نہ کسی ریشمی چلمن سے وہی دو آنکھیں گھورتی محسوس ہوئی تھیں۔

وہ بری طرح الجھ گیا تھا۔ معاملہ ''میزبان اور مہمان'' کا نہ ہوتو وہ فوراً آگے بڑھ کر اس کا کھوج لگانے کی کوشش ضرور کرتا۔

چنانچہ اب وہ اسی کوشش میں تھا۔ اریبہ اور شاہ زمان کی روانگی کے بعد اس نے بھی کرنا چاہا لیکن اب اسے وہ دو ''جاسوس'' آنکھیں کہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ یہ دریافت کرنے کی کوشش کرے کہ گھر میں افرادِ خانہ کی ''تعداد'' وغیرہ کتنی ہے؟ چونکہ علی ان کے گھر کا فرد نہیں تھا اسی لیے...... وہ نہیں پوچھ سکتا تھا، البتہ اقبال خان سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی مگر اس نے بھی ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی، حتیٰ کہ اپنے متعلق بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ شادی شدہ تھا یا نہیں۔ یا شاید یہ سب اس نے علی کو بتانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی تھی لیکن علی نے اب تہیہ کرلیا تھا کہ وہ پتا چلانے کی کوشش ضرور کرے گا۔

وہ ایک ملازم تھا۔ اس کا نام یوں تو شیخ خالد تھا مگر سب اسے پپو میاں کہتے تھے۔ وہ یہاں کے ایک جدی پشتی ملازم جوڑے کی اکلوتی اولاد تھا جو مرچکے تھے۔ پپو میاں... اسی حویلی میں پیدا ہوا تھا اور جب سے ادھر ہی تھا۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال تھی، شادی شدہ تھا اور اس کی بیوی بانو زنان خانے میں کام کرتی تھی۔

علی نے پپو میاں کے ساتھ خاصی گہری نبھالی تھی۔ اسی سے اس نے باتوں باتوں میں دریافت کیا تو اسے معلوم ہوا، حویلی میں کل چار مکین تھے۔ نواب صاحب، ان کی بیگم نائمہ، اقبال خان اور ان کی بیوی مہرو، جس کا پورا نام مہرالنساء تھا۔

البتہ مہرالنساء کے سلسلے میں پپو میاں نے انکشاف ضرور کیا جو کم از کم علی کے لیے چونکا دینے والا ہی تھا۔ اس نے بتایا کہ...... مہرو درحقیقت نواب شہباز خان کے بھائی سراج خان کی بیٹی ہے۔

'غدار کی بیٹی نواب صاحب کے گھر میں......!' علی نے دل میں سوچا اور پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ 'تو کیا وہ دو جاسوس آنکھیں مہرو کی تھیں...... مگر کیوں......؟ وہ کیوں اسے دیکھتی تھی؟ کیا وہ ان کی باتیں سنا کرتی تھی؟' یہ سب سوچتے ہوئے اچانک علی کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا تھا۔

☆☆☆

بچھورام...... جس خاموشی کے ساتھ گیا تھا اسی خاموشی کے ساتھ راج محل لوٹ آیا۔ کسی کو اس کی مکارانہ آمد و شد کا پتا ہی نہ چل سکا۔

نجو بائی بے چینی سے اس کی منتظر تھی، اسے ابھی تک نہیں پتا چلا تھا کہ بچھورام راج محل لوٹ آیا ہے۔ نہ ہی اس نے نجو بائی کو اپنا چہرہ ''کرایا'' تھا۔ وہ بہت مسرور تھا اور ایک ''انداز خاص'' سے ہی وہ نجو بائی کے پاس جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا جس کے لیے اس نے خصوصی تیاری کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ اب اپنے اقامتی گوشے کے اندر اسی ''تیاری'' میں مصروف تھا۔

رات اپنے ابتدائی پہر میں تھی اور وہ ...... حسب سابق سفید سوتی ساڑی میں اپنی تخلیہ گاہ میں سونے کے لیے آگئی۔ جیسا کہ مذکور ہوچکا، نجو بائی کا اب زیادہ وقت اپنی تخلیہ گاہ میں ہی گزرتا تھا کہ یہی اس کے لیے بہتر بھی تھا۔

یہ سب کو معلوم تھا۔ اس کا بیٹا اینش کمار اور بیٹی سونجنا بھی اسی میں راضی تھے کہ کہیں راجا پرتاب کمار بار بار اسے اپنی نظروں کے سامنے دیکھے اور ...... اس کا دبا ہوا قہروغضب امڈ پڑے اور وہ جلال میں آکر ان کی ماں کو بندی خانے میں ڈلوانے کا حکم جاری کردے۔ اس طرح کم از کم وہ ان کی ماں کی سازش کو بھلائے ہوئے تو تھا۔

لہٰذا...... وہ صرف اپنے دونوں بچوں کے لیے ہی، سارے دن میں تھوڑی دیر کے لیے باہر آتی اور پھر دوبارہ تخلیہ گاہ کا رخ کرتی۔ سمجھنے اور دیکھنے والوں کے لیے وہ ایک ایسی دھارمک ودھوا عورت کا روپ دھار چکی تھی جس نے خود کو تیاگ دیا تھا اور اب پوجا پاٹ میں خود کو مصروف رکھتی تھی۔ مگر کون جانتا تھا کہ وہ اس طرح ایک کونے میں رہتے ہوئے بھی نفاق اور ایک نئی سازش کا بیج بونے میں مشغول تھی۔ اس چھوٹی سی پوجا پاٹ کی جگہ کو اس نے بہ ظاہر تخلیہ گاہ کا نام دے رکھا تھا جو درحقیقت عیاش گاہ تھی۔

وہ تخلیہ گاہ میں آکر اپنی مسہری پر دراز ہوگئی۔ اس کی بڑی گہری آنکھوں میں اب نئے خواب سمانے لگے تھے۔ مہارانی بننے کے خواب......

اچانک اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کمرے میں دیے اور شمعیں روشن تھیں۔ اس نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا۔ دیکھنے سے پہلے وہ جان گئی تھی کہ اس کی تخلیہ گاہ میں یوں صرف...... ایک ہی شخص بغیر دستک دیے داخل ہوسکتا ہے اور وہ ہے بچھورام۔ وہ واقعی بچھورام ہی تھا مگر...... اس کے باوجود نجو بائی اپنے رازداں کو دیکھ کر چونک پڑی تھی۔ اس کا چہرہ حیرت کی تصویر اور آنکھیں اس کی تفسیر بن گئی تھیں۔

''بب...... بچھورام......! ای ی...... یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا کرنے چلے ہو تم......؟'' اس نے رات کی خاموش اور دم بخود تنہائی میں نہایت ہلکی مگر لرزتی سی آواز میں دروازے پر کھڑے مسکراتے بچھورام کی طرف دیکھ کر کہا۔

بچھورام...... جو اس وقت زرق برق اور چمکدار پوشاک میں کھڑا بالکل ایسا ہی دکھ رہا تھا، جیسے کسی ریاست کا مہاراجا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ نجو بائی اسے اس ''لباسِ فاخرہ'' میں دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے گی اور بے اختیار نشۂ حکمرانی میں آکر اس کی طرف بڑھے گی اور خود سے لپٹا لے گی مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔

اپنے غلام اور اس کے بچی سے بدہیت وجود پر اپنے آنجہانی پتی کا یہ شاہانہ لباس دیکھ کر نجو بائی سرتاپا ایک جلتا اور سلگتا ہوا انگارہ بن گئی۔ اسے بچھورام کا چرخ سا بے کشش وجود تو نظر آرہا تھا لیکن...... چہرہ...... نہیں۔ اس کی جگہ اچانک مہاراجا چندر گپتا کا چہرہ آن ٹکا تھا جس نے نجو بائی کو سرتاپا لرزا کر رکھ دیا تھا۔

وہ بپھر گئی۔ ایسا دوسری یا تیسری بار ہوا تھا کہ جب بھی اس کی نگاہوں کے سامنے اپنے شوہر کا چہرہ دکھائی دیتا اس کی یہی کیفیت ہو جاتی تھی۔ وہ یک دم اٹھی اور ہسٹریائی سی آوازیں حلق سے خارج کرتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور بچھورام کے منحنی سے وجود کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ وہ گھبرا گیا۔ نجو بائی ایک سرو قد اور توانا، بھرپور جسم کی مالک تھی۔ اس نے بچھورام کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر خارزدہ لہجے میں کہا۔

''بچھورام! تت...... تیری جرأت کیسے ہوئی کہ تُو میرے سورگ باش پتی کا لباس پہنے؟ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی...... مورکھ......!''

یہ کہتے ہوئے اس نے بچھورام کا لمبوترا پتلا چہرہ اپنے ناخنوں سے نوچ ڈالا۔ یہی نہیں، اس کی پوشاک بھی اتارنے کی مجنونانہ کوشش کرنے لگی۔ اس پر جیسے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ بچھورام نے اس کے ''دورے'' کا ایک ہی علاج کر کے نجو بائی کو اس کی اوقات یاد دلا دی۔

اس نے بھی غصے سے اپنے دانت اور ہونٹ بھینچ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ بلبلا کر الٹ پڑی۔ چند قدم پیچھے لڑکھڑائی اور دوسرے ہی لمحے وہ چند قدموں کے فاصلے پر اسی طرح کھڑے کھڑے اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں اور فق چہرے کے ساتھ بچھورام کو تکتی رہ گئی۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے گال پر تھا۔

''نجو بائی! تیرا دماغ کیوں الٹ جاتا ہے؟ آج تو تُو نے یہ سب کر دیا، پرنتو آئندہ دھیان رکھنا، ایسا نہ ہو کہ میں تجھے بندی خانے تک پہنچا دوں۔'' وہ اپنے اندر کی غلاظت کو یک دک سی کھڑی نجو بائی کے چہرے پر انڈیلتا ہوا اور اس کے ذرا قریب آکر مزید بولا۔

''مت بھول اپنی اوقات کو تو بھی...... کہ اب مہارانی تو کیا نجو بائی بھی نہیں رہی ہے تُو...... بلکہ کچھ بھی نہیں رہی ہے، شکر کر میرا کہ تجھے ایک بار پھر بلندیوں تک پہنچا رہا ہوں۔ تیری خاطر میں کہاں کہاں کی خاک چھانتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں کہ تجھے دوبارہ مہارانی بننے کی خوش خبری سناؤں...... پرنتو، تو نے میری ساری محنت کو مٹی کا مادھو بنا ڈالا، بلکہ تو اس قابل ہی نہیں ہے کہ تجھے دوبارہ اونچی شان نصیب ہو، تو اب ادھر ہی راج محل کے ایک دور دراز کونے میں پڑی سڑتی رہ...... ساری زندگی...... یہی تیری سزا ہے۔''

کہتے ہوئے بچھورام نے اپنی مہاراجاؤں والی پوشاک اتار کر غصے سے، گم صم سی کھڑی نجو بائی پر اچھال دی۔

نجو بائی کے اندر ایک اور دھماکا ہوا...... وہ اپنے غلام، جواب اس کا غلام کہاں رہا تھا...... وہ تو اس کی جلوتوں کا ہی نہیں بلکہ خلوتوں کا بھی ساتھی اور رازداں بن چکا تھا۔ وہ تو اسے تاجِ حکمرانی پہنانے کے وسیلے کر رہا تھا۔ نجو بائی نے فوراً ناگن کی طرح کینچلی بدلی...... اور بے اختیار اس کی طرف بڑھی اور اس کے قدموں میں جا گری۔

اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بچھورام کے قدم پکڑ لیے۔

''مم...... مجھے شما کر دو بچھورام! معاف کر دو مجھے...... میں ابھاگن ہوں، تمہارے اتنے بڑے احسان کو نہ سمجھ سکی۔ میں تمہاری کوششوں کے بعد مہارانی بن بھی جاؤں تو تمہاری کنیز ہی بن کر رہوں گی۔''

نجو بائی کی گریہ وزاری، آنسو اور دادِ فریاد نے بچھورام کو موم کر دیا۔ اس نے بڑی گرسنہ نظروں سے نجو بائی کے اپنے قدموں میں جھکے ہوئے وجود کو دیکھا اور اس کے اندر کا مردار خور کرگس...... بیدار ہو گیا۔

نجو بائی نے اسے رام کرنے کے لیے بس اتنا ہی تو کیا تھا کہ...... اپنے بھرے بھرے بدن میں خوب کسی ہوئی ساڑی کا باریک ساپلو، جو قدموں میں جھک جانے کی وجہ سے اس کے شانوں سے ڈھلک گیا تھا۔ اسے سنبھالنے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اسی ''ہتھیار'' نے بچھورام کی عقل خبط کر ڈالی تھی۔ وہ اس کے اندر کی کینہ پرور مکڑی

کو بھانپ نہ سکا اور کسی اندھے گدھ کی طرح ڈھے گیا۔
اس نے آہستگی سے جھک کر نجو بائی کو بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور دونوں مسہری کی طرف بڑھ گئے۔
نجو بائی اس سے کہہ رہی تھی، اسے پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے۔ شاید پے در پے ناکامیوں اور صدمات نے اسے ادھ موا کر دیا ہے۔ بچھورام نے تسلی دی۔
کمرے میں ایکا ایکی بھیدوں بھری خاموشی طاری ہوگئی۔ تخلیہ گاہ کی دیواروں پر اب صرف ایک دیے اور ایک شمع کی روشنی لرز رہی تھی جس کے جلو میں دو سائے ایک دوسرے سے چسپاں جلوہ کناں تھے۔
اگلے دن سحر...... سے قبل بچھورام اپنے منحنی سے وجود پر مہاراجا چندر گپتا کی پوشاک جھلاتا ہوا تخلیہ گاہ سے نکلا اور...... سیدھا اپنے اقامتی گوشے کا رخ کیا۔
وہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اس نے جلدی جلدی اشنان وغیرہ کرنے کے بعد اپنی اصل پوشاک نکال کر پہنی اور تازہ کار حالات کی سن گن لینے کے لیے اپنے چند آدمیوں سے ملا۔ انہی سے معلوم ہوا کہ ریاست ناگرہ کو فرنگیوں کی طرف سے ایک بڑی جنگ کا خطرہ ہے۔ بچھورام دل ہی دل میں بڑا خوش ہوا۔
اگرچہ ...... تخلیہ گاہ میں نجو بائی نے بھی اسے یہی کچھ بتایا تھا، تاہم اب اس کی تسلی ہوگئی۔ وہ اس بات سے باخبر تو پہلے ہی سے تھا تاہم اب وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں متوقع جنگ کے جواب میں یہاں کی کیا ''تیاریاں'' تھیں؟
بچھورام اندر کا آدمی تو تھا ہی، جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ فرنگیوں کو منہ توڑ جواب دینے کے لیے کوہ شالیہ کی تینوں ریاستوں میں اتحاد قائم ہو چکا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ، خاطر خواہ طریقے سے عسکری تیاریاں بھی مکمل کر لی گئی ہیں۔
یہ خبر بچھورام کے لیے اہم تھی، وہ اس سے واقف نہ تھا۔ اسی وجہ سے فکرمند ہو گیا۔ اس نے ترنت شیورائے بھولکر تک یہ اہم اطلاع پہنچانے کے لیے اپنے ایک ساتھی کو تیز رفتار گھوڑے پر دلی کی جانب روانہ کر دیا۔
راج محل میں ہی نہیں بلکہ اب ریاست ناگرہ میں بھی بچھورام کی در پردہ حیثیت ایک غدار باغی کی سی تھی۔ اسی سبب اس نے اپنے ساتھ چند ساتھیوں کو ملا رکھا تھا جو پہلے سے ہی اس کی اطاعت کا دم بھرا کرتے تھے۔
اگلے دن ہی رات تک بچھورام کا یہ قاصد لوٹ آیا۔ شیورائے بھولکر نے اپنے جوابی پیغام کے ساتھ چند ہدایات بھی اسے دی تھیں۔
سب سے پہلے شیورائے نے...... بچھورام کو اس اہم اطلاع دینے کی شاباشی دی اور ساتھ ہی چند ہدایات بھی دیں کہ اتحادی افواج کی نقل و حرکت اور ان کے اسلحے کی صراحت تفصیل کے ساتھ اور ان کی نفری قوت کے بارے میں بتلائے۔ سب سے آخر میں ایک ''اسکرپٹ پری پلان'' تھا جس کے مطابق جنگ سے پہلے پہلے بچھورام کو ریاست ناگرہ میں راجا پرتاب کمار کے خلاف پروپیگنڈا مہم چلانا تھی۔ یہ پروپیگنڈا مہم ریاست سمیت راج محل کے اندر بھی چلانے کی کوشش کی جائے اور بالخصوص شاہی فوج کے سینا پتی موج سنگھ اور اس کے نائب ہری رام کو راجا پرتاب کمار سے بددل کیا جائے۔ یوں جنگ کے نتائج زیادہ خاطر خواہ اور مثبت حاصل ہونے کا امکان تھا۔
بچھورام نے فوراً جوابی پیغام لکھ بھیجا تھا جس کے مطابق اس نے کہا تھا کہ پہلے ہی روز سے جب نیا راجا گدی نشین ہوا تھا تو اس نے اپنی ''مہم'' کا آغاز کر دیا تھا۔ البتہ سینا پتی موج سنگھ ایک مضبوط کردار کا آدمی ہے اور وہ راجا کا وفادار ہے، اسے بدلنا ناممکن ہے، لیکن اس کے نائب ہری رام کو ہاتھ میں کیا جا سکتا ہے وغیرہ۔
یوں بچھورام نے درونِ خانہ راجا پرتاب کمار کے خلاف پروپیگنڈا مہم کا آغاز کر ڈالا۔ راج محل سے باہر یا اندر اس کے جتنے بھی ہم خیال تھے، انہیں ہر طرف پھیلا دیا، جنہوں نے عام لوگوں میں گھل مل کر راجا پرتاب کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا کہ...... پرتاب کمار نے خود ہی باپ کی ہلاکت کا سامان پیدا کیا تھا اور الزام میں اپنی سوتیلی ماں کو راج محل میں ہی نظر بند کر دیا۔
یہی نہیں نئے راجا کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے فرنگیوں کے ساتھ بھی تعلقات خطرناک حد تک خراب کر دیے گئے ہیں، غرضیکہ نئے راجا نے پوری ریاست کو جنگ میں جھونکنے کا سامان پیدا کر دیا ہے وغیرہ۔
اس روز وہ تخلیہ گاہ میں نجو بائی کے ساتھ موجود تھا اور وہ اس سے نیچی آواز میں کہہ رہی تھی۔
''بچھورام! تمہیں پورا وشواس ہے نا کہ...... انگریز سرکار ناگرہ کو فتح کر لے گی؟''
''پورا وشواس ہے مجھے...... نجو بائی! تم کیوں چنتا کرتی ہو۔'' بچھورام نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بھلا انگریز سرکار سے بھی کوئی لڑ سکتا ہے...... اور پھر ہم بھی تو یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہوئے۔ تم دیکھ ہی

رہی ہو کہ میں خود اپنی جان کو خطرے میں ڈالے راجا پرتاب کمار کی جڑیں کترنے میں لگا ہوا ہوں۔"

"ہاں! یہ تو بنے آخر کو ناگرہ کا مہاراجا بھی تو تم نے ہی بنانا ہے نا......!" نجو بائی اٹھلا کر اور اک ادائے دلربانہ سے بولی لیکن اس نے دیکھا کہ بچھورام کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی رہی تھی۔ کہاں تو وہ اس کی ایک ادائے دل آراء اور خوش نگاہ مسکراہٹ پر اس کے قدموں میں لوٹنے لگ جاتا تھا۔ وہ بھویں سکیڑ کر بولی۔

"کیا بات ہے بچھورام۔ تم کچھ فکرمند نظر آرہے ہو؟"

"ایک بات بتاؤ نجو بائی! یہ بدری ناتھ کو تم اب اپنے کام کا آدمی سمجھتی ہو یا نہیں۔" وہ گومگو سے انداز میں بولا۔ نجو بائی اس کے عجیب سوال پر پہلے تو ذرا بھونچکا... سی رہ گئی پھر جواب میں نفرت خیز لہجے میں بولی۔

"اسی مورکھ نے تو ہمیں آج اس انجام تک پہنچایا ہے۔ ایک نمبر کا مطلب پرست اور ذلیل آدمی ہے یہ بدری ناتھ۔ اب میں سمجھ چکی ہوں، وہ اپنے مطلب کے سوا اور کسی چیز سے غرض نہیں رکھتا۔ اس نے ہمیں بھی اب تک محض بہلاووں اور دھوکے میں رکھا، بلکہ میں تو اسے اب اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگی ہوں۔"

"بس، نجو بائی! میں تمہارے منہ سے یہی سننا چاہتا تھا۔ اب میں شانت ہو گیا۔" بچھورام ایک دم بولا، جیسے اس کے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔

"آخر بات کیا ہے؟ تم نے یہ اچانک بدری ناتھ کے بارے میں کیوں پوچھ لیا؟" نجو بائی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاتا ہوں، پہلے مجھے ایک ضروری کام نمٹانے دو۔"

بچھورام یہ کہہ کر جلدی سے تخلیہ گاہ سے نکل گیا۔ نجو بائی اسے حیران اور الجھی ہوئی نگاہوں سے تکتی رہ گئی۔ بچھورام نے وہاں سے سیدھا کالی کے مندر کا رخ کیا۔ وہ ایک گھوڑے والی بگھی میں وہاں پہنچا تھا۔

پہلے تو اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ ...... اپنے کسی مخبر سے اس کا کھوج لگوائے گا لیکن معاملہ چونکہ انتہائی رازداری اور احتیاط کا متقاضی تھا، اس لیے اس نے خود ہی اسے نمٹانے کا ارادہ کیا تھا۔

وہ کالی کے مندر پہنچا تو اس کی ملاقات ابتدا میں ہی پرس رام سے ہوگئی۔ وہ اس وقت پروہت وغیرہ کے روپ میں نہیں تھا۔ عام سے پجاری کے بھیس میں تھا۔ وہ بھی اسے نظرانداز کرتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔

مہاراجا چندر گپتا کے مرنے کے بعد اب یہاں کے لوگ بھی بچھورام اور نجو بائی کو ناپسند کرنے لگے تھے۔ وہ انہیں احسان فراموش سمجھنے لگے تھے۔ یوں بھی نجو بائی مہارانی نہیں رہی تھی اور نہ ہی خود بچھورام کسی مہارانی کا غلام خاص رہا تھا۔ اسی لیے پرس رام ہی کیا کالی کے مندر کے کسی پجاری نے بھی اسے منہ لگانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ بچھورام بھی گنوں کا پورا تھا، سمجھ گیا کہ یہ محض کالی کے پجاری نہیں بلکہ چڑھتے سورج کے پجاری بھی تھے۔

یوں ان کی بے رخی نے بچھورام کے دل میں ان کے خلاف مزید نفرت بھر دی۔ کہاں تو یہ سب ہی اس کے آگے بچھے چلے جاتے تھے مگر اب......

پھر بھی اس نے مہاپجاری بدری ناتھ سے ملنے کا فیصلہ کیا...... لیکن اسے ملنا تو درکنار مندر کی چوکھٹ تک پار کرنے نہیں دی گئی۔ ناچار اس نے ایک پجاری سے التجا کر ڈالی۔

"ارے بھیو! ذرا ایک پرس رام سے ہی ملاقات کرا دو۔"

"وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے، اندر سب جاپ الاپ میں مصروف ہیں۔" ایک پجاری نے رکھائی سے کہا۔

"ارے تو اس میں اتنا ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" بچھورام مکاری سے بولا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے وہ پتا اب پھینک ہی دینا چاہیے تھا، جس کے اثر کا اسے اندازہ کرنا تھا، بولا۔

"اچھا چلو میرا صرف ایک پیغام پرس رام تک پہنچا دو۔" بچھورام نے ابھی دانستہ مہاپجاری بدری ناتھ کے بجائے سر دست پرس رام کو چھاپنا چاہا تھا۔

"ہاں ہاں ...... پہنچا دیں گے، جب وہ فارغ ہوں گے تو...... کیا پیغام ہے؟" اسی پجاری نے بے رخی سے کہا۔

"پرس رام سے اتنا کہہ دینا کہ ...... میں ماریا کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ بس، چلتا ہوں۔"

بچھورام نے بے پروائی سے کہا اور فوراً پلٹ کر جانے لگا تو وہ پجاری "ماریا" کے نام پر بری طرح چونک گیا۔ اس نے فوراً بگھی کی طرف جاتے ہوئے بچھورام کو عقب سے آواز دے ڈالی۔

"اے بچھورام! ذرا ٹھہر۔ ادھر آ......"

بچھورام کے پتلے پتلے بدہیت سے ہونٹوں پر

مکارانہ مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ اس کی جانب پلٹ کر چند قدم آگے بڑھا۔

''ماریا سے متعلق کیا پیغام ہے، مجھے بتا دو......'' پجاری نے کہا تو بچھورام مکاری سے بولا۔

''نہیں، یہ تو میں پھر دوبارہ آ کر اب مہا پجاری بدری ناتھ کو ہی بتاؤں گا۔''

''اب زیادہ اکڑنے کی ضرورت نہیں......'' اسی پجاری نے ہلکے سے درشت لہجے میں اس سے کہا۔ ''ٹھہر جاؤ پھر...... میں تمہاری ملاقات پروہت سے کرائے دیتا ہوں۔ چل ادھر آ......''

بچھورام اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ پجاری اسے مندر کے اندر لے گیا۔ ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے بچھورام کو وہیں رکنے کا کہا اور خود اندر چلا گیا۔ ابھی اسے گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک بچھورام نے باہر سے ہی اندر کی سن گن لی تو اسے پرس رام کی غصیلی آوازیں سنائی دیں اور اگلے ہی لمحے اس نے بذات خود پرس رام کو اسی پجاری کے ساتھ کمرے سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ وہ پجاری کو بری طرح جھڑک رہا تھا اور کمرے کے دروازے پر پہنچنے تک اس نے جیسے بچھورام کو سنانے کی غرض سے پجاری سے کہا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی، بچھورام جیسی معزز شخصیت کو تم نے باہر کھڑا کر رکھا ہے۔'' پھر وہ کھسیانی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بچھورام سے مخاطب ہو کر بولا۔

''شما کر دینا بھائی بچھورام......! یہ بے وقوف ہے، آپ کو باہر ہی کھڑا کر دیا۔ پدھاریے...... پدھاریے۔'' اس نے بچھورام کے سامنے نہایت خوش اخلاقی سے کہا اور بچھورام...... جو گنوں کا پکا تھا، پل کے پل میں سمجھ گیا کہ اس کا پھینکا ہوا پتا، اپنی کامیاب ترپ چال پر آ گیا ہے۔ ورنہ کہاں تو یہی پرس رام اسے خود دیکھ کر بھی منہ موڑ گیا تھا اور اب......

بچھورام اس کے ساتھ اندر آ گیا۔ دونوں چکنے چمکتے فرش پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں اب ان کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

''کیا بات ہے بچھورام! یہ تو بتا رہا تھا کہ تم کسی ناری ماریا کے بارے میں کچھ بتانا چاہ رہے تھے؟''

''میں نے تو تمہیں بھی دور سے ہی دیکھ کر پرنام کیا تھا، مگر تم تو مجھ پر ایک ذرا نگاہ ڈال کر مندر کے اندر گھس لیے تھے؟'' بچھورام نے بھی جیسے اپنے دل کی بھڑاس نکال ہی لی۔ تاہم وہ فوراً بھانپ گیا تھا کہ معاملہ وہی ہے جس کا اسے یقین کی حد تک شبہ تھا۔ اس پر پرس رام ایک بار پھر مکارانہ فروتنی سے بولا۔

''ارے بھائی بچھورام! اب جانے بھی دو۔ ہم تو بڑھے ہو گئے، دکھتا بھی صحیح طرح سے نہیں ہے۔ تم بتاؤ یہ ماریا کا کیا چکر ہے؟''

بچھورام خود بھی کیا کم کائیاں تھا، اس کی مکاری بھانپ کر اس نے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مقصد کی بات کر ڈالی۔ بولا۔

''ماریا نام کی ایک فرنگن دوشیزہ تھی۔ وہ اچانک لاپتا ہو گئی ہے، تمہیں تو پتا ہی ہے بھائی پرس رام کہ ان سسرے...... فرنگیوں کا ایک کتا بھی کھو جائے تو یہ اس کا کھوج لگانے کے لیے پاتال تک جا اترتے ہیں۔ یہ تو پھر ایک لڑکی کا معاملہ ہے اور لڑکی بھی کون، کسی معمولی انگریز کی نہیں بلکہ برٹش آرمی کے ایک کرنل کی بیٹی ہے، وہ بھی اکلوتی اور لاڈلی۔ کرنل اینڈرسن نام ہے اس کا۔'' یہ کہنے کے بعد اس نے دانستہ کچھ دیر کی خاموشی اختیار کر لی اور بھانپتی ہوئی نظروں سے پرس رام کا چہرہ تکنے لگا جو ایک دم فق سا ہو گیا تھا۔ بچھورام بھی سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا تھا۔

''تت...... تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا؟'' پرس رام نے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا چلنا تھا، میں تو شہر گیا تھا، وہیں جگہ جگہ پوسٹر اور اخبارات کے ٹکڑوں میں تصویر کے ساتھ یہ سب اعلان درج تھا...... ماریا کی تصویر بھی تھی۔'' بچھورام نے یہ کہتے ہوئے ایک اخبار کا ٹکڑا نکال کر اسے دکھایا، جس میں ماریا کی تصویر بھی تھی جو اس نے شیورائے بھولکر سے حاصل کی تھی۔

پرس رام نے اخبار کا وہ ٹکڑا لے کر اپنے چہرے اور آنکھوں کے بالکل قریب کر لیا۔ بچھورام کی گھاگ نظریں اس کے چہرے کے زبردست اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتی رہیں۔

''کیا تم نے اس فرنگن ناری کو کہیں دیکھا ہے؟'' بچھورام نے جان بوجھ کر یہ کہا تو پرس رام یوں اچھل پڑا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، گڑبڑاتے لہجے میں بولا۔

''بب...... بھ...... بھلا مجھے کیا معلوم......؟ میں تو...... میں تو اس تصویر کو ہی پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''

اس کی گھبراہٹ دیکھ کر بچھورام کا شبہ اب یقین میں بدل چکا تھا۔ وہ بڑے آرام سے اس کے شانے پر اپنا ایک ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''دیکھو بھیو، پرس رام......! بات صاف کرو گے تو

صاف ہی رہے گی اور ختم بھی ہوجائے گی۔ چھپاؤ گے تو بڑھ جائے گی۔ دوستی اور معاملہ داری کی بات کروں گا میں ...... کیونکہ یہاں ہم سب ساجھے ہیں اور کوئی الگ نہیں۔ کوئی آفت آئی تو ہم سب ہی نرغے میں آئیں گے۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو بتا دو ابھی...... تاکہ اس کا حل ابھی سے سوچ لیا جائے۔"

شاطر بچھورام کی بات نے پرس رام کو اندر سے بری طرح ٹھٹکا کر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا، یہ کہنا کیا غلط تھا کہ اسی معاملے پر کچھ دنوں سے پرس رام خود بھی پریشان تھا اور اس نے اپنی پریشانی کا اظہار مہا پجاری بدری ناتھ سے بھی کیا تھا۔ تب ہی وہ ایک گہری سانس کھینچ کر ادھر ادھر ایک نظر ڈالنے کے بعد رازدارانہ لہجے میں بچھورام سے بولا۔

"بھائی بیجورام! تمہاری بات کو میں رد نہیں کرتا۔ تھوڑے دنوں پہلے ہی میں نے مہا پجاری بدری ناتھ سے بھی یہی کچھ کہا تھا کہ اس فرنگن ماریا کی نشانی تک کو ختم کردو مگر وہ نہیں مانے۔ بس! تب سے ہی مجھے چنتا کھائے جا رہی ہے۔"

"نشانی......؟ کیسی نشانی......؟" بچھورام (بیجورام) نے بھویں سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "نشانی" پر اس کے کان کھڑے ہوگئے تھے۔

تب پرس رام نے نیچی آواز میں کہا۔ "بھائی بیجورام! اب تم ہی میری مشکل حل کرسکتے ہو اور کوئی طریقہ بتاؤ کہ مہا پجاری جی کی بدھی میں یہ بات آئے۔ ورنہ سب گئے کام سے۔"

"یہی تو کہا میں نے بھیو! جو معاملہ ہے ادھر ہی صاف کردو۔ بعد میں گلے پڑ جائے گا۔ ویسے یہ نشانی والی کیا بات ہے؟"

"تم تو ہمارے پرانے خیرخواہ ہو بیجورام! کسی سے ذکر مت کرنا۔" پرس رام بولا۔ "سسری ماریا کی اس پورن ماشی میں بلی چڑھا دی گئی۔"

"کیا......" بچھورام کا چہرہ فق ہوگیا۔

"ہاں! پرنتو آگے سنو۔ اس سسری ماریا کے پاس ایک شاہی خنجر تھا، چھوٹا سا۔ کوئی نمونہ تھا وہ...... جو اس کے باپ نے نشانی کے طور پر اپنی بیٹی (ماریا) کو دے رکھا تھا۔ وہ خنجر اپنے بدری ناتھ جی کو بھا گیا۔ وہ اس نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ میں نے سمجھایا بھی کہ یہ خنجر ہم سب کو پھنسوا دے گا، مگر وہ خود کو مہابلی سمجھتے ہیں۔ اس بات کو خاطر میں ہی نہیں لائے اور ہمیں بری طرح جھڑک دیا۔" وہ اتنا بتا کر چپ ہوگیا۔

بچھورام کے کان فوراً کھڑے ہوگئے۔ اندر سے وہ بہت خوش ہوا، ماریا کی گمشدگی کے سلسلے میں اس کا یہ خدشہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پرس رام کبھی بھی یہ راز اس کے سامنے نہیں کھولتا، لیکن چونکہ یہ لوگ یعنی بچھورام اور نجو بائی ان کے کالے کرتوتوں سے پہلے ہی واقف تھے، اسی لیے پرس رام نے بچھورام سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ یوں بھی خود اس کی دم پر پاؤں آپڑا تھا۔

"تم اب کوئی چنتا مت کرو۔ میں خود بھی دوبارہ یہاں آؤں گا اور مہا پجاری بدری ناتھ سے ملوں گا اور اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔" پرس رام اس کی بات پر مطمئن ہوگیا اور اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

بچھورام کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ وہ فوراً وہاں سے کھسک گیا اور اس نے راج محل آکر ہی دم لیا۔ اب وہ اپنے اقامتی گوشے میں بیٹھا سوچ میں گم تھا۔ اس کی چال کامیاب گئی تھی۔ اس نے پرس رام سے بڑی لچھے دار باتیں کرکے اس کے منہ سے حقیقت اگلوالی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ماریا سے متعلق ایک اہم بات بھی اس کے علم میں آگئی تھی۔ وہ خنجر، وہ نشانی، ان سب پجاریوں کے گلے کا پھندا بن سکتی تھی۔

"بچھورام! تمہارے ہاتھ ترپ چال لگ چکی ہے، فرنگیوں کے جنگ کا ایک اور جواز ان تک پہنچا دے۔ پھر ان پجاریوں کا قصہ ختم......" اس نے خود سے کہا اور فوراً ایک قاصد کے ہاتھ یہ اہم پیغام شیو رائے بھولکر کی طرف روانہ کردیا۔

☆☆☆

کوہ شمالیہ پر چڑھائی کی عسکری منصوبہ بندی کو بالآخر حتمی شکل دے دی گئی تھی، اس جنگی پلان کے مطابق...... سب سے پہلے ریاست ناگرہ کو تختۂ مشق بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا کیونکہ...... ایک تو یہی ریاست سب سے پہلے ان کے نشانے پر تھی اور اسے فتح کیے بغیر تریپال اور پالن پور تک رسائی مشکل اور کٹھن تھی، کیونکہ دوسرا راستہ بے حد دشوار گزار اور ناہموار تھا۔ وہاں صرف انفنٹری فوج ہی داخل ہوسکتی تھی اور اسے بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ جبکہ اول الذکر راستے پر انفنٹری سمیت آرٹلری اور آرڈیننس (توپیں، گولہ بارود) کی آمد و شد بہ آسانی ممکن ہوتی۔

لہٰذا اس وقت دلی کی قلعہ بند قابض حویلی کے ایک

ہال کمرے میں پانچ عسکری ماہرین سمیت تین اعلیٰ عہدے دار وسط میں بچھی ہوئی گول میز پر ایک بڑے سے نقشے پر جھکے ہوئے اسی جوڑتوڑ میں معروف تھے۔

ان مذکورہ آٹھ اور چند دیگر متعلقہ افسران میں گورنر رڈنی کاسٹوفر، جنرل مائیکل شا، کرنل بلسٹروڈ، میجر ڈی فارسٹ جو تیسویں لائٹ کیولری کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا، بریگیڈیئر ڈان کیورشم، کرنل بلسٹروڈ کی اپنی رجمنٹ کا ایک کمانڈنگ آفیسر جیرالڈ، ایک ریزیڈنٹ آفیسر اور آٹھواں کرنل اینڈرسن شامل تھا۔

شیورائے بھولکر ایک طرف خاموش بیٹھا تھا مگر اس کی نظریں کرنل اینڈرسن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے کرنل اینڈرسن کی جگہ اس کا نائب کیپٹن جیمس وہاں نظر آرہا تھا، بھولکر بھی نہیں تھا وہاں۔ یہ دونوں لگ بھگ کوئی دو گھنٹے پہلے ہی یہاں افراتفری کے عالم میں پہنچے تھے۔ ورنہ تو یہ اہم اجلاس گزشتہ پانچ گھنٹوں سے جاری تھا۔

وجہ اس کی یہی تھی کہ شیورائے بھولکر کو بچھورام کا پیغام ملا تھا جو اس نے ترنت کرنل اینڈرسن کو خود بمبئی (خلیج کھمبات) جا کر پہنچایا تھا۔ اس پیغام کو پاتے ہی کرنل اینڈرسن ایک دم سکتے میں آگیا تھا۔ ایک طرف مارے غم کے وہ ڈھے سا گیا تھا تو دوسری جانب وہ بری طرح طیش میں بھی آگیا تھا۔ بچھورام کی اطلاع کے مطابق اسے بتادیا گیا تھا کہ اس کی بیٹی کو ناگرہ میں کالی کے مندر میں موجود بدمعاش پجاریوں کے ایک شیطانی گروہ نے اغوا کر کے کالی دیوی کے چرنوں میں قربانی کے طور پر مار ڈالا تھا۔

نشانی کے طور پر ماریا کے پاس اس کے باپ کرنل اینڈرسن کا جو خنجر تھا، وہ اس شیطانی ٹولے کے سربراہ مہاپجاری بدری ناتھ کے قبضے میں تھا۔ وہاں کالی کے مندر کے خفیہ تہ خانے میں اور قیدی لڑکیاں بھی ابھی تک موت کی گھڑیاں گن رہی تھیں۔

بہرکیف...... کرنل اینڈرسن کے علم میں یہ بات تھی کہ عنقریب برٹش ملٹری اپنی پوری فورس کے ساتھ کوہ شمالیہ کی ایک اہم ریاست ناگرہ پر چڑھائی کرنے والی ہے اور ناگرہ وہی ریاست تھی جہاں یہ کالی کا مندر واقع تھا۔

یہ سنتے ہی کرنل اینڈرسن انتقام کی آگ میں سلگتا ہوا بھولکر ...اور اس کے پیغام سمیت یہاں آن پہنچا تھا اور ساری صورت حال سے عسکری اعلیٰ قیادت کو آگاہ کر دیا تھا۔ ان کے ہاتھ ناگرہ پر حملے کا ایک اور طاقت ور جواز ...آگیا تھا۔ یوں بغیر کسی پلاننگ کے کرنل اینڈرسن نے بھی اس میں شمولیت حاصل کر لی تھی اور اپنے نائب کیپٹن جیمس کو اپنی جگہ خلیج کھمبات میں مقرر کر دیا تھا۔

''سب سے پہلے اس ریلوے لائن کو آرڈیننس کی ترسیل کے لیے کام میں لایا جائے گا۔''

جنرل مائیکل شا نے جنگی نقشے پر اپنے قلم کی نوک رکھتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''یہاں ایک صنوبر کا گھنا جنگل ہے۔ توپیں اور گولہ بارود اسی مقام پر اتارا جائے گا کیونکہ یہاں سے ریاست کا قلعہ راج محل قریب پڑتا ہے۔ گولہ باری کی ابتدا راج محل سے ہوگی۔ اسی کے عقب میں کالی کا مندر ہے، ہماری ایک دوسری انفنٹری اس جگہ سے مندر پر حملہ کرے گی۔ ہر ممکن یہ کوشش کی جائے کہ پجاریوں اور قیدیوں کو زندہ حالت میں پکڑا جائے بالخصوص مہاپجاری بدری ناتھ کو...... تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جائے... اور ملکہ وکٹوریہ سمیت دنیا کو ان کے کالے کرتوت دکھائے جائیں۔ یوں برصغیر میں ہمارے خلاف نفرت اور جارحانہ فضا ابھرنے نہیں پائے گی۔''

جنرل مائیکل شا اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

مزید دوسرے افسران بھی اپنی اپنی رجمنٹ کی پلاننگ دیتے رہے۔ نو سے بارہ انچ کے دہانوں والی توپوں سے کم کی توپیں استعمال نہیں کی جائیں گی...... اس فیصلے کو ڈان کیورشم نے آخر میں رکھا تھا۔

گفتگو ہوتی رہی، جس کے مطابق ناگرہ کو فتح کرنے کی صورت میں برٹش گورنمنٹ فوراً اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کرے گی، جس کی باگ عنان سرکار انگلشیہ کے سابقہ خیر خواہ آنجہانی مہاراجا چندر گپتا کی بیوہ مہارانی نجو بائی کے سپرد کردی جائے گی کیونکہ جنگ کا پہلا جواز ہی یہی جتایا گیا تھا۔

دوسری رجمنٹ انفنٹری کی کمانڈ کرنل اینڈرسن کے حوالے کی گئی تھی۔ جو خود بھی اپنے سینے میں بیٹی کے انتقام کی آگ اور شعلے سموئے بپھرا بیٹھا تھا۔ جبکہ آرٹلری کمانڈ بریگیڈیئر ڈان کیورشم اور کرنل بلسٹروڈ کے سپرد تھی۔ باقی افسران ان کے معاونین اور انڈر کمانڈ تھے۔

رات گئے جنگی حکمت عملی کی یہ کارروائی جاری رہی۔

اگلا پورا دن آرام کیا گیا اور تیسرے دن فوج کوہ شمالیہ کی جانب کوچ کر گئی۔

☆☆☆

دونوں اس نئی مہم میں پہلے سے زیادہ پرجوش نظر

آرہے تھے۔ سہ پہر تک ڈاک گاڑی نے انہیں بمبئی پہنچا دیا۔ یہاں سے آگے انہوں نے مدھرنا پہنچنا تھا۔ اس کے بعد خلیج کھمبات اور پھر ان کی اصل منزل ''ٹریزر آئی لینڈ'' تھی لیکن اب وہ اس ڈاک گاڑی میں آگے تک کا سفر نہیں کرسکتے تھے کیونکہ اس کی مخصوص ساخت گشت کرتے ہوئے انگریز اہلکاروں کو چونکانے کا سبب بن سکتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے بمبئی اتر کر ڈاک گاڑی چھوڑ دی۔

کوچبان خالی ڈاک گاڑی کے ساتھ اسی وقت واپس لوٹ گیا۔ یہ دونوں ہوڑہ ندی کے کنارے پہنچے جدھر مچھیروں کی ایک بستی آباد تھی۔ انہیں سب سے پہلے ادھر ہی پہنچنے کا حکم ملا تھا کیونکہ خاور حیات اور اس کے ساتھیوں کا یہی بیس کیمپ تھا۔ یہ درحقیقت مسلمانوں کی بستی تھی۔ کچھ ہندو بھی تھے، مگر وہ مجاہدین آزادی کے متوالوں کی بھرپور مدد کرتے تھے۔

اس بستی کی طرف انگریز فوجیوں کا دھیان کم ہی جاتا تھا۔ البتہ دو ایک بار فرنگی فوجیوں نے یہاں اچانک چھاپے بھی مارے تھے، مگر ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگ سکا تھا۔ وہاں انہیں عبدالرحمان سے ملنا تھا، وہ اس کا پتا پوچھتے ہوئے اس کی مڑھی تک پہنچے۔ اریبہ اور شاہ زمان اس کے لیے اجنبی ہی تھے لیکن جب زمان نے خاور حیات کا نام لیا تو اس نے ان دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ خاور حیات اور اس کے ساتھیوں کی ناکامی اور افسوسناک انجام کا ان دونوں کی زبانی سن کر رحمان کو بہت رنج ہوا۔

وہ ایک پچاس پچپن سالہ دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کی بیوی اور ایک جوان شادی شدہ بیٹا بھی تھا۔ اریبہ اور زمان کے لیے الگ مڑھی کا بندوبست پہلے ہی سے موجود تھا۔

''رحمان بھائی! ہم آج رات ہی مدھرنا اور پھر وہاں سے اس جزیرے تک پہنچنا چاہتے ہیں جدھر وہ ''سی ہاک'' نامی جہاز لنگر انداز ہے۔''

کھانا کھانے کے دوران شاہ زمان نے عبدالرحمان سے کہا۔ ان کے آگے بھنی ہوئی مچھلی اور ابلے ہوئے چاول رکھے گئے تھے۔ مڑھی میں اس وقت ان تینوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

''بے شک تمہیں اپنی یہ مہم ضرور سر کرنا چاہیے لیکن کسی قسم کی جلد بازی پہلے یہاں آنے والے مجاہدوں کی طرح ناقابلِ تلافی نقصان کا سبب بھی بن سکتی ہے۔'' عبدالرحمان نے سنجیدگی سے کہا۔

''جلد بازی کیسی رحمان بھائی؟'' اریبہ نے بھنی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا اور تھوڑے چاول منہ میں ڈالتے ہوئے عبدالرحمان سے پوچھا۔ ''آپ نے ہماری منزل تک راہنمائی کرنی ہے۔''

عبدالرحمان نے پرشفیق مسکراہٹ سے اریبہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹی! تم دونوں کو ہی شاید اندازہ نہیں ہے کہ تمہاری یہ مہم کس قدر اہم اور اس سے زیادہ خطرناک بھی ہے۔ شکست کی صورت میں یا تو جان جانا لازمی ہے یا پھر موت سے بدتر قید...... میں تمہیں خوف زدہ نہیں کررہا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس مہم میں وہی مجاہدین سامنے آتے ہیں جو موت سے نہیں ڈرتے، لیکن بیٹی! اصل بات تو جو زندگی سے بھی بڑھ کر ہے، وہ مشن کی کامیابی ہی ہوتی ہے۔ اگر خاور حیات کی طرح اس بار بھی مشن خدانخواستہ ناکام ہوا تو سمجھو سب ختم ہوگیا۔''

عبدالرحمان اتنا کہہ کر چند ثانیوں کے لیے رکا، اریبہ اور شاہ زمان بڑے غور سے اس کی بات سننے میں محو تھے۔ وہ آگے بولا۔

''تمہیں یہاں سے پہلے مدھرنا پہنچنا ہوگا، جہاں مکمل طور پر فرنگی سامراج قابض ہے۔ جو ایک اڑتی ہوئی چڑیا کے بھی پر گننے سے نہیں چوکتے۔ چپے چپے پر فوجی گشت کر رہے ہوتے ہیں پھر وہاں سے اگر بچ نکلے تو آگے خلیج کھمبات ...... کے ساحل تک پہنچنا اس سے بڑھ کر مشکل مرحلہ ہے اور سارے مشکل مرحلوں کی آخری حد وہ منحوس جزیرہ ...... ہے، جہاں ہمارے دیش اور دھرتی کے لوٹے ہوئے خزانوں کا ڈھیر چھپا رکھا ہے۔ جنہیں تھوڑے تھوڑے عرصے بعد بحری جہازوں میں لاد کر انگلستان پہنچایا جاتا ہے۔ اس خطرناک جزیرے (ٹریزر آئی لینڈ) میں تم دونوں کو اس وقت تک رہتے ہوئے فرنگی چوروں کا منصوبہ خاک میں ملاتے رہنا ہوگا جب تک کہ ان کے تینوں باربردار جہاز تباہ نہیں ہوجاتے۔ یا پھر خزانے کے اس ڈھیر کو کسی اور جزیرے پر نہیں پہنچا دیا جاتا۔''

''ہماری منصوبہ بندی یہی ہے، اسی لیے ہم دو ہی اس اہم مشن کے لیے روانہ کیے گئے ہیں۔'' شاہ زمان نے فوراً کہا۔

''ہم اسی جہاز کو جو وہاں اب تک لنگر انداز ہے اور انگلستان روانگی کے لیے تیار ہے، کسی دوسرے گمنام جزیرے تک لے جانے اور سارا خزانہ ان غاصب اور چور فرنگیوں کی نظروں سے وہیں چھپائے رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''تمہارا منصوبہ ٹھیک ہے دوست!'' عبدالرحمان بولا۔ ''لیکن یہ ساری باتیں اتنی آسان نہیں ہیں۔''

''مشن کوئی بھی آسان نہیں ہوتا عبدالرحمان بھائی!'' اریبہ نے کہا۔ ''مگر ہم ایک مسلمان کی حیثیت سے اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ باطل کی جنگ کے خلاف حق کو ہمیشہ فتح ہی نصیب ہوتی ہے اور انشاء اللہ فتح ہماری ہی ہوگی۔''

''انشاء اللہ' آمین۔''

شاہ زمان اور عبدالرحمان نے بیک وقت زیر لب کہا اور اس کے بعد یہ لوگ ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

اگلے دن صبح اریبہ اور شاہ زمان بستی سے نکل پڑے۔ وہ دونوں مچھیروں کے بھیس میں مچھلی اور جھینگوں کے ٹوکرے اٹھائے ایک موٹر بس میں سوار ہو گئے۔ یہ بس مدھرنا ہی جا رہی تھی۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، ریاست مدھرنا پر مکمل طور پر غاصب فرنگیوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا اور اسے بمبئی شہر میں ضم کر لیا گیا تھا۔ پہلے یہاں کسی راجا کے نام پر کٹھ پتلی حکومت قائم کی گئی تھی لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کے سارے ریاستی امور ختم کر کے باقاعدہ برٹش شہری انتظامیہ کے زیر تسلط لے آیا گیا تھا۔ ریاست مدھرنا کا اب صرف نام رہ گیا تھا۔

یہ دونوں بس کے آخری حصے میں بیٹھے تھے۔ ان کے بدن پر مچھیروں والا ہی لباس تھا اور ان کے ٹوکروں سے مچھلی، جھینگوں کی بو اٹھ رہی تھی۔ کئی مسافروں نے انہیں دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی تھی۔ ان کے لباس سے بھی اسی قسم کی بو اٹھ رہی تھی۔ یہ ان دونوں کے لیے ''اچھی'' ثابت ہو رہی تھی، کیونکہ آگے ایک چوکی پر بس کو روک کر چند فرنگی سپاہیوں نے چیکنگ بھی کی تھی اور ایک ایک مسافر کو بہت گھور گھور کر دیکھا تھا۔ جس مسافر پر انہیں ذرا سا بھی کسی قسم کا شبہ ہوتا، وہ فوراً اس کی تلاشی لینا شروع کر دیتے اور بعض کو تو بس سے اتار کر اپنے ساتھ بھی لے جاتے تھے۔

ان فرنگی غاصبوں کی ظالمانہ روش دیکھ کر شاہ زمان اور اریبہ غصے سے کھول اٹھے تھے..... دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر ان غاصب فرنگیوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

ایک اور چوکی پر ان کی بس روک لی گئی۔ سرخ وردی میں کچھ فرنگی اہلکار بس میں چڑھے اور ایک ایک مسافر کو تیز اور گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جن کے آگے تیز چمکتی ہوئی سنگینیں نصب تھیں۔ ان کی جانب بھی دو اہلکار آئے۔

''اس میں کیا ہے؟'' ایک فرنگی نے بس کے فرش پر رکھے ٹوکرے کو اپنے پیر سے ٹھوکر رسید کرتے ہوئے ان دونوں سے درشت لہجے میں دریافت کیا۔

''حضور، مائی باپ! مچھلی اور جھینگا ہے۔'' شاہ زمان نے فدویانہ لہجے میں جواب دیا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟'' دوسرے اہلکار نے تحکمانہ درشتی سے پوچھا۔

''ہوڑہ ندی سے.....''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''بڑی مارکیٹ.....''

''یہ عورت تمہاری کیا لگتی ہے؟'' پہلے والے نے اریبہ کی طرف گھورتے ہوئے شاہ زمان سے پوچھا۔

''یہ..... یہ میری پتنی ہے سرکار.....!''

''تمہارے نام.....؟''

''میرا نام کلپنا اور یہ میرا پتی، راجو ہے۔'' اس بار اریبہ نے جواب دیا۔

''راجو کیا نام ہوا؟ پورا نام کیا ہے؟''

''ررر.....راج کمار.....'' شاہ زمان نے فوراً کہا۔ دونوں اہلکار اس کے نام پر ہنسے۔ ایک نے طنز آمیز حقارت سے کہا۔

''نام دیکھو راج کمار.....اور دھندا دیکھو.....''

''بس جی حضور! ماتا پتا نے جانے کیا سوچ کر یہ نام رکھ دیا تھا میرا۔ پرنتو اسی لیے میں صرف راجو ہی کہلوانا پسند کرتا ہوں۔'' شاہ زمان نے کہا۔

اہلکار بس سے اتر گئے اور اسے روانگی کا حکم مل گیا۔

ان دونوں کی سانس میں سانس آئی۔ عبدالرحمان نے غلط نہیں کہا تھا کہ یہاں قدم قدم پر سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔ کھڑکی سے باہر بھی انہیں فرنگی سپاہیوں اور فوجیوں کے گشتی دستے نظر آ رہے تھے، شاید یہاں بغاوت پھوٹنے کا زیادہ خطرہ تھا۔ بہرطور یہ دونوں بڑی مارکیٹ والے اسٹاپ پر اتر گئے۔

عبدالرحمان نے انہیں بتایا تھا کہ وہ بڑی مارکیٹ میں پہنچ کر اس کے وسطی راستے سے ہوتے ہوئے دوسری طرف سے باہر نکلیں گے تو سیدھے ہاتھ پر شاکر حسین نامی ایک آدمی کی چھابڑی نما دکان پر پہنچ کر رک جائیں اس سے آگے کی راہنمائی..... وہی کرتا۔ ان دونوں کو وہاں پہنچ کر عبدالرحمٰن کا حوالہ دینا تھا۔

مارکیٹ میں خاصا رش تھا، یہاں بھی انہیں ڈنڈا بردار فرنگی سپاہی گشت کرتے دکھائی دیے تھے۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ وہ مارکیٹ میں کسی بھی دو افراد کو زیادہ دیر کھڑے ہوکر ایک دوسرے سے باتیں کرنے بھی نہیں دیتے تھے اور ان کے قریب پہنچ کر زمین پر ڈنڈا بجادیتے۔

یہ دونوں مارکیٹ کے بیچ والے راستے پر چلتے ہوئے شاکر حسین کی چھابڑی پر پہنچے۔ وہاں کچھ گاہک موجود تھے۔ ایک دبلا پتلا لمبا غریب سا شخص میلی کچیلی بنیان اور اسی طرح کی شلوار پہنے گاہکوں کو مچھلی فروخت کررہا تھا۔ عبدالرحمان کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق شاہ زمان کو بھی شاکر حسین لگا تھا۔

یہ دونوں سروں پر ٹوکرے اٹھائے اس کے قریب پہنچے۔ شاہ زمان نے اس کے ذرا قریب پہنچ کر ہولے سے کہا۔

''تم شاکر حسین ہو؟''

''ہاں......''

''میں ہوڑہ ندی والی بستی سے آیا ہوں، عبدالرحمان نے بھیجا ہے۔ ہمیں آگے جانا ہے۔''

شاکر حسین اس کی بات پر چونکا اور چوکنا نظروں سے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد سرگوشی میں بولا۔

''ابھی ٹھہرو، میں ان گاہکوں کو فارغ کردوں۔''

اتنے میں دو اہلکار اس طرف کو آئے۔ وہ شاہ زمان اور اریبہ کو دیکھ کر رک گئے۔ دونوں انہی کی طرف گھور رہے تھے۔

''ارے بھائی! دام وہی دوں گا، جو میں نے بتائے ہیں۔'' شاکر حسین نے ان دونوں فرنگی سپاہیوں کو ان کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر چالاکی سے کہا، زمان اور اریبہ بھی سمجھ گئے۔

شاہ زمان نے فوراً ٹوکرا اٹھایا اور کپڑا ہٹا کر اسے دکھاتے ہوئے بولا۔

''ارے بھیو! ایک دم فس کلاس لایا ہوں، دام تو ذرا مناسب دے دو۔''

''نہیں بھائی نہیں، جو دام بتایا ہے اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ آگے جاؤ نہیں تو......''

''اچھا بھائی! وہی دے دو پھر۔'' اس بار اریبہ نے کہا۔

''پہلے گاہک فارغ کردوں، ابھی ٹھہر جاؤ۔'' شاکر حسین بولا۔

وہ دونوں اہلکار مطمئن ہوکر آگے بڑھ گئے۔ اریبہ اور شاہ زمان خاموش کھڑے رہے۔

شاکر جب فارغ ہوگیا تو جلدی سے بولا۔ ''تم لوگوں کا زیادہ دیر یہاں کھڑا ہونا اب ٹھیک نہیں ہے۔ سپاہی تمہیں دیکھ گئے ہیں۔ یہاں سے خلیج کھمبات جانے کے لیے ......تم پیدل بندرگاہ تک جاؤ گے۔ کم از کم ایک کلومیٹر پیدل چلنا پڑے گا۔ کسی موٹر بس یا سائیکل رکشا میں مت بیٹھنا۔ شبہ ہوجائے گا۔ وہاں بندرگاہ پر مراد خان نام کے ایک آدمی کو ڈھونڈنا ہوگا تمہیں......وہ گوداموں کا چوکیدار سپروائزر ہے، اس سے میرا نام لینے کے بجائے رحمان بھائی اور خاور حیات کا نام لے لینا۔ جاؤ اب یہاں سے......''

حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اریبہ اور شاہ زمان وہاں سے فوراً رفوچکر ہوگئے۔

شکر رہا کہ سردی کا موسم تھا لیکن باوجود اس کے بندرگاہ تک پیدل چلتے چلتے دونوں کے جسموں پر پسینا چمکنے لگا۔ وہ کبھی سستانے کے لیے بیٹھ جاتے اور کبھی چل پڑتے۔

عبدالرحمان کی درست راہنمائی اور کچھ اپنی ہوشیاری اور محتاط روی سے یہ دونوں بالآخر خیریت کے ساتھ بندرگاہ پہنچ ہی گئے، وہاں یہ ذرا سستانے کے لیے رکے۔ ایک قریب کے نل سے پانی پیا۔

چوکیدار مراد خان کو تلاشنے میں انہیں چنداں دشواری نہیں ہوئی تھی لیکن یہاں بھی انہیں گشتی اہلکاروں کے دستے دکھائی دے رہے تھے۔

مراد خان ایک چالیس پینتالیس سالہ آدمی تھا۔ دراز قامت اور صحت مند، وہ ان کے منہ سے عبدالرحمان اور خاور حیات کا نام سنتے ہی ٹین کے ایک ڈربا نما کمرے میں لے آیا۔

☆☆☆

ان دو ''جاسوس آنکھوں'' کو اس بار چھاپنے کا علی ریحان نے مصمم ارادہ کررکھا تھا۔ یہ جاسوس آنکھیں اس وقت ہی علی کو دکھائی دیتی تھیں جب وہ نواب شہباز یا اقبال خان سے محوِ گفتگو رہتا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں تنہا ہوتا اور وہ آنکھیں کسی پردے یا چلمن کے کونے سے اسے گھورتی ہوئی نظر آتیں۔

اس وقت بھی علی، نواب صاحب اور اقبال......ایک کمرے میں بیٹھے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ علی اور اقبال اپنی افواج کے ساتھ کل صبح غروبِ آفتاب سے پہلے ہی ناگرہ کی طرف روانہ ہونے والے تھے۔ تریپالی پہاڑی پر انہیں رکنا تھا، جہاں پالن پور کی فوج سے ان کا الحاق

ہوتا اور اس توثیق کے بعد انہیں ناگرہ کی طرف ایک لشکر کی صورت میں روانہ ہوجانا تھا۔

نواب شہباز نے بالآخراس فوج کی کمانڈ ہاتھ میں لینے کے لیے علی ریحان کو رضامند کرہی لیا تھا۔ ان کا اپنا سپہ سالار محمد علی تھا۔ وہ ایک بہادر اور دلیر آدمی تھا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ تریپال کی سرحدوں کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا۔

نواب شہباز نے ایک سو جانثار، تربیت یافتہ جنگی ماہر کے حامل جری سپاہیوں کی ایک نصف بٹالین فوج علی ریحان کے سپرد کردی تھی۔ ان میں دو کیپٹن تھے، مشتاق شاہ اور حفیظ اللہ۔ چار توپچی تھے، اسلحے میں سنگین والی ...... رائفلیں اور کارتوس پستولیں تھیں۔ گولہ بارود بھی تھا۔ دو عدد توپیں تھیں۔ دس کے قریب ہاتھی بھی تھے۔ ان کے ہودوں میں بہترین نشانچی اور ماہر تیر انداز اور نیزہ باز موجود تھے۔

اقبال خان نائب سالار تھا۔ علی کو اس پر شرمندگی تو ہوئی تھی کہ ایک نواب زادہ اس کا نائب تھا۔ اس نے اس کا اظہار صرف نواب شہباز سے ہی نہیں بلکہ اقبال خان سے بھی کیا تھا، انہوں نے بڑی فراخ دلی اور وضع داری کے ساتھ جواب دیا تھا کہ ...... مقصد اس جنگ کو کامیاب بنانا اور اس کے مثبت نتائج حاصل کرنا ہے لہٰذا جو جس عہدے کی اہلیت رکھتا ہے، ایمان داری اور غیر جانبداری سے اس کا تعین کرنا ہی عظیم مقصد کی کامیابی ہے۔

علی نے بھی تن کر نواب صاحب سے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ وہ اس عظیم مقصد کی خاطر اپنی جان تک لڑا دے گا۔ جبکہ نواب شہباز اور اس کے بیٹے اقبال خان کو اس کا پہلے ہی اندازہ تھا کہ علی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی ایک بہادر اور بے جگر مجاہد تھا۔ اس نشست کے اختتام تک علی نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک کھڑکی کے جھولتے پردے سے ان دو جاسوس آنکھوں کو دیکھا تھا۔

نشست کے اختتام کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گیا اور ...... دانستہ خود کلامیہ بولنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی کن انکھیوں سے اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے پردے کی طرف بھی دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اسے پردے کا ایک کونا سرکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہاں وہی دو آنکھیں دکھائی دیں مگر وہ اس سے بہ ظاہر لاتعلق بنا اسی طرح بڑبڑاتا ہوا کھڑکی کے قریب سرکتا چلا گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ اس نے پردے پر جھپٹا مارا اور کسی کی نرم و نازک گردن اس کے ہاتھ کے مضبوط شکنجے میں آ گئی۔ ساتھ ہی ایک ہلکی سی نسوانی کراہ کی آواز بھی ابھری۔

علی نے دیکھا وہ ایک دبلی پتلی اور سانولی سی عام شکل وصورت کی جوان لڑکی تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ اسے ایک معمولی سی ملازمہ لگی تھی۔ بس اس کی ایک ہی خصوصیت تھی کہ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر کشادہ تھیں۔

''کون ہو تم اور کس کے کہنے پر یہ جاسوسی کرتی ہو؟''

''م ...... میں کسی کے لیے ...... ج ...... جاسوسی نہیں کرتی۔'' وہ ہراساں لہجے میں پھنسی پھنسی آواز سے بولی۔

''جھوٹ مت بولو۔ جانتی نہیں ہو کہ میری اس حویلی میں کیا حیثیت ہے؟'' علی نے درشت لہجے میں اسے دھمکایا۔ ''سچ بتا دو، ورنہ اسی وقت تمہاری گردن کا منکا توڑ ڈالوں گا۔'' یہ تہدید کرتے ہوئے علی نے اس کی نازک سی گردن پر اپنے مضبوط ہاتھ کے شکنجے کا دباؤ تھوڑا بڑھایا تو وہ ایک دم خوف زدہ سے لہجے میں گھٹی گھٹی آواز سے بولی۔

''ب ...... بتاتی ہوں۔''

''بتاؤ مگر سچ ...... ورنہ اب کی بار ایک ہی جھٹکا دوں گا اور قصہ ختم ......'' علی اس بار خونخوار لہجے میں بولا اور اس کی گردن پر دباؤ کم کیا۔

''وہ ...... وہ ...... میں بی بی جی کے کہنے پر ایسا کرتی تھی۔''

''بی بی جی کون؟ کھل کر بولو۔'' علی نے اسے گھرکا۔

''م ...... مہرو ...... مہرالنساء۔''

اس نام پر علی چونکا۔ پوممیاں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق اس کا شبہ اسی پر تھا۔ وہ تصدیق کی خاطر بولا۔

''مہرو بی بی سے تمہاری مراد وہی خاتون تو نہیں، جو نواب صاحب کی بہو اور ان کے چھوٹے بھائی سراج خان کی بیٹی ہے؟''

''ج ...... ہاں ......!''

''ہوں ......'' علی نے ایک پُرسوچ ہنکاری خارج کی اور اسے دھمکا کر اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ ایک دم خوف زدہ ہو کر یوں بھاگی جیسے اسے تھوڑی بھی دیر ہو گئی تو موت آ جائے گی۔

علی سوچ میں پڑ گیا۔ اگلے دن ناگرہ روانگی تھی۔ اس وقت سہ پہر تھی۔ اس نے سب سے پہلے اقبال سے اس بارے میں بات کرنا مناسب سمجھا اور اس کی آمد کا منتظر رہا۔ وہ آرام کرنے اپنے کمرے میں گیا ہوا تھا۔ ان کی آخری نشست رات میں ہونا تھی۔

لیکن علی نے اسی وقت پیومیاں کو جو مہمان خانے میں اس کی خدمت پر مامور کیا گیا تھا، سے کہلوا کر اقبال خان کو اسی وقت بلوا لیا۔

وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ علی کو اب بھائی کہتا تھا۔

''خیریت تو ہے نا...... علی بھائی! اس وقت بلا لیا، یہ آپ کے آرام کا وقت نہیں تھا؟''

''آرام بھی کر لیں گے ابھی رات پڑی ہے، یہ بتائیں آپ تو آرام نہیں کر رہے تھے؟ یا مصروف......''

''ارے ...... نہیں نہیں میری بھلا کیا مصروفیت...... بیٹھیں۔'' اقبال کہتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ علی بھی اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ بے شک اس کے اس نواب زادے کے ساتھ کچھ بے تکلفانہ مراسم پیدا ہونے لگے تھے مگر پھر بھی علی اس کے ساتھ انداز و تخاطب، نشست و برخاست اور رائج القابات کے سلسلے میں خیال رکھتا تھا۔ وہ لحہ بھر اس مخمصے میں پڑ گیا تھا کہ کہیں اقبال کو اس کی بات بری نہ لگ جائے لیکن بات تو حقیقت تھی اور بتانی بھی ضروری تھی۔

''کیا بات ہے، لگتا ہے کوئی اہم بات رہ گئی ہے۔''

اقبال نے گہری سوچ میں گم دیکھا تو علی نے ایک گہری سانس خارج کی اور اسے ساری حقیقت بتا دی۔ یہ بتاتے ہی اس نے فوراً سے پیشتر نواب زادے کے چہرے کو دیکھا تھا۔ مگر وہاں ایسے کوئی تاثرات نہ تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اسے علی کی بات بری لگی ہو، بلکہ اس کے برعکس وہ ایک دم غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا...... یہ نجمہ ...... اور مہرو......'' پھر وہ علی سے مخاطب ہو کے بولا۔

''تم ٹھہرو میں ابھی......''

''نہیں نواب زادہ صاحب!'' علی ریحان نے ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس سے کہا۔

''ابھی یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے، کل ہم نے فوج کے ساتھ ناگرہ روانہ ہونا ہے لیکن مجھے فکر و تشویش اس امر کی ہے کہ آپ کی اس عظیم الشان حویلی پری محل میں چھپے ہوئے دشمن ہماری غیر موجودگی میں کوئی گل نہ کھلا دیں۔''

''میں اسی لیے تو یہی کرنے جا رہا ہوں۔'' اقبال طیش میں بولا۔

''آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھے۔'' علی نے تحمل سے کہا۔ ''اگر گھر کا کوئی فرد، جیسا کہ اس مذکورہ واقعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے، اس غداری میں شامل ہے تو وہ کون ہو سکتا ہے، یہ تو آپ کو پتا چل ہی گیا ہوگا، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان پر کسی قسم کا تشدد کیے بغیر سر دست حویلی میں نظر بند کر دیا جائے اور ملازمہ نجمہ کو فوراً یہاں سے نکال دیا جائے۔''

اقبال نے علی کی طرف دیکھا اور اچانک سے مسکرا دیا۔ علی کو حیرت ہوئی۔ اقبال اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں بولا۔

''علی! ملازمہ نجمہ کا تو تم نے نام لے لیا، مگر جو اصل مجرم ہے اس کا نام تم نے لیے بغیر اشارے سے کام چلایا۔ یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی اور شرافت ہے۔''

''مجھے اپنے معزز میزبانوں کے گھر میں کسی پردہ دار خاتون کا نام لینا مناسب نہیں لگتا۔'' علی نے دھیرے سے کہا۔ ''لیکن مجھے ان کے مجرم ہونے پر بے حد افسوس ہے۔''

''ہاں! مہر النساء میری بچپن کی منگیتر تھی۔ ہمارے دادا حضور کی یہی خواہش تھی کہ دونوں بھائی (نواب شہباز خان اور سراج خان) آپس میں خاندانی اور خون کا رشتہ مضبوط کرنے کے لیے ایک دوسرے کے سمدھی بھی ضرور بنیں۔ دادا حضور کی یہ خواہش ایک طرح سے ان کی وصیت کا بھی درجہ رکھتی تھی۔ یوں مہرو تین سال پہلے میری بیوی بن کر یہاں آگئی۔'' وہ اتنا کہہ کر رکا پھر بولا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں، کل صبح روانگی ہے، فجر کی نماز سب اکٹھے ادا کر کے نکلیں گے۔''

''انشاءاللہ۔'' علی نے کہا۔

اگلے دن باجماعت نماز فجر ادا کی گئی اور یہ جنگی قافلہ ناگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

علی سالار کی حیثیت سے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے پاس رائفل، قرلی اور تلوار بھی تھی۔ کمان ... اس کے کاندھے پر تھی اور ترکش اس کی کمر پر۔ وہ پوری طرح سے ہتھیاروں سے لیس تھا۔

اقبال خان بھی اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ بھی ہتھیاروں سے لیس تھا............ یہ قافلہ دوپہر تک رواں دواں رہا اور بالآخر سہ پہر تک یہ ناگرہ پہنچ گئے۔

علی کو اب اس بات کا خوف نہ تھا کہ راج محل کے لوگ اسے ''سوشیل'' کے حوالے سے پہچان لیں گے۔ اب وہ ڈر والی بات ہی نہیں رہی تھی۔ فرنگیوں کے اب سب دشمن بن چکے تھے تاہم پھر بھی اس نے کسی بدمزگی سے بچنے کے لیے کافی حد تک اپنی مخصوص پوشاک کے ذریعے حلیہ بدل رکھا تھا۔

ناگرہ میں سپہ سالار موج سنگھ نے ان کا شایانِ شان استقبال کیا۔ پھر علی ریحان اور اقبال خان کو راجا پرتاب کمار کے روبرو بھی پیش کیا گیا۔ راجا پرتاب نے ان کے جذبۂ یکجہتی کو سراہا اور انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اسی طرح شام تک پالن پور سے مہاراجا مہندر سنگھ کی بھی امدادی فوج پہنچ گئی۔

راتوں رات اتحادی افواج کے سالاروں کی اہم نشست ہوئی اور یہ لوگ جنگی حکمتِ عملی تیار کرنے لگے۔

☆☆☆

حویلی نما اس مکان کے ایک نسبتاً بڑے کمرے میں سراج خان اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کی سرخی بھی تھی اور تفکر و تشویش کے گہرے سائے بھی۔

اس کمرے میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ تین افراد اور بھی تھے جن میں اس کا بدہیت قسم کا ملازم بھی شامل تھا جو درحقیقت ایک بدمعاش تھا۔ سراج کے آدمی اسی کے زیردست رہتے تھے۔ اس کی دائیں کنپٹی زخمی نظر آرہی تھی اور اس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کا نام داور تھا۔ دوسرا انسپکٹر منظور شاہ تھا جبکہ تیسری شخصیت نجمہ کی تھی، یہ وہی نجمہ تھی، جسے علی ریحان نے بے نقاب کیا تھا اور بعد میں اسے نواب شہباز نے ہمیشہ کے لیے پری محل سے نکال دیا تھا۔

یہ تینوں کچھ نادم نادم اور شکست خوردہ سے کھڑے تھے۔

اچانک سراج خان ٹہلتے ٹہلتے رکا اور ان تینوں کی طرف گھوما پھر پُرغیظ لہجے میں بولا۔

''غضب ہوگیا یہ تو...... ہر میدان میں شکست ہورہی ہے ہمیں...... ایک طرف وہ چکنی مچھلی کی طرح ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور دوسری طرف منظور شاہ تم بھی کچھ نہیں کرسکے۔ تیسری جانب داور نے راہزن کے بھیس میں بھی کچھ نہیں کیا اور اب یہ نجمہ بھی اپنا چہرہ لٹکائے یہاں روتی ہوئی آگئی۔''

یہ کہتے ہوئے وہ پھر غصے سے ٹہلنے لگا اور پھر رک کر ان کی طرف گھوم گیا۔ تینوں کی طرف دیکھ کر اس نے دانت پیس کر دوبارہ اسی لہجے میں کہا۔

''جی تو چاہتا ہے کہ تم تینوں کے چہروں پر کالک مل دوں۔''

''جناب! میں نے تو پوری کوشش کی تھی۔'' انسپکٹر منظور شاہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''میں نے اور داور نے راہزنوں کے ٹولے کا ڈراما بھی کیا تھا مگر......''

''کیا خاک کوشش کی تھی تم نے منظور......؟'' سراج طیش کے مارے دہاڑ کر بولا۔ ''اب پتا نہیں وہ کیا اہم پیغام تھا اور ہمارے لیے کتنا اہم ہوگا۔ اس جنگ کا کیا احوال دوں جس کی اتحادی فوجیوں کی صورت میں ناگرہ کی جانب روانگی ہورہی ہے۔ اوپر سے یہ بدذات عورت نجمہ نے کام خراب کردیا خود کو ظاہر کرکے۔ شہباز خان اب مجھ پر ایک بار پھر نظر بندی کے احکامات جاری کردے گا۔ یہی وقت تو تھا انگریز بہادر کی ہمدردیاں لینے کا، سب بگڑ گیا۔ سارا کام تم لوگوں کی نالائقیوں کی وجہ سے خراب ہوگیا۔ تم صرف حرام کے نوالے توڑتے رہے ہو اور بس......''

وہ بری طرح تلملانے لگا۔ ان تینوں کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔

''دفع کیوں نہیں ہوجاتے اب ہماری نظروں کے سامنے سے......'' وہ پھر جنونیوں کے سے انداز میں چلایا۔ ''تمہاری منحوس صورتیں دیکھ کر میرے اندر کا ابال مزید بڑھ رہا ہے۔''

وہ تینوں فی الفور وہاں سے کھسک گئے۔ سراج خان کرسی پر گرنے کے انداز میں اپنا سر پکڑے بیٹھ گیا۔ وہ سوچتا رہا کہ کیا کیا جائے۔ وقت اور موقع بڑا نازک تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ایسے میں اگر وہ انگریز سرکار کے کام آجاتا تو یہ ان کی نظروں میں اس کا اہم کام شمار ہوتا۔

اچانک وہ ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال پر چونکا اور خودکلامیہ بڑبڑایا۔

''چلو، زیادہ نہیں مگر اتنا تو بتا ہی سکتا ہوں کہ ناگرہ کی طرف اتحادی افواج کوچ کرچکی ہے۔ بے شک ان کے مخبروں نے بھی مطلع کرہی دیا ہوگا لیکن میں تو اپنا ''فرض'' نبھاؤں۔''

یہ خیال آتے ہی اس نے فوراً داور کو بلایا اور اسے یہی پیغام دے کر فوراً دلی روانہ کردیا۔

سراج خان کے تعلقات کرنل اینڈرسن تک تھے۔ داور یہ پیغام لے کر اسی وقت ایک برق رفتار گھوڑے پر دلی کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

بچھو رام سے ملنے کے بعد پرس رام کا اب کہیں جا کر کچھ من شانت ہوا تھا۔ اسے امید تھی کہ بچھو رام اس نازک مسئلے میں ضرور اس کی مدد کرے گا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ وہ تو خود یہاں ان کی قبر کھودنے کی نیت سے آیا تھا۔ جو وہ کھود بھی چکا تھا اور کرنل اینڈرسن اپنے سینے میں انتقام کی ایک زبردست طوفانی آگ لیے اس طرف کا رخ کرنے

والا تھا۔ اس کی تین سو سپاہیوں پر مشتمل افواج نے ناگرہ سمیت کالی کے مندر کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

پرس رام اس وقت خیالوں کی جنت میں تھا کہ اچانک اسے ایک گرج دار آواز سنائی دی۔

"پرس رام...... !ترنت ہمارے پاس پہنچو۔"

وہ اس آواز اور حکم پر بری طرح لرز گیا اور ہکا بکا ہو کر کبھی اپنے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھتا تو کبھی دیواروں کو...... وہ حیران ہوا اور خوف زدہ بھی۔ اگرچہ وہ اس آواز کو پہچان چکا تھا جو مہاپجاری بدری ناتھ ہی کی تھی لیکن اسے حیرت اس بات پر تھی کہ آواز اس قدر قریب سے آئی تھی جیسے بدری ناتھ اس کے کہیں آس پاس ہی موجود ہو۔

بہرکیف...... وہ ایک دم اٹھ کر بھاگا، کمرے سے نکلا اور دھوتی سنبھالتے دوڑتا ہوا بدری ناتھ کے کمرے کی طرف جانے کے لیے بڑے وسیع و عریض ہال سے گزرا، جہاں کالی کا دیوقامت، پراسرار اور بدہیبت بت ایستادہ تھا کہ اچانک بدری ناتھ کی آواز نے اس کے قدم وہیں روک دیے۔

"رک جاؤ پرس رام......"

پرس رام کا دل ہی نہیں، جسم بھی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا۔ اس نے دیکھا وہاں اردگرد اور پجاری بھی...... کھڑے تھے۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ وہ سمجھ گیا کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ مہاپجاری اس پر بری طرح برہم ہے مگر کیوں......؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔

اس کا رخ کالی کے بت کی جانب تھا اور اگلے ہی لمحے اس نے بت کی اوٹ سے مہاپجاری بدری ناتھ کو نمودار ہوتے دیکھا۔ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہی پرس رام کا اپنا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔

مہاپجاری بدری ناتھ کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں سے شعلے پھوٹ رہے تھے۔ اسی وقت سانپوں کی تیز اور کریہہ پھنکاروں سے ہال کمرا گونج اٹھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے لاتعداد زہریلے سانپ بت کے سر، کاندھوں اور پھیلے ہوئے آٹھ ہاتھوں پر رینگتے نظر آنے لگے مگر فرش تک ابھی کسی سانپ نے رخ نہیں کیا تھا۔

"پرس رام! تم نے ایسا کیوں کیا......؟ کیا تمہیں نہیں پتا تھا کہ ہم...... مہابلی کے مہابلی...... بلکہ مہارشی ہیں......"

بدری ناتھ نے اسے قہرناک اور سرخ انگاروں بھری آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"مم...... مم...... مہاشے...... جی...... گگ...... گرو جی......! آپ تو مہابلی ہی ہیں اور میں کیا کہوں......؟ لل...... لیکن مجھ سے غلطی کیا ہوئی؟" پرس رام کی حالت پتلی ہوئی جا رہی تھی۔

"تم نے اس مندر کی کالی ماں دیوی کی ہتھیا کی ہے مورکھ! اب اپنے انجام کی چنتا کر......" بدری ناتھ بولا۔ پرس رام حیران پریشان رہ گیا۔

"تم نے...... بچھو رام کو اندر آنے کیوں دیا؟ ہم اب نجو بائی اور بچھو رام سے ہر قسم کا سمبندھ توڑ چکے تھے۔ تم اس کی باتوں میں کیوں آئے اور اس خنجر کا راز کیوں اگلا؟"

بدری ناتھ کی زبانی یہ سن کر پرس رام آدھی موت مر گیا۔ اس نے ملتجیانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے لیکن اسی وقت کالی کے بت پر رینگتے ہوئے کئی زہریلے سانپ اچھلے اور سیدھا پرس رام کے اوپر آن گرے۔

"چھ...... چھما کر دو...... مہاگرو......" پرس رام کے منہ سے اتنا ہی برآمد ہوا اور اسی لمحے یک بیک ایک سانپ نے اس کی گردن میں دانت گاڑ دیے۔ پرس رام کے حلق سے جگر پاش چیخ ابھری۔ دوسرے سانپ نے اس کے چہرے پر پھن مار کے اس بری طرح ڈسا کہ پرس رام کی کپکپاتی ٹانگوں میں دم ہی نہ رہا...... اور وہ فرش پر گر پڑا۔ اس کا منہ کھل گیا اور منہ سے جھاگ بہہ نکلا۔ اس کا وجود ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا...... اور بالآخر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔

ان بدمعاش پجاریوں میں سے ایک پجاری اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا تھا۔

دیگر پجاری سر جھکائے ہاتھ جوڑے اسی طرح خاموش کھڑے رہے۔ کسی نے آگے بڑھ کر پرس رام کو بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"دیکھ لیا تم سب نے غداری کا انجام......"

معاً مہاپجاری بدری ناتھ نے گونجیلی آواز میں کہا۔ "ہم سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی۔ ہم مہابلی نہیں بلکہ مہارشی بن چکے ہیں۔"

"رشی مہابلی کی جے...... رشی مہابلی کی جے......"

وہاں موجود دیگر پجاریوں نے نعرے لگائے۔

"تم کیا جانو کہ ہمیں کالی نے کتنی شکتیاں دان کر دی ہیں۔ افسوس پرس رام کے انجام پر ہے ہمیں کہ اس نے ہماری، کالی کی طاقت پر بھروسا نہ کیا اور ایک راز کھول دیا۔ کسی اور سے مدد مانگی۔ اس کا یہی انجام ہونا تھا۔"

پجاریوں نے پھر جے جے کار کے نعرے بلند کر

دیے۔ مہاپجاری نے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا۔ مندر کے ہال میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ وہ آنکھیں موندیں زیرلب کچھ بدبدانے لگا اور تمام سانپ رینگتے ہوئے کالی کے بت کے عقب میں جا کر غائب ہو گئے۔

''ہمیں سب معلوم ہے۔'' بدری ناتھ پھر آنکھیں کھول کر بولا۔

''فرنگی ناگرہ پر چڑھائی کرنے والے ہیں۔ انہوں نے جنگ کا بگل بجادیا ہے۔ یہ لوگ کالی کے اس پوتر استھان پر بھی حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر ہم انہیں نشٹ کر کے رکھ دیں گے، ہاہاہاہا......''

یہ کہتے ہوئے مہاپجاری بدری ناتھ نے ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگایا اور پھر کالی کے بت کے پیچھے جا کر غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے کمرے میں تھا۔ یہ کمرا مندر کے تہ خانے کے قریب ایک بعید ترین گوشے میں بنا ہوا تھا۔ اس کمرے میں وہ جاپ الاپ کیا کرتا تھا۔ یہاں بھانت بھانت کی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کوئی نیچے زمین پر اور کچھ دیواروں کے طاقچوں پر بجی ہوئی تھیں۔ کمرے میں عجیب سی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ چھت سے دو گھنٹیاں بندھی ہوئی جھول رہی تھیں۔ ایک جانب ترشول رکھا ہوا تھا اور بھی الابلا پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔

کمرے کے وسط میں انگیٹھی تھی جس میں شعلے دہک رہے تھے۔ اس نے ایک طاقچے سے سیاہ رنگ کی مورتی اٹھائی۔ یہ کسی مرد سادھو کی تھی، جو خاصا تنومند اور موٹا تھا۔ وہ نیم برہنہ تھا۔ اس کا سر بھی گنجا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کی ہتھیلیاں کھلی پڑی تھیں۔ ایک میں قشقے کا مسالا اور دوسرے ہاتھ میں زردی رنگ کا پاؤڈر تھا جیسے سیندور ہو۔

بدری ناتھ نے اس مورتی کو نہایت احترام کے ساتھ اٹھا کر اپنے سامنے فرش پر رکھا اور خود بھی پلتھی مار کے بیٹھ گیا پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر اس مورتی کے سامنے اپنا ماتھا ٹیکا اور پھر سیدھا ہو کے آنکھیں موندیں۔ وہ زیرلب کچھ بدبدانے لگا...... ذرا دیر بعد وہ سادھو کی مورتی کے دونوں آگے کی طرف پھیلے ہاتھوں کی کھلی ہتھیلیوں سے سفوف نما شے کو چٹکی میں لیتا اور دہکتی ہوئی انگیٹھی میں ڈال دیتا، شعلے ایک لمحے کو دہکتے اور آگ بھڑکتی اور پھر معدوم سی ہو جاتی۔

اچانک انگیٹھی میں سلگتے الاؤ کی روشنی تھوڑی ماند پڑی اور کمرے میں تاریکی سی پھیل گئی۔ تب ہی ایک تیز سنسناتی ہوئی آواز ابھری، یوں جیسے کسی نے زور سے ہنکارا بھرا ہو۔

مہاپجاری بدری ناتھ نے یک دم اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کمرے کا ماحول ایکا ایکی خوفناک اور پراسرار سا ہو گیا تھا۔ بدری ناتھ کی کھلی ہوئی آنکھوں میں ہلکی ہلکی لو ٹمٹما رہی تھی۔ اس کا مکروہ چہرہ ڈراؤنا سا ہونے لگا۔ تب ہی اس کے حلق سے آواز ابھری۔ یہ اس کی اپنی آواز ہرگز نہ تھی۔

''کالی کی رکھشا تیرے ذمے ہے۔ کالی کا استھان خطرے میں ہے۔ پرنتو تجھے کالی نے شکتیاں دان کر دی ہیں۔ اسے مہاشکتی کرنے کے لیے تجھے ایک گوری چمڑی والی فرنگن کو ترنت بلیدان کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ ابر سیاہ، مندر کے پوتر استھان اور کالی کو اپنی لپیٹ میں لیں...... مجھے اور کالی کو اس کنواری کنیا کے خون سے نہلادے۔''

بدری ناتھ کے موٹے موٹے بدہیت ہونٹ ایک دم تھم گئے۔ آنکھوں میں ٹمٹماتی لو غائب ہوگئی۔ چہرے کا ڈراؤنا پن جاتا رہا۔ اس کا چہرہ بتدریج معمول پر آگیا۔ پہلی بار بدری ناتھ کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار نمودار ہوئے اور وہ فوراً اٹھا۔ انگیٹھی سرد ہو چکی تھی۔ اس نے مورتی کو دوبارہ طاقچے میں اٹھا کر رکھا اور کمرے سے نکل کر اوپر ہال میں بنے ہوئے اپنے کمرے میں آگیا اور تین پجاریوں کو اپنے روبرو پیش کیا پھر انہیں حکم دیا کہ اسی وقت راکاشی وادی کی طرف نکل جاؤ اور اس فرنگن (رینا) کو اٹھا لاؤ۔

☆☆☆

دڑبے نما اس کمرے کی بہ ظاہر تو حالت خستہ ہی تھی، جس کا ماحول سیلن زدہ سا تھا۔ دیواریں ٹیڑھی میڑھی اور زنگ آلود ہو رہی تھیں۔ ایک چارپائی چھ کا روشن دان تھا۔ آگ تاپنے کے لیے ایک کونے میں انگیٹھی رکھی ہوئی تھی پانی کا گھڑا تھا اور اس پر جست کا ٹیڑھا میڑھا گلاس رکھا تھا...... ایک کونے میں میلا چیکٹ موٹا سا گرم بچھونا دھرا پڑا تھا۔

اب شام ہو چلی تھی اور تاریکی سی اطراف میں پھیلنے لگی تھی۔ سردی بھی بڑھنے لگی تھی۔ مرادخان نے انگیٹھی دہکا دی تھی اور گرما گرم قہوہ بنالیا تھا۔

پھر قہوہ پینے کے دوران اریبہ اور شاہ نسان نے مرادخان کو دھیرے دھیرے اور سرگوشی میں ساری باتیں بتا دیں، جسے سننے کے بعد چند ثانیوں کے لیے مراد نے پُرغور سی خاموشی اختیار کرلی اور اس کے بعد سرگوشی میں بولا۔

"تم یہاں میرے پاس زیادہ دیر نہیں ٹک سکتے۔ حالات خراب ہیں اور تمہیں یہ مشن بھی جلدی نمٹانا ہوگا۔"

"ہم خود بھی یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہتے۔" شاہ زمان نے فوراً جواب دیا۔ "کیونکہ ہمیں بھی ان حالات کا مشاہدہ ہو چکا ہے۔ یہاں بندرگاہ پر تو زیادہ ہی سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔"

"اس لیے کہ...... خاور حیات والے مشن کی بھنک پڑنے اور اس کی ناکامی کے بعد فرنگیوں کو خوب اندازہ ہو چکا ہے کہ ان کی چوری مجاہدین کے علم میں آ چکی ہے اور وہ خاور حیات کی ناکام مہم کے بعد اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ کوئی اور مجاہد گروپ یہاں کا رخ کر سکتا ہے اور اس جزیرے تک رسائی کی پہلی سیڑھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔" مراد بولا۔ "لیکن اس کے ساتھ ہی تمہیں ایک خوش خبری یہ بھی سناؤں گا، اس بار اس مشن میں خطرہ پہلے کی نسبت کم ہو گیا ہے اور کچھ آسانیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔"

"اچھا...... وہ کیسے؟" شاہ زمان نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اریبہ اور شاہ زمان کی آنکھوں میں چمک ابھری تھی۔

"کرنل اینڈرسن ایک تجربہ کار اور گھاگ آدمی ہے ظالم اور بے رحم بھی لیکن اب وہ اس جزیرے پر نہیں رہا۔ کچھ دنوں کے لیے کہیں چلا گیا ہے۔ اس کی جگہ ایک کیپٹن کو بھیج دیا گیا ہے۔ اس کا نام جیمس ہے، وہ ایک نوجوان انگریز لڑکا ہے۔ اس کی نئی نویلی بیوی ازابیل کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ وہ دونوں ادھر سے ہی سرکاری اہلکاروں کی معیت میں اس جزیرے کی طرف گئے تھے۔"

"اوہ...... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" اریبہ اس مشکل مہم میں آسانی محسوس کر کے خوش ہو کے بولی۔

"ہاں اریبہ بہن! اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ روانگی جتنی جلد ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ پتا نہیں کب کرنل اینڈرسن واپس آ جائے، اس سے پہلے یہ مشن نمٹا لو۔"

قہوہ ختم ہو چکا تھا۔ اچانک باہر سے کسی نے ٹین کے دروازے پر موٹا سا ڈنڈا زور سے بجایا۔ تینوں چونک پڑے۔ مراد نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ شاید "دستک" دینے کے اس انداز کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا کہ باہر کون لوگ ہو سکتے ہیں۔

وہ اٹھا اور اس نے ان دونوں کے ٹوکروں کو فرش پر الٹ دیا۔ پھر دروازے کی طرف لپکا۔

اریبہ اور شاہ زمان نے جلدی سے مچھیروں والا اینڈ واسر پر رکھا اور فرش پر پھیلی ہوئی مچھلیوں اور جھینگوں کا شمار کرنے میں مصروف ہو گئے۔

اندر داخل ہونے والے دو ڈنڈا بردار سپاہی تھے۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں......؟"

ایک فرنگی نے درشت لہجے میں پوچھا، ساتھ ہی وہ دونوں فرش پر بیٹھے اریبہ اور شاہ زمان کو جھینگے مچھلی سمیٹتے ہوئے دیکھنے لگے۔

"کون...... ہیں یہ دونوں......؟" دوسرے نے بھی سوال داغا۔

اریبہ اور شاہ زمان اپنا "کام" چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ مراد نے فدویانہ سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

"سرکار......! یہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ اعلیٰ نسل کے جھینگے لائے تھے۔ کچھ ٹھیکے وغیرہ کی بات کر رہا تھا ان سے......"

"ہوں......" ایک خرانٹ سے سپاہی نے ہنکاری بھری۔ پھر تحکمانہ درشتی سے بولا۔

"انہیں جلد فارغ کرو، یہاں کسی کو رہنے کی اجازت نہیں۔"

"جی حضور! بالکل...... یہ خود بھی جلدی میں ہیں، بس تھوڑی دیر۔" مراد نے کہا۔ "قہوہ پیش کروں سرکار......؟"

دونوں سپاہی ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے پھر ایک نے مراد سے کہا۔

"ہم باہر کھڑے ہیں۔ دو پیالی بھیج دو۔"

"ابھی بھیجتا ہوں حضور......!" مراد نے کہا۔ وہ دونوں فرنگی سپاہی اریبہ اور شاہ زمان کو ایک بار پھر کڑی...... نظروں سے گھورتے ہوئے باہر نکل گئے۔

تھوڑی دیر بعد مراد نے جلدی جلدی انگیٹھی پر دوبارہ قہوہ تیار کیا اور دو پیالیاں باہر کھڑے سپاہیوں کو پیش کیں، جسے پینے کے بعد وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے گشت پر آگے نکل گئے۔

"دیکھا تم لوگوں نے...... کس قدر سختی ہے۔" مراد ہولے سے بولا اور وہ دونوں اپنے سر کو پرخیال انداز میں دھیرے دھیرے جنبش دینے لگے۔

تھوڑی دیر بعد مراد نے ٹین کے کمرے سے نکل کر باہر ادھر ادھر جھانکا۔ وہاں سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ دوبارہ اندر آیا اور بولا۔

"یہی وقت ہے، فوراً نکلنے کی کرو۔ وہ سارے لوگ شراب و کباب میں مصروف ہوں گے۔ دوبارہ گشت شروع ہو گیا تو منزل کا رخ نہیں کر سکو گے۔"

مراد نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ انہیں باہر نکل کر کیا کرنا تھا۔

اریبہ اور شاہ زمان جلدی سے نکلے اور مطلوبہ سمت کی طرف بڑھ گئے۔ جلد ہی انہیں وہ لانچ دکھائی دے گئی جہاں انہیں پہنچنا تھا۔

لانچ پر سناٹا طاری تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ چند کیبن روشن اور کچھ تاریک تھے۔ دو سپاہی گشت کرتے نظر آئے۔ ان کے انداز سے تساہل ظاہر ہوتا تھا، شاید وہ شراب و کباب کی اس شبینہ تقریب سے محرومی پر بددلی کا شکار تھے۔

اریبہ اور شاہ زمان ...... ان کی نظروں سے بچتے ہوئے لانچ میں سوار ہو گئے۔

مراد کے مطابق یہ لانچ ہر روز رات کے دوسرے پہر سپاہیوں اور فوجیوں کی شفٹیں بدلنے کے لیے مذکورہ جزیرے تک آتی جاتی تھی۔

لانچ کے اندر ایک محفوظ اور خفیہ جگہ پر دونوں چھپ کر بیٹھ گئے۔

مہم کا ایک بڑا ابتدائی حصہ کامیابی سے اور غیر متوقع طور پر جلد طے ہو گیا تھا، تاہم ابھی آخری اور فیصلہ کن مرحلہ باقی تھا۔ اگرچہ یہاں تک بھی رسائی حاصل کرنا خطرے سے خالی نہ تھا مگر دونوں نے اپنی روایتی ہوشیاری اور زیرک دماغی سے ابتدائی مرحلہ کامیابی سے سر کر لیا تھا۔ آگے کی بھی اچھی امید اسی لیے تھی کہ اب وہاں کرنل اینڈرسن جیسے گھاگ، تجربہ کار اور خرانٹ افسر کے بجائے ایک کیپٹن رینک کا نوجوان تعینات تھا۔

شاہ زمان یہی چاہتا تھا کہ کرنل اینڈرسن ہوتا تو وہ اسے جہنم واصل کر کے خاور حیات اور اس کے مجاہد ساتھیوں کی موت کا بدلہ ضرور لیتا۔

☆☆☆

رات اپنے جوبن پر تھی۔ سرد برفیلی ہوا چل رہی تھی۔ جنگل میں سناٹا طاری تھا۔ دور کہیں کبھی کسی جانور کے رونے کی آواز ابھرتی اور پھر وہی سناٹا منحوس گدھ کی طرح اپنے پر پھیلا لیتا۔

وہ تینوں پجاری بہت احتیاط کے ساتھ راکاشی بستی میں داخل ہو چکے تھے۔

رینا کے اغوا کی منصوبہ بندی اور اس کا کھوج لگانے کی مہم بہت پہلے سے جاری تھی۔ پھر جب مقرر کردہ دو جاسوس پجاریوں نے مطلع کیا تھا کہ رینا راکاشی بستی کے ہی ایک جھونپڑے میں اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ رہائش پذیر ہے تو بدری ناتھ کو تسلی ہو گئی کہ اب وہ بچ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی، تاہم اسے تشویش تو ہوئی تھی کہ وہ ان کے دشمنوں کی گود میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھی۔

اس وقت بستی پر مکمل خاموشی کا راج تھا۔ سرکنڈوں اور کھپریل کی مخروطی چھتوں والے جھونپڑوں اور مڑھیوں پر کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

تینوں پجاری اب بڑے آرام اور اطمینان کے ساتھ مطلوبہ جھونپڑے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ قریب پہنچ کر ایک نے کھڑکی کا رخ کیا۔ دوسرے نے دروازے کی طرف جبکہ تیسرا عقب میں چلا گیا۔

ذرا ہی دیر بعد اپنے تئیں کچھ اطمینان کر کے وہ دروازے پر آ کر پھر یکجا ہو گئے۔

''اندر دو گوشے بنے ہوئے ہیں۔ زنانہ گوشہ جھونپڑے کی عقبی دیوار کے پاس ہے۔'' ایک پجاری نے سرگوشی کی۔

''وہاں ایک کھڑکی بھی ہے، مگر وہ اتنی بڑی نہیں کہ ہم اندر گھس سکیں۔''

''ہم دروازے سے جائیں گے لیکن صرف دو...... ایک باہر ہی موجود رہے گا۔''

دوسرا بولا تو باقی دو نے اثبات میں اپنے سر ہلائے۔

''اگر کوئی جاگ پڑا تو خنجر مار کے ہلاک کر ڈالیں گے۔''

یہ تینوں شیطان کے پجاری خاصے تنومند تھے۔

دو نے پھوس کا کمزور سا دروازہ زور دے کر کھول دیا۔ اندر فقط ایک دیا روشن تھا جس کی پیلی زرد روشنی میں انہیں دو مرد موٹے اور گرم لبادے اوڑھے گہری نیند سوتے ہوئے نظر آئے۔ یہ دونوں شوکی اور رابرٹ تھے۔

دونوں پجاری ...... ان کے بیچ سے گربہ قدمی کے ساتھ جھونپڑے کے عقبی گوشے کی جانب بڑھے۔

اندر قدم رکھتے ہی ان کے مکروہ چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ طاری ہو گئی۔ گارشیا اور رینا قریب قریب گہری نیند سو رہی تھیں۔

یہ دونوں اپنا شکار تاڑ چکے تھے۔ اس کے بعد ایک نے اپنے سیاہ لبادے سے کوئی سفوف نکالا اور گہری نیند سوئی ہوئی رینا کے چہرے پر چھڑکا۔ اس کے بعد بڑی آہستگی سے ان دونوں نے رینا کے بے سدھ وجود کو اٹھایا اور پھر کاندھے پر لاد کر جھونپڑے سے باہر نکل گئے۔

(جاری ہے)

آخری باب

کبھی اپنوں اور کبھی غیروں سے ٹھکرائے جانے والے ایک معصوم انسان کا قصہ

زویا اعجاز

جی جی کر مرنا اور مر مر کر جینا، عجیب فلسفہ ہے زندگی کا... اس کے باوجود وقت کا ایک ایک لمحہ اپنا حق ادا کرنے میں کسی غفلت کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ بھی کیسا مقدر لکھوا کر لایا تھا۔ جن کی نظروں میں سب سے بلند مقام ہونا تھا انہی کے دل سے اتر گیا مگر کیوں...؟ اس سوال کا جواب تلاش کرتے کرتے وہ عمر کی آخری منزل پر پہنچ گیا، افسوس جواب نہ پاسکا البتہ زندگی کے آخری باب میں اس تشنگی کی کچھ یوں تلافی ہوئی کہ اسے خدا کی رضا پر پیار آگیا۔

یہ زندگی ایک ایسی کتاب ہے جس میں پوشیدہ ابواب کے متعلق ہم سب لاعلم ہیں۔ ہر شخص کی کتابِ حیات میں الگ ابواب ہوتے ہیں لیکن ایک پہلو ایسا بھی ہے جو ہم سبھی میں مشترک ہے۔

☆☆☆

پہلا باب:

اخلاق علی اسم بامسمیٰ تھا۔

والدین کی آنکھوں کا تارا' دادا' دادی کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور چار بہنوں کا راج دلارا بھائی۔ پیدائش کے ساتھ ہی اسے اس قدر اہم ذمے داریاں ملیں کہ ان کے نادیدہ بار سے وہ کبھی پھل پھول ہی نہ سکا۔

''ارے صداقت صاحب! آپ کا بچہ تو بہت ہی کمزور ہے۔ اسے کچھ کھلاتے پلاتے نہیں کیا؟'' ہوش سنبھالتے ہی اخلاق کی سماعت میں ان فقرات کی گونج پڑی۔

''ارے میاں! اللہ کا دیا سبھی کچھ تو ہے ماشاء اللہ! خوراک کے معاملے میں بھی کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔'' ابا جان فوراً وضاحت دیتے۔

یوں لڑکپن ہی سے اس کی زندگی میں ''عوامی رائے'' نے بے حد اہمیت اختیار کرلی۔

تین سال کی عمر میں اسے قریبی مسجد میں بھیج دیا گیا۔ سفید براق شلوار قمیص میں ملبوس' سر پر جالی دار ٹوپی' آنکھوں میں سرمہ' گردن پر خوشبودار پاؤڈر اور بازو پر دادی جان کا دیا

ہوا امام ضامن پہنے اس روز وہ خود کو بہت معتبر محسوس کر رہا تھا۔
''مسجد میں دل لگا کر سیپارہ پڑھنا میرے لال!'' ماں نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے ہدایت کی۔
''جی اماں! میں خوب دل لگا کر پڑھوں گا۔'' اس نے اپنا ننھا سا سینہ تان کر کہا۔
''وہاں گندے بچوں کے ساتھ دوستی مت گانٹھنا۔'' بڑی بہن نے سمجھایا۔
''لیکن گندے بچے مسجد میں کیسے آسکتے ہیں؟ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ مسجد اللہ کا گھر ہوتا ہے۔'' اس کے چھوٹے سے ذہن نے فوراً تاویل پیش کی۔
''اُفوہ! بھئی ہمارا مطلب ہے کہ دوستی سوچ سمجھ کر کرنا۔'' بہن نے جواب دیا۔
''بھئی اخلاق میاں! مولانا صاحب سے ہماری بڑی اچھی یاد اللہ ہے۔ انہیں کسی شکایت کا موقع دیا تو مانو ہماری ناک کٹ جائے گی۔'' دادا جان نے بڑے مان سے کہا۔
''میں کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا دادا جی! میں ان کی ہر بات مانوں گا۔'' اخلاق نے انہیں یقین دلایا۔
''چلو بھئی! میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔ دیر سے جانا بالکل اچھی بات نہیں ہوتی۔'' ابا نے بھی چپکے سے ایک نصیحت تھمائی۔
''میں کبھی بھی دیر نہیں کروں گا ابا جان! ہمیشہ وقت سے پہلے ہی تیار ہو جایا کروں گا۔''
''شاباش! بڑوں کی بات ماننے والے زندگی میں کبھی ناکام نہیں ہوتے۔'' ابا نے ایک گر سکھایا جو اس نے اپنے ذہن کی سلیٹ پر انمٹ سیاہی سے نقش کر لیا۔
اخلاق علی نے گھر کے ہر فرد سے کیا ہوا وعدہ مکمل ایمانداری سے نبھایا۔
قاری صاحب اس کی ذہانت اور تابعداری سے بہت خوش تھے۔ وہ اپنا سبق سب سے پہلے یاد کرتا اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی بہت اپنایت سے نمٹا دیتا۔ بچوں کے زیر استعمال چٹائیاں بچھانے اور تہ کرنے کی ذمے داری اس نے بن کہے ہی سنبھال لی تھی۔ گھڑوں میں پانی بھرنے اور جھاڑو دینے سے بھی اسے کوئی عار محسوس نہ ہوتا۔
''اخلاق تو ہمارا سب سے ہونہار شاگرد ہے۔ بڑا ہی بخت آور ثابت ہوگا یہ۔'' ایک روز مولانا صاحب نے دادا جان کو بتایا۔ ان کا خون سیروں بڑھ گیا۔

☆☆☆

دوسرا باب:
اخلاق علی کی عمر پانچ پڑاؤ عبور کر چکی تھی۔
قواعد وضوابط کے مطابق اب اسکول میں داخلے کا وقت آن پہنچا تھا۔ ابا جان نے ایک قریبی اسکول میں اس کا داخلہ کروا دیا۔ روانگی کے پہلے روز گھر میں عجیب کہرام برپا تھا۔ اس کے صدقے کے لیے ایک کالا بکرا پہلے ہی ذبح کیا جا چکا تھا۔ چاروں بہنیں، والدین اور دادی اماں کی حالت ایسی تھی گویا اسے میدان جنگ میں بھیجا جا رہا ہو۔
''آج تمہاری زندگی کا بہت اہم دن ہے بیٹا! اب تم نئے دوست بناؤ گے۔ معاشرے میں چلنا سیکھو گے۔'' ابا جانے کیوں ایسی مشکل باتیں کرتے تھے جنہیں وہ مکمل سمجھ ہی نہ پاتا۔
اخلاق کے ذہن نے چپکے سے یہ بات اپنی گرہ میں باندھ لی کہ سختیوں کا سامنا ہی اسے مردانگی کا تمغہ دلوا سکتا ہے۔ اس نے ایک نئے جذبے سے کمر کس لی۔

☆☆☆

اخلاق اسکول کی پڑھائی میں بھی بہت ہونہار ثابت ہوا۔ اساتذہ اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے۔ تابعداری تو اس پر ختم تھی۔ والدین اور بہنوں کے سنگ زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ کوئی معاشی پریشانی تھی نہ ہی دیگر مسائل۔ وہ احسن طریقے سے تعلیمی مدارج طے کرتا چلا گیا۔ اسی دوران بڑی دو بہنوں کی شادی ہوگئی۔ اخلاق نے میٹرک کا امتحان بہت شاندار نمبروں سے پاس کیا۔
''آج اماں بی کی روح کتنی خوش ہوگی۔ کاش وہ ہم سب میں موجود ہوتیں۔'' ابا جان آبدیدہ ہو گئے۔
''ہاں! ابا بھی ہوتے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے۔'' اس کے چچا نے قدرے حاسدانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ان کا بیٹا اخلاق سے دو سال بڑا ہونے کے باوجود میٹرک میں کئی بار فیل ہو چکا تھا۔ تنگ آکر چچا نے اسے اپنے ساتھ دکانداری سکھانی شروع کر دی تھی۔
''اخلاق بیٹے نے واقعی ہمارے خاندان کا نام روشن کر دیا ہے۔'' ایک ماموں نے بھی محبت جتائی۔
''لیکن اصل آزمائش کا وقت تو اب شروع ہوگا۔'' چچا نے ہنستے ہوئے کہا۔
''کیوں..... اب ایسا کیا ہو گیا؟ اللہ پاک میرے بچے کو آزمائشوں سے محفوظ رکھے۔'' امی ہول گئیں۔
''اب اخلاق میاں کالج میں داخلہ لیں گے۔ وہاں تو بگاڑ کے ایک سو ایک رستے پہلے ہی موجود ہوتے ہیں۔'' چچا کی شیریں زبان ان کی آنکھوں میں جھلکتے عکس سے بالکل لگا نہیں کھا رہی تھی۔

''ہمارے اخلاق میاں ایسے بالکل بھی نہیں ہیں۔ انہیں بخوبی علم ہے کہ سب کی بہنیں بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں۔ ہم نے انہیں عورت ذات کی عزت کرنا بہت عمدگی سے سکھایا ہے۔'' ابا جان کے ان سنجیدہ الفاظ نے اسے اپنی ہی نظروں میں معتبر کر دیا۔

اس روز اپنے بزرگوں کے مابین بیٹھے اخلاق علی نے عزم مصمم کر لیا کہ وہ اپنا دھیان محض پڑھائی ہی کی طرف رکھے گا۔ ڈاکٹر بننا اس کا جنون تھا اور اس جنون کی راہ میں آنے والا ہر پتھر وہ پاش پاش کر دے گا۔

☆☆☆

تیسرا باب:

میڈیکل کالج میں داخلہ اخلاق کے حسین ترین خوابوں کی تعبیر تھا۔ پڑھائی میں تو وہ شروع ہی سے بہت اچھا تھا' سنجیدگی اور لگن شامل ہوتے ہی اس کی کامیابیاں مزید نکھرنے لگیں۔ پہلے سال کا اختتام انٹر بورڈ میں اس کی تیسری پوزیشن پر ہوا تو ساتھی طلبہ و طالبات نے پہلی دفعہ اسے ''نوٹس'' کرنا شروع کیا۔

''میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ یہ کوئی معمولی لڑکا نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت ایک گریز اور تڑپ دکھائی دیتی تھی۔ ایسے افراد ہمیشہ ہی بہت خاص ہوتے ہیں۔'' نازک مزاج اور حسین فریحہ نے لگاوٹ کا مظاہرہ کیا۔ وہ ایک اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ پڑھائی میں اتنی اچھی نہیں تھی لیکن اپنے حلقۂ احباب کی وجہ سے کبھی ناکام بھی نہیں ہوتی تھی۔

اس کے توصیفی کلمات نے وہاں بیٹھے سبھی لڑکوں کے دل میں حسد و جلن کے جذبات برپا کر دیے۔ لڑکیوں کے جذبات البتہ قدرے مختلف تھے۔ انہیں تاسف تھا کہ اتنا ہونہار اور ہمہ گیر خوبیوں کا مالک انسان آج تک ان کی نظروں سے پوشیدہ کیوں رہا۔

اس کے بعد وہاں مقابلے کی سخت فضا قائم ہو گئی۔ کلاس کی لڑکیوں نے اخلاق کو اپنی جانب مائل کرنے کی سرتوڑ کوششوں کا آغاز کر دیا۔ وہ کبھی نوٹس لینے کے بہانے اس کے اردگرد منڈلاتیں تو کبھی اہم ٹاپک سمجھنے کے لیے فارغ پیریڈ میں اس سے منتظر ہو جاتیں۔

''اخلاق ڈیئر! یہ چیپٹر تو سمجھ آ کے ہی نہیں دے رہا۔ تم سمجھا دو نا پلیز۔'' کوئی پری وش اس کے قریب آ کر بیٹھتی تو قربت کی حرارت سے اخلاق کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ حلق میں کانٹے اگ آتے۔

''کلاس روم میں جس وقت یہ لیکچر دیا جا رہا تھا تب سمجھ لیا ہوتا۔'' وہ اپنے جذبات و کیفیات پر قابو پاتے ہوئے بدقت تمام کہتا۔

''یہ ضروری تو نہیں کہ ہر ذہین شخص اچھا معلم بھی ہو...... اور جانے کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تمہارا سمجھایا ہر لفظ میرے دل میں اتر جائے گا۔'' اس ادا پر اخلاق کا دل پسلیوں کے قفس سے نکل کر اس کے قدموں میں لوٹنے کے لیے بے تاب ہونے لگتا۔

''تو پھر میں تمہاری طرف سے اقرار ہی سمجھوں؟'' اخلاق کی یہ کیفیت اس لڑکی کو بہت محظوظ کر رہی تھی۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر وہ جان گئی تھی کہ لوہا گرم ہو چکا ہے اور ایک معمولی سی چوٹ بھی اس کے لیے کافی ہو گی۔ لڑکی نے نہایت اپنایت سے اس کے بازو پر اپنا مرمریں ہاتھ رکھ دیا۔

اخلاق کے لیے اپنی دھڑکنوں پر ضبط ناممکن ہونے لگا۔ وہ جذبات و احساسات سے بھرپور انسان تھا۔ کالج کی رنگینیاں اور لہراتے آنچل اسے اپنی جانب بھرپور مائل کرتے تھے لیکن اپنے عہد کا احساس قدم بہکنے سے روک لیا کرتا۔

لڑکی ہنوز امید بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ''میں کل سے فری پیریڈ میں تمہارے پاس آ جایا کروں گی۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا۔

''نہیں...... مجھے تمہیں یا کسی اور کو پڑھانے سمجھانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ جاؤ! اپنا رستہ ناپو۔'' اس نے رکھائی و بے نیازی کے خول میں سمٹتے ہوئے جواب دیا۔ لڑکی اس ردعمل کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔

''میں ان خرافات میں بالکل نہیں الجھوں گا۔ میں ان سب کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔'' اس نے خود کلامی کی۔ یہ الفاظ اس لڑکی کے لیے تیزاب کے چھینٹے ثابت ہوئے۔ اخلاق کو اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ایک عہد کی پاسداری کرتے وہ اپنے لیے بہت بڑے مسائل کھڑے کر چکا تھا۔

کلاس کی دیگر لڑکیوں کے علاوہ فرسٹ ایئر کے طلبہ بھی اس سے مدد طلب کرنے چلے آتے۔ وہ مارے باندھے لڑکوں کی مدد تو کر دیتا تھا لیکن صنفِ نازک سے گریز کا اب بھی وہی عالم تھا۔ یہ رویہ ہر سو ایک نئے تنازع کو جنم دینے لگا۔

''میاں اخلاق! تم ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ چھپے رستم ثابت ہوئے ہو۔'' سمیر نے معنی خیزی سے کہا۔

''کیوں...... اب میں نے کیا کر دیا بھلا؟''

''لڑکیوں سے گریز' رکھائی اختیار کر کے انہیں اپنی کشش میں دیوانہ کرنے کے یہ طریقے ہمیں تو کبھی نہ آئے۔''

''مجھے ان میں کوئی دلچسپی نہیں...... میں تو......'' اخلاق

نے جلدی سے وضاحت دینی چاہی لیکن حمزہ نے قطع کلامی کر کے اس بات کو الگ ہی رنگ دے دیا۔
''یہ تو ہمیں نظر ہی آرہا ہے کہ تمہیں ان میں کوئی دلچسپی نہیں.....تمہاری دلچسپی کے محور کچھ اور ہیں.....'' اس نے لوفرانہ انداز میں بائیں آنکھ میچی۔
''لاحول ولاقوۃ..... پتا نہیں کیا خرافات سوچتے رہتے ہو تم لوگ۔'' اخلاق بھڑک اٹھا۔
''غصہ کیوں کرتا ہے پیارے! ابھی ہمیں بھی تو اپنی خدمت کا موقع دے۔'' ایاز نے مزید طرح دی۔
اخلاق کے لیے یہ سب ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ اس نے خاموشی سے وہاں سے اٹھ جانا بہتر سمجھا۔ معنی خیز قہقہوں اور ذومعنی فقرات کی گونج میں اسے ایک اور طوفان کی آہٹ سنائی ہی نہ دی جو اس کے عقب میں پوری قوت سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔

☆☆☆

اپنی ذات سے کیے گئے عہد نبھاتے ہوئے اخلاق علی یہ حقیقت فراموش کر بیٹھا تھا کہ توازن ہی زندگی کا ربط اور خوبصورتی کی اصل بنیاد ہے۔ وہ خود کو صاحب کردار اور بے نیاز ثابت کرنے کے لیے کائنات کی سب سے نازک اور حساس صنف 'عورت' کے جذبات مجروح کرنے لگا تھا اور زخمی انا کی حامل عورت کسی چوٹ کھائی ہوئی ناگن سے کم نہیں ہوتی۔
فریحہ، سنبل، شازیہ، نازنین اور ساجدہ جب اپنی مہم میں ناکام ہوگئیں تو احساسِ ذلت اور انتقام سے بے حال تھیں۔ فریحہ کا حال بدترین تھا۔ اسے اپنی ''قوتِ تسخیر'' پر بے حد مان تھا۔ وہ آتشِ انتقام میں بری طرح پھنک رہی تھی اور پھر ایک روز اسے اپنے انتقامی جذبات سرد کرنے کا شاندار موقع میسر آگیا۔
فریحہ نے اخلاق کی سبھی عادات اور معمولات پر گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ پہلے پہل وہ تفریح کی خاطر فری پیریڈز اپنے دوستوں کے ساتھ کینٹین میں گزار لیا کرتا تھا لیکن پھر سمیر اور ایاز کے ننگِ انسانیت تبصروں کے بعد وہ ان سے بھی گریزاں رہنے لگا۔ فراغت میں وہ لائبریری جانے کو ترجیح دیا کرتا۔ اس کے مزاج میں مردم بیزاری کا عنصر غالب آگیا تھا۔ لائبریری کے انتہائی گوشے میں کتابوں کے مطالعے اور نوٹس کی تیاری میں اسے ذہنی کوفت سے نجات ملی رہتی۔
ایسے ہی ایک روز وہ حیاتیات کے اہم اسباق کے متعلق کتابیں کھنگالنے میں مصروف تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انٹرنیٹ کی سہولت اس قدر عام نہیں ہوئی تھی اور کتابوں کی محبت ضرورت بن کر طلبہ کی زندگی کا اہم حصہ تھی۔ وہ اپنی مصروفیت سے اس وقت چونکا جب ایک تیز خوشبو کا جھونکا بالکل پاس محسوس ہوا۔ اس کے سامنے کھڑی فریحہ کی آنکھوں میں نفرت و وحشت کا مکمل جہان آباد تھا۔
''کیا بات ہے..... یہاں کیوں آئی ہو؟'' اخلاق نے رکھائی سے پوچھا۔
''یہ لائبریری کسی کی ذاتی جاگیر نہیں ہے مسٹر افلاطون..... میں یہاں وہ کرنے آئی ہوں جو تمہاری سوچ اور تصور سے بہت بالاتر ہے۔'' فریحہ کے لہجے میں زہریلی پھنکار تھی۔
''اوکے! میں چلتا ہوں پھر یہاں سے۔'' وہ اطمینان سے اٹھا اور اپنی کتابیں سمیٹنے لگا۔
فریحہ کے ہاتھ تیزی سے حرکت میں آئے۔ اس نے ایک جھٹکے سے میز پر رکھی سب کتابیں نیچے گرا دیں۔
''یہ.....کک.....کیا بے ہودگی ہے؟'' وہ حیران ہوا۔
اسی لمحے فریحہ نے اپنی آستین اور کندھوں سے کپڑے پھاڑ کر بلا کی تیزی سے بال بھی منتشر کر دیے۔
''مجھے چھوڑ دو اخلاق! میں نے آخر تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ اس لائبریری کے تقدس کا ہی خیال کرلو۔'' وہ سہمے ہوئے انداز میں کتابوں کے ریک کی طرف ہٹی اور انہیں بھی نیچے گرا دیا۔
اس شور شرابے کی آوازیں اب لائبریرین تک پہنچ چکی تھیں۔ اگلے چند لمحات میں اخلاق کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ فریحہ کی دگرگوں حالت اور کہرام اسے مظلوم ثابت کر چکا تھا۔ اس موقع پر سنبل اور ساجدہ نے بھی اخلاق کی بدباطنی کے قصے مشہور کرنے شروع کر دیے۔
کالج کے چند ''سماجی خدمت گار'' نما لڑکے ایسے واقعات بھی انتظامیہ کے سامنے لے آئے جن میں جونیئر لڑکوں سے اخلاق کی بدفعلیاں ثابت ہوتی تھیں۔ وہ وقت اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ اپنے کردار کی حفاظت کرنے کے صلے میں اسے ہولناک بدنامی اور کالج سے معزولی کا پروانہ ملا تو یہ صدمہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہونے کے بعد وہ ایک طویل عرصے تک صاحبِ فراش رہا۔
اس کے خوابوں کا گلشن بری طرح اجڑ گیا تھا۔

☆☆☆

چوتھا باب:

انسانی زندگی میں کچھ حادثات کی نوعیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کرتی جاتی ہے۔ متاثرہ شخص اگر اس آسیب سے نکلنا بھی چاہے تو اسے کسی جانب سے کوئی مدد یا آسرا نہیں ملتا۔ یہ صورت حال اس کے لیے ایک گرداب ثابت ہوتی ہے جس میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔

اخلاق کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

اس کے اسپتال سے آنے کے بعد گھر میں عزیز رشتے داروں، پڑوسیوں اور دیگر احباب کا تانتا بندھنے لگا۔ اخلاق کی مبینہ حرکات پر تاسف، غم و غصے کا اظہار زبان زدِ عام تھا۔

''اکلوتے لڑکے اکثر والدین کے ہاتھوں سے یونہی نکل جایا کرتے ہیں۔ بوڑھے ماں باپ اب ان کے پیچھے ہر جگہ تو نہیں جاسکتے نا۔'' چچا نے بڑی ہمدردی سے نکتہ اٹھایا۔

''سچ کہتے ہو بھائی! اکلوتی اولادِ نرینہ پر سختی بھی کیونکر کی جاسکتی ہے۔'' ممانی نے کہا۔ ''ویسے حقیقت تو یہ ہے کہ صداقت صاحب کو اولاد کی تربیت پر مان بھی تو بہت تھا۔''

''ہاں! اللہ پاک ہمیشہ یونہی غرور اور مان کے بت توڑا کرتا ہے۔''

یہ تبصرے یونہی شب و روز اس کی سماعت میں گونجتے رہتے۔ زہریلے فقرات کی بازگشت اس کی قوتِ ارادی کے لیے منفی کردار ادا کرتی اور نتیجتاً وہ صحت یابی کے مطلوبہ معیار تک پہنچ ہی نہ سکا۔

''اچھی خاصی صحت ہوا کرتی تھی لڑکے کی...... اب دیکھو تو ذرا کیسے ہڈیاں نکل آئی ہیں۔'' کوئی رشتے دار خاتون امی سے کہتیں تو اخلاق ایک لمحے کے لیے سوچ میں ڈوب جاتا۔

''ارے! یہ تو سامنے کی بات ہے۔ ایسے کاموں میں سب سے پہلے صحت و تندرستی ہی کا تو کباڑا ہوتا ہے۔'' خاتون کے شوہر نے بے باکی سے کہا تو امی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''بس بھائی صاحب! اسے اپنی غلطی پر بہت ملال ہے۔ یہ آئندہ ایسی کوئی غلطی نہیں کرے گا۔'' امی کے الفاظ نے اسے شرمساری کے بحر میں غرق کردیا۔ اپنی تربیت کو شفاف ثابت کرنے کے لیے انہوں نے کتنی آسانی سے ایک جھوٹ تراش لیا تھا۔

ابا جان چند ایک اداروں میں داخلے پر ناکامی کے بعد بہت دلبرداشتہ ہوگئے۔ دو ماہ بعد چند احباب نے ابا جان کو اسے اپنی دکان پر آبائی کاروبار میں طاق کرنے کا مشورہ دیا تو دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں یہ قدم اٹھانے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا۔ کریانے کے ساتھ منیاری کے لوازمات سے ان کی دکان پر خاصی چہل پہل اور پیسوں کی مناسب ریل پیل رہتی تھی۔

''کل سے میرے ساتھ دکان پر چلنا۔ میں خود تو اتنا پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ کیش کے معاملات کے لیے کسی نہ کسی کو ملازم رکھنا پڑتا ہے۔ بہتر ہے کہ اب یہ کام تم خود سنبھال لو۔''

''ٹھیک ہے ابا! میں آجایا کروں گا۔'' وہ تابعداری سے بولا۔ اس موقع پر وہ ایک بار پھر اپنی صفائی اور بے گناہی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسے علم تھا کہ حسبِ سابق یہ کوشش بے کار ہی ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت کے خواب دیکھنے والے اخلاق علی نے خاموشی سے ابا کے ساتھ دکان پر مالی معاملات دیکھنے کا آغاز کردیا۔

☆☆☆

اخلاق علی کی زندگی میں ایک نیا موڑ آگیا تھا۔

اس نے اپنے خوابوں کی ناگہاں موت پر صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے نئے معمولات سے سمجھوتا کرلیا۔ ابتدا میں اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹوٹے، بکھرے خوابوں کی کرچیاں آنکھوں اور دل میں کسک کا احساس پیدا کرتی تھیں لیکن دھیرے دھیرے یہ چبھن روح میں اَن مٹ خلا پیدا کرگئی۔ اس کے سامنے جوان بہنوں کی شادی کا کٹھن مرحلہ بھی موجود تھا۔ بڑی دو بہنوں کی شادیاں خاندان میں ہی خوش اسلوبی سے انجام پاچکی تھیں۔ تیسری بہن کی منگنی طے تھی اور چھ ماہ بعد شادی کی تاریخ پہلے ہی حتمی قرار دے دی گئی تھی۔

اخلاق کا رجحان مذہب کی طرف مائل ہونے لگا۔ نماز کی ادائیگی تو وہ پہلے بھی کرتا تھا لیکن اب اس معمول میں باقاعدگی آگئی تھی۔ ربِ دو عالم کے دربار میں پنجگانہ حاضری اسے اس بات کا احساس دلاتی تھی کہ اس دنیا میں کوئی تو ہے جو اس کی بے گناہی اور معصومیت کا شاہد ہے۔

''گناہ کا احساس بہت جان لیوا ہوتا ہے بھئی! اس دور میں اپنی غلطی و کوتاہی کا احساس بھی اللہ کی رحمت سے کم نہیں ہوتا۔'' یہ فتویٰ صادر کرنے والی اس کی سگی خالہ تھیں جو اخلاق کی تیسری بہن کی شادی کی تقریب پر رشتے داروں کے جمِ غفیر میں اس کی ذات کو تختۂ مشق بنائے ہوئے تھیں۔

''ہاں بہن! اب اپنے اخلاق میاں کی طرف ہی دیکھ لو۔ نوجوانی کے جوش میں غلطی تو کر بیٹھا لیکن شریف ماں باپ

کی اولاد تھا سوتلافی کی طرف مائل ہوتے ہی بنی۔'' پھپھو نے بھتیجے کی بھرپور حمایت کی۔

''اخلاق کی موجودہ زندگی دیکھ کر مجھے تو بہت افسوس ہوتا ہے بھئی!'' چچا نے افسوس سے ہاتھ ملے اور پھر حاضرین کے بھرپور سوالات کے بعد سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا خاصا لائق فائق لڑکا تھا۔ اس کے سامنے ایک بھرپور روشن مستقبل موجود تھا لیکن ایک ذرا سی غلطی نے سب کچھ ختم کر دیا۔ وہ ہاتھ جنہیں سیکڑوں لوگوں کے لیے مسیحا بننا تھا' آپریشن کرتے ہوئے جانے کتنے لوگوں کی زندگیاں بچانی تھیں' اب خواتین سے سازوسامان تول کر کیش لیتے ہیں۔'' انہوں نے تاسف سے کہا۔ قریب ہی مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے اخلاق کے سینے میں گہرا دھواں سا بھر گیا۔

وہ سر جھکائے اپنی راہ پر چل دیا۔

☆☆☆

بہن کے فرض سے سبکدوش ہوتے ہی زندگی میں ایک نیا رخ پیدا ہو گیا۔ احباب واقارب اس کی سونی زندگی کے بارے میں فکرمند نظر آنے لگے اور حسب سابق انہوں نے یہ تشویش اخلاق کے والدین میں بھی منتقل کر دی۔ ہر بار مختلف تبصروں اور تجزیوں کا ایک نیا بازار گرم ہونے لگا۔

''بیٹے کی شادی میں تاخیر سے کام نہ لینا۔ شادی کا فریضہ وقت پر ہی ادا کرنا بہتر ہوتا ہے۔'' دردمندانہ مشورہ دیا جاتا۔

''بالکل ٹھیک کہا اس نے۔ اخلاق میاں کے ساتھ تو یوں بھی ایک حادثہ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر شیطان کے بہکاوے میں آئے، اسے کسی کھونٹے کے ساتھ باندھ دینا ہی مناسب ہوگا۔'' دوسری رائے ابھرتی۔

''لیکن ایک بات کا خیال رکھ لینا صداقت بھائی!'' کسی مرد رشتے دار کی آواز سب کو پرتجسس کرتی۔ ''بیٹی کی شادی سے پہلے گھر میں بہو لے آئے تو بیٹی کو ہاتھ سے گنوا بیٹھو گے۔''

''ابھی تو ایک بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ فی الحال حالات اجازت نہیں دیتے کہ کوئی اور قدم اٹھایا جائے۔'' ابا جان نے سادگی اور صاف گوئی سے کہا۔

''ہم تو آپ ہی کی بھلائی کے لیے کہہ رہے تھے۔ اپنی اولاد کے لیے آپ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔'' چچا ہمیشہ کریز کی چاروں جانب اسٹروک کھیلنے کے ماہر تھے۔

اخلاق کے لیے یہ سب تبصرے وتجزیے کڑوے کسیلے سہی لیکن شادی کا ذکر سنتے ہی اس کے تصور میں غیرارادی طور پر ہی رعنائی پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک سجا سنورا خوشبوؤں میں لپٹا سراپا چھم سے آنکھوں کے دریچوں سے جھلک دکھانے لگتا۔ اس کے دل میں میٹھی میٹھی سی کسک جاگ اٹھتی تھی۔ چاہنے' چاہے جانے اور خودسپردگی کے جذبات تن من میں سرشاری پیدا کرنے لگتے۔ وہ دکان کے معاملات میں بھی نہایت تندہی سے محنت کرنے لگا تھا۔ اس مصروفیت میں دو سال دبے پاؤں بیت گئے۔ کام کاج کی لگن نے ان مختلف آراء اور پھبتیوں کی جانب توجہ ہی مبذول نہ ہونے دی جو اس کی شادی میں تاخیر پر کسی مقدس فریضے کی طرح ادا کی جا رہی تھیں۔ اس تاخیر کا سبب اخلاق کی کسی جسمانی واخلاقی کمزوری کو گردان کر اس کے کردار کی خوب دھجیاں اڑائی جاتیں۔

کچھ ماہ بعد مریم کے لیے رشتے دیکھنے کا آغاز ہوا تو والدین نے فیصلہ کیا کہ اس کی شادی بھی ساتھ ہی نمٹا دی جائے گی۔ تصور کی رعنائی میں چند خواب مزید چپکے سے در آئے۔ اس دوران چچا کے بیٹے کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ عام طور پر وہ ایسی کسی بھی تقریب میں جانے سے گریز کیا کرتا تھا لیکن اب متوقع یقینی شادی کے خیال نے اسے بہت معتبر بنا دیا تھا اور وہ سب کی ہرزہ سرائی سے محفوظ رہ کر تمام تقاریب سے بہت اچھی طرح لطف اندوز ہو سکتا تھا۔

اس منصوبہ بندی اور خیالات پر تقدیر کے ایک ہی وار نے اَن مٹ تباہی پھیر دی۔

☆☆☆

پانچواں باب:

مہندی کی تقریب کے لیے اخلاق بہت پُرجوش تھا۔

اس نے دیگر کزنز کے ساتھ باہمی رضامندی سے مخصوص کرتہ شلوار سلوایا تھا۔ ان سب نے ڈھول کی تھاپ پر رقص کا منصوبہ بھی بنا رکھا تھا۔ چچا کے بیٹے کی شادی بڑے تایا کی بیٹی سے ہو رہی تھی لہٰذا مخلوط تقریب کا اہتمام ان کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ ٹینٹ اور کھانے پینے کا انتظام چھت پر تھا۔ رسم کی ادائیگی سے قبل کسی کو شگون کے دوپٹے کی کمی محسوس ہوئی تو اخلاق کو نیچے دوڑایا گیا۔ اس کی مطلوبہ کمرے میں آمد ایک نیا دھماکا ثابت ہوئی۔ وہ دروازے پر دستک دیے بنا بے نیازی سے کمرے میں داخل ہوا تو علم ہوا کہ وہاں آدم وحوا کے مابین شرمناک تعلق نہایت دھڑلے سے جاری تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے زمین وآسمان کی گردش تھم کر رہ گئی۔ اخلاق کی تیسری بہن زاہدہ کے شوہر اور امی کی چچازاد بہن کی بیٹی زرقا کو ایک ساتھ دیکھ

کر وہ ساکت رہ گیا۔

"تت ......تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ پھنسی ہوئی آواز میں بولا۔ اپنے لہجے اور سوال کے بودے پن کا احساس اسے مزید نروس کر رہا تھا۔ "شہزاد بھائی آپ! آپ سے یہ امید نہیں تھی...... میں ابھی سب کو بلاتا ہوں یہاں۔" اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی شہزاد نے ایک جست لگا کر دروازہ پار کیا اور صحن میں جاتے ہی بہ آوازِ بلند خاندان کے بزرگوں کو صدائیں دینے لگا۔ ذرا سی دیر میں وہاں ایک مجمع لگ چکا تھا۔

"دودھ کی رکھوالی کے لیے بلی کو بھیج کر کہاں کی دانشمندی دکھائی آپ لوگوں نے؟" وہ چلا کر بولا۔ "اگر میں یہاں اس کا تعاقب کرتے ہوئے نہ پہنچتا تو یہ جانے کیا گل کھلاتا۔"

"سچ کہتے ہیں بھئی! چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہ جائے۔" زرقا کے والد خالو خلیل نے تنفر سے کہا۔

"خدا جانے کب سے یہ کچھ ہوتا رہا ہے۔" شہزاد نے مزید ہوا دی۔ زرقا کی رنگت بھی زرد پڑ چکی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ تنہائی میں اسے سبز باغ دکھلا کر محبت کے نام پر خراج وصول کرنے والا شہزاد یکدم کیا کرنے لگا ہے۔ اس کا ڈھلکا آنچل، اور مٹا ہوا میک اپ گناہ گار لمحات کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

"یہ جھوٹ بول رہے ہیں...... میں تو ابھی یہاں آیا تھا۔" اخلاق ہکلا گیا۔

"اس کی باتوں پہ مت جایئے۔ یہ تو ماضی میں بھی یہی کچھ کرتا رہا ہے۔" شہزاد نے آگے بڑھ کر اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ اس کی معنی خیز نظریں اور بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے مخصوص اشارے بھانپ کر اخلاق جان گیا کہ اس نے کردار کی ایک اور بازی ہار دی ہے۔ کسی بھی بحث اور حجت کی صورت میں زاہدہ کے ساتھ ہونے والے سلوک کی کوئی ضمانت ہی نہ تھی۔

"میرا بس چلے تو میں ابھی اس کے ٹکڑے کر ڈالوں۔" خالو نے اسے دبوچ لیا۔ اس صورتِ حال میں صداقت بھی حواس باختہ ہو گئے۔ بیٹے کی ناقابلِ معافی غلطی اور متوقع سلوک نے ان کے بیٹے پر دباؤ بڑھا دیا لیکن وہ سب کچھ نظر انداز کیے اس کا گلا دبوچ کر بے دردی سے ٹھوکریں رسید کرتے خلیل کو قابو کرتے لگے جن کے حلق سے غرائیں برآمد ہو رہی تھیں۔

"میں اسے جان سے مار دوں گا۔" اس نے گھر کی بچیوں پر بھی میلی نظر رکھنی شروع کر دی ہے۔"

شادی، خوشی کا ماحول، جوش و جذبہ یکدم سراسیمگی میں تبدیل ہو گیا۔

"معاف کر دیجیے بھائی صاحب! میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں۔" امی سے شاید اکلوتے بیٹے کی حالت دیکھی نہ گئی۔ انہوں نے ہاتھ جوڑنے کے بعد اپنا دوپٹا بھی خالو کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس صورتِ حال پر اخلاق شدت سے موت کی تمنا کرنے لگا۔

"امی! میں نے کچھ نہیں کیا۔" اس کی گھگیاہٹ پر اباجی نے آگے بڑھ کر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

"خاموش رہ بدبخت! خاموش رہ!" غضب سے ان کی آواز لرز رہی تھی۔

"اس کی یہ حرکت بالکل قابلِ معافی نہیں ہے۔ پوری برادری کے سامنے میری بیٹی کو ذلیل و رسوا کیا ہے۔ اب کون بیاہنے آئے گا اسے؟" خالہ نے آنسو بہائے۔

"میں اسے اپنی بہو بنانے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" امی نے فوراً کہا۔ اخلاق کو اپنے وجود سے کوئی ٹرین گزرتی محسوس ہوئی۔ اس نے شدتِ کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ زرقا بھی کسی سنگی مورت کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اپنی ذات پر پڑنے والی اس افتاد سے وہ جان ہی نہ سکا کہ زرقا کی روح بھی کند چھری سے ذبح ہونے کی اذیت محسوس کر رہی ہے۔

شہزاد سے اس کا تعلق نیا نہیں تھا۔ وہ شادی سے قبل ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور ان کی یہ محبت تمام حدود و قیود سے مبرا تھی۔ والدین کے دباؤ پر شہزاد کو زاہدہ سے شادی کے لیے ہامی بھرنی پڑی لیکن اس نے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی بیوی کو طلاق دے کر زرقا کو اس کا مقام ضرور عطا کرے گا۔ محبت، وعدوں اور نفس کی دکھائی خوش نما تتلیوں کا تعاقب کرتی زرقا اس کی بے دام کنیز تھی۔ وہ چوری چھپے باہر ملا کرتے اور اکثر کسی مخلوط تقریب میں بھی شہزاد اس سے اپنی محبت کا 'خراج' ضرور وصول کرتا تھا۔ آج اخلاق کی آمد پر اس نے جس طرح طوطا چشمی اور خود غرضی کا مظاہرہ کیا، وہ زرقا کی نسوانی انا اور وقار کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ اسے شہزاد کے ساتھ اخلاق سے بھی شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔ ایک مرد کی دلیرانہ موقع شناسی اور دوسرے مرد کی بزدلی نے اسے نفرت کے گہرے سمندر کا مسافر بنا دیا۔ محبت نے اس کی زندگی بہت اہتمام سے اجاڑی تھی۔

☆☆☆

مہندی کے اس فنکشن پر اخلاق کا نکاح زرقا سے پڑھوا

دیا گیا۔

خالو نے دوراندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حق مہر میں پچاس لاکھ کی بھاری رقم تفویض کروائی اور یوں ایک مقدس ترین بندھن کی بنیاد نفرت، کدورت و رنجش کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اخلاق کے لیے ازدواجی زندگی کا ایسا آغاز قطعی غیر متوقع تھا۔ اس کے سہانے خوابوں کی کرچیاں دن رات دل و دماغ کو لہولہان رکھتیں۔ اپنے کردار پر لگنے والی ایک اور تہمت کی اذیت اس سے سہی نہ جارہی تھی۔ زرقا کی صورت میں یہ زخم ہمیشہ لہو اگلتا ہی محسوس ہوتا تھا۔ اس کے رویے میں مردم بیزاری اور چڑچڑا پن غالب آ گیا۔ وہ گھر میں شہزاد کی آمدورفت پر کوئی روک ٹوک لگا سکتا تھا نہ ہی دل و دماغ پر نقش وہ مناظر بھول سکتا تھا۔ اس موقع پر قدرت کو شاید اس پر ترس آ ہی گیا اور شہزاد کو بیرون ملک ملازمت مل گئی۔ کچھ ماہ بعد اس نے بیوی کو بھی وہیں بلوا لیا۔ وقت دبے پاؤں بیتنے لگا مریم کی شادی بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ ہر فرد اپنی زندگی میں مطمئن اور خوش تھا مگر اخلاق خوشی اور اطمینان کے معنی ہی بھول چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ خدا سے بے اختیار شکوے کرنے لگتا کہ اسے کن گناہوں کی سزا دی جارہی ہے۔ ازدواجی زندگی نہایت تلخی کا شکار تھی۔ زرقا سے آئے روز جھگڑے اسے ہمہ وقت ذہنی تناؤ میں مبتلا رکھتے۔ وہ دونوں ہی نفرت و منافقت کی زندگی جی رہے تھے۔

''شہزاد بھائی کے بیرون ملک چلے جانے کا افسوس تو بہت ہوتا ہوگا تمہیں؟ برسوں پرانا یارانہ جو چھوٹ گیا ہے۔'' وہ اکثر اسے کچوکے دیتا۔

''نہیں! مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا۔ اگر وہ میرے سامنے رہتا تو میں خود ہی کسی روز اسے جان سے مار دیتی۔'' زرقا پھنکارتی۔ ''البتہ ایک بات کا افسوس ضرور ہے کہ میری قسمت میں تم جیسا بزدل مرد لکھا تھا۔ یہ بزدلی اور کمزوری تمہیں کہیں کا نہ رکھے گی۔ لکھ لو میری یہ بات۔''

''ہونہہ! حرافہ عورت۔'' اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا تو زرقا نے اس کا منہ اپنے تیز دھار ناخنوں سے نوچ لیا۔

''خبردار! خبردار...... جو مجھے کبھی ایسی گالی دینے کی کوشش کی۔ مجھے کچھ بھی کہنے سے قبل اپنے کردار پر ایک نظر دوڑا لیا کرو جو اس قدر مشکوک تھا کہ کسی نے بھی سچائی کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کیے بغیر ہی تمہیں اصل مجرم تسلیم کرلیا۔'' اس کے دوبدو جواب، بے خوفی اور دیدہ دلیری اخلاق کو مزید طیش میں مبتلا کردیتی۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اخلاق کے دل میں کہیں نہ کہیں خواہش تھی کہ زرقا اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے معافی مانگ لے اور پھر سب تلخیاں پس پشت ڈالے وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کردیں۔

دوسری جانب زرقا شوہر کی جانب سے ان کدورتوں کے خاتمے کی پہل کی خواہشمند تھی۔ ماضی میں ہوئی غلطیوں کو بھلا کر وہ بھی خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی مگر شوہر کا طنزیہ رویہ اسے انتقامی جذبات میں مبتلا کردیتا۔

زندگی یونہی بیتتی چلی جارہی تھی۔ ایک جبری ازدواجی زندگی کے ساتھ وہ ہنوز اولاد کی دولت سے محروم تھے۔ اس کے والدین بھی پوتا یا پوتی کھلانے کے آرزومند دکھائی دیتے۔ کچھ وقت اور گزرا تو احباب اور واقف کار افراد نے اپنے مخصوص انداز میں ٹٹولنا شروع کردیا۔

''شادی کو آٹھ سال ہوگئے۔ کسی خوشخبری کی طرف سے کان ترس گئے ہیں۔''

''بس دعا کرو کہ اللہ کرم کردے اپنا۔'' امی ٹھنڈی آہ بھر کر کہتیں۔

''کہیں علاج وغیرہ کروا کے دیکھو! آج کل تو سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے۔''

''اللہ کے فضل سے دونوں ہی نارمل ہیں۔ بس اللہ ہی کی طرف سے دیر ہے۔''

''اچھا! پھر اللہ کرم فرمائے۔ بیٹی ہی دے دے مگر گود تو بھرے۔'' ہمدردانہ دعا موصول ہوتی۔

''اخلاق میاں کی طرف سے کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں...... اس کے معمول بھی تو بہت مشکوک رہے ہیں۔'' ایک اور بے باک تبصرہ اس کی روح کو گھائل کرتا۔

اس کشمکش میں کتنے ہی موسم بیت گئے۔ اخلاق نے اپنی ذات کو کاروبار تک محدود کرلیا۔ والدین کو حج کروانا اس کی دیرینہ آرزو تھی۔ اس نے دوڑ دھوپ کرکے اگلے سال ہی انتظامات مکمل کردیے۔ روانگی سے دو روز قبل انہوں نے اخلاق کو اپنے پاس بلایا۔ زرقا اس وقت گھر پر موجود نہیں تھی۔

''اخلاق...... میرے بچے! میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔ تیری تابعداری پر مجھے فخر ہے۔'' امی کا آبدیدہ لہجہ اور الفاظ کی سنجیدگی نے اس کے ہونٹوں پر زخمی تبسم بکھیر دیا۔

''چھوڑیں امی! مجھ سا بدبخت اور بدکردار اولاد ہوگی بھلا؟''

''نہ بیٹا! ہمیں اور شرمندہ مت کر......'' اباجی نے بوجھل آواز میں کہا۔ ''ہم مانتے ہیں کہ تیرے سلسلے میں ہم سے کچھ زیادتیاں ہوئی ہیں لیکن بخدا ہماری نیت غلط نہیں تھی۔''

''کچھ...... کیا یہ صرف کچھ زیادتیاں تھیں؟'' وہ آزردہ ہوا۔

''میں جان گیا تھا کہ زرقا کے معاملے میں اصل قصوروار

..." شہزاد ہی تھا۔ اس روز شہزاد کے حوالے سے اصل حقیقت ہم جان گئے تھے لیکن بیٹی کا معاملہ تھا..... اس لیے اسے قصور وار نہ ٹھہرا سکا۔ بیٹی کا گھر اجاڑنے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔" اباجی کی آنکھوں میں نمی چھلکی۔

"اپنے مجبور ماں باپ کو معاف کر دینا بیٹا!" امی نے کہا۔ اخلاق کے الفاظ گنگ تھے۔ "میں نے تیری بہن کو بھی بعد میں ساری حقیقت بتادی تھی۔ اسی نے طریقے سے دباؤ ڈال کر شہزاد کو بیرونِ ملک ملازمت کی طرف مائل کیا۔"

"کیا فائدہ امی جی۔ کیا فائدہ؟" وہ افسردگی سے کہتا ہوا اٹھ گیا۔ والدین بھی افسردگی سے اسے جاتے دیکھتے رہے۔ انہیں خیال تھا کہ واپسی کے بعد وہ اس سے ایک بار پھر اس موضوع پر بات کریں گے لیکن تقدیر نے انہیں ایسا کوئی موقع ہی نہ دیا۔ اس سال دورانِ حج حجاج کے کیمپوں میں آتشزدگی کا واقعہ ہوا جن میں جاں بحق ہونے والے افراد میں اخلاق کے والدین بھی شامل تھے۔

☆☆☆

چھٹا باب:۔

والدین سے محرومی خواہ کسی بھی عمر میں ہو انسان کی زندگی تندو تیز ہواؤں کی زد میں آجایا کرتی ہے اور اخلاق تو تبدیلی در تبدیلی کا شکار ہوا تھا۔

اس کا آخری جذباتی سہارا بھی ختم ہو گیا۔ زندگی میں کیف اور امنگ ناپید ہو گئیں۔ اسی دوران اسے خوشخبری ملی کہ زرقا امید سے ہے۔ یہ خبر تازہ ہوا کا ایک جھونکا تو ثابت ہوئی لیکن حسبِ سابق وہ اپنی خوشی کے اظہار سے قاصر تھا۔ زرقا البتہ بے حد مسرور تھی۔ ماضی کی بیزاری سے قطع نظر اولاد کی نوید نے اس کے وجود میں توانائی کا ایک نیا ذخیرہ پیدا کر دیا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ شوہر سے بھی ایسے ہی بے ساختہ جذبات کے اظہار کی خواہشمند تھی لیکن اخلاق کو کاروباری معاملات نے بے حد الجھا رکھا تھا۔ اسے اباجان کی کمی بے حد محسوس ہوتی تھی۔ ان کی موجودگی نے کتنے ہی کاروباری مسائل پیدا ہونے سے روک رکھے تھے۔ انہی معاملات کو سلجھاتے بالآخر وہ وقت بھی آ گیا جب زرقا نے ایک پھول سی بچی کو جنم دیا۔ بچی قدرے کمزور لیکن بہت خوبصورت تھی۔ اخلاق کے دل و دماغ میں عجیب کیفیت برپا تھی۔ اس کے سینے میں محبت کا ایک طوفان موجزن تھا لیکن زرقا کی گود میں گلابی کمبل میں ملبوس بیٹی کے وجود سے ایک بے عنوان خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے میکانکی انداز میں اس کے کانوں میں اذان دی۔ تھوڑی ہی دیر میں اہلِ خانہ واحباب کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔

"اللہ نے آخر سن ہی لی اخلاق کی بھی۔ ورنہ اب تو لوگ طرح طرح کے سوال پوچھ کر شرمندہ کرنے لگے تھے۔" بڑی بہن نے کہا۔

"اللہ ہی سنتا ہے آپا! اور کون حاجت روا ہے بھلا؟" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہاں بھئی! بیٹی ہی سہی لیکن اولاد تو ہوئی..... تم دل چھوٹا نہ کرو۔ بیٹا بھی دے گا اللہ۔" آپا بچپن میں اپنی اور بہنوں کی پیدائش کے ضمن میں ہونے والے تبصرے ہی لاشعوری طور پر دہرا رہی تھیں۔

"بیٹا ہو یا بیٹی! کیا فرق پڑتا ہے۔ اولاد تو بس نیک اور بانصیب ہونی چاہیے۔" زرقا نے سادگی سے کہا۔ اس نے بھی ایسے مواقع پر بزرگوں سے سنی بات ہی دہرائی تھی لیکن اخلاق کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ زرقا نے براہِ راست اسی کے کردار پر وار کیا ہے۔ اس لمحے اسے بیوی سے پہلے سے کہیں زیادہ نفرت محسوس ہوئی۔ کچھ دیر پہلے زرقا کے لیے جو بے عنوان محبت اور کشش محسوس ہوئی تھی یکدم نابود ہو گئی۔

"آپا کے کہنے کا مقصد ہے کہ تمہارے خاندان میں بیٹیاں ہی زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ کہیں تم بھی یہی معمول نہ دہرانے لگو۔" اخلاق نے سرد مہری سے اسے مخاطب کیا۔

"اولاد مرد کے نصیب سے پیدا ہوتی ہے۔ عورت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اتنا پڑھ لکھ کر بھی یہ بات نہ سمجھ سکے آپ۔ تعلیم حاصل کرنے پر دھیان ہوتا تو آج یہ نوبت تھوڑی ہی آتی۔" زرقا نے بھی بدلحاظی سے جواب دیا۔ وہ اس وقت بپھری ہوئی شیرنی لگ رہی تھی۔ اس کی ہر بات اور عمل اخلاق کے دل میں مزید نفرت اور بیزاری پیدا کر رہا تھا۔

خاندان کے سامنے یہ گفتگو معمولی بات ہرگز نہیں تھی۔ وہ کسی گہری تبدیلی کا لمحہ تھا۔ اخلاق کو اپنے وجود میں ایک گلیشیئر اترتا ہوا محسوس ہوا۔ آس پاس بیٹھے افراد سے بیگانگی اور اجنبیت کا احساس اس قدر گہرا تھا کہ وہ خود ان محسوسات کی گہرائی سے خوفزدہ ہو کر رہ گیا۔

زندگی کا یہ باب پہلے سے کہیں زیادہ تلخ اور ناقابلِ برداشت ثابت ہوتا تھا۔

☆☆☆

بیوی سے ہونے والی اس چپقلش کے بعد اخلاق نے خود کو کاروباری معاملات میں غرق کر دیا۔

شب و روز کی محنت ہی کا نتیجہ تھا کہ اگلے تین سال میں اس نے اردگرد کی دو دکانیں خرید لیں۔اس دوران خواہش کے باوجود دوسری اولاد کے لیے کوئی امید بر نہ آسکی۔اخلاق کو اپنی بیٹی۔۔۔۔ کے لیے بے حد گداز اور محبت محسوس ہوتی تھی لیکن اس محبت میں پوشیدہ خوف اسے بے حد نڈھال اور بوجھل کیفیت میں مبتلا رکھتا۔کالج میں فریحہ' ساجدہ' شازیہ اور نازنین کے بعد زرقا کی صورت میں اسے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی آزمائش میسر آئی تھی۔وہ شدید نفسیاتی دباؤ کا شکار ہوکر ایسی کیفیت میں مبتلا ہو چکا تھا جہاں محرومیاں اور کسک آسیب بن کر فہم و شعور پر دبیز پردہ تان دیتی ہیں۔اپنی انہی الجھنوں سے لڑتا وہ ایک میکانکی زندگی گزار رہا تھا۔کاروبار وسعت اختیار کرتا جا رہا تھا۔نصیب کا یہ عالم تھا کہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا تو سونا بن جاتی۔اس کامیابی پر عزیز و اقارب بھی انگشت بدنداں تھے۔

''بھئی اخلاق میاں! تم نے تو خوب ترقی کمائی۔دولت تو ہُن کی طرح برس رہی ہے۔'' خاندان کے بزرگ اکثر کسی نہ کسی تقریب میں اسے گھیر لیتے۔

''کیا فائدہ بھئی؟ اتنا کچھ کما رہا ہے لیکن کل کلاں کو سب داماد بٹور لے گا۔بیٹا ہوتا تو کاروبار سنبھال بھی لیتا۔'' چچا نے حسب سابق اپنی دور اندیشی کا مظاہرہ کیا۔ان کے دو پوتے تھے لیکن بیٹے کا کاروبار اس قدر مستحکم نہیں تھا۔اخلاق ان کی بات پر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔اسے ہمیشہ یونہی اولادِ نرینہ سے محرومی کا احساس دلایا جاتا تھا۔

''اللہ پاک نے قسمت میں یہ سکھ لکھا ہوا ہے تو ضرور ملے گا ورنہ ہم انسان کیا کر سکتے ہیں؟''

''تو بھلا کر کیوں نہیں سکتے۔شریعت نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دے رکھی ہے۔'' اس کی ممانی دبے لفظوں میں جتاتیں۔

''ارے ممانی! آپ کی مطلقہ بیٹی کے لیے اس مٹی کے مادھو پر تو نظر نہیں ٹھہر گئی آپ کی؟'' زرقا بدلحاظی سے کہتی۔ ''اگر ایسا سوچ بھی رہی ہیں تو یاد کیجیے کہ اباجان نے نکاح نامے میں دوسری شادی پر قدغن رکھی تھی۔''

''ارے ہاں بھئی! تمہاری شادی اور وہ حالات کون بھول سکتا ہے بھلا؟ اللہ کو بھی جانے کیا آزمائش منظور تھی کہ تمہارے ہاں ہی صرف بیٹی پیدا کی۔اب بتاؤ بھلا' اپنی جوانی تو سنبھال نہ سکیں، بچی کی تربیت کیا خاک ہوگی۔''

''یہ فکر بھی بے کار کر رہی ہیں آپ۔جو لوگ اپنے ماضی سے سیکھتے ہیں وہ مستقبل میں ویسی غلطیاں کبھی نہیں دہراتے۔''

بھرے مجمعے کے سامنے ایک بار پھر ماضی کی نقاب کشائی نے اسے گہرا چرکا دیا۔وہ شوہر کی جانب سے دفاع کی منتظر تھی لیکن اخلاق کے چہرے پر نظر آتی بے نیازی نے اسے اپنا دفاع خود کرنے پر مجبور کر دیا۔اس واقعے کے بعد ان کے مابین سرد مہری اور نفرت مزید گہری ہوگئی۔

☆☆☆

وقت کی پرواز جاری رہی۔

اخلاق اور زرقا اپنے متعین کردہ دھاروں میں بہتے رہے۔ان کے باہمی تعلقات نہایت واجبی تھے تاہم سیماب کی ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر اب اخلاق نے اسے ماضی کے حوالے سے کوئی بھی بات جتانی چھوڑ دی تھی۔

زرقا بھی بیٹی کے ساتھ معروف ہوگئی تھی۔اخلاق اس کی ذہنی کیفیت سے ناآشنا تھا اور وہ اسے سمجھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔اس لیے اسے علم ہی نہ ہوسکا کہ عورت کے پاس جب شوہر کی محبت' اعتماد اور ستائش نہ ہو تو جبلی طور پر ہی وہ اپنی ذات کو اولاد کے لیے فراموش کر دیتی ہے۔زرقا بھی یہی کر رہی تھی۔وہ شوہر کی واپسی یا اصلاح کی طرف سے مکمل مایوس ہو چکی تھی۔ایسی مایوس' افسردہ اور ٹھکرائی ہوئی نظرانداز عورت اپنی ذات کو مجسم قربانی و ایثار بنا کر اولاد کے سامنے پیش کرتی ہے۔اولاد اور باپ میں غیر محسوس طریقے سے فاصلے پیدا کر دیتی ہے۔اخلاق کے کبھی خیال میں اولاد کی بنیادی ضروریات پوری کر دینا ہی باپ کا سب سے بڑا فریضہ تھا اور اس فرض کی ادائیگی وہ بہت اچھی طرح کر رہا تھا۔

سیماب بہترین تعلیمی ادارے میں پڑھ رہی تھی۔زرقا نے اسے خاندان کے دیگر افراد اور بچوں سے دور ہی رکھا تھا۔بیٹی کے حوالے سے اخلاق کے ذہن میں ایک خاص لائحہ عمل تھا جس کے بارے میں وہ مکمل منصوبہ بندی کر چکا تھا۔زرقا سے کشیدہ تعلقات کی اسے کوئی پروا نہ تھی۔وہ اپنی حکمتِ عملی کے مطابق ہی بھی معاملات چلا رہا تھا۔

اگلے کئی سال انہی معمولات اور تلخیوں میں گزر گئے۔

ایک ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح رہتے وہ ایک دوسرے کی ذات سے بے نیاز ہو چکے تھے۔سیماب تیزی سے عہدِ شباب کی طرف گامزن تھی۔وہ پڑھائی میں بھی بہت اچھی تھی۔ہر سال اچھا نتیجہ لاتی۔اخلاق کے دل میں بے ساختہ فخر و مسرت کے جذبات پیدا ہونے لگتے۔پڑھ لکھ کر کسی بلند مقام پر پہنچنا اس کی اپنی خواہش بھی تو تھی جو کسک بن کر آج بھی دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ تھی۔دل ہمک کر بیٹی کو اپنے سینے سے لگانے کے لیے مچلتا لیکن ایسے ہی کسی لمحے جانے کیسے زرقا کو

ان عزائم کی خبر ہو جاتی۔

"یہ سامان جلدی سے سمیٹو اور سونے کی تیاری کرو۔" وہ سختی سے انہیں سابقہ معمولات کا احساس دلاتی۔

"مما پلیز! تھوڑی دیر اور....." سیماب کے انداز میں بے تابی اور تشنگی ہوتی لیکن ماں کے چہرے پر چھائی خشونت اور غصہ اسے مزید دم مارنے نہ دیتا۔ وہ خاموشی سے اپنے تحائف سمیٹ کر پیاسی نظروں سے باپ کو نہارتی لوٹ جاتی تو زرقا کے چہرے پر فاتحانہ اور زہریلی مسکراہٹ رقص کرنے لگتی۔ اخلاق کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور ردِعمل کے طور پر وہ ایک بار پھر سرد مہری کے خول میں سمٹ جاتا۔

☆☆☆

موسموں کے تغیر کی تال میل کے ساتھ کیلنڈر کا رقص جاری رہا۔

اخلاق اور زرقا کی زندگی سابقہ مدار کے گرد ہی گردش کرتی رہی۔ عزیز واقارب اور احباب کے "پُرخلوص مشورے اور تجاویز" میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پھر سیماب نے میٹرک کا امتحان نہایت شاندار نمبروں سے پاس کر لیا۔ اس روز زرقا کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ اخلاق کے دل میں بھی فخر ومسرت کے ساتھ اپنے ماضی کی ایک سنہری یاد دھیمی آنچ سے کسک دینے لگی۔ اس نے بیٹی کی کامیابی کی خوشی میں ایک تقریب منعقد کر لی۔

"سیماب کو کون سے کالج میں پڑھانے کا ارادہ ہے؟ ماشاء اللہ اتنے اچھے نمبر حاصل کیے ہیں اس نے۔" اس روز خاندان کے ہر فرد کی زبان پر یہی کلمات تھے۔

"اسے تو کوئی بھی کالج ہاتھوں ہاتھ لے گا۔" اخلاق کی بہن ماجدہ نے کہا۔

"سیماب کسی کالج میں نہیں جائے گی۔ اس کی پڑھائی کا سلسلہ یہیں ختم ہو جائے گا۔" اخلاق نے اطمینان سے جواب دیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ایسا کیسے ممکن ہے بھلا؟" حیرت اور تعجب بھری صدائیں ابھریں۔

"بالکل ممکن ہے۔ میں نے اپنے ایک کاروباری دوست کے بیٹے سے اس کا نکاح طے کر دیا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں موجود ہوں گے۔ نکاح کے ساتھ رخصتی بھی کر دی جائے گی۔" اس کا اطمینان برقرار تھا۔ اس کے الفاظ گویا بم دھماکا تھے جس کی گونج وہاں موجود ہر شخص پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

"خاندان کے لڑکے مر گئے ہیں کیا جو تم کسی انجان کے ہاتھ بیٹی کا ہاتھ تھمانے چلے ہو؟" بہن نے غصے سے کہا۔ "کسی سے مشورہ کیا نہ اطلاع دی۔ شادی بیاہ تو تمہارے لیے ہر بار ہی گڈے گڑیا کا کھیل رہا ہے۔" اس کے طنز نے اخلاق کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ بکھیر دی۔

"میں سیماب کا باپ ہوں۔ اس کا بھلا برا آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ کالج نہ جانا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ آپ کو علم نہیں کہ پڑھائی کی آڑ میں وہاں کیا کچھ ہوتا ہے۔" اس کا لہجہ اٹل تھا۔ "کم عمری میں ہی شادی کر دینی بہتر ہوتی ہے ورنہ نفس بہک جائے تو اپنی لپیٹ میں بہت سی زندگیاں مزید تباہ کر دیتا ہے۔"

"تم..... نفسیاتی مریض..... تم اپنی اولاد کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟" زرقا اپنا ضبط کھو بیٹھی۔ سیماب بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے باپ کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

"اسی میں سب کی بھلائی ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"دیکھو اخلاق میاں! ایسے فیصلے اتنی عجلت میں کرنے مناسب نہیں ہوتے۔ تم ہتھیلی پر سرسوں کیوں جما رہے ہو؟"

عظیم ماں

تھامس ایڈیسن مشہور عالم سائنس دان جب بچہ تھا۔ وہ اسکول سے آیا اور ایک سربمہر لفافہ اپنی والدہ کو دیا کہ استاد نے دیا ہے کہ اپنی ماں کو دے دو۔ ماں نے کھول کر پڑھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر اس نے بہ آوازِ بلند پڑھا۔ "تمہارا بیٹا ایک جینئس ہے۔ یہ اسکول اس کے لیے بہت چھوٹا ہے اور اتنے اچھے استاد نہیں کہ اسے پڑھا سکیں، سو آپ خود اسے پڑھا لیں۔"

سالوں کے بعد جب تھامس ایڈیسن ایک سائنس دان کے طور پر مشہورِ عالم ہو گیا تھا اور والدہ وفات پا چکی تھیں، وہ اپنے خاندان کے پرانے کاغذات میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا کہ اسے وہی خط ملا۔ اس پر لکھا تھا..... آپ کا بیٹا انتہائی غبی و ذہنی ناکارہ ہے۔ ہم اسے مزید اسکول میں نہیں رکھ سکتے۔ اس دن ایڈیسن نے ڈائری میں لکھا۔ تھامس ایلوا ایڈیسن ایک ذہنی ناکارہ بچہ تھا، مگر ایک عظیم ماں نے اسے صدی کا سب سے بڑا سائنس دان بنا دیا۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

ماموں نے رسان سے سمجھایا۔ وہ بھی اپنے ایک پوتے کے لیے سیماب کا ہاتھ مانگنے کے دیرینہ آرزومند تھے۔

''میں کچھ غلط کر رہا ہوں نہ ہی منفرد...... عجلت میں شادی ایک بار پہلے بھی تو ہو چکی ہے۔ اس وقت آپ سب اس فیصلے پر عملدرآمد کرنے پر تلے تھے، مبادا میں کہیں فرار ہی ہو جاؤں...... اب اتنی تڑپ کیوں؟''

''اس وقت بات کچھ اور تھی...... لیکن اب......'' انہیں سمجھ ہی نہ آرہا تھا کہ اخلاق کو کیسے سمجھائیں۔

''تو تم اس بات کا بدلہ اپنی اولاد سے لوگے؟'' زرقا بے یقین تھی۔

''نہیں احمق عورت! میں اپنی اولاد کو مستقبل کے بہت سے مسائل سے بچا رہا ہوں جو تم کبھی سمجھ ہی نہیں سکوگی۔'' وہ جھلایا۔ ''میں نے اپنی بیٹی کے لیے ایک بہترین لڑکا منتخب کیا ہے۔ وہ سرکاری محکمے میں ملازم ہے۔ اس میں کوئی شرعی عیب نہیں۔ میں نے سیماب کی تصویر دکھا کر ہی یہ رشتہ پکا کیا تھا۔''

''مجھے یقین نہیں آتا۔'' زرقا کی تڑپ دیدنی تھی۔ ''سنو! میں جان گئی ہوں کہ تمہارا مقصد کیا ہے...... تم مجھ سے انتقام لینا چاہتے ہو نا! تمہیں خدا کا واسطہ...... یوں مت کرو۔ میں تمہاری بے گناہی کا......''

''خاموش! بس خاموش ہو جاؤ۔'' وہ غرا کر بولا۔ ''میں اتنا کم ظرف نہیں کہ تمہارے اعتراف کے لیے اپنی اولاد کی زندگی سے کھیلنے لگوں۔ اس بات کو یہیں ختم کر دو تو بہتر ہے۔''

سیماب کی حالت ان سبھی سے مختلف تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کس قدر آسانی اور اس کی ذاتی خواہشات کو نظرانداز کر کے طے کر لیا گیا ہے۔

زندگی نے سیماب کو کبھی ہموار راہ گزر فراہم نہیں کی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے خود کو عجیب و غریب اور مشکل نفسیات کے حامل افراد میں گھرا پایا تھا۔ والدین نے کبھی آپس میں خوشگوار لہجے یا انداز میں گفتگو نہیں کی تھی۔ ان کی آنکھوں سے چھلکتی بیزاری اور لہجوں کی تپش وہ نوعمری میں بھی مکمل شدت سے محسوس کیا کرتی تھی۔ والد کے لیے اس کا دل بے حد ہمکتا لیکن 'گلے لگانے' 'گود میں اٹھا کر لاڈ کرنے' کندھوں پر جھولنے کی حسرت ہمیشہ حسرت ہی رہی۔ اس کی تمام ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ ہر خواہش بن کہے ہی تکمیل پالیتی مگر باپ کا لمس اور اظہارِ محبت کبھی نصیب نہیں ہو سکا۔ ماں نے اسے کڑی نگرانی میں تربیت دی تھی۔ اسے کسی خاندانی تقریب میں بھی شرکت کی اجازت نہ تھی۔ یہ صورتِ حال اس کے لیے الجھن آمیز تو تھی لیکن وہ یہ کبھی جان ہی نہ پائی کہ اپنے ماضی کی بازگشت اس تک پہنچنے سے روکنے کے لیے ہی زرقا نے یہ قدم اٹھا رکھا تھا۔

''پاپا میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟'' اس کی سوچ اب ایک ہی نکتے پر مرکوز تھی۔ چکراتے ذہن اور بکھری ہمت کو مجتمع کرتے اس نے باپ کی طرف دیکھا اور بولی۔

''مجھے یہ شادی نہیں کرنی...... مجھے پڑھنا ہے...... پلیز پاپا! میں نے آج تک آپ سے کچھ نہیں مانگا...... مگر آج میری یہ خواہش تسلیم کر لیجیے۔'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

اخلاق کے سینے میں ایک عجیب سا گداز پیدا ہو گیا۔ اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر بیٹی کو گلے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے نم لہجے میں گویا ہوا۔

''میری بچی! میرا یہ فیصلہ تمہاری بہتری ہی کے لیے ہے۔ احمد نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہیں پڑھائی سے کبھی نہیں روکے گا۔ وہ تمہارا ہر جائز خواب پورا کرے گا۔''

سیماب کے وجود پر بھی ایک لرزہ طاری تھا۔ باپ کی محبت اور لمس کی خواہش پوری ہوئی بھی تو کس مقام پر۔ اس کے کشادہ سینے میں سماتے ہی وہ اپنی ہر سوچ اور تمنا سے دستبردار ہونے کے لیے جانے کیسے خود کو آمادہ پا رہی تھی۔ اپنے یہ جذبات خود اس کی سمجھ سے بھی بالاتر تھے۔ باپ کے وجود سے اٹھتی خوشبو اس کی تھپکی اور بوسہ جادوئی لمسے تھے۔

''ٹھیک ہے پاپا! آپ کی خوشی کے لیے مجھے ہر فیصلہ منظور ہے۔'' چند لمحوں بعد اس نے خود کو کہتے پایا۔

اخلاق کی آنکھوں سے نکلے آنسو اس کی ڈاڑھی کے بال بھگونے لگے۔ وہ بہت مطمئن اور سرشار تھا۔ سیماب کی رخصتی کے بعد اب محض ایک ہی فرض باقی رہ گیا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کی تکمیل بھی اس کے لیے مشکل ثابت نہ ہوگی۔

☆☆☆

آخری باب:

نیم تاریک کمرے میں یادوں کا رقص مکمل آہنگ سے جاری تھا۔

کبھی کسی یاد کا ٹکڑا الگ ہوتا اور اس کے بے بس وجود سے لپٹ جاتا۔ خواہش کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کچھ دیر مزاحمت کے بعد اس نے اپنے آپ کو اس تند و تیز لہر کے حوالے کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ چپکے سے اٹھا اور اپنا بوجھل وجود گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تو ایک اور سناٹا بھی اس کے ہم رکاب تھا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ اس کے قدم خود بخود ایک منزل

کی طرف اٹھتے چلے جارہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے خود کو روشنی، طمانیت اور ٹھہراؤ سے منور ''خانۂ خدا'' کے روبرو پایا۔ یہاں پہنچتے ہی وحشت کا وہ رقص ختم ہوگیا۔ اس نے نوافل کی نیت باندھ کر لرزتے وجود سے ٹھنڈے فرش پر پیشانی ٹیکی تو مسیحائی کی تاثیر روئیں روئیں میں سرایت کرگئی۔ دعا میں ہاتھ اٹھائے تو دل میں رستا ناسور آنسوؤں کی صورت میں اخراج بن گیا۔ اس کے دماغ پر ایک دھندسی طاری ہونے لگی تھی۔

اپنی عمر کے اس آخری پڑاؤ میں ہر انسان کی طرح وہ بھی زندگی میں بیتے ہر باب سے ایک بار پھر گزر رہا تھا۔ ماضی کا یہ سفر ہر موڑ پر ایک سوال چھوڑ کر کسک، پچھتاوے اور ملال کی نئی لہر میں شرابور کردیتا۔ نوافل سے فراغت پاتے ہی اس نے ستون سے کمر لگالی۔ ٹھنڈک اور سکون کی غیر مرئی لہریں وجود کو سکون دینے لگیں۔

''پڑھ لیے نوافل؟'' اس کی سماعت میں ایک شناسا آواز پڑتے ہی دل و دماغ نے یاد دلایا کہ وہ اس آواز سے کس قدر نفرت میں مبتلا رہا ہے۔

''ہاں! مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس لیے یہاں چلا آیا۔'' اس نے خود کو کہتے پایا۔

''یہاں نیند آنے کا سوال ہی کیا؟ نیند تو وہ تھی جس میں مبتلا ہم ایک جبری مدار میں گردش کررہے تھے۔ یہاں اس مقام پر تو ہر قسم کی خوابیدگی اور غفلت اپنا وجود کھو کر ہمیں اپنے اصل کا آئینہ دکھا دیتی ہے۔''

''سچ کہہ رہی ہو۔ میرے ساتھ بھی تو یہی ہورہا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر خود کو زرقا سے متفق پایا۔ یہ امر اس کے لیے مزید حیران کن تھا۔ اس عورت سے تو وہ تاعمر اختلاف ہی کرتا رہا تھا...... تو پھر آج کیوں اس کی باتوں سے متفق ہورہا تھا؟ وہ الجھنے لگا۔

''اس الجھن کو ذہن پر سوار مت کرو۔ میرے ذہن میں بھی اس وقت یہی سوال برپا ہے کہ ساری زندگی تم سے نفرت اور بیزاری سے بھرپور وقت گزارنے کے بعد میں اس مقام پر آتے ہی تمہاری اہمیت اور محبت کس طرح، کیونکر محسوس کرنے لگی ہوں؟''

''تو کیا جواب ملا؟''

''جواب کی صورت میں غلطیوں اور کوتاہیوں کا ایک طویل باب مجسم سامنے آجاتا ہے۔ میں ان غلطیوں کو مٹا کر نیا باب رقم کرنا چاہتی ہوں لیکن وہ ہیولے کسی بھی طرح گرفت میں آکے ہی نہیں دیتے۔''

''غلطیاں...... ہاں! اب میری سمجھ میں آئی کہ یہاں اس مقام پر کیا خلش ستا رہی ہے۔ غلطیاں...... کوتاہیاں اور خودساختہ دنیا میں قید زندگی کے ہر باب میں اپنا کردار۔ ہاں! میں جان گیا۔''

''مجھے یہاں ایک زرقا دکھائی دے رہی ہے۔ وہ زرقا جو اپنے والدین کے گھر خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ والدین نے ایک حد میں اسے ہر آسائش مہیا کررکھی تھی۔ وہ خوش تھی لیکن اس خوشی کی تہ میں ایک چبھن ہوتی تھی جو ان خوشیوں کو پوری طرح محسوس ہی نہیں کرنے دیتی تھی۔ جانتے ہو وہ چبھن کیا تھی؟'' زرقا کے توقف پر اخلاق نے نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''ہاں! اب میں واضح طور پر دیکھ سکتی ہوں کہ اس لڑکی کے آس پاس موجود افراد کی سوچ، گفتگو اور نظریات بہت الجھے ہوئے، کبھی ذومعنی اور کبھی دل دکھانے والے ہوتے۔'' وہ ایک ستون پر نظریں جمائے کہتی چلی گئی۔ انداز ایسا تھا جیسے سامنے نظر آتے مناظر کو بیان کررہی ہے۔ ''ذرا ہوش سنبھالتے ہی اس کے والدین کو احساس دلایا جانے لگا کہ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ ان سے اتنا لاڈ پیار کرنا اس کے مستقبل کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ پھر کچھ عرصہ گزرا تو اس کی سماعت میں ایسے فقرات پڑنے لگے کہ لڑکی ذات کو اتنی تعلیم دلوانا بے سود ہوتا ہے۔ انہیں تو مستقبل میں صرف گھرداری سیکھنی ہوتی ہے۔ ایسی ہی باتوں سے مجبور ہوکر والدین نے انٹر کے بعد مزید پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ ہاں! میں دیکھ رہی ہوں کہ اس زرقا کے وجود میں تلملاہٹ، بغاوت اور محرومی کا پہلا بیج اسی مقام نے بویا تھا۔ اب منظر بدل گیا ہے۔ اب میرے سامنے وہ لڑکی موجود ہے جس کے چہرے پر دبا دبا غصہ اور خوف ہے۔ وہ کسی رشتے دار کی گفتگو سن رہی ہے جو اس کے والدین کو کہہ رہا ہے کہ موجودہ وقت میں اچھے رشتے ملنا کس قدر مشکل ہوتے ہیں۔ لوگ شرافت کا نقاب پہن کر سامنے آتے ہیں اور شادی ہوتے ہی اپنا اصل چہرہ دکھا دیتے ہیں۔ انجان لوگوں، ایک اجنبی انسان کے ساتھ زندگی گزارنے کا خیال زرقا کے دل میں خوف کی جڑیں پیوست کررہا ہے۔ اس کی ذہنی رو دھیرے دھیرے شہزاد نامی ایک عزیز کی طرف منتقل ہورہی ہے جو کافی عرصے سے اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ زرقا کو ایک عجیب سی تقویت کا احساس ہونے لگا ہے۔ وہ سوچ رہی ہے کہ شہزاد کی محبت قبول کرلی تو سارے مسائل خودبخود حل ہوجائیں گے۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے تو

ساری دنیا سے لڑ جھگڑ کر بھی اس سے شادی کرلے گا۔ایسا سوچتے ہوئے وہ یہ بھول گئی ہے کہ ان کے والدین میں کس قدر گہری اور ان مٹ رنجشیں استوار رہی ہیں۔وہ صرف یہ سوچ رہی ہے کہ شہزادا سے پلکوں پر بٹھا کر رکھے گا۔یہ خیال اسے شہزاد کی طرف مائل کرنے لگا ہے۔'' اس نے ایک توقف کیا اور گہری سانس لیتے ہوئے دھیمے لہجے میں سلسلۂ کلام جوڑا۔'' اب مجھے جوزرقا نظر آرہی ہے میں اسے دیکھتے ہوئے شدید کرب میں مبتلا ہورہی ہوں۔وہ محبت کی خوش رنگ تتلیوں کے رنگ چھوتی ہوئی شکاری کی آنکھوں میں پوشیدہ ہوس کے رنگ کیوں نہیں پہچان پارہی؟ شہزاد کو سامنے پاکر بے خودی کی منازل طے کرتی اس لڑکی کو کیوں احساس نہیں ہورہا کہ مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا۔وہ اگر والدین کے دباؤ میں آکر زاہدہ سے شادی کرچکا ہے تو اسے یہی کرنا تھا۔زرقا کو یونہی ٹھوکر کھانی تھی۔لو دیکھو! اب وہ گناہ گار بنی ایک مجمعے میں کھڑی ہے۔اس کا محبوب ہی اسے سرِعام رسوا کررہا ہے۔اس کا نکاح ایک ایسے فرد سے پڑھایا جارہا ہے جس کی بابت وہ مختلف چہ میگوئیاں سنتی رہی تھی۔اس نکاح کے بعد زرقا کے دل میں شوہر کے لیے ایسے جذبات پیدا ہوئے ہیں جن سے وہ پہلے ناآشنا تھی۔یہ محبت کا ایک نیا روپ تھا۔وہ جوابی طور پر بھی ایسی ہی محبت کی طالب نظر آرہی ہے لیکن ارگرد بسنے والے لوگ اسے اپنی غلطی بھولنے دے رہے ہیں نہ ہی شوہر کو اس کی طرف مائل ہونے دے رہے ہیں۔وہ کسی نہ کسی طریقے سے ماضی ان کے سامنے اجاگر کردیتے ہیں اور شوہر اس کی جانب آتے آتے بھی پلٹ جاتا ہے۔ذلت، محرومی اور توہین کا یہ احساس زرقا کی روح کو زہرآلود کرنے لگا ہے۔وہ اولاد کے سامنے اپنی کوتاہیوں کے تذکرے سے خائف نظر آرہی ہے۔اس نے اپنی بیٹی کو کبھی رشتے داروں اور خاندان میں گھلنے ملنے نہیں دیا۔وہ انتقامی ردِعمل کے طور پر اسے باپ سے بھی دور کررہی ہے۔اسے یہی خدشہ تھا کہ اگر اخلاق اس کا ماضی بیٹی کے سامنے طشت ازبام کردے تو اس کی زندگی کا مقصد ہی ختم ہوجائے گا۔لیکن اخلاق جو کچھ کررہا ہے وہ اس کی سوچ سے بھی بالاتر ہے۔وہ اچانک بیٹی کا نکاح طے کرکے شادی کا فیصلہ سنارہا ہے۔زرقا تڑپتے ہوئے خود ہی ماضی کے اوراق برہنہ کرنے پر مائل نظر آرہی ہے لیکن اس نے یہ حماقت سرزد نہیں ہونے دی۔سیماب شادی کے بعد اپنے گھر رخصت ہوچکی ہے۔وہ احمد کے ساتھ ایک خوش باش اور بھرپور زندگی بسر کررہی ہے......اس وقت زرقا مجھے ایک اونچے مقام پر بیٹھی یہ سوچتی نظر آرہی ہے کہ اخلاق کے اس فیصلے نے اسے کس قدر پریشانی سے بچالیا تھا۔اگر وہ اپنی مرضی سے یا خاندان ہی میں کہیں بیٹی کا رشتہ طے کردیتی تو زندگی بھر کی مسافت رائگاں جاتی۔اولاد کا دکھ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا۔زندگی کی کتاب اپنے آخری باب تک آن پہنچی ہے اور ان اختتامی صفحات کو پلٹتی زرقا یہ سوچ رہی ہے کہ گزشتہ ابواب کی تلخیاں اور غلطیاں کیسے بھولی جائیں، کیسے اصلاح کی جائے؟'' اس کی آواز معدوم ہوئی تو ایک کراہ کی صدا نے ماحول کو بوجھل کردیا۔

''تم رو رہے ہو......مرد بھی روتے ہیں کیا؟'' زرقا نے حیرانی سے استفسار کیا۔

''ہاں! مرد بھی روتا ہے کیونکہ وہ بھی ایک انسان ہوتا ہے۔تمہیں اس بابرکت اور مقدس سرزمین پر اپنے تخیل وتصور میں جوزرقا نظر آرہی ہے، اسی کے مقابل مجھے بھی تو ایک اخلاق دکھائی دینے لگا ہے۔ذمے داریوں اور توقعات کے بوجھ تلے دبا ننھا سا لڑکا......وہ خود کو ہر ایک کی نظروں میں اچھا ثابت کرنے کے لیے بساط سے بڑھ کر کام کررہا تھا کیونکہ اس کے ذہن میں اوائل عمری سے ہی ایک بات نقش کردی گئی تھی کہ بڑوں کی بات پر عمل کرنے والا زندگی میں کبھی ناکام نہیں ہوتا......میں چاہ کر بھی اسے روک نہیں پایا۔میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ بساط سے بڑھ کر کیے گئے کام اس کے وجود کو دھیرے دھیرے ایک آسیب میں جکڑ لیتے ہیں۔اپنی ذات کو ہمیشہ ممتاز، منفرد اور دوسروں سے برتر دیکھنے کا آسیب......

'' وہ لڑکا اب اسکول جانے لگا ہے۔ذمے داریوں کا بار پہلے سے مزید بڑھ گیا ہے۔اساتذہ اس کی تعریفیں کرتے ہیں اور ساتھی طلبہ حسد۔اسے دوسروں کو حسد میں مبتلا ہوتے دیکھ کر بہت خوشی محسوس ہورہی ہے۔میں چاہتا ہوں کہ اس کے چہرے سے خوشی وفخر کا یہ احساس نوچ کر پھینک دوں۔اسے یہ بتاؤں کہ ایسے ہی لمحے تو ہماری آزمائش ہوتے ہیں۔جس قدر طویل یہ لمحات ہوں گے، اسی قدر بھیانک آزمائش ہوگی۔اس لڑکے کو کیسے سمجھاؤں میں؟''

اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا آپھنسا۔چند لمحے آنکھیں موند کر اس نے ستون کی جانب دیکھا اور پھر سلسلۂ کلام کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے اہلِ خانہ اکلوتا ہونے کے سبب اسے دوسرے لڑکوں اور محلے کے بچوں سے گھلنے ملنے نہیں دیتے۔وہ اپنے ہم جولیوں میں نہیں کھیلے گا تو کیسے جانے گا کہ دنیاداری اور ایک عام انسان سے برتاؤ کے طریقے کیا ہوتے

ہیں؟ یہ اہم نکتہ میں اس کے والدین اور بہنوں کو کیسے ذہن نشین کراؤں کہ اپنے بچے کو دوسروں سے ممتاز رکھنے کی خواہش میں وہ اسے تباہی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔'' وہ بے بسی سے مٹھیاں بھینچنے لگا۔ ''اب مجھے میٹرک کے امتحان میں شاندار کامیابی سمیٹ کر عزیز واقارب کی ستائش سمیٹتا شرمیلا سا نوجوان نظر آرہا ہے...... لیکن وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے آس پاس اور بھی لوگ موجود ہیں جو کامیابی پر مبارکباد کے ڈونگرے برساتے اس کے مستقبل کی بابت تشویش میں مبتلا دکھائی دے رہے ہیں۔ تابعداری اور بزرگوں کے ادب میں سر جھکائے اس لڑکے کی گردن اٹھا کر میں اسے دکھانا چاہتا ہوں کہ ان میں چند ہی افراد دلی طور پر مخلص ہیں۔ اکثریت کے مسکراتے لہجوں کے عقب میں نہایت منفی عزائم پوشیدہ ہیں، وہ اس کے کردار کو ہلکا ثابت کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں لیکن اس نادان نے ان کی باتوں کے پیش نظر ایک لائحہ عمل تیار کرلیا ہے کہ وہ صنفِ نازک سے ایک فاصلہ برقرار رکھے گا تاکہ آئندہ ایسی محافل میں اسے ''باکردار'' ٹھہرایا جاسکے۔ بے وقوف...... کم فہم انسان! سمجھ کیوں نہیں رہا کہ ہر پہلو میں توازن ہی زندگی کی اصل خوبصورتی ہوتی ہے۔'' اخلاق کا تنفس بے ربط اور آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔

''کالج کے پہلے سال اس نے اپنی عام سی شخصیت کے باعث بہت نظراندازی اور منفی خطابات برداشت کیے۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ان سبھی کو ذہانت کے بل بوتے پر مات دینے کا جنون نظر آنے لگا ہے...... لو دیکھو! اب وہ بورڈ میں تیسری پوزیشن کا مالک بن گیا ہے۔ اردگرد ساتھی اسے رشک وحسد کے جذبات سے دیکھ رہے ہیں۔ یہی جذبات تو اسے مطلوب تھے۔ اسے منفرد نظر آنے کا شوق تھا نا۔ کلاس فیلو لڑکیاں بہانے بہانے سے اس کے قریب آنے کی خواہشمند ہیں۔ یہ تو اس کے لیے دہری تسکین کا سامان ہے۔ لڑکوں کو جلن میں مبتلا کر کے ملنے والی خوشی ایک طرف اور ان لڑکیوں سے گریز میں کامیابی کے بعد خود کو ''باکردار'' ثابت کرنے کی مسرت کا بھی کوئی مول ہی نہیں...... میں اسے ان اقدامات سے روک کر بتانا چاہتا ہوں کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اور اسے کسی کو یوں دھتکار کر انسانیت کی تذلیل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ اس سے پڑھائی میں مدد ہی لینا چاہتی ہیں نا۔ ارے! تو کردو مدد...... اور ان کی ناجائز تمناؤں کو مثبت طریقے سے کسی اور دھارے میں تبدیل کردو...... لیکن وہ تو ایک کے بعد ایک غلطیاں دہراتا ہی چلا جارہا ہے۔

''لو دیکھو ذرا! اب وہ لائبریری کے گوشے میں ہونق بنا فریحہ کو کسی ناگن کے روپ میں دیکھ رہا ہے...... یہ تو ہونا ہی تھا...... اسی کی آبیاری تو اس نے کی تھی۔ اب اگر کالج کے سربراہ نے وہاں موجود لڑکوں اور لڑکیوں کی گواہی پر اسے معطل کردیا ہے تو حیرانی کیسی؟ اس نے کسی کو اپنا دوست بنایا ہی کب تھا کہ انہیں اپنی دلی کیفیات سے آگاہ کرسکے۔ وہ اسے دوشی .... ثابت کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں ...... یہ تو ہونا ہی تھا...... اس معطلی کے بعد خاندان بھر میں ہونے والی سبکی بھی پہلے ہی سے طے تھی۔ اکثریت اسی دن کی تو منتظر تھی۔ اپنی اولاد سے برتر نظر آتا وہ انتہائی عام سا لڑکا ذلیل ورسوا ہونے لگا ہے تو ان کا بھی حق تھا کہ اسے مزید دباؤ میں مبتلا کریں...... مجھے اس کا بے بس باپ سرکاری کالجوں میں دھکے کھاتا نظر آرہا ہے لیکن اپنی بربادی کے غم میں مبتلا اخلاق اتنا سا نکتہ کیوں نہیں سمجھ پارہا کہ وہ پرائیویٹ تعلیم بھی تو جاری کرسکتا ہے۔ اس احمق نے دکانداری سنبھال کر منفی سوچ کے حامل افراد کی حسِ انتقام کو تسکین فراہم کردی ہے لیکن اپنے خیرخواہوں کے لیے کوئی مثبت راہ دکھائی کیوں نہیں دے رہی جو روشن اور واضح ترہے۔ دکان سنبھالتے اپنے کردار کی دھجیاں اڑتے دیکھ کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتے اخلاق کو اپنا بہنوئی ایک لڑکی کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں نظر آیا ہے تو اس کے دل ودماغ میں بسی محرومی نے اسے ایک نئی راہ سجھادی ہے۔ وہ ناکردہ گناہوں کی سزا پاکر زندگی میں ہر مقام پر ذلیل ورسوا ہوا ہے تو یہ گناہ گار بھی تو انہی والدین کی اولاد ہیں جو اسے ہر بار کچوکے دینے سے باز ہی نہیں آتے۔ انہیں بھی تو یونہی رسوا ہونا چاہیے۔ یہ سب سوچتے اور عمل کرنے کے لیے تیار کھڑے اخلاق کو میں کیسے باور کرواؤں کہ عزت اور ذلت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مقابل اس کا بہنوئی ہے اور شادی شدہ بیٹی کا گھر کسی بھی تہمت سے محفوظ رکھنا پہلے ہی سے رسوائی کا شکار بیٹے کو مزید رسوا ہونے سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے والدین نے اپنی بشری کمزوری کے تحت بیٹی اور داماد کا رشتہ بچالیا...... اس کے نکاح میں آنے والی وہ لڑکی رسوائی وذلت کا مجسم تمغہ تھی۔ اسے دیکھ کر وہ دہری کشمکش میں مبتلا ہورہا ہے...... ایک طرف نکاح کے مقدس بولوں کی طاقت اس سے محبت کرنے کی طرف مائل کرتی ہے تو دوسری جانب اپنی بے گناہی اور اس کے گناہ گار ہونے کا احساس دل میں نفرت پیدا کرتا ہے...... رک جا کم عقل انسان! تو

کیوں نہیں سمجھ رہا کہ نیتوں کا احوال صرف اللہ جانتا ہے۔ تُو کیوں اپنی مردانگی کے زعم میں اسے سزا دینے میں خود کو حق بجانب تصور کر رہا ہے......''

کرب کی ایک نئی اور طاقتور لہر نے اس کے وجود کو ایک بار پھر ڈھانپ لیا۔ اس نے بمشکل سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑا۔

''اخلاق اب انتقام کی ایک نئی راہ پر چل نکلا ہے۔ وہ اس عورت کو اولاد کی تڑپ میں مبتلا دیکھنا چاہتا ہے اس لیے دیدہ و دانستہ اسے اولاد سے محروم رکھے ہوئے ہے۔ ہوش تو اسے تب آیا ہے جب سالہاسال گزرنے کے بعد والدین نے اپنی کوتاہی کا اعتراف کر کے اس کی زخمی انا کو تسکین پہنچائی اور عزیز و اقارب اس کی مردانگی پر سوال اٹھانے لگے۔ اسے بھی جانے کیوں شدت سے زندگی میں اولاد کی کمی محسوس ہونے لگی ہے۔ پروردگار نے بھی اس کے لیے بہترین سزا تجویز کر رکھی تھی۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد اس کی لاکھ کوششوں کے باوجود امید کی کوئی کونپل پھوٹ کر ہی نہ دی...... وہ کم عقل اب بھی سنبھلنے کے بجائے بیٹی سے خوفزدہ رہنے لگا ہے۔ خواہش کے باوجود اسے قریب لانے کی ہمت ہی نہیں کر پا رہا۔ اس دنیا میں سیماب کی ذات ہی تو ایسی ہے جس کی آنکھوں میں اسے اپنے لیے بے ریا محبت نظر آتی ہے جسے اس کے ماضی کے متعلق چنداں علم نہیں۔ اس کی محنت سے کاروبار میں ترقی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کاروباری، سنجیدہ حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے سے اس کی کم فہمی کو شعور عطا ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اسی فہم و ادراک نے اسے آگہی کے ایک اور عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس کی زندگی کا حاصل سیماب ہی تو ہے۔ جلد یا بدیر خاندان سے اس کے طلبگاروں کی فہرست طویل ہوتی جائے گی۔ وہ کس کو انکار کرے گا؟ کس کو قبول کرے گا؟ وہ یقیناً اس کی دولت پر بھی نظریں جمائے ہوں گے۔ چلو خیر! دولت تو دنیاوی مال ہے۔ انکار کی صورت میں کسی کی بھی جانب سے ان کے ماضی کا افسانہ پوشیدہ رہنا ممکن ہی نہ ہوتا اور پھر سیماب اس سے نفرت کرنے لگتی...... اس موڑ پر ایک اہم ترین فیصلے کی ضرورت شدید ترین ہے اور اس نے بالآخر مناسب ترین وقت پر بیٹی کی ذمے داری سے سبکدوشی کا ارادہ کر لیا ہے۔ کاش! وہ اپنے رویے میں تھوڑی سی تبدیلی لا کر ادب و لحاظ کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے عزیز و اقارب کو ان کی غلط گوئی پر ٹوک بھی پاتا۔ زاہدہ کو یہ احساس دلا سکتا تھا کہ اس نے بہنوں کے سامنے شوہر کی عزت بنائے رکھنے کے لیے بھائی کے وجود میں ایک موت برپا کر دی ہے۔ زرقا سے اس کی نفرت اپنی جگہ بجا لیکن درگزر بھی تو کوئی وصف ہوتا ہے...... وہ یہ سب انہیں کیسے کہتا...... وہ تو خود مذہبی شعائر پر عمل کے باوجود اپنی انتقامی خاموش روش کو درست سمجھتا رہا...... اخلاق علی الاعلان حق گوئی کی ہمت تو نہیں کر سکا لیکن ایک کٹھن مسافت طے کرتے ہوئے بیٹی کو محفوظ ہاتھوں میں سونپنے کی کامیابی پر وہ بہت خوش ہے۔ اب اس کے سامنے ایک آخری قرض ہے...... اس کے والدین حج کی مکمل ادائیگی سے قبل ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ وہ انہی کے لیے اس مقدس سرزمین میں چلا آیا ہے...... مجھے اخلاق ایک پُرنور مقام پر زرقا کے ساتھ بیٹھا نظر آ رہا ہے...... وہ اپنی ساری انا اور جذبات ایک جانب رکھ کر اسے بتانا چاہتا ہے کہ زرقا! اخلاق تم سے بہت محبت کرتا ہے...... اسی لمحے سے جب اس نے تمہیں اپنی زوجیت میں قبول کیا تھا۔ وہ اپنی تمام کوتاہیوں پر بہت شرمندہ ہے...... مداوا کرنا چاہتا ہے...... تمہیں ایک باعزت زندگی دینا چاہتا ہے...... لیکن زندگی کی اس کتاب کے تمام ابواب پلٹتے اخلاق کو کوئی رستہ نظر نہیں آ رہا ہے...... ڈرتا ہے کہ زرقا نے اسے معاف نہ کیا تو......'' اس کی آواز معدوم ہوتے ہوتے سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔

زرقا نے تڑپ کر اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''اتنی دیر کیوں کر دی اخلاق! اتنی دیر کیوں کر دی؟ یہ امرت مجھے پہلے عطا کر دیتے تو شاید کتابِ حیات کے کچھ باب ہم تبدیل کر پاتے۔''

سکوت کا ایک طویل لمحہ ان کے مابین ساکت ٹھہر گیا۔ ان کی آنکھیں مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔ اس خاموشی کو اخلاق کی بوجھل آواز نے چھناکے سے توڑا۔

''زرقا! کیا ہمارا آخری باب بھی یونہی تشنہ رہے گا؟''

''نہیں! ہم اسے تشنہ نہیں رہنے دیں گے...... ہم اس سرزمین پر ایک عہد کر کے لوٹیں گے کہ جو روایات دانستگی یا نادانستگی میں ہمارے بزرگوں نے قائم کیں، ہم ان سے اگلی نسل کو آگاہ اور محفوظ رکھیں گے۔'' زرقا اب بہت پُراعتماد دکھائی دے رہی تھی۔

''ہاں زرقا! ہم بہت سی زندگیوں کا آخری باب اس قدر کٹھن اور تشنہ رہنے سے بچا لیں گے۔'' اخلاق نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

فضا میں فجر کی اذان کے مقدس کلمات کی گونج انہیں تلافی کا ایک اور موقع فراہم کرنے کے لیے بارگاہِ الٰہی میں طلب کر رہی تھی۔ وہ اس تلافی کے لیے مکمل تیار تھے۔

بیس پچیس برس کے عرصے میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ خان مشتاق، کوٹھی کے ٹیرس پر شیڈ کے نیچے بیٹھا بظاہر ہلکی بارش سے بھیگے خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن درحقیقت ماضی میں جھانکتے ہوئے اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے بھی گزر رہا تھا۔ بیوی کے آجانے پر خیالات کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ پیچھے آن کھڑی ہوئی اور دونوں ہتھیلیاں اس کے گالوں پر جما کر بولی۔ ''میں نے نفیس ہوٹل والوں کو فون کر دیا ہے۔ آج کے موسم نے بڑی پرانی یاد دلا دی۔ یاد ہے نا! اسی طرح رم جھم لگی ہوئی تھی۔''

اس نے خاوند کی مونچھوں کے سرے انگلیوں کی پوروں میں لے کر مروڑنے شروع کر دیے۔ خان نے بیوی کی کلائیاں پکڑ کر کھینچ لیں۔ وہ جھکی اور شوہر کے گال سے گال ملا دیا۔ بارش میں تیزی آگئی اور وہ بازو چھڑا کر پلک جھپکتے میں ساتھ ہی زانو ملا کر بیٹھ گئی۔ خان نے کہا۔ ''تم بھی وہی بارش کا دن یاد کر رہی ہو۔ کتنے سال گزر گئے۔ وہ دن نہیں بھولتا۔ میں بھی اس وقت وہی سب کچھ یاد کر رہا تھا...... کتنے سال ہوئے ہیں سجو!......

وسیلہ

محمد الیاس

انسان خطا کا پُتلا ہے لیکن یہ بھی قدرت کی مہربانی ہے کہ انسان کو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا نہ صرف شعور دیا بلکہ وسیلہ بھی بنا دیا اور جو لوگ اس کارِ خیر کو نیک نیتی سے کرتے ہیں اس کا اجر انہیں ان کے گمان سے بڑھ کر ملتا ہے۔ کچھ یہی حال اس جوڑے کا بھی تھا جن کا ساتھ نباہنا تو کیا ساتھ رہنا بھی مشکل ترین تھا مگر پھر بھی زندگی کی آخری سانس تک ساتھ نہ چھوڑ پائے۔

نفرت سے منہ پھیرنے والے جوڑے کی محبت بھری کہانی

چوبیس یا شاید پورے پچیس؟...... یہی ستمبر کے آخری دن تھے۔ جاتے جاتے بارشوں کا موسم پلٹ آیا تھا......"

ساجدہ نے ٹوک دیا۔ "موسم نہیں، ہمارا مقدر پلٹ آیا تھا۔ ورنہ سوچو خدانخواستہ اگر اس روز...... اللہ کی قسم میں نے پکاپکا فیصلہ کرلیا تھا۔ چاروں بیٹیوں سمیت شام کے بعد اندھیرا ہوتے ہی ڈیم میں چھلانگ لگا دینی تھی۔ پچھلی رات سے فاقہ تھا۔ لڑکیاں رو رہی تھیں۔ سلیمہ کو تمہارے پاس بھیجا اور وہ روتی ہوئی واپس آ گئی۔ بتایا کہ ابا نہیں مانتے۔ وہ ناراض ہیں۔ کہتے ہیں گھر نہیں آؤں گا۔ میں نے لڑکیوں کو اندر بٹھایا اور بہانہ بنا کر نکل آئی۔ ڈیم کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھا۔ جھیل کنارے تک بھری ہوئی تھی۔ پہلے سوچا کہ اکیلی مروں۔ تینوں چھوٹی تمہارا خون ہیں۔ ضرور خیال کرو گے، لیکن بڑی سے تو تمہارا کوئی رشتہ نہیں بنتا۔ مگر میں نے اس کو بھی اسی طرح جنا ہے، جیسے چھوٹیوں کو۔ میری چاروں سگی ہیں۔ کیا ہوا اگر ان سب کا باپ ایک نہیں۔ پہلے والے کمینے شوہر سے ماتھا پیٹ پیٹ کر جان چھڑائی تو دوسرا سگے بھائی نے ڈھونڈ نکالا......"

مشتاق خان نے بیوی کو بازوؤں میں بھرا اور بولا۔ "دُر دُر فضول باتوں سے باز نہ آئی۔ بوڑھی ہو گئی۔ جن اور پری آخری عمر میں ایک ہی جیسے ہو جاتے ہیں۔ ماسٹر صاحب اپنے دوستوں کی محفل میں میاں محمد بخش کے شعر اکثر سنایا کرتے تھے...... سدا نہ باغیں بلبل بولے سدا نہ باغ بہاراں، سدا نہ ماپے حسن جوانی سدا نہ صحبت یاراں۔ ہم دونوں کے ماں باپ پہلے ہی دنیا سے چلے گئے۔ مجھ پر کبھی حسن جوانی آئی نہ تھی۔ شکر ہے مولا کا، تمہارا رولا بھی ختم ہوا۔ اونچی ذات کی گجری اور سوہنی سنکھی مگر بدتمیز اکھڑ اور مغرور...... میں نے کسی سے دھوکا نہیں کیا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے، میری ذات، میرا پیشہ اور یہ کہ رنڈوا تھا۔ ایک بیٹے کا باپ۔ تمہیں میرے بن ماں کے بیٹے پر کبھی رحم نہ آیا۔ اس کو گھر میں برداشت ہی نہ کیا۔ تمہاری چھٹی ہو گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے چیک کر کے صاف کہہ دیا کہ اب تم بچہ پیدا نہیں کر سکتیں۔ کتنا سمجھایا کہ حبیب، بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ ہمارے بعد ان کا خیال رکھنے والا اس کے سوا اور کوئی نہ ہوگا۔ میں اسی لیے دوسری شادی کرنے پر راضی نہیں ہوتا تھا کہ آنے والی کہیں حبیب سے برا سلوک نہ کرے۔"

ساجدہ نے لاگ لپٹ کرتے ہوئے ٹوک دیا۔ "چلو چھوڑو نا...! ماسٹر اعجاز صاحب کی باتیں کرو۔ ہمارے لیے فرشتہ ثابت ہوئے...... اللہ کرے، سارے لوگ ہی ان جیسے ہو جائیں۔ میرے اور تمہارے رشتے داروں نے صرف تماشا دیکھا۔ سسرالی برادری ہماری لڑائی دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ میرا ننھیال ددھیال ایک ہو گیا تھا اور ہمارا نکاح ہونے سے پہلے ہی بائیکاٹ کر دیا کہ چھوٹی ذات والے کو لڑکی دے کر برادری کی ناک کٹوا دی۔ میرے بھائی نے کسی کی پروا نہ کی۔ مجھے سمجھایا...... مشتاق میرے ساتھ ساتویں جماعت تک پڑھا ہوا ہے۔ میں اس کی خوبیاں جانتا ہوں۔ ایسا بندہ کبھی بھوکا نہیں مرتا۔ سانپ کے منہ سے روزی کما کر لاسکتا ہے۔ اس کے باپ اور دادا نے نائیوں والا پیشہ ضرور اختیار کیا تھا۔ یہ پیشہ ہے، ذات نہیں اور کسی پیشے میں کوئی برائی نہیں ہوتی۔ انگریز قوم اسی لیے کامیاب ہے کہ کسی پیشے کو گھٹیا نہیں سمجھتی۔ مجھے خود انگلینڈ میں نائی کی دکان پر نوکری ملی اور اب اچھا بھلا کاریگر ہوں۔ رشتے داروں کی باتیں مت سنو۔ ہمارے ماں باپ مر چکے ہیں۔ تم اس کے بیٹے کا خیال رکھنا، وہ تمہاری بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھے گا......"

اچانک جھال سا آیا اور ہوا کے ہلکے جھونکے سے دونوں پھوار میں بھیگنے لگے۔ خنکی محسوس ہونے پر دونوں باہم مزید چپک گئے۔ مشتاق بولا۔ "پھر تم نے بھائی کی نصیحت پر عمل کیوں نہ کیا۔ میرے اپنے سارے رشتے دار اس لیے ناراض تھے کہ خاندان میں کنوارے رشتے ٹھکرا دیے تھے۔ تمہارے بھائی سے میری بچپن کی دوستی تھی۔ میں نے اسکول چھوڑ کر کام سیکھنا شروع کر دیا۔ عثمان...... تمہارا بھائی میٹرک کر کے انگلینڈ چلا گیا۔ جب تمہاری طلاق ہو گئی تو واپس آیا۔ مجھ سے بات کی، میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ "ساجدہ، زبان کی سخت ہے، دل کی بری نہیں۔ تم دوست ہو۔ میں جوان بہن کو اکیلے چھوڑ کر انگلینڈ میں چین سے نہیں رہ سکوں گا......"

ساجدہ نے کہنی سے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ "چلو چھوڑو اس کہانی کو...... سو بار، ہزار بار سنا چکے ہو۔ ماسٹر صاحب کی بات کرو۔ وہ کہاں ہوتے ہیں۔ ان کا پتا لگاؤ۔ اللہ کرے زندہ ہوں اور تندرست خوش باش ہوں۔ ان کو ہم اپنے ہاں مہمان بلائیں۔ ہمیں دیکھ کر انہیں خوشی ہوگی کہ مٹی سے اکھڑا ہوا جو پودا انہوں نے اپنے ہاتھوں سے دوبارہ لگایا اور پانی دیا، وہ پھل پھول کے درخت بن چکا ہے......"

مشتاق نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "شہر بھر کے وہ تمام لوگ جو ہر روز ان کے پاس محفل لگایا کرتے تھے...... شاعر، پروفیسر، استاد اور وکیل، سب سے پوچھ لیا...... نوکری چھوڑ کر لاہور چلے گئے تھے، اپنے بال بچوں میں۔ کہتے ہیں کسی سے نہیں ملتے۔ گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ جائداد کی آمدنی پر گزارہ ہے۔"

ذرا توقف کر کے مشتاق مسکرایا اور دوبارہ بولا۔ "انہیں

گھر میں مہمان رکھنے کا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ اس بڑھاپے میں خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ مجھے تمہاری ایسی بری لت لگی ہے کہ اب وچھوڑا (جدائی) برداشت نہ ہوگا۔ جس طرح تمہیں وہ بار بار یاد آتے ہیں، میرا دل کہتا ہے، وہ بھی تمہیں دل ہی دل میں پسند کرتے تھے...... جس دن انہوں نے اکھڑا ہوا پودا اپنے ہاتھوں سے لگایا اور پانی دیا، تمہارے حسن کی تعریف کر کے میرے دل میں سوئی ہوئی تمہاری محبت جگائی۔ ان کی میٹھی میٹھی باتوں میں جادو تھا۔ مجھ پر فوراً اثر ہو گیا۔ وہ جہاں بھی ہیں، خوش رہیں۔ انہیں مہمان بلا کے میں کہیں اکیلا نہ رہ جاؤں اور ساری زندگی بیٹھا پچھتاؤں......"

"توبہ توبہ کرو! آخری عمر میں بھی بیوی پر اعتبار نہیں جما۔ اسی لیے میں کہتی ہوں، خاوند پورے بے ایمان ہوتے ہیں...... ماسٹر صاحب کو دیکھ کر مجھے خیال آتا تھا کہ میرا باپ بھی شاید ایسا ہوگا۔ میں نے ابا کو دیکھا نہیں...... یہی سنا ہے، بڑے دانا، پُروجاہت اور شکل صورت والے تھے......"

بولتے بولتے ساجدہ پل بھر کو خاموش ہوئی اور شوہر کو دھپ مار کر دوبارہ بولی۔ "تمہارے جیسے بے کار شے کو ماسٹر صاحب نے دوست کیسے بنا لیا؟ یہی سنا ہے کہ شہر کے بڑے بڑے اونچے لوگ ان کے پاس بیٹھتے تھے۔ کہاں وکیل اور افسر لوگ، کہاں ماکھا نائی، جو سوائے باپ والا پیشہ کرنے کے باقی سارے کام کرتا تھا۔ پائپ فٹ کرنا، پانی کی موٹریں لگانا، بکرے ذبح کرنا، دیگیں پکانا اور تنور میں روٹیاں لگانا...... اور پتا نہیں کیا کیا۔ کوئی پیسے دے اور جو مرضی ہے کروا لے۔ اتنا لالچی بندہ، اللہ کی شان دیکھو! اب مشتاق خان بن بیٹھا ہے۔ خان...... خان صاحب! کوٹھی کا مالک۔ میرے بھائی کو دعائیں دو، جس نے حبیب کو انگلینڈ بلایا اور وہ پاؤنڈ بھیجتا ہے۔"

بیوی کی ناک کو چٹکی سے پوروں میں لے کر مشتاق نے دبایا اور بولا۔ "شرم کرو شرم۔ حبیب تمہارا داماد بھی ہے۔ اب دل سے کینہ نکال دو......"

اس نے ایک جھٹکے سے ناک چھڑائی اور چمک کر بول اٹھی۔ "بڑے بے فیض ہو۔ تمہیں کب یقین آئے گا کہ حبیب کے خلاف میرے دل میں کبھی بھی حسد نہ تھا۔ تم اس سے زیادہ محبت دکھاتے تھے، میں چڑ جاتی تھی۔ اللہ گواہ ہے وہ مجھے شروع سے اچھا لگا۔ دل میں پہلا خیال بھی آیا کہ سانولا ہے مگر بڑا نقشی۔ کیا اچھا ہو، بڑا ہو کر میرا داماد بنے۔ جوان ہو کر ایسی چھب نکالی، اللہ بری نظر سے بچائے۔ لاکھوں میں ایک۔ تمہاری شکل نہ عقل۔ صرف ہنر ہی ہنر یا لالچ۔ وہ تمہاری طرح لالچی بھی نہیں۔ تینوں بہنوں کی شان دار طریقے سے شادیاں کیں۔ سگے بھائیوں سے زیادہ اچھا ثابت ہوا۔"

مشتاق نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی بری عادت بھی بندے کو فائدہ دے جاتی ہے۔ مجھے صحیح اندازہ نہیں کہ تمہاری دبی ہوئی محبت نے جوش مارا یا ماسٹر صاحب کا دیا ہوا لالچ کام کر گیا اور میں فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ اس لیے تم مجھے لالچی ہونے کا طعنہ نہ دیا کرو۔ ورنہ اس روز اکھاڑا گیا پودا پڑا سوکھ جاتا تھا...... ماسٹر صاحب سمجھایا کرتے تھے کہ بیٹیوں والے مرد کو بیوی کا غصہ برداشت کر لینا چاہیے لیکن علیحدگی کا کبھی نہ سوچے۔ ورنہ بیٹیوں کی زندگی برباد ہو جاتی ہے...... ویسے وہ مجھ سے عمر میں چار پانچ سال چھوٹے ہی ہوں گے۔ تمہارے برابر تقریباً۔ اس لیے مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرو کہ تمہیں ان کی شکل میں باپ نظر آتا تھا۔ وہ اور بات ہے کہ انہوں نے چھوٹے ہو کر بھی ہم سے وہی سلوک کیا جو نیک ماں باپ اپنی اولاد سے کرتے ہیں۔"

شریر سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے مشتاق نے کہا۔ "ویسے سچی بات ہے کہ دنیا ماسٹر صاحب کی باتیں سن کر نشے میں آ جاتی تھی لیکن مجھے نصیحت کرتے ہوئے جب تمہارا ذکر آتا تو وہ مجھے نشے میں لگتے اور کہتے۔ مرد کی یہی شان ہے کہ بیوی کے ناز نخرے اٹھائے۔ اس سے مردانگی کم نہیں ہوتی...... مسکرا کر کہتے، خوبصورت عورت میں ناز نخرہ ہوتا ہی ہے۔ تمہاری بیوی میں اس کے ساتھ ذرا اکڑ بھی آ گئی ہے، کوئی بات نہیں۔ عورت باکردار ہو اور خوبصورت بھی تو اس کی اکڑ برداشت کر لینی چاہیے اور یہ نسلی تکبر جہالت کی وجہ سے ہے۔ ورنہ دیکھو تم! اس کا بھائی کتنا روشن خیال ہو گیا، حالانکہ تعلیم اس کی میٹرک ہی ہے۔ جبکہ بعض لوگ پڑھ لکھ کر بھی جاہل رہتے ہیں......"

ساجدہ نے پھر وہی سوال دہرایا۔ "تم مجھے اس بات کا جواب دو کہ وہ تم جیسے کوڑ کو پسند کیوں کرتے تھے؟ خان صاحب تو تم پچھلے دس سال میں بنے ہو، اس سے پہلے بلکہ بہت پہلے، بیس پچیس سال، بالکل کوڑا کرکٹ ہوا کرتے تھے۔ شکل اتنی بری نہیں تھی، صرف رنگ ہی پکا تھا لیکن حلیہ اور لباس دیکھ کر دل کوئلہ ہو جایا کرتا تھا۔ تمہیں آگ لگا کر خود بھی مر جانے کو دل چاہتا۔ کہاں کونج گجری اور کہاں کوا نائی۔"

مشتاق نے بیوی کی چٹکی لی اور کہنے لگا۔ "جب وہ نئے نئے ٹرانسفر ہو کر آئے تو اسکول کے لڑکے مجھے ان کے گھر کی ٹونٹیاں اور ڈونکی پمپ ٹھیک کروانے لے گئے تھے۔ کرائے کا مکان لیا تھا۔ بیوی اور ایک ہی بچی تھی، وہ دونوں اگلے ہفتے آ گئیں۔ انہیں جس کام کی ضرورت پڑی، میں نے کر دیا۔ مہینے

بعد بقرہ عید تھی۔ سب سے پہلے ان کا بکرا ذبح کیا۔ ایسی دوستی ہوئی کہ جو بھی کام ہوتا، مجھے ہی بلواتے۔ جب ان کے تینوں بچے اسکول جانے لگے تو بوڑھے والدین کو لمبی بیماری لگ گئی۔ بیگم کی ساس ان کی خالہ لگتی تھی۔ لاہوری تھے۔ بیگم وہاں کسی لڑکیوں کے اسکول میں پڑھاتی رہی تھیں، اس لیے آبائی گھر چلے گئے۔ ماسٹر صاحب ہر مہینے کی پہلی ہفتہ وار چھٹی پر گھر ضرور جاتے۔ چھڑے ہونے پر دوستوں کی محفل ہر روز لگتی۔ میں فارغ ہو کر ان کے پاس چلا جاتا۔ سارے کام کرتا۔ چائے بنا کر مہمانوں کو پلاتا۔ پکوڑے تلتا، کھانا بھی پکا دیا کرتا۔ عالم فاضل لوگوں کی محفل میں بیٹھ کر ان کی باتیں غور سے سنتا، مزہ آ جاتا۔ یہی سوچتا کہ بیوی کی بکواس سننے سے بہتر ہے، یہاں بیٹھ کر عقل اور دانائی کی اونچی اونچی باتیں سنو۔ لطیفے بھی ہوتے، ہنسی مذاق قہقہے، جن کی مجھے اکثر سمجھ آ جاتی......"

ساجدہ نے اچانک اس کی سنواری ہوئی مونچھوں کو مسل ڈالا، جس سے تیکھی نوکوں کے بال بکھر گئے۔ بھڑک کر بول اٹھی۔ "بے وفا نہ ہو تو...... بکواس یہی کرتی تھی کہ حلیہ ٹھیک کرو۔ ایک تو شکل بے سری، اوپر سے لباس بے ڈھنگا۔ اچھے بھلے پیسے کما کر بینک میں جمع اور ماسٹر صاحب کی اترن پہن لیتے تھے۔ کپڑے بیشک قیمتی ہوتے تھے لیکن کھلے اور لمبے۔ خدا کی قسم کارٹون لگتے تھے۔ میرا کلیجا جل جاتا۔ پہلا خاوند پیدائشی پوستی اور کام چور نکلا۔ گھر میں فاقہ کر لیتا لیکن کام پر نہ نکلتا۔ الٹا مجھ سے لڑائی شروع کر دیتا کہ عثمان بھائی انگلینڈ سے پورا خرچہ کیوں نہیں بھیجتے...... میری قسمت دیکھو، دوسرا مقدر میں ایسا لکھا تھا کہ پہلے والے کی ساری کسریں نکال دیں۔ ہر وقت کام ہی کام۔ بندہ آرام بھی کر لیتا ہے۔ رات کے ایک بجے بھی دستک سن کے بیوی کے پاس سے اسی پل اٹھ جانے والا مرد۔ اتنی بے قدری۔ صرف پیسے کی خاطر...... ایسا خاوند دوبارہ قریب آئے، عورت کو چاہیے پیٹھ موڑے کمرے سے باہر نکال دے۔ یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ بے قدری برداشت کرتی رہی......"

مونچھوں کو بل دیتے ہوئے مشتاق نے ہاتھ روک لیے اور پچکار کر بولا۔ "پیسا، تمہارے اور اولاد کے لیے ہی کما کے لاتا رہا تھا نا! جمع کرنے سے ہی سارے کام ٹھیک ہوئے۔ بیٹے کی شادی کی، بیٹیاں پڑھائیں۔ پاؤنڈ بہت بعد میں آنے شروع ہوئے۔ یاد کرو، کتنا خرچہ ہوا تھا، حبیب کو انگلینڈ بھیجنے پر...... اور پھر اس کی بیوی بچے کو بھی میں نے اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے بھیجا۔ کسی سے ایک روپیا ادھار نہ لیا۔ پیسا بچانے سے ہی کام نکلتے ہیں۔ خود میں نے اپنے اوپر کبھی ایک پیسا نہ ضائع کیا۔ حرام ہے جو جیب سے ٹافی کے لیے بھی سکہ نکالا ہو......"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مشتاق خان کو دل کا دورہ نہ پڑ جائے، جیب سے پیسا نکلنے پر...... ایسا کنجوس مکھی چوس کوئی دنیا میں اور پیدا ہی نہیں ہوا۔ شہر میں ایک ماسٹر نہیں، کئی ماسٹر اسی لیے یار بنا رکھے تھے۔ کہیں کھانے کو مل گیا، کہیں چائے پی لی۔ جہاں سے جو بچی کچی شے ملی، ہڑپ کر لی۔ مفت میں ملے پرانے سامان سے گھر بھر رکھا تھا۔ کباڑ کا مال، کبھی کولر اٹھائے آ رہے ہو، کبھی پنکھا، کبھی واشنگ مشین...... یا اللہ! میں سوچ سوچ کر حیران ہوتی۔ ایک جیسی تین تین چیزیں پہلے ہی پڑی ہیں۔ شہر میں اور کوئی منگتا نہیں رہا۔ صرف میرا شوہر ہی رہ گیا۔ ریڑھے رکشے کا کرایہ بھی خرچ نہیں کرتا...... جس دن تم نے اتنی بھاری واشنگ مشین سر پر اٹھا رکھی تھی، مجھے اتنا غصہ آیا کہ پہلے ہی سنگل اور ڈبل، دو مشینیں گھر میں پڑی ہیں۔ کسی روز اس بندے کا منکا ٹوٹ جائے گا۔ تب اس کا لالچ ختم ہو گا۔ پہلے میں طلاقن ہوئی، اب بیوہ ہو جاؤں گی۔ کیوں نہ ڈنڈا مار کر اس کا گوڈا گٹا (گھٹنا اور ٹخنہ) توڑ دوں۔ چار دن آرام سے گھر بیٹھے۔ یہی کباڑ بیچ کر روٹی کھا لیں گے......" وہ بولتے بولتے ہنس پڑی۔

مشتاق نے قہقہہ لگایا اور بیوی کی پتلی کمر میں بازو ڈال کر ایک ہی جھٹکے سے قریب کر لیا۔ وہ مچلی اور بے طرح ہنسنے لگی۔ بولی۔ "ارے ارے! میری پسلیاں چڑھ گئی ہیں۔ بڑھاپے میں لاڈ سوجھنے لگے ہیں، اب اتنی جان نہیں رہی......"

گرفت سے آزاد ہو کر ساجدہ ساتھ بیٹھ گئی۔ دونوں کی سانسیں پھول گئیں۔ مشتاق قدرے ہانپتے ہوئے بول پڑا۔ "کوئی ایک چیز بیکار نہیں گئی۔ مرمت، رنگ روغن اور صفائی ستھرائی کر کے بیچ دیتے تھے۔ محلے اور نئی آبادی کی عورتیں تمہاری کتنی احسان مند تھیں، جنہیں تم نے قسطوں پر چیزیں دیں...... ویسے ایک بات صحیح ہے۔ ماسٹر صاحب نے میاں محمد بخش کا کلام یاد کر رکھا تھا۔ بلبل والے کے علاوہ ایک اور شعر بھی اکثر سنایا کرتے۔ نیچاں دی اشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا، ککر تے انگور چڑھایا تے ہر گچھا زخمایا...... ایک بوڑھے پروفیسر صاحب کہا کرتے تھے کہ عورت ذات میں حوصلے اور صبر کی کمی ہوتی ہے۔ میں ان لوگوں کی باتیں خاموشی سے سنا کرتا۔ کچھ کہنے کی اوقات ہی نہ تھی لیکن بیٹھا سوچتا رہتا۔ تمہاری ہر وقت کی بک بک نے مجھے سولی پر لٹکا رکھا تھا۔ میرے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عورت ذات ہے ہی بے فیض۔ پہلے خاوند کی گردن دبا کر تم نے طلاق لی کہ وہ نکما تھا۔ مجھ سے ہر وقت خفگی

کیا کرتیں کہ میں دن رات کام کرتا ہوں۔ بھئی! سیدھی بات ہے، رات کو کسی کا مسئلہ حل کرنے سے دگنی تگنی مزدوری ملتی ہے۔ جس رات ایک بجے اٹھ بھاگنے کا طعنہ آج بھی دیتی ہو، وہ ایمرجنسی ہوگئی تھی۔ یاد کرو۔ چودھری رزاق نے دروازے پر آواز دی تھی کہ ٹینکی کی لائن ٹوٹ گئی ہے اور پانی سیڑھیوں سے کمروں میں آرہا ہے۔ اس لیے چھلانگ مار کے اٹھ گیا تھا کہ اپنا کیا......؟ گھر کا معاملہ ہے پھر بھی۔ مشکل گھڑی میں جب بھی کسی کا کام کیا، دہرا فائدہ اٹھایا۔ اگلے نے دہری مزدوری دی اور احسان مند بھی رہا اور جپھا مار کے شکریہ ادا کیا۔ جب بھی کسی دفتر میں کام پڑا اس نے فوراً فون ملایا اور سفارش کی......افسوس، تم نہیں سمجھوگی۔ بات وہی ہے، نیچاں دی اشنائی کولوں فیض......"

ساجدہ نے شوہر کے سینے پر دو ہتڑ مار کر دھکیل دیا اور بولی۔ "دور ہو جاؤ......اتنی اونچی ذات کو نیچ کہتے ہوئے ذرا شرم نہیں آئی۔ مجھ میں صبر تھا تو تمہارے ساتھ گزارہ کیا۔ ورنہ سب کچھ برباد ہو گیا تھا۔ میں اندھیرا پڑنے کا انتظار کر رہی تھی کہ دن کی روشنی میں ڈیم کی طرف جاتے ہمیں کوئی دیکھ نہ لے۔ فیصلہ کرلیا تھا کہ چاروں بیٹیوں کو بھی ساتھ لے کے مروں گی تاکہ میرے بعد رل نہ جائیں۔ حبیب رات کو بڑی دیر سے گھر آیا کرتا تھا۔ اس دن تم ضد پر اڑے رہتے اور پچھلے پہر گھر نہ آجاتے تو تمہارے ہاتھ کچھ نہ آتا۔ سوائے ہماری لاشوں کے......وہ بھی اگر قسمت اچھی ہوتی تو صحیح سلامت مل جاتیں......"

مشتاق نے بیوی کا ہاتھ تھام لیا اور سرد آہ بھر کے بولا۔ "واہ! وہ گھڑی پل کی بات ہی تھی۔ ورنہ کیا سے کیا ہو جاتا۔ توبہ استغفار۔ پتھر پر لکیر کی طرح دل پہ لکھ لیا کہ طلاق دے دوں گا۔ ہر روز بیوی سے بے عزت نہیں ہوا جاتا۔ کمینہ، بدشکل، لالچی کہلوانا برداشت سے باہر ہو گیا۔ یہی سوچا کہ پیسے ہیں، مقدمہ لڑ کر بیٹیاں لے لوں گا۔ اصل میں ماسٹر صاحب نے میری اور سلیمہ کی باتیں سن لی تھیں۔ دسویں جماعت کا ایک لڑکا کوئی سبق پوچھنے آیا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب نے اس سے باتیں کرتے ہوئے سوسو کے کچھ نوٹ دیے اور کہا......ذرا جلدی سے اچھی طرح پیک کروا کے لے آؤ۔"

ذرا سا توقف کرتے ہوئے مشتاق نے سرد آہ بھری اور دوبارہ بولنے لگا۔ "بارش برس رہی تھی۔ ماسٹر صاحب نے برآمدے میں مجھے اپنے سامنے کرسی پر بٹھا لیا اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے۔ میاں بیوی کے تعلق کا پورا نقشہ کھینچ دیا۔ بتایا کہ اس سے اچھا رشتہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ والدین نہیں رہتے۔ بہن بھائی، حتیٰ کہ اولاد بھی اپنے گھر کی ہو جاتی ہے۔ آخرکار میاں بیوی ہی ایک دوسرے کے لیے رہ جاتے ہیں۔ کہنے لگے......اس عاشقانہ موسم میں بیوی سے دور رہنے والا کوئی مرد بدقسمت ہی ہوگا۔ یہ لڑکا واپس آجائے تو میں بھی لاہور نکل جاؤں گا۔ وہاں بھی یہی موسم بنا ہوا ہے۔ بیوی سے پیار بھری باتیں کروں گا۔ دنیا میں محبت کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ بچے بھی خوش ہو جائیں گے۔ خوبصورت اور خوب سیرت بیوی سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں ہوتی۔ جو عورت اپنے شوہر کی اولاد پیدا کرے اور گھر کا نظام چلائے، اس سے کیا گلہ شکوہ؟ اس بے چاری کے پاس اور کیا بچارہ جاتا ہے؟ جب اپنا آپ ہی سونپ دیتی ہے تو اس کے ناز نخرے اٹھا لینے میں مرد کی مردانگی کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ اصلی مرد میدان کی نشانی یہی ہے کہ مردوں کے مقابلے میں ڈٹ جائے لیکن عورت کی سخت بات سن کر نہ صرف مسکرا دے بلکہ پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔"

ساجدہ مبہوت ہوئی نم آنکھوں سے سن رہی تھی۔ مشتاق پر بھی وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ کہنے لگا۔ "اس وقت مستانی ہوا کے ساتھ پھوار پڑنے سے ہمیں برآمدے میں ہلکی ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔ ماسٹر صاحب نے میری آنکھوں کے سامنے عشق محبت بھری ایسی فلم چلائی کہ میرا دل اچھل اچھل کے باہر آنے لگا۔ تمہیں سینے سے لگا کے پیار کرنے کو تڑپ اٹھا۔ اتنے میں وہ لڑکا واپس آگیا۔ اس کے ساتھ نفیس ہوٹل کا ملازم تھا۔ دونوں نے اخباروں میں لپٹے دو بنڈل اٹھا رکھے تھے، جن پر پلاسٹک بھی دیا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب مجھ سے کہنے لگے۔ یہ کڑاہی گوشت اور نان، گرم گرم گھر لے کے جلدی پہنچو۔ جاتے ہی سلیمہ بیٹی کا منہ چومو۔ تمہاری بیٹیاں بڑی معصوم اور پیاری ہیں۔ چاروں کو باری باری چومنا۔ وہ ہنس پڑے اور کہا۔ سب مل کے ایک ساتھ کھانا۔ کوئی گلہ شکوہ زبان پر نہ لانا۔ بلکہ معافی مانگ لینا۔ یہی انسان کی بڑائی ہے۔ جب بچیاں کھا پی کے سو جائیں تو باقی اللہ کارساز ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم دونوں برسات کی جاتی بہار کے مزے نہیں لوٹ پاؤ گے......"

ساجدہ کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں۔ اتنے میں گیٹ کی گھنٹی بج اٹھی۔ مشتاق نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چل اٹھ، کڑاہی گوشت آگیا ہے۔ کھائیں اور آج اسی برسات کی یاد تازہ کریں۔" نم آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ ساجدہ پر رقت طاری ہوگئی اور وفورِ جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"اللہ! ماسٹر کی جھولی دنیا جہان کی خوشیوں سے بھر دے۔"

آخرکار

مرزا امجد بیگ

تمام رشتے اللہ کی طرف سے انعام ہوتے ہیں مگر صد افسوس انسان نے انہیں امتحان بنادیا ہے۔اپنی ذات... اپنے مفادات کے گرداب میں الجھ کر اس نے ہر ڈوری کو اپنے لیے پھندا بنا کر خود کو کمزور کرلیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر رشتہ بے اعتبار لگنے لگا ہے۔جیون ساتھی... اتنا خوب صورت تعلق اللہ نے دیا مگر دل پر چوٹ لگ جائے تو جیون اور ساتھی دونوں مخالف سمت میں چل کر اپنے اپنے وار سے نہ صرف تعلق بلکہ زندگی ہی ختم کرنے کے منصوبے بنانے لگ جاتے ہیں۔کچھ ایسا ہی ماجرا ان کے ساتھ بھی پیش آیا۔ خطا کسی کی، سزا کسی کو... مگر بالآخر لاکھ پردوں کے باوجود مجرم کا چہرہ سامنے آہی جاتا ہے۔ شوہر کا اعتبار مجروح کرنے والی بیوی کے لالچ نے اچھے بھلے گھر کو بکھیر دیا۔

بیگ صاحب کی ڈائری سے ایک معتبر تعلق

کا عبرتناک انجام

وہ عورت اچانک ہی میری گاڑی کے سامنے آگئی تھی۔ میں اپنے دوست سے ملنے گلبرگ کے علاقے میں آیا ہوا تھا۔ وہ چھٹی کا دن تھا اس لیے میں نے گھر سے نکلنے کی ہمت بھی کرلی تھی ورنہ ایک وکیل اور ڈاکٹر کی زندگی میں فرصت کہاں۔ ان دونوں پیشوں کو تیکنیکی زبان میں اینٹی سوشل پروفیشن کہا جاتا ہے۔

میں نے فوراً بریک لگا کر اس عورت کو بچانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں مجھے کامیابی بھی حاصل ہوئی... تاہم اس کا جسم ہلکے سے میری گاڑی کے بونٹ سے ٹکرا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ زمین پر گر گئی تھی۔ میں گاڑی سے باہر نکلا اور اس عورت کی خبر گیری کے لیے آگے بڑھ گیا۔

اس دوران میں وہ اٹھ کر کھڑی ہوچکی تھی۔ وہ درمیانے قد کی ایک خوش شکل عورت تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس کے قریب رہی ہوگی۔ وضع قطع اور پہناوے سے وہ مڈل کلاس نظر آتی تھی۔ میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''محترمہ! آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟''

''بس، اللہ نے بچالیا ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''شاید آپ کا دھیان کہیں اور تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے آپ بغیر دیکھے ہی مین روڈ پر چڑھ گئی تھیں۔ اگر میں نے بروقت بریک نہیں لگائے ہوتے تو آپ کو کوئی سنگین حادثہ بھی پیش آسکتا تھا۔ کراچی کے بے ہنگم ٹریفک کا کوئی بھروسا نہیں۔ یہاں خود ہی خود کو بچانا پڑتا ہے، کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا۔''

''سوری......'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں جانتی ہوں، غلطی میری ہے۔ آپ نے میری جان بچائی۔ اس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔''

شرمندگی کا اظہار کرکے اس نے تو دکے شریف النفس ہونے کا ثبوت دیا تھا ورنہ اس نوعیت کی صورت حال میں کراچی کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اس عورت کی جگہ اگر کوئی اور خاتون ہوتی تو اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے بجائے وہ الٹا مجھ پر

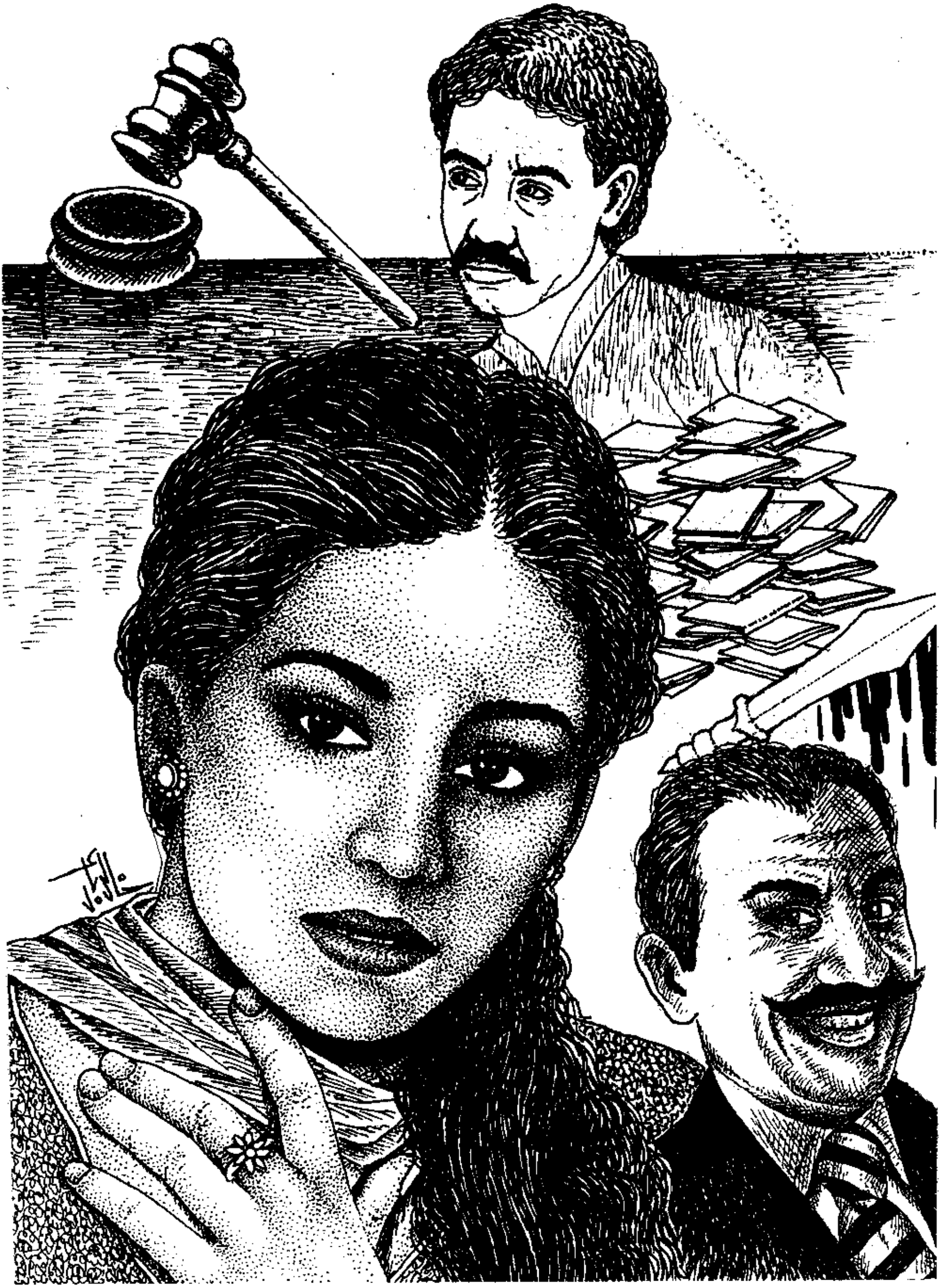

چڑھ دوڑتی۔ ''اندھے ہو...... دیکھ کر نہیں چلا سکتے۔ لوگ گاڑیاں لے لیتے ہیں مگر چلانے کی تمیز نہیں...... وغیرہ وغیرہ۔''

اور اس کا شور سن کر درجنوں مرد وہاں جمع ہو جاتے اور یہ دیکھے سمجھے بغیر کہ قصور کس کا ہے، وہ بڑھ چڑھ کر اس عورت کی حمایت کرنے لگتے۔

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ اس وقت کسی پریشانی میں مبتلا ہیں۔'' میں نے اپنایت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''اگر کوئی حرج نہ سمجھیں تو مجھے اپنی الجھن کے بارے میں بتائیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ممکن ہے، میں آپ کی کوئی مدد کرسکوں......!''

سچی بات تو یہ ہے کہ اس نروس خاتون کو دیکھ کر مجھے اس سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے انتہائی معقولیت کے ساتھ جس طرح صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا وہ مجھے اچھا لگا تھا۔

''کوئی حرج نہیں ہے۔'' وہ میرے استفسار کے جواب میں معتدل انداز میں بولی۔ ''آپ کی گفتگو سے خلوص جھلکتا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں، ہاں یہ سچ ہے کہ میں سخت پریشان ہوں۔''

''جب تک آپ مجھے اپنی پریشانی نہیں بتائیں گی، مدد کی نوعیت کا یقین نہیں کیا جاسکتا۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''دراصل میری پریشانی کی وجہ عابد ہے۔'' وہ مصیبت زدہ لہجے میں بولی۔ ''میں اسی سلسلے میں فرقان صاحب سے ملنے یہاں آئی تھی مگر پتا چلا کہ وہ لاڑکانہ گئے ہوئے ہیں۔ بس، میں مایوس واپس جارہی تھی کہ بے دھیانی میں آپ کی گاڑی کو نہ دیکھ سکی اور ٹکر ہوگئی۔ میں آپ کی شکرگزار ہوں کہ آپ نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بروقت اپنی گاڑی کو روک لیا اور میں اسپتال پہنچنے سے بچ گئی۔'' بات کے اختتام پر اس نے مجھے ممنونیت بھری نظر سے دیکھا۔

''آپ احسان مندی کے اظہار، اپنی بےدھیانی اور کار سے ٹکراؤ کو فی الحال بھول جائیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ بس میرے تین سوالات کے جواب دے دیں۔ باقی باتیں اس کے بعد ہوں گی۔''

وہ الجھن آمیز استفساریہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''سوال نمبر ایک، آپ کا نام کیا ہے؟''

''نبیلہ!'' اس نے جواب دیا۔

''آپ فرقان صاحب سے کس سلسلے میں ملنے آئی تھیں؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''فرقان صاحب ایک چلتا پرزہ قسم کے انسان ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''عابد نے مجھے ان سے ملنے کے لیے کہا تھا۔ عابد کو یقین ہے کہ فرقان صاحب مسئلے کا کوئی حل نکال سکتے ہیں۔''

''سوال نمبر تین بنیادی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ عابد کون ہے؟ اور سوال نمبر تین ضمنی...... آپ اپنے کس مسئلے کو حل کرنے کے لیے پریشان حال پھر رہی ہیں؟''

''عابد میرا شوہر ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اور عابد اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔ عابد نے مجھے فرقان صاحب سے ملنے کے لیے اس لیے کہا تھا کہ وہ عابد کے لیے کسی ماہر وکیل کا بندوبست کردیں گے۔ یہ ہے سارا قصہ......''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''لیکن فرقان صاحب تو لاڑکانہ چلے گئے۔ ویسے پولیس نے آپ کے شوہر کو کس چکر میں پکڑ رکھا ہے؟''

''عابد پر قتل کا الزام ہے۔'' وہ دکھی لہجے میں بولی۔

''پھر تو واقعی آپ کو اپنے شوہر کے لیے کوئی قابل وکیل کرنا پڑے گا۔'' میں نے فکرمندی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''قتل کا الزام کوئی معمولی بات نہیں۔ پولیس والے تو چھوٹے موٹے جرائم میں بھی انسان کی وہ درگت بنا ڈالتے ہیں کہ وہ اپنا احوال کسی کو سنانے کی بھی ہمت نہیں کرسکتا۔''

''عابد پچھلے چار روز سے پولیس کسٹڈی میں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد وہ اسے عدالت میں پیش کریں گے۔''

''میں نے سنا ہے، ریمانڈ کے دوران میں پولیس والے ملزم کو اس طرح دھو ڈالتے ہیں جیسے دھوبی کاسٹک پوٹاش سے کپڑے دھوتا ہے۔''

''آپ مجھے ڈرائیں تو نہیں۔'' وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ کی نظر میں کوئی قابل وکیل ہو تو اس کا پتا بتائیں۔ وکیل تو ہر حال میں مجھے کرنا ہی ہے۔ آپ ایک ہمدرد انسان ہیں۔ یقیناً کسی اچھے وکیل کو جانتے ہوں گے۔''

''میں ایک وکیل کو جانتا تو ہوں۔'' میں نے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اچھا بھی ہے، قابل بھی ہے اور ماہر بھی ہے لیکن......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''لیکن کیا بھائی صاحب؟''

''لیکن یہ کہ......'' میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ وکیل صاحب بہت اصول پرست ہیں۔ وہ کوئی بھی کیس لینے سے پہلے اچھی خاصی چھان بین کرتے ہیں۔ اگر انہیں ذرا سا بھی شبہ ہوجائے کہ کلائنٹ جرائم پیشہ ہے اور اپنی چرب زبانی سے وہ خود کو معصوم و بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کررہا ہے تو پھر وہ کیس کو چھوڑ دیتے ہیں۔''

''مجھے ایسے ہی ایمان دار اور اصول پسند وکیل کی تلاش ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ عابد بے گناہ ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''پلیز...... آپ مجھے ان وکیل صاحب سے رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ بتادیں۔ میں کل ہی جاکر ان سے تفصیلی ملاقات کروں گی۔''

میں نے نبیلہ کو اپنا وزیٹنگ کارڈ تھمایا اور ''خدا حافظ'' کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔

آیندہ روز وہ میرے روبرو آفس میں بیٹھی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوری توجہ سے اس کی روداد سنی پھر ہمارے درمیان میری فیس کے معاملات طے ہوئے۔ اس نے دو اقساط میں فیس ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا یعنی نصف فیس ایڈوانس اور نصف اس وقت جب اس کیس کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہو۔ جب اس نے مجھے آفس میں بیٹھے دیکھا تو اسے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ یہ توقع نہیں کررہی تھی کہ گزشتہ روز وہ جس شخص کی کار سے ٹکرائی تھی، وکیل کی حیثیت سے اگلے روز اسی سے ملاقات ہوگی۔ اس ملاقات پر اس نے جس حیرت کا اظہار کیا تھا میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں یہ بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا کہ نبیلہ کی بیان کردہ کہانی کی روشنی میں عابد مجھے بے قصور نظر آیا تھا۔ اسی بنا پر میں نے اس کا کیس لینے کی ہامی بھری تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ کہانی کے اگلے حصے میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ بعض باتیں میں نے دانستہ آپ سے چھپانے کی کوشش کی ہے جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر آئے گا۔

☆☆☆

ملزم عابد پیشے کے اعتبار سے ایک کارپینٹر تھا اور اس کی رہائش کراچی کے ایک متوسط علاقے سمن آباد میں تھی۔ اس کی دکان بھی اسی علاقے میں تھی۔ عابد کی شادی کو لگ بھگ چار سال ہوگئے تھے۔ اس کی صرف ایک بیٹی تھی جس کا نام سندس تھا۔ سندس کی عمر کم وبیش تین سال رہی ہوگی۔ یہ مختصر سی فیملی خوش باش زندگی گزار رہی تھی کہ ان کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی اور عابد کو قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا اور اس وقت وہ عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں تھا۔

مقتول خدیجہ نامی ایک عورت تھی اور وہ ملزم کی محلے دار تھی۔ مقتول کی فیملی بھی نہایت ہی مختصر تھی۔ میاں بیوی اور دو بچے۔ خدیجہ کا شوہر رؤف احمد ایک آئس کریم فیکٹری میں ملازم تھا۔ بڑی بیٹی مہ جبیں گریجویشن کررہی تھی اور گھر کے اندر ہی ایک بیوٹی پارلر اور فٹنس جیم بھی چلاتی تھی جہاں محلے کی فربہ اور بے ڈھنگی عورتیں اپنا وزن کم کرنے کے لیے کلاسز لیا کرتی تھیں۔ مقتول کا ایک سات سالہ بیٹا بھی تھا جس کی عمر سات سال تھی۔ عدیل نامی یہ بچہ محلے ہی کے ایک اسکول ''پرکس گارڈن اکیڈمی'' میں کلاس ٹو کا اسٹوڈنٹ تھا۔

واقعات کے مطابق وقوعہ سے چند روز پہلے مقتول اور ملزم کے بیچ ایک پھڈا ہوگیا تھا۔ ملزم عابد ایک غصہ ور اور گرم مزاج کا انسان تھا اور غلط بات پر وہ فوراً غضب ناک ہوجایا کرتا تھا۔ اس پھڈے سے پہلے بھی ایک دوسرے ایشو پر ان دونوں کے بیچ ''تو تو، میں میں'' ہوچکی تھی۔

آنٹی خدیجہ (مقتول اسی نام سے محلے میں جانی جاتی تھی) کو اپنے کچن میں لکڑی کا کچھ کام کروانا تھا اور اس نے عابد سے اس کام کا اسٹیمیٹ لکھوایا تھا۔ عابد نے اپنے حساب سے خدیجہ کو ایک اماؤنٹ بتادیا تھا۔ آنٹی خدیجہ بہت ہوشیار اور چالاک عورت تھی۔ اس نے محلے ہی کے ایک دوسرے کارپینٹر کو بلا کر اسی کام کے ریٹس لیے۔ اس کارپینٹر کا نام الیاس تھا اور عابد سے اس کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ الیاس کو کسی طرح یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ عابد اس سے پہلے خدیجہ آنٹی کو ریٹس دے چکا تھا لہٰذا اس نے کچن کے کام کا جو اسٹیمیٹ دیا وہ عابد سے کہیں کم تھا لہٰذا خدیجہ نے الیاس سے وہ کام کروالیا اور عابد کے خلاف چہ میگوئیاں بھی کیں کہ وہ بے ایمان اور لٹیرا قسم کا بڑھئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ......!

ایک ہی محلے میں اس نوعیت کے مخالفانہ بیانات بہت تیزی سے سفر کرتے ہوئے متعلقہ شخص تک جاپہنچتے ہیں۔ آنٹی خدیجہ نے عابد کے خلاف جو زہر اگلا وہ من وعن بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر عابد تک رسائی حاصل کرچکا تھا۔ عابد نے فوری طور پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا لیکن اس کے دل ودماغ میں آنٹی خدیجہ کے لیے غم وغصہ بھر گیا تھا پھر چند روز بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ عابد کے غبار کو بہہ نکلنے کا راستا مل گیا۔

آنٹی خدیجہ کے پاس بی سی (کمیٹی) ڈلا کرتی تھی۔ اب کی بار والی بی سی میں ایک کمیٹی عابد کی بھی تھی۔ یہ ایک

محلے داری کی چھوٹی سی بی سی تھی یعنی اس بی سی کے کُل دس ممبرز تھے اور روزانہ سو روپے دینا ہوتے تھے۔اس طرح ایک ماہ کے بعد تیس ہزار روپے کی بی سی کھلتی تھی۔ چند روز پہلے جو بی سی کھلی اس پر عابد اور خدیجہ آنٹی کے بیچ اچھی خاصی بدمزگی ہوگئی تھی۔

''بھئی! مجھے یہ منظور نہیں کہ عدیل پرچی اٹھائے۔'' عابد نے اعتراض کیا۔ ''یہ کام کسی اور بچے سے بھی تو کرایا جاسکتا ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں، ہر بار کسی نئے بچے کوڑائی کرنا چاہیے۔ ہمارے محلے میں بچوں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔''

آنٹی خدیجہ کے پاس جو بی سی ڈلتی تھی اس کی سالہا سال سے یہ روایت رہی تھی کہ بی سی کی پرچی خدیجہ کا بیٹا عدیل ہی اٹھایا کرتا تھا۔ عدیل پچھلے کئی سال سے پرچیاں اٹھاتے اٹھاتے سات سال کا ہوگیا تھا اور آج تک کسی ممبر نے اس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

''پرچی تو میرا بیٹا ہی اٹھائے گا۔'' آنٹی خدیجہ بھی ضد پر اتر آئی تھی۔ ''جب اور کسی ممبر کو تکلیف نہیں تو پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''میں بھی اس بی سی کا ممبر ہوں۔'' عابد نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اور مجھے سخت اعتراض ہے۔ آپ لوگ میری بات کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔''

''آپ لوگ'' سے عابد کی مراد وہ تمام خواتین و حضرات تھے جو پرچی نکالنے کے موقع پر وہاں جمع تھے۔ ایک نے عابد سے پوچھا۔

''آپ کے اعتراض کا سبب کیا ہے؟''

''مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس بی سی میں گھپلا ہورہا ہے۔'' عابد نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''ہائیں......!'' ایک عورت نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔ ''کیسا گھپلا عابد بھائی؟''

''آنٹی خدیجہ نے اپنے بیٹے کو ایک خاص انداز میں ٹرینڈ کررکھا ہے۔'' عابد نے پُر وثوق انداز میں کہا۔ ''یہ اپنی مرضی سے جس کی بھی چاہیں، بی سی نکال سکتی ہیں۔''

''یہ تو بڑی زیادتی والی بات ہے۔'' ایک دوسری عورت خفگی بھرے انداز میں بولی۔ ''انسان کو بے ایمانی تو نہیں کرنی چاہیے نا......!''

بی سی سسٹم میں پرچی اٹھنے کے موقع پر عموماً وہی لوگ جمع ہوتے ہیں جن کی بی سی ابھی نکلی نہیں ہوتی ورنہ جو لوگ بی سی لے چکے ان کا وہاں کیا کام اور جو ہر ماہ بڑی آس امید لے کر آئے ہوں اور انہیں پتا چلے کہ پرچی اٹھانے میں کوئی منظم گڑبڑ کی جارہی ہے تو ان کا تشویش میں مبتلا ہوجانا ایک لازمی امر ہے لہٰذا عابد کے اعتراض اٹھانے پر وہاں مختلف قسم کی الٹی سیدھی باتیں شروع ہوگئیں۔ جن کی ابھی تک بی سی نہیں نکلی تھی اور وہ ہر ماہ نامراد واپس لوٹ جاتے تھے انہیں عابد کی بات میں بہت وزن محسوس ہوا اور وہ اپنے طور پر نوع بہ نوع تبصرے کرنے لگے۔ گویا پرچی اٹھنے کا معاملہ تعطل کا شکار ہوگیا۔

اس صورتِ حال نے آنٹی خدیجہ کو پریشان کردیا۔ اس نے عابد سے کہا۔ ''اس شرانگیزی میں تمہارا زیادہ قصور نہیں۔ سیانے جو کہہ گئے ہیں وہ غلط نہیں ہوسکتا۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔''

اتفاق سے عابد نے ہلکی پھلکی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس معروف اردو محاورے کو اپنی ذات پر ایک سنگین حملہ سمجھا اور چراغ پا ہوتے ہوئے وہ آنٹی خدیجہ سے مستفسر ہوا۔

''تم نے مجھے چور کہا......؟''

''تو اس میں کیا شک ہے۔'' آنٹی خدیجہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی کراری آواز میں کہا۔ ''چوروں کو سارے نظر آتے ہیں چور۔''

''آنٹی! میں نے تمہاری کون سی بھینس چرالی ہے جو مجھے چور کہہ رہی ہو۔'' عابد نے غصیلے لہجے میں استفسار کیا۔

''صرف بھینس چرانے ہی سے انسان چور نہیں کہلاتا۔'' آنٹی خدیجہ نے ایک گہری چوٹ کی۔ ''تین ہزار کا کام پانچ ہزار میں کرنے والا شخص بھی ڈاکو ہی کہلائے گا اور ڈاکو، چور سے بھی آگے کی چیز ہے۔''

عابد آنٹی خدیجہ کے اشارے کو بخوبی سمجھ گیا تھا۔ اس نے الیاس کارپینٹر کے نسبتاً کم پیسوں میں کچن کا کام کرنے کا حوالہ دیا تھا۔ عابد نے بڑی مشکل سے آنٹی خدیجہ کے طنز کو برداشت کیا اور کہا۔

''اب میں کیا بولوں۔ تم عورت ذات ہو۔ اگر میرے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی تو سب مجھے ہی بدتمیز اور نہ جانے کیا کیا کہیں گے۔''

''اور تم کیا سمجھتے ہو، میں تمہیں ایسی ویسی بات نکالنے دوں گی۔'' آنٹی خدیجہ نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''اس سے پہلے ہی میں تمہارا منہ نہیں توڑ ڈالوں گی۔''

ان کے بیچ پندرہ بیس منٹ تک تیز و تند فقروں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ آخر میں آنٹی نے کہا۔

''اگر تم سمجھتے ہو کہ میں بی سی میں بے ایمانی کررہی ہوں تو تم اپنی بی سی نکال لو۔ تم نے اب تک جتنے پیسے

بھرے ہیں وہ میں تمہیں بعد میں واپس کر دوں گی۔''

''بعد میں نہیں۔'' عابد نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''اگر ابھی اور اسی وقت میرے بھرے ہوئے پیسے لوٹا دو تو میں بی سی توڑنے کو تیار ہوں۔''

''ابھی تو میرے پاس پیسے ہیں نہیں۔ تمہیں چند ماہ تک انتظار کرنا پڑے گا۔'' آنٹی نے بیزاری سے کہا۔ ''آج تو جس کی پرچی اٹھے گی اسے سب سے پہلے پے منٹ کرنا ہوگی۔''

''مجھے تین دن کے اندر اپنی رقم چاہیے۔'' عابد نے ضدی لہجے میں کہا۔ ''ورنہ میں تمام ممبرز کو بتا دوں گا کہ تم اپنے بیٹے کی مدد سے کس طرح پرچی اٹھانے میں بے ایمانی کرتی ہو۔''

''ارے بھائی! اس نیک کام کے لیے تین دن کا انتظار کیوں۔'' ایک دل جلی عورت بولی۔ اس بے چاری کی بی سی ہمیشہ اینڈ پر نکلا کرتی تھی۔ ''تم ابھی بتا دو ناکہ خدیجہ آنٹی کس طرح کا گھپلا کر رہی ہے۔''

''ابھی بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' عابد نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں...... کا کیا مطلب ہوا؟'' عورت نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

''مطلب یہ کہ پرچی نارمل ہو چکی ہے۔'' عابد نے کہا۔

''یہ کیا پہیلیاں ڈال رہے ہو؟'' وہ عورت مزید الجھ گئی۔ ''کھل کر بتاؤ، تم کہنا کیا چاہ رہے ہو......؟''

عابد نے لوہا گرم دیکھا تو آنٹی خدیجہ کی راکٹ سائنس کو منظرعام پر لے آیا۔ اس نے وہاں موجود بی سی کے خواتین و حضرات ممبرز کو یہ کہانی سنا ڈالی۔

''اس فراڈن آنٹی نے اپنے بیٹے کو اچھی طرح ٹرینڈ کر رکھا ہے۔ آنٹی نے جس کی بی سی نکالنا ہوتی ہے، عدیل اسی ممبر کی پرچی اٹھاتا ہے۔ آپ سب کے ذہنوں میں اس وقت ایک ہی سوال ہے کہ پرچیاں تو سب کی سب تہ شدہ ہوتی ہیں پھر اس معصوم بچے کو یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ کس کی پرچی اٹھانا ہے؟ یہی تو اس چکرباز آنٹی کی سائنس ہے۔ ٹھہریں، میں آپ کو بتاتا ہوں......'' اس نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''آنٹی دغاباز نے تمام ممبرز کی پرچیوں کو ایک ہی انداز میں تہ کر کے بند کر رکھا ہے اور اوپر سے تمام تہ شدہ پرچیاں ایک جیسی ہی نظر آتی ہیں۔ اب قصہ یہ ہے کہ آنٹی نے جس ممبر کی بی سی نکالنا ہوتی ہے اس کی تہ شدہ پرچی کو دو تین گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیتی ہے اس طرح یہ پرچی خوب ٹھنڈی ہو جاتی ہے پھر جب پرچی اٹھانے کا وقت آتا ہے تو اس ٹھنڈی ٹھار تہ شدہ پرچی کو باقی تہ شدہ پرچیوں میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ یہ تمام پرچیاں ایک تسلے میں ڈال کر عدیل کے سامنے رکھ دی جاتی ہیں۔ عدیل چونکہ آنٹی کا تربیت یافتہ ہے۔ وہ بڑے ڈرامائی انداز میں تسلے کے اندر ہاتھ گھماتا ہے۔ سب ممبرز یہی سمجھتے ہیں کہ معصوم بچہ پرچیوں کو اچھی طرح مکس کر رہا ہے لیکن درحقیقت وہ ٹھنڈی ٹھار پرچی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ پھر جیسے ہی مطلوبہ پرچی اس کے ہاتھ کو چھوتی ہے، وہ اسے دبوچ کر باہر نکال لیتا ہے...... یہ ہے سارا کھیل۔''

''لیکن اس میں آنٹی خدیجہ کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟'' ایک عورت نے بہت اہم سوال کیا۔ ''وہ اتنا کھٹ راگ کس لیے پھیلاتی ہے......''

''یہ سب کمیشن کا چکر ہے۔'' عابد نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''بعض ممبرا آنٹی سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر وہ ان کی بی سی نکال دے تو وہ اسے دو، تین ہزار یا اس سے زیادہ کا نذرانہ پیش کریں گے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو، بکواس کر رہے ہو۔'' آنٹی خدیجہ آپے سے باہر ہو گئی۔ ''تم نے مجھ پر جو سنگین الزام لگایا ہے، اس کا نتیجہ بھی بھگتو گے۔''

''میں نے کسی پر کوئی الزام نہیں لگایا بلکہ حقیقت بیان کی ہے۔'' عابد نے برہمی سے کہا۔ ''اسی لیے تو نشیب میں پانی بھر رہا ہے۔''

ان جملوں کے بعد ان دونوں میں شدید نوعیت کی زبانی کلامی جنگ ہوئی۔ وہاں پر موجود لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ یہ ٹکراؤ ان الفاظ پر اختتام پذیر ہوا۔

''اب تو میں خود تمہاری بی سی توڑ رہی ہوں۔'' آنٹی خدیجہ نے تلملاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور پیسے بھی دوں گی، آخری بی سی کھلنے کے ایک ماہ بعد۔''

''پیسے تو تمہیں تین دن کے اندر ہی دینا ہوں گے۔'' عابد نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ''ورنہ نتائج کی ذمے داری بھی تم پر ہوگی۔''

اور...... اس تو تکار کے پانچویں روز آنٹی خدیجہ کو قتل کر دیا گیا تھا اور اس وقت تک عابد کو پیسے نہیں ملے تھے۔

☆☆☆

واقعات کے مطابق جس وقت خدیجہ آنٹی کو قتل کیا

گیا، وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اس کا شوہر رؤف اپنی ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا۔ مہ جبیں کالج گئی تھی اور ننھا عدیل اسکول میں تھا۔ وقوعہ یعنی آنٹی خدیجہ کا گھر اسی گز کے رقبے پر تعمیر شدہ ایک دومنزلہ گھر تھا جس کی بالائی منزل پر صرف ایک ہال نما کمرا بنا ہوا تھا جسے مہ جبیں جیم کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ وہاں پر مہ جبیں نے ایکسر سائز کی چند مشینیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اس جیم تک پہنچنے کے دو راستے تھے۔ ایک تو گھر کے اندرونی حصے سے تھا اور دوسرا بالکل الگ تھلگ۔ اس راستے سے مہ جبیں کے پاس آنے والی عورتیں اوپر ہال تک پہنچتی تھیں۔ یہ راستہ ایک زینے کی شکل میں تھا جس کا دروازہ گھر کے داخلی دروازے کے برابر میں تھا۔ ایکسر سائز والے ہال میں مہ جبیں نے تازہ ہوا کی آمدورفت کے لیے بڑی بڑی کھڑکیاں بنوا رکھی تھیں جن پر جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہال کے اندر سے یہ آسانی باہر دیکھا جاسکتا تھا تاہم باہر سے ہال کے اندر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ یہ جالیاں بہترین پردے کا کام کرتی تھیں۔

مکان کی زیریں منزل پر صرف دو کمرے اور ایک صحن تعمیر کیا گیا تھا۔ کمروں میں سے ایک کو ڈرائنگ روم اور دوسرے کو بیڈروم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ان دو کمروں کی تعمیر کے بعد جتنی بھی جگہ بچی تھی اسے صحن کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا جس کے اندر پھول دار پودوں والے گملے بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ بیڈروم آنٹی خدیجہ اور رؤف احمد کے تصرف میں تھا جبکہ عدیل اور مہ جبیں نے ڈرائنگ روم پر قبضہ جما رکھا تھا۔ آنٹی خدیجہ کی لاش بیڈروم کے اندر اس کے بیڈ پر پائی گئی تھی۔

لاش کی دریافت کا سہرا عدیل کے سر بندھتا تھا۔ عدیل کے اسکول کی چھٹی ڈیڑھ بجے ہوتی تھی اور چھٹی کے وقت خدیجہ اسے اسکول سے لے کر آتی تھی۔ وقوعہ کے روز یعنی آٹھ فروری کو جب خدیجہ، عدیل کو پک کرنے اسکول نہیں پہنچی تو عدیل پریشان ہوگیا۔ پرنس گارڈن اکیڈمی عدیل کے گھر سے تین گلی کی مسافت پر تھا۔ یہ اتنا زیادہ فاصلہ نہیں تھا کہ وہ اکیلا گھر نہ جاسکتا ہو لیکن وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی اسکول جانے آنے کا عادی تھا اس لیے وہ اسکول میں رک کر اپنی ماں کا انتظار کرتا رہا۔

جب اسکول سے عدیل کے علاوہ تمام بچے رخصت ہوگئے تو پرنسپل کو تشویش ہوئی۔ اسکول کی ایک ٹیچر کا اس گلی سے گزر ہوتا تھا جہاں آنٹی خدیجہ کا گھر تھا۔ پرنسپل نے مذکورہ ٹیچر سے کہا۔

”سلمٰی! اس کی ماں کے ساتھ پتا نہیں، آج کیا پرابلم ہوگئی ہے جو وہ اپنے بچے کو لینے نہیں آئی۔ تم جاتے ہوئے اسے اس کے گھر تک چھوڑ دینا۔“

”اوکے میڈم! میں عدیل کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“ سلمٰی نامی اس ٹیچر نے کہا۔

سلمٰی، عدیل کو گھر کے دروازے سے اندر کر کے آگے بڑھ گئی تھی لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد عدیل روتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور اس نے روتے ہوئے لوگوں کو بتایا۔

”امی اپنے بیڈ پر بے ہوش پڑی ہیں اور ان کے کپڑوں پر بہت سا خون لگا ہوا ہے۔ میں نے امی کو بہت ساری آوازیں دیں لیکن وہ اٹھ نہیں رہیں......“

آنٹی خدیجہ کا اس وقت سونا یا بے ہوش ہوجانا اتنا تشویش ناک نہیں تھا لیکن عدیل نے جو یہ بتایا کہ اس کے کپڑوں پر بہت سا خون لگا ہوا ہے اس سنسنی خیز اطلاع نے ہر ایک کی توجہ اپنی جانب مبذول کردی اور تین چار خواتین وحضرات صورتِ حال کی خبرگیری کے لیے آنٹی خدیجہ کے بیڈروم میں پہنچ گئے۔

خدیجہ آنٹی اپنے بستر پر چت پڑی تھی اور اس کا بدن ساکت تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندگی سے بہت دور جاچکی ہے۔ سینے پر سے اس کا لباس بھی خون سے تربہ تر تھا۔ یہ بہت ہی پیچیدہ اور ہنگامی صورتِ حال تھی لہٰذا فی الفور اس واقعے کی اطلاع علاقے کے تھانے تک پہنچائی گئی اور ایک بندے کو رؤف کی فیکٹری کی جانب دوڑایا گیا۔

اسی اثنا میں مہ جبیں بھی کالج سے واپس آگئی تھی۔ موجودہ سچویشن نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا تاہم اس نے جلد ہی اپنے حواس پر قابو پالیا اور عدیل کو سنبھالنے کے ساتھ ہی اس نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صورتِ حال کو بھی اپنے قابو میں کرلیا تھا۔

پولیس اور رؤف لگ بھگ ایک ساتھ ہی جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔ پولیس کی کارروائی لگ بھگ ایک گھنٹے تک چلتی رہی پھر انہوں نے رؤف کی نشاندہی اور راہنمائی میں عابد کو آنٹی خدیجہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔ مقتول کے ورثا قاتل کے حوالے سے جس شخص پر اپنے شک کا اظہار کریں، پولیس اس بندے کو کسی بھی قیمت پر نظرانداز نہیں کرسکتی۔ رؤف اور مہ جبیں نے بہت زور دے کر پولیس کو بتایا تھا کہ ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں سوائے ترکھان عابد کے۔ پھر انہوں نے پولیس کو وہ تمام واقعہ بھی سنا دیا تھا جس میں آنٹی خدیجہ اور عابد کی خاصی جھڑپ ہوئی تھی اور عابد نے

مقتول خدیجہ کو خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی تھی۔

پولیس کو اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے اتنا سا اشارہ کافی تھا۔ انہوں نے فوراً سے پیشتر عابد کو اس کی دکان سے گرفتار کرلیا تھا اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا کہ اس وقت عابد عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں تھا وہ چندروز بعد چالان کے ساتھ عدالت میں پیش کرنے والے تھے۔ اس کے بعد مقدمے کا باقاعدہ آغاز ہونا تھا۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھی نبیلہ سے کہا۔

''آپ نے مجھے جو معلومات فراہم کی ہیں میری نظر میں وہ ناکافی ہیں لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ باقی کا تمام ہوم ورک میں خود کرلوں گا لیکن اس کے لیے مجھے گاہے بگاہے آپ کے تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔''

''میں آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''بس، آپ مجھے یہ یقین دلادیں کہ عابد کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''کیا عابد نے آنٹی خدیجہ کو قتل کیا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہرگز نہیں!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں مانتی ہوں کہ عابد بہت غصے والا ہے۔ غلط بات اس سے برداشت نہیں ہوتی اور وہ فوراً آگ بگولا ہوجاتا ہے لیکن مجھے پکا یقین ہے کہ اس نے خدیجہ کو قتل نہیں کیا۔''

''بس تو پھر آپ اس بات کا بھی پکا یقین رکھیں کہ اگر عابد بے گناہ ہے تو پھر اس کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔'' میں نے نبیلہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اللہ کے فضل و کرم سے وہ اس مقدمے میں باعزت رہا ہوگا۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے وکیل صاحب۔'' وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کی باتوں سے مجھے بڑا حوصلہ ملا ہے ورنہ میں تو خود کو ختم ہوتا محسوس کررہی تھی۔''

''اچھے اور برے حالات انسان کی زندگی میں آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''قدرت نے جب کسی انسان کا امتحان لینا ہوتا ہے تو وہ اسے اچھے یا برے حالات میں گرفتار کردیتی ہے اور اس آزمائش میں کامیابی کے لیے چندایک نکات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ باقی کا کام خودبخود ہوتا چلا جاتا ہے۔''

''اور وہ اہم نکات کون کون سے ہیں؟'' وہ عقیدت بھرے انداز میں مستفسر ہوئی۔

''جب انسان کا اچھا وقت چل رہا ہوتا ہے تو اس بات کو ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ یہ وقت ہمیشہ نہیں رہنے والا لہٰذا اس دوران میں اپنے آرام و آسائش کی خاطر بھی حد سے تجاوز نہ کریں۔ ایک لمٹ میں رہتے ہوئے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو بھی انسان سمجھیں اور ان کا حتی الامکان خیال رکھیں۔ یہ آپ کا انویسٹمنٹ ہے جو برے وقت میں مارک اپ کے ساتھ آپ کو واپس ملے گا۔''

میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جب انسان کا برا وقت چل رہا ہو تب بھی اسی بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ تکلیف عارضی ہے۔ مشکل وقت میں انسان کو صبر و تحمل اور برداشت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہی تین چیزیں انسان کی نیا کو پار لگاتی ہیں۔''

''میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اس وقت میں بھی ایک مصیبت میں گرفتار ہوں۔ میں آپ کی دی ہوئی ٹپس پر ضرور عمل کروں گی۔''

''قدرت عموماً انسان کو تین طریقوں سے آزماتی ہے۔'' میں نے اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''نمبر ایک۔ انسان کو کسی چیز سے محروم رکھ کر وہ اس کے ضبط اور صبر کا امتحان لیتی ہے۔ ہر محرومی میں صبر اور شکر کے ساتھ زندگی بسر کرنے والا کامیاب ہوجاتا ہے۔ نمبر دو، کسی انسان کو اس کی اہلیت اور اوقات سے کہیں زیادہ نواز کر قدرت اس کے ظرف کی آزمائش کرتی ہے۔ کم ظرف آپے سے باہر نکل کر اپنی اوقات کو بھول جاتا ہے اور مخلوق خدا کو خود سے حقیر جان کر ان کے ساتھ ظلم و زیادتی پر اتر آتا ہے لہٰذا وہ امتحان میں فیل ہوجاتا ہے۔ نمبر تین...... قدرت کی یہ آزمائش سب سے زیادہ کڑی ہے یعنی قدرت کسی اہل اور قابل انسان کو زمانے بھر کی نعمتوں سے سرفراز کردے۔ عزت، دولت، صحت، شہرت...... سب کچھ اسے عطا کردے اور پھر اچانک یہ سب چھین لے۔ وہ انسان اپنی تمام تر قابلیت اور اہلیت کو استعمال کرنے کے باوجود بھی حالات کو قابو میں نہ لاسکے اور جھنجلا کر اللہ سے گلہ شکوہ شروع کردے۔ برے وقت میں، اچھے وقت کو فراموش کرکے وہ ناشکری پر اتر آئے تو سمجھو کہ وہ امتحان میں فیل ہوگیا۔''

''آپ کی باتیں دل میں ترازو ہوجاتی ہیں وکیل صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اگر آپ ڈاکٹر ہوتے تو مریض آپ کی باتیں سن کر اپنے مرض کو بھول

جاتا۔ پھر اسے دوائی کھانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔''

''اور تب.....'' میں نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''تمام میڈیکل اسٹورز والے سارا دن فارغ بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے.....''

وہ میری بات پر کھلکھلا کر ہنس دی۔ مجھے یہ دیکھ کر خاصا اطمینان محسوس ہوا کہ میں اسے افسردگی کی کیفیت سے باہر کھینچ لایا تھا۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ نے مجھ سے تعاون کرنے کے لیے کہا۔ مجھے بتادیں کہ کس قسم کا تعاون کرنا ہوگا؟''

میں نے نبیلہ کو اس کیس کے حوالے سے چند ضروری ہدایات دیں جن میں زیادہ تر کاموں کا تعلق مقتول کی فیملی اور ان کے گھریلو حالات سے تھا۔ اس کیس کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے مجھے یہ تمام تر معلومات درکار تھیں۔ نبیلہ نے یہ تمام اہم معلومات مجھے فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔

''میں آج یا کل کسی وقت متعلقہ تھانے جا کر عابد سے ملاقات کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس سے چند اہم سوالات کرنا ہیں اور بعض کاغذات پر اس کے دستخط بھی چاہئیں۔ اب ان شاء اللہ! ہماری ملاقات عدالت کے کمرے میں ہوگی۔''

''ان شاء اللہ!'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

ہمارے بیچ الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا پھر وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگئی۔ جب وہ میرے آفس سے نکلی تو اس کے قدموں میں اعتماد نظر آتا تھا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ اس دوران میں، میں نے ملزم عابد سے ایک بھرپور ملاقات کر لی تھی۔ وہ ایک قوی الجثہ اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے ہلکی سی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی کرختگی پائی جاتی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط تھا۔ اگر اس کا ایک ہاتھ کسی کو پڑ جاتا تو اس کے زمیں بوس اور بے ہوش ہونے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی اور وہ یہ کہ عابد دیکھنے میں جتنا غصہ ور نظر آتا ہے، درحقیقت وہ ایسا تھا نہیں، اندر سے وہ مجھے ایک سچا، کھرا اور نرم دل انسان لگا تھا۔ اس کے دل و جگر میں ایک خاص نوعیت کا گداز پایا جاتا تھا۔ اسے انسانوں کی ''اخروٹ کیٹیگری'' میں رکھا جاسکتا تھا یعنی اوپر سے سخت اور اندر سے نرم۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ذکر کرتا چلوں۔ اس رپورٹ کے مطابق مقتول آنٹی خدیجہ کی موت آٹھ فروری کی دوپہر دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور رپورٹ میں واضح الفاظ میں لکھا ہوا تھا کہ مقتول کو حالتِ نیند میں فنا کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ وجۂ موت اس کے سینے میں خنجر گھونپ کر اسے زندگی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق مقتول کی قمیص پر جو خون لگا ہوا ملا تھا وہ خالص نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ..... اس خون میں پانی یا کچھ اور ملا کر اسے پتلا کر دیا گیا ہو لیکن مقتول کے جسم میں موجود خون کا معائنہ بتاتا تھا کہ اس کی حالت نارمل ہے۔ صرف کپڑوں پر لگے ہوئے خون کی کیفیت اصلی خون کی بہ نسبت کافی پتلی تھی یعنی جسم سے خارج ہونے کے بعد خون کا مخصوص گاڑھا پن جاتا رہا تھا اور وہ اپنے فطری انداز میں لباس پر جم نہیں پایا تھا۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ملزم کی درخواستِ ضمانت دائر کر دی لیکن جج نے درخواستِ ضمانت کو رد کرتے ہوئے آئندہ پیشی کے لیے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے دی۔

اس عدالتی کارروائی سے مجھے قطعاً کوئی مایوسی نہیں ہوئی تھی کیونکہ قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی اور یہ بات میں نے نبیلہ کو بھی اچھی طرح سمجھا دی تھی لہٰذا وہ بھی مطمئن تھی۔ میں نے نبیلہ کو جس نوعیت کی معلومات اکٹھا کرنے کو کہا تھا وہ کام اس نے خاطر خواہ کر دیا تھا۔ آئندہ پیشی سے قبل کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی میں لگ بھگ دو ماہ لگ گئے۔ اس دوران میں مجھے ہوم ورک کرنے کا اچھا خاصا موقع مل گیا تھا۔ میں نے وہ تیاری مکمل کر لی تھی جو اس کیس کے لیے ضروری تھی۔

آئندہ پیشی پر عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو عدالت کا کمرا حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے میری ہدایات کی روشنی میں صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس ''انکار'' پر ملزم کا تفصیلی بیان ریکارڈ کیا گیا۔ یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ میرے موکل نے میری ہدایات کو من و عن یاد رکھا تھا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ کی جانب سے کم و بیش آٹھ گواہوں کی فہرست پیش کی گئی تھی میں صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کے بیان میں کوئی اہم بات یا خاص نکتہ موجود ہوگا۔

کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے۔ اسے استغاثہ کا وارث بھی کہا جاتا ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ میں نے جج سے درخواست کی۔

''جناب عالی! اس سے پہلے کہ استغاثہ کا کوئی گواہ بیان دینے کے لیے کٹہرے میں آئے، میں معزز عدالت کی اجازت سے اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

میری اس استدعا پر وکیل استغاثہ نے ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھا تاہم وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میری فرمائش میں قابلِ اعتراض کوئی بات نہیں تھی لہٰذا جج نے مجھے انکوائری آفیسر سے سوال وجواب کی اجازت دے دی۔

انکوائری آفیسر ایک سب انسپکٹر تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام مقصود علی تھا۔ وہ وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

''انسپکٹر صاحب!'' میں نے اس کے عہدے میں سے ''سب'' کے لفظ کو خارج کرتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''آپ ایک بہادر اور دلیر پولیس افسر ہیں جس کا ثبوت آپ کا دایاں ہاتھ ہے......''

مقصود علی کا دایاں ہاتھ ندارد تھا۔ ایک ڈاکو سے گتھم گتھا مقابلہ کرتے ہوئے ڈاکو کی گولی چل جانے سے مقصود علی کا دایاں ہاتھ اس بری طرح زخمی ہو گیا تھا کہ کلائی پر سے اس کے گھائل ہاتھ کو کاٹنا پڑا تھا۔ انتہائی نزدیک یعنی ایک آدھ انچ کے فاصلے سے لگنے والی گولی نے مقصود کے ہاتھ کے پرخچے اڑا دیے تھے تاہم مزے کی بات یہ تھی کہ مقصود نے شدید زخمی ہونے کے باوجود بھی ڈاکو کو فرار ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔ جرأت مندی کے اس مظاہرے پر اسے فوراً اے ایس آئی سے ایس آئی (سب انسپکٹر) بنا دیا گیا تھا اور میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر زبانی کلامی ہی سہی مگر تھوڑی دیر کے لیے اسے انسپکٹر کے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔

''تعریف کا شکریہ جناب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''آئی او صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟''

''وہ کوئی مقتول کی گلی کا رہائشی تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہمیں بذریعہ فون اس افسوس ناک واقعے کی اطلاع دوپہر دو بجے دی گئی تھی اور ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد ہم جائے واردات پر پہنچ گئے تھے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ نے کئی صفحات پر مشتمل جو چالان تیار کیا ہے اس میں لکھا ہوا ہے کہ جب آپ موقع پر پہنچے تو مقتول آنٹی خدیجہ کی لاش اس کے بیڈروم میں بیڈ پر پڑی تھی اور بیڈروم کی چھت والا پنکھا فل اسپیڈ سے چل رہا تھا۔ اگر میں نے چالان کے اس حصے کو سمجھنے میں کوئی غلطی کی ہو تو آپ میری راہنمائی فرمائیں......؟''

''نہیں...... آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے۔'' وہ رسانیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''واقعی مقتول کے بیڈروم کا سیلنگ فین آندھی اور طوفان کی رفتار سے آن تھا۔''

''کیا اس امر میں کسی شک کی گنجائش ہے کہ مقتول آنٹی خدیجہ کی موت آٹھ فروری کی دوپہر دس سے بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی؟''

''کوئی شک نہیں وکیل صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''فروری کا مہینا کراچی میں اتنا گرم نہیں ہوتا کہ اس قدر تیز پنکھا چلانے کی ضرورت پیش آئے۔'' میں نے آئی او کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اور آٹھ فروری کو تو مطلع بھی ابر آلود تھا، صبح سے کوئٹہ کی ٹھنڈی ٹھار ہوا چل رہی تھی پھر......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''ہر آدمی کا اپنا مزاج ہوتا ہے وکیل صاحب! بعض لوگوں کو بہت زیادہ گرمی لگتی ہے۔ میری بیوی تو دسمبر جنوری میں بھی پنکھا چلا کر ہی سوتی ہے، چاہے شیٹ کیوں نہ اوڑھنا پڑے۔ وہ کہتی ہے کہ پنکھے کی پنکھڑیاں گھوم رہی ہوں تو دل کی تسلی ہوتی ہے۔''

''تو پھر یہ بھابی صاحبہ کا کوئی نفسیاتی معاملہ ہے لہٰذا ہم واپس مقتول کی طرف آ جاتے ہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''پوسٹ مارٹم کی میڈیکل ایگزامنر رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مقتول کے جسم سے خارج ہونے والا خون اس کے بدن کے اندر موجود خون کی بہ نسبت پتلا تھا یعنی وہ خون مقتول کی قمیص پر اس طرح نہیں جم پایا تھا جیسا کہ عام طور پر لہو کی جمنے کی خاصیت میں شامل ہے، اس نے محض مقتول کی قمیص کو رنگ ڈالا تھا...... یہ کیا معما ہے؟''

''شروع میں یہ مجھے بھی معما ہی لگا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن بعد میں اس کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی تھی۔''

''کیا وہ وجہ آپ مجھے بھی سمجھا دیں گے؟'' میں نے پُراشتیاق سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں نہیں وکیل صاحب!'' وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ مقتول کا بلڈ پریشر ہائی رہتا تھا اور وہ دل کی مریضہ بھی تھیں۔ اس نوعیت کے مریضوں کو ڈاکٹرز جو ادویہ استعمال کراتے ہیں ان میں ایک ٹیبلٹ خون کو پتلا کرنے والی بھی ہوتی ہے تاکہ خون کا گاڑھا پن دل کی شریانوں اور وریدوں میں کسی قسم کی گڑبڑ پیدا نہ کرے اور دل کے والوز متاثر نہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے عموماً اسپرین دی جاتی ہے۔''

''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مقتول اپنے دل کے معاملات کو درست رکھنے کے لیے کوئی ایسی میڈیسن لے رہی تھی جو گاڑھے خون کو پتلا کرنے کا موجب ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی بالکل!'' اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اگر آپ کی بات کو درست مان لیا جائے تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ میڈیکل ایگزامنر نے اپنی رپورٹ میں ایسے کسی کیمیکل کی نشاندہی کیوں نہیں کی جو خون کو پتلا کرتا ہو۔ مطلب، اگر مقتول واقعتاً خون کو پتلا کرنے والی کوئی دوائی لے رہی تھی تو اس میڈیسن کو کیمیکل ایگزیم میں ٹریس ہو جانا چاہیے تھا؟''

''آپ اس بارے میں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں!'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''میں نے تو اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ اگر آپ کو کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ پر کوئی اعتراض ہے تو اس کا جواب متعلقہ شعبہ ہی دے سکتا ہے۔''

''آپ بھلے میرے اس سوال کا جواب نہ دیں۔'' میں نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایک خاص معاملے میں مجھے آپ کی رائے کی ضرورت ہوگی۔''

''کون سا معاملہ؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''میری تشفی کا معاملہ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''میں آپ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا میڈیکل سائنس نے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ہارٹ پیشنٹس کے لیے کوئی ایسی میڈیسن بنالی ہے جو جسم کے اندر موجود خون کو توجوں کا توں گاڑھا ہی رہنے دے لیکن بدن سے خارج ہونے والے خون کو نسبتاً پتلا کر دے...... میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے عین مطابق؟''

''میں بھلا اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''میڈیکل ریسرچ کے بارے میں میری معلومات زیادہ وسیع نہیں ہیں۔''

''چلیں، آپ سے آلۂ قتل پر بات کر لیتے ہیں۔'' میں نے اپنا کام سیدھا کرنے کی آڑ میں اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک تفتیشی افسر ہونے کے ناتے آپ کو اس بارے میں تو مکمل جانکاری ہونا چاہیے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''کیا آپ نے آلۂ قتل برآمد کر لیا......؟''

''نہیں......'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''آلۂ قتل کی تلاش جاری ہے۔''

''حیرت کی بات ہے۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ملزم آٹھ دس روز تک عدالتی ریمانڈ پر آپ کی کسٹڈی میں رہا۔ آپ نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے ہر قسم کے تفتیشی حربے استعمال کیے اور بالآخر اس کیس کے چالان کے ساتھ ملزم کو حوالۂ عدالت کر دیا اور آپ کہہ رہے ہیں آلۂ قتل کی تلاش ہنوز جاری ہے......؟''

''ہم بہت جلد آلۂ قتل کو برآمد کر لیں گے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''انشاء اللہ اگلی پیشی سے قبل یہ کام کر لیا جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ ملزم نے آلۂ قتل کو کسی خفیہ مقام پر چھپا رکھا ہے یا پھر کسی گٹر میں پھینک دیا ہے کیونکہ اس کے گھر اور دکان کا تو ہم نے چپا چپا کھنگال ڈالا ہے۔''

''جب ملزم آپ کی کسٹڈی میں تھا تو آپ اس سے آلۂ قتل برآمد نہیں کرا سکے۔ اب تو وہ جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل چلا جائے گا۔ خیر......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے آئی او کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر پوچھا۔

''کیا آپ میری اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ آلۂ قتل کوئی تیز دھار خنجر تھا؟''

''جی بالکل۔'' وہ سر کو اثبات میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اسی جانب اشارہ کرتی اور مقتول کے سینے کا گھاؤ بھی یہی کہانی سناتا ہے کہ آلۂ قتل کوئی خنجر یا خنجر جیسی کوئی تیز دھار چیز ہے۔''

میں نے ایک آدھ سوال کے بعد آئی او کو فارغ کر دیا۔

اگلے گواہ کا نام تھا سکندر جو ''سکندر بھائی'' کے نام سے مشہور تھا۔ سکندر بھائی ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک ڈرائیونگ انسٹرکٹر تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرایا پھر وکیلِ استغاثہ جرح کے لیے اس کے نزدیک

چلا گیا۔

''سکندر صاحب!'' وکیل استغاثہ نے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔ ''کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟''

''جی۔'' گواہ نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بتایا۔ ''یہ وہی بندہ ہے جس نے خدیجہ کو قتل کیا ہے۔''

''واقعات کے مطابق، آپ نے وقوعہ کے روز ملزم کو مقتول کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے چالاکی سے استفسار کیا۔ ''آپ کو یقین ہے کہ آپ نے وقوعہ کے دن جس شخص کو مقتول کے گھر سے نکلتے دیکھا، وہ ملزم ہی تھا؟''

''جی بالکل، وہ یہی تھا۔'' گواہ بڑے وثوق سے بولا۔

''آپ کو کچھ اندازہ ہے، آپ نے کتنے بجے ملزم کو مقتول کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا؟''

''لگ بھگ گیارہ بجے دوپہر۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''کیا آپ کی اس وقت ملزم سے کوئی بات ہوئی تھی؟''

''نہیں جناب!'' گواہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اس وقت عابد خاصا گھبرایا ہوا اور بڑی جلدی میں تھا اور میں نے پیچھے سے آواز دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی ہمارے بیچ سلام دعا سے زیادہ مراسم نہیں ہیں۔''

وکیل استغاثہ نے جرح موقوف کی تو اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے قریب چلا آیا اور استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

''سکندر بھائی! آپ کی رہائش کراچی کے کس علاقے میں ہے؟''

''ایف سی ایریا میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''سکندر بھائی!'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ ''ایف سی ایریا اور سمن آباد میں اچھا خاصا فاصلہ ہے، کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ وقوعہ کے روز یعنی آٹھ فروری کو آپ مقتول کے علاقے میں کیا کر رہے تھے؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے پوچھ لیا۔ ''کیا کسی ایف سی ایریا کے رہائشی کے سمن آباد جانے پر کوئی پابندی عائد ہے یا کراچی کے ایک محلے سے دوسرے محلے میں جانے کے لیے ویزا لینا پڑتا ہے؟''

استغاثہ کے گواہ سکندر بھائی نے بڑے ٹیڑھے پن کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں اگر چاہتا تو اسے کوئی سخت جواب دے سکتا تھا لیکن میں نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت ہی بردباری سے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ کراچی کے کسی بھی محلے کا شہری کسی بھی دوسرے محلے میں بلکہ پاکستان کے ہر علاقے میں بغیر ویزا کے جاسکتا ہے۔ معزز عدالت صرف وقوعہ کے روز جائے واردات پر آپ کی موجودگی کا سبب جاننا چاہتی ہے......''

''وہ جی، بات دراصل یہ ہے کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ادھر سمن آباد میں خدیجہ کے گھر کے نزدیک میری خالہ رہتی ہے۔ میں اکثر خالہ سکینہ سے ملنے سمن آباد جاتا رہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، بات سمجھ میں آگئی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں ملزم کے حوالے سے بتایا ہے...... یہ وہی بندہ ہے جس نے خدیجہ کو قتل کیا ہے۔ کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے آنٹی خدیجہ کو قتل ہوتے دیکھا تھا؟ یعنی کیا آپ اس قتل کے عینی شاہد ہیں......؟''

''جی نہیں......'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''میں نے ملزم کو قتل کی واردات کرتے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا......''

''پھر آپ کے پُر وثوق جواب کا سبب کیا ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''میں نے عابد کو خدیجہ کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔'' وہ سنبھالا لیتے ہوئے بولا۔

''گھر کے کون سے دروازے سے نکلتے دیکھا تھا؟'' میں نے استفسار کیا۔ ''مین گیٹ سے یا سیڑھیوں والے چھوٹے دروازے سے؟''

''جی، زینوں والے چھوٹے دروازے سے۔''

''وہ زینے جو سیدھے بالائی منزل والے جیم تک لے جاتے ہیں۔'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''جہاں مقتول کی بیٹی محلے کی عورتوں کو صحت مند رہنے کے ٹوٹکے بتاتی ہے۔''

''جی بالکل۔ میں اسی دروازے کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ میری بات کے اختتام پر بول اٹھا۔ ''جیم سے ایک زینہ خدیجہ کے گھر کی زیریں منزل پر بھی اترتا ہے۔''

''آپ تو مقتول کے گھر کی تفصیل اس طرح بتا رہے ہیں جیسے آپ اس گھر کے اندر آتے جاتے رہتے ہوں......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''زیادہ نہیں مگر ایک آدھ بار جانا ہوا ہے۔'' اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کس سلسلے میں؟''

''درحقیقت میں ایک ڈرائیونگ انسٹرکٹر ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''خدیجہ بھی مجھ سے

ڈرائیونگ سیکھتی رہی ہے۔ ایک دو بار اس نے چائے پانی کے لیے گھر کے اندر بلالیا تھا اور میں انکار نہیں کرسکا۔''

''بہت اچھا کیا آپ نے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اگر کوئی خلوص سے خاطر تواضع کی پیشکش کرے تو اس کا دل نہیں توڑنا چاہیے اور مقتول تو ویسے بھی آپ کی شاگرد تھی۔ اس پر تو آپ کا کچھ زیادہ ہی حق بنتا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا سکندر بھائی؟''

میں نے آخری جملہ ذومعنی انداز میں ادا کیا تھا۔ وہ ایک لمحہ متذبذب رہنے کے بعد ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں تو استاد کئی سال تک شاگرد سے اپنے گھر کا سارا کام کروایا کرتے تھے پھر کہیں جا کر تھوڑا بہت کچھ سکھا دیتے تھے۔ واقعی، شاگرد اگر ساری زندگی بھی استاد کی خدمت کرتا رہے تو وہ اس کا حق ادا نہیں کرسکتا۔''

میں ''استاد شاگرد'' کے حقوق وفرائض کی بحث کے موڈ میں نہیں تھا لہٰذا اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''تو وقوعہ کے روز آپ اپنی خالہ سکینہ سے ملنے سمن آباد گئے پھر مقتول کے گھر کے قریب پہنچے تو آپ نے کم وبیش گیارہ بجے دوپہر ملزم کو مقتول کے گھر کے زینے والے چھوٹے دروازے سے نکلتے دیکھا اور آپ نے سمجھ لیا کہ وہ زینے کے راستے بالائی منزل پر پہنچا ہوگا۔ پھر وہاں سے وہ زینہ اتر کر زیریں منزل پر آیا ہوگا اور پھر خدیجہ کو قتل کرنے کے بعد وہ اسی راستے سے واپس چلا گیا ہوگا......''

''جی......'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بالکل ایسا ہی ہوا ہوگا۔''

''سکندر بھائی! میری اور آپ کی بات میں ''ہوگا، ہوگا'' کچھ زیادہ ہی ہوگیا ہے۔'' میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔ ''اگر ہم مفروضوں کو خیرباد کہہ کر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئیں تو آپ میرا ساتھ دیں گے۔''

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو تاہم اس نے مجھے مایوس نہیں کیا اور بڑی دلیری سے بولا۔

''بے شک! میں آپ کا ساتھ دوں گا۔''

''جب وقوعہ کے روز ملزم کو آپ نے مقتول کے گھر سے نکلتے دیکھا تو کیا ملزم کی آپ پر بھی نظر پڑی تھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''میرا مطلب ہے، آپ لوگوں کا آمنا سامنا ہوا تھا؟''

''جی نہیں۔ میں نے صرف عابد کو عقب سے دیکھا تھا؟''

''اور عقب سے دیکھ کر آپ کو اندازہ ہوگیا کہ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں یہی بتایا ہے نا؟''

''جی ہاں، میں نے یہی بتایا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور یہ اندازہ میں نے اس کی چال کو دیکھ کر لگایا تھا۔ ہمارا نہ تو سامنا ہوا اور نہ ہی ہمارے بیچ کوئی بات چیت ہوئی تھی۔''

''جب آپ نے ملزم کو گھبراہٹ آمیز انداز میں مقتول کے گھر کے چھوٹے دروازے سے نکل کر جاتے ہوئے دیکھا تو کیا آپ کو......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے اسے ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے گھورا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ملزم کی پشت پر کوئی تختی لگی نظر آئی تھی......؟''

وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مطلب یہ کہ کوئی ایسی تختی جس پر لکھا ہو...... میں خدیجہ آنٹی کے سینے میں خنجر گھونپ کر اسے موت کی نیند سلا آیا ہوں......'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ وقوعہ کے روز، بقول آپ کے نہ تو آپ کا ملزم سے سامنا ہوا تھا اور نہ ہی آپ دونوں کے بیچ کوئی بات چیت ہوئی تھی لیکن آپ نے وکیل استغاثہ کے استفسار کے جواب میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہا تھا...... یہ وہی بندہ ہے جس نے خدیجہ کو قتل کیا ہے۔ اتنا پُروثوق جواب تو وہی شخص دے سکتا ہے جس نے اول، اپنی آنکھوں سے قتل کی واردات ہوتے دیکھی ہو۔ دوم، اسے قاتل نے خود اپنے اس ''کارنامے'' کے بارے میں بتایا ہو۔ سوم، اس نے قاتل کی پشت پر لگی تختی پر اس کا اقبال جرم پڑھ لیا ہو......؟''

''آپ بالکل غلط سمجھے ہیں۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔

میں نے تحمل لہجے میں کہا۔ ''آپ بالکل صحیح سمجھا دیں۔''

''میں نے وقوعہ کے روز ملزم کو گھبرائے ہوئے انداز میں مقتول کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''پھر جب پولیس نے اسے خدیجہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا، تب مجھے معلوم ہوا کہ اس کی گھبراہٹ کا راز کیا تھا اور ابھی جو سرکاری وکیل نے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تو میں نے کہہ دیا کہ یہ وہی بندہ ہے جس نے خدیجہ کو قتل کیا ہے۔ بس، اتنی سی بات ہے......''

"اوکے۔ہم اتنی سی بات کو ایک طرف رکھتے ہیں۔"

میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔"سکندر صاحب! باقی باتوں کو چھوڑیں۔صرف یہ بتائیں کہ وقوعہ کے روز جب آپ نے ملزم کو مقتول کے گھر سے نکلتے دیکھا تو اس نے کون سا لباس پہن رکھا تھا؟"

"شلوار قمیص۔" وہ جلدی سے بولا۔

"کس رنگ کا شلوار قمیص؟"

"نیلے رنگ کا......" ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔

"بکواس......" میں نے درشت لہجے میں کہا۔"آپ سراسر غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ملزم نے وقوعہ کے روز ہلکے بھورے رنگ کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔میری اس بات کی تصدیق انکوائری آفیسر بھی کریں گے کہ گرفتاری کے وقت ملزم کے بدن پر کس رنگ کا لباس تھا۔"

استغاثہ کا گواہ سکندر بھائی میری ڈانٹ سن کر بغلیں جھانکنے لگا تو جج نے آئی او سے اس سلسلے میں استفسار کیا۔ آئی او نے گواہوں والے کٹہرے میں آکر میرے دعوے کی تصدیق کردی۔آئی او سچ بولنے پر مجبور تھا۔اگر وہ ڈنڈی مارتا تو میں ملزم کے لباس کے حوالے سے دس افراد کو گواہ بنا کر عدالت میں پیش کرسکتا تھا۔یہ بات آئی او بخوبی جانتا تھا لہٰذا اس نے سچ بولنے ہی میں بھلائی محسوس کی۔

جج نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا۔"وکیل صاحب!" آپ کو گواہ سے اور تو کچھ نہیں پوچھنا؟"

"جناب عالی!" میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔"استغاثہ کے گواہ سکندر بھائی کو غلط بیانی پر میں...... دروغ گو درجہ اول ثابت کرچکا ہوں لہٰذا وہ تو میری طرف سے فارغ ہی ہے البتہ آئی او صاحب اتفاق سے وٹنس باکس میں آہی گئے ہیں تو میں ان سے صرف ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہوں گا۔"

جج نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔"اجازت ہے۔"

"آپ کے پیش کردہ چالان میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ مقتول کے بیڈروم کے دروازے کے ہینڈل پر برادے کے ذرات لگے ہوئے ملے تھے۔" میں نے آئی او کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"یہ کیا مسٹری ہے مقصود صاحب؟"

"وکیل صاحب! یہ مسٹری نہیں بلکہ ہسٹری ہے۔" وہ کراری آواز میں بولا۔"جس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ وقوعہ کے روز مقتول کے بیڈروم میں کوئی ایسا شخص داخل ہوا تھا جس کے ہاتھوں پر لکڑی کا برادہ لگا ہوا تھا یعنی کوئی کارپینٹر......!"

"جائے وقوعہ سے دو سو گز کے دائرے میں تین کارپینٹرز اپنی دکانیں کھولے بیٹھے ہیں۔عابد، الیاس اور افضل۔" میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔"لیکن آپ نے میرے موکل اور اس کیس کے ملزم عابد کو تختہ مشق بنانے کا فیصلہ کیا۔اس کا کوئی خاص سبب؟"

"بنیادی سبب تو ملزم اور مقتول کے درمیان پائی جانے والی چپقلش ہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔"پھر مقتول کے شوہر اور بیٹی نے بھی ملزم پر ہی اپنے شک کا اظہار کیا تھا۔"

"لہٰذا آپ نے اس کیس کو حلوا جان کر میرے موکل کو گرفتار کرلیا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر کڑے انداز میں پوچھا۔"جس دروازے کے ہینڈل پر آپ کو لکڑی کے برادے کے ذرات ملے تھے کیا آپ نے وہاں سے اس برادے والے ہاتھ کے فنگر پرنٹس اٹھانے کی زحمت کی تھی؟"

"نہیں......" وہ قدرے ڈھٹائی سے بولا۔"ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"اگر آپ اتنی سی زحمت کرلیتے تو اصل قاتل تک پہنچنے میں آپ کو مشکل پیش نہ آتی۔خیر......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر کندھے اچکا دیے۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

"دا کورٹ از ایڈ جارنڈ......!"

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں استغاثہ کا گواہ عبدالباسط کھڑا تھا۔عبدالباسط کی عمر پینتیس کے قریب رہی ہوگی۔وہ ایک پستہ قامت شخص تھا۔باسط کے سر کے بیشتر بال اڑ چکے تھے۔چندیا کے گرداگرد بالوں کی ایک جھالر سی نظر آتی تھی۔وہ جب اپنا بیان ریکارڈ کرا چکا تو وکیل استغاثہ نے اس پر ہلکی پھلکی جرح کی جس کا لب لباب یہ تھا۔

وقوعہ کے روز باسط اپنے کسی کام سے ملزم کی دکان پر گیا تھا۔ملزم نے باسط کو دکان پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود کہیں غائب ہوگیا۔آدھے پونے گھنٹے کے بعد جب ملزم واپس آیا تو خاصا پریشان نظر آتا تھا۔ملزم نے اس کا کام نہیں کیا اور اگلے دن آنے کو کہا وغیرہ وغیرہ...... پھر تھوڑی

ہی دیر کے بعد پتا چلا کہ آنٹی خدیجہ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس کے بعد جب ملزم کو خدیجہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا تب باسط کو یقین ہو گیا کہ ملزم اسے اپنی دکان پر بٹھا کر آنٹی خدیجہ کو موت کے گھاٹ اتارنے گیا تھا۔

اپنی بات پر میں جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور استغاثہ کے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

''باسط صاحب! آپ یہ گواہی محبت میں دے رہے ہیں یا بغض میں......؟''

''میں سمجھا نہیں!'' وہ پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔

میں نے اتنی آسان سی بات استغاثہ کے گواہ کو سمجھانا ضروری نہ سمجھا اور اگلا سوال کیا۔ ''آپ اپنے کسی کام کے لیے ملزم کے پاس گئے تھے؟''

''میری بیوی نے کئی روز سے میرا جینا حرام کر رکھا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اصل میں ہمارے فریج کا پٹرا (چوکی) ایک دو جگہ سے مرمت مانگتا تھا۔ پٹرے کی اس خرابی کی وجہ سے فریج ہلتا رہتا تھا۔ میں اسی پٹرے کو ٹھیک کرانے اس کی دکان پر گیا تھا۔'' بات کے اختتام پر اس نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے میرے موکل کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

''باسط صاحب! آپ کس دن اپنا پٹرا مرمت کرانے ملزم کی دکان پر پہنچے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جس روز آنٹی خدیجہ کا قتل ہوا۔'' گواہ نے بتایا۔

''اس روز کوئی تاریخ بھی تو ہوگی......؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی، وہ آٹھ فروری کا دن تھا۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''بالکل درست تاریخ بتانے کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ کیا میں آپ سے اس دن کے حوالے سے چند باتیں پوچھ سکتا ہوں؟''

''ضرور پوچھیں جناب۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''میرا حافظہ واقعی بہت اچھا ہے۔ میری بیوی کہتی ہے کہ شاید میں بچپن میں بہت زیادہ بادام کھایا کرتا تھا......''

''آپ کے بارے میں آپ کی بیوی کے فتوے کو میں چیلنج نہیں کروں گا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اچھی طرح سوچ کر بتائیں، وقوعہ کے روز ملزم نے کس رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا؟''

''بھورے رنگ کا شلوار قمیص۔'' اس نے جواب دیا۔

''جیسا کہ عام لکڑی کا رنگ ہوتا ہے۔''

''اور اس دن خاصی تیز دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''ہیں نا......؟''

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس دن تو آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی پھلکی برسات بھی ہوئی تھی۔ موسم خاصا خنک ہو رہا تھا۔ شاید یہ کوئٹہ کی ہواؤں کا اثر تھا۔''

''آپ کی بیوی کی ذہانت کو ماننا پڑے گا باسط صاحب۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کے بارے میں بھابی کی رائے بالکل درست ہے۔ واقعی، آپ کا حافظہ بلا کا ہے۔''

''بس جناب!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''کبھی غرور نہیں کیا۔''

میں نے باتوں باتوں میں عبدالباسط کے منہ سے چند ایسی باتیں نکلوالی تھیں جن کی روشنی میں سکندر بھائی کی دروغ گوئی اور آئی او کے بیان کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی۔

''غرور کرنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔'' میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے کہا اور پوچھا۔ ''باسط صاحب! آپ وقوعہ کے روز کتنے بجے اپنے فریج کا پٹرا ٹھیک کرانے ملزم کی دکان پر پہنچے تھے؟''

''یہی کوئی گیارہ بجے کے قریب۔'' اس نے جواب دیا۔

''ملزم نے آپ کو دکان پر بٹھایا اور خود اپنے کسی کام سے کہیں چلا گیا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر پوچھا۔ ''کیا آپ جانتے ہیں وہ کہاں گیا تھا؟''

''آنٹی خدیجہ کو قتل کرنے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''یہ بات آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''آپ تو ملزم کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہوسکتا ہے، وہ سبزی سودا دینے اپنے گھر گیا ہو......''

اور حقیقت بھی یہی تھی' عابد نے مجھے بتایا تھا کہ وہ باسط کا کام کرنا ہی نہیں چاہتا تھا لہٰذا اسے دکان کی رکھوالی پر بٹھا کر خود اپنے گھر سبزی وغیرہ دینے چلا گیا تھا۔ واپس آکر اس نے باسط سے کہا تھا کہ وہ پٹرا اس کی دکان پر چھوڑ جائے۔ وہ بعد میں ٹھیک کر دے گا۔

''اگر وہ سبزی سودا دینے اپنے گھر گیا ہوتا تو پولیس اسے آنٹی خدیجہ کے قتل کے چکر میں گرفتار کیوں کرتی۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''چند روز پہلے آنٹی خدیجہ سے اس کا جھگڑا بھی ہوا تھا اور اس نے آنٹی کو خطرناک نتائج کی دھمکی

بھی دی تھی۔"

"تم کہیں اس واقعے کا ذکر تو نہیں کر رہے جو بی سی کی وجہ سے رونما ہوا تھا؟" میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی جی، وہی....." وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ملزم نے اس روز آنٹی سے بہت بدتمیزی کی تھی اور اسے الٹی سیدھی دھمکیاں بھی دی تھیں۔"

"کیا تم نے بھی مقتول کے پاس بی سی ڈال رکھی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ "یہ ٹھنڈی پرچی کا کیا معاملہ ہے۔ کیا واقعی ننھے عدیل کو اس بے ایمانی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں وکیل صاحب۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "یہ سب ملزم کے دماغ کا فتور ہے۔ وہ آنٹی خدیجہ سے پھڈا کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے پرچی کو بہانہ بنا لیا۔ ہم سالہا سال سے آنٹی کے پاس بی سی ڈال رہے ہیں اور ہمیں آنٹی سے کبھی شکایت..... نہیں ہوئی۔ اگر ملزم اپنے دعوے میں سچا تھا تو پھر اس نے پرچی کو معتدل ہی کیوں ہونے دیا۔ اسے چاہیے تھا کہ ٹھنڈی ٹھار پرچی نکال کر سب کو دکھاتا۔ اس کی بات میں کوئی صداقت نہیں تھی اس لیے اس نے جان بوجھ کر اتنا وقت لیا تاکہ وہ لوگوں سے کہہ سکے کہ اب تو پرچی نارمل ہو چکی۔ دراصل، وہ لوگوں کو آنٹی کی طرف سے بدگمان کرنا چاہتا تھا۔"

"یہ بات تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں بھی مانتا ہوں کہ میرے موکل نے پرچی کو معتدل ہونے کا موقع دے کر سنگین غلطی کی تھی۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "اسے چاہیے تھا کہ پہلے وہ فریج میں لگی ہوئی ٹھنڈی پرچی کو تسلے میں سے نکال کر لوگوں کو اس کی ٹھنڈک محسوس کراتا پھر جھگڑا شروع کرتا۔"

"جناب! ٹھنڈی پرچی والا کوئی چکر تھا ہی نہیں۔" وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "اس کی بی سی نہیں نکل رہی تھی اور آنٹی خدیجہ کے لیے اس کا دل ودماغ پہلے ہی غصے سے بھرا ہوا تھا اس نے اسی لیے یہ سارا ناٹک کیا تھا۔"

"ویسے آپس کی بات ہے....." میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "مقتول اور ملزم کے بیچ میں اصل جھگڑا تھا کیا؟ کیونکہ آپ پرچی والے واقعے کو تو ایک بہانہ قرار دے رہے ہیں۔"

"جی بالکل۔ پھڈے باز لوگوں کو لڑائی جھگڑے کے لیے معمولی سا بہانہ چاہیے ہوتا ہے اور ملزم ایسا ہی انسان ہے۔ غصے کا تیز، بددماغ اور جھگڑالو۔" وہ ناپسندیدہ نظر سے میرے موکل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اصل مسئلہ اس سے پہلے اس وقت شروع ہوا تھا جب آنٹی نے اپنے کچن کے کسی کام کے لیے ملزم سے رابطہ کیا تھا لیکن اس نے دوگنا کا اسٹیمیٹ دیا۔ بعدازاں وہی کام آنٹی نے ایک دوسرے کارپینٹر سے ملزم کے بتائے ہوئے پیسوں سے آدھے میں کروا لیا تھا۔ آنٹی چونکہ دل اور نیت کی صاف تھیں اس لیے لگی لپٹی نہیں رکھتی تھیں۔ بعض لوگ انہیں منہ پھٹ بھی کہتے ہیں۔ بہرحال....." وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر ایک گہری سانس لینے کے بعد اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"آنٹی نے ملزم کی بے ایمانی کے حوالے سے ادھر ادھر بہت باتیں کی تھیں جو ظاہر ہے، ملزم تک پہنچ گئی تھیں۔ اس نے کئی لوگوں سے کہا کہ وہ بہت جلد آنٹی کو عبرت ناک سبق سکھائے گا پھر پرچی والے تنازع کے موقع پر تو اس نے یہاں تک دھمکی دے ڈالی..... اگر تین روز کے اندر آنٹی نے اس کی بی سی والے پیسے واپس نہیں کیے تو نتائج کی ذمے داری اسی پر ہوگی..... پھر اس واقعے کے پانچویں روز جو نتیجہ برآمد ہوا اس کی وجہ سے آنٹی تو گئیں منوں مٹی کے نیچے اور یہ کمبخت قتل کے مقدمے میں پھنسا ہوا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے..... برے کام کا برا نتیجہ!"

عبدالباسط نے ابھی مجھے جو تفصیلی معلومات فراہم کیں، میں یہ ساری باتیں پہلے سے جانتا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔

"باسط صاحب! ابھی آپ نے کسی دوسرے کارپینٹر کا ذکر کیا ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو مذکورہ بڑھئی کا نام الیاس ہے....."

"جی، آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا۔" وہ جلدی سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "الیاس نے آدھے پیسوں میں آنٹی کے کچن کا بڑا شاندار کام کر دیا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ الیاس نہایت ہی ایمان دار اور اپنے فن کا ماہر شخص ہے۔" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی بالکل۔ ایسا ہی ہے۔"

"اور ملزم آپ کی نظر میں ایک بے ایمان اور جھگڑالو شخص ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اپنا سابق جواب دہرا دیا۔ "جی بالکل۔ ایسا

ہی ہے۔"

"پھر کیا وجہ ہے کہ....." میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ترش لہجے میں استفسار کیا۔"آپ ایک ایمان دار اور کاریگر کارپینٹر کو چھوڑ کر ایک بدتمیز اور بے ایمان بڑھئی کے پاس اپنے فریج کا پٹرا مرمت کرانے پہنچ گئے تھے؟"

ایک لمحے کے لیے وہ گڑبڑا گیا لیکن جلد ہی سنبھلتے ہوئے بولا۔"وہ بات دراصل یہ ہے کہ الیاس ان دنوں کراچی میں تھا نہیں لہٰذا مجبوراً مجھے ملزم کے پاس جانا پڑا کیونکہ میری بیوی پٹرے کی مرمت کے لیے صبح و شام میرے کان کھاتی رہتی تھی....."

"لیکن....." میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔"آپ کے تو دونوں کان مجھے ایک دم سلامت نظر آرہے ہیں۔ان پر دانتوں سے کاٹنے کا کوئی نشان بھی دکھائی نہیں دے رہا.....؟"

"آپ سمجھیں نا جناب۔یہ بات میں نے محاورتاً کہی ہے۔" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔"میرا مقصد یہ تھا کہ بیوی میرا دماغ کھاتی رہتی..... میرا مطلب ہے، وہ بار بار پٹرے کو لے کر میرا دماغ خراب کرتی رہتی تھی۔"

"سمجھ گیا!" میں نے اس کے سر کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا پھر پوچھا۔"وہ آپ نے الیاس کے کراچی سے باہر جانے کی بات بھی محاورتاً تو نہیں کی؟"

"نہیں جناب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔"الیاس واقعی اس روز کراچی میں نہیں تھا۔"

"وہ کہاں گیا ہوا تھا؟" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

عبدالباسط نے جواب دیا۔"حیدرآباد۔"

"کیا وہ خیریت سے حیدرآباد گیا تھا؟"

"جی، وہاں کوئی شادی تھی۔" اس نے بتایا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ خرچہ کرنے حیدرآباد گیا تھا....."

"ظاہر ہے جناب! شادی بیاہ کے مواقع پر انسان کا خرچہ تو ہوتا ہی ہے نا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔"اور اگر شادی کسی قریبی رشتے دار کی ہو تو سمجھو کہ خرچہ دوگنا ہوگا۔"

"اور اس کے ساتھ ہی اگر اس انسان کی بی سی بھی نکلی ہوئی ہو تو پھر سمجھ لو کہ خرچہ تین گنا.....؟" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"بی سی" کے ذکر پر عبدالباسط نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔"آپ کو کس نے بتایا کہ الیاس کی بی سی کھلی تھی؟"

"اس قسم کی خبریں موکلات مجھ تک پہنچاتے ہیں....."

میں نے "موکل" کا بڑا پراسرار استعمال کیا تھا۔عابد میرا موکل تھا جو اس وقت جیوڈیشل ریمانڈ پر تھا۔اس کے ناتے نبیلہ بھی ایک طرح سے میری موکل ہی تھی لہٰذا میں نے استغاثہ کے گواہ عبدالباسط سے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔میں نے "موکل" کی ٹرم نبیلہ ہی کے حوالے سے استعمال کی تھی کیونکہ مقتول کے تمام تر معاملات کی خبریں اسی نے مجھے فراہم کی تھیں۔

باسط میری بات کو کسی اور طرف لے گیا، حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔"آپ وکیل ہیں یا کوئی پہنچے ہوئے عامل کامل جو موکلات سے کام لیتے ہیں؟"

"پیشے کے اعتبار سے تو میں ایک وکیل ہی ہوں اور اس وقت عدالت میں پہنچا ہوا ہوں۔" میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔"لیکن جب کسی کیس کے برتن میں سے سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا تو میں موکلات کی انگلی کو ٹیڑھا کر کے کام چلا لیتا ہوں۔زیرِ سماعت کیس کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔"

"جناب! آپ کی باتیں میرے دماغ میں سما نہیں رہیں۔" وہ الجھن بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس کا سبب بھی میں جانتا ہوں۔" میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے سبب؟" وہ بے حد سنجیدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے معزز عدالت کے روبرو یہ انکشاف کیا تھا کہ آپ کی بیوی نے آپ کا دماغ کھا لیا ہے یا خراب کر دیا ہے۔" میں نے سنجیدہ انداز میں غیر سنجیدہ بات کہہ ڈالی۔"اس نوعیت کی دماغی حالت میں تو عام سی باتیں بھی جگہ نہیں بنا پاتیں، میری مشکل باتیں بھلا کہاں سما پائیں گی....."

"جناب! آپ مذاق کر رہے ہیں نا.....؟" وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔"آپ کے پاس موکلات وغیرہ تو نہیں ہیں نا.....؟"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے بہ الفاظِ دیگر میری تفریح کا کباڑا کرتے ہوئے احتجاجی لہجے میں نعرۂ مستانہ بلند کیا۔"میرے فاضل دوست کافی دیر سے ایسی بے سروپا باتیں کر رہے ہیں جن کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ان کا مقصد استغاثہ کے معزز گواہ کو ہراساں کرنا ہے۔علاوہ

ازیں اس قسم کی بحث سے عدالت کا قیمتی وقت بھی ضائع ہو رہا ہے لہٰذا میری عدالت سے استدعا ہے کہ وکیل صفائی کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

جج نے وکیل استغاثہ کو مایوس نہیں کیا۔ اس کی فرمائش کو فوراً پورا کرتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! استغاثہ کے گواہ پر آپ کی جرح مکمل ہوگئی یا مزید کوئی سوال کرنا چاہیں گے؟''

''جرح تقریباً مکمل ہو چکی۔'' میں نے سرِتسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ ''بس جناب! آخری ایک دو سوال ہیں اور...... نہایت ہی اہم سوالات!''

''بیگ صاحب!'' جج سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''پلیز پروسیڈ۔''

''باسط صاحب!'' میں گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''کیا ہمارے درمیان مذاق کا کوئی رشتہ ہے؟''

''نہیں جناب...... بالکل نہیں۔'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔

''بس تو پھر سمجھ لیں کہ میں بے حد سنجیدہ ہوں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''جس طرح مجھے یہ خبر ملی کہ الیاس کارپینٹر بی سی والے تیس ہزار روپے خرچ کرنے ایک قریبی عزیز کی شادی میں حیدر آباد گیا ہوا ہے اسی طرح میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ وہی بی سی تھی جس کے کھلنے کے موقع پر ''ٹھنڈی پرچی'' والا تنازع کھڑا ہوا تھا۔ دو روز بعد مقتول نے ازراہِ عنایت یہ بی سی الیاس کارپینٹر کو دے دی تھی اور جب آنٹی خدیجہ کا قتل ہوا اس روز الیاس کارپینٹر حیدر آباد میں شادی کے ہنگاموں میں مصروف تھا۔''

''لیکن......'' وہ بے حد الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''الیاس کے حیدر آباد جانے والی بات تو میں نے آپ کو بتائی ہے......؟''

''تو میں نے کب اس حقیقت سے انکار کیا ہے۔'' میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت تم نے بھی میرے لیے ایک موکل کا کردار ادا کیا ہے۔ تم کیا سمجھ رہے تھے کہ میرے پاس وہ چلے اور وظیفے سے قابو کیے جانے والے موکل ہوں گے؟ نہیں جناب! میرے موکل تو گوشت و پوست کے جیتے جاگتے انسان ہی ہیں جو آپ کی طرح مجھے کچھ نہ کچھ بتا کر چلے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی ابھی مجھے ایک موکل نے خبر دی ہے کہ آپ......!''

میں نے اس کے دماغ کو جھٹکا پہنچانے کے لیے بات ادھوری چھوڑی تو وہ ماہیِ بے آب کے مانند تڑپ کر مستفسر ہوا۔ ''کہ...... کیا......؟''

''کہ یہ......'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ حیدر آباد کیوں نہیں گئے۔ یہ شادی تو آپ کے عزیزوں کی بھی تھی......؟''

''یہ بات آپ کو کس نے بتائی......؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

''میرے انکشافات پر حیران ہونا چھوڑ دیں باسط صاحب۔'' میں نے گہری نظر سے اسے گھورا۔ ''آپ کو یقین کر لینا چاہیے کہ میرے موکلات غلط اطلاعات فراہم نہیں کرتے۔ آپ رشتے میں الیاس کارپینٹر کے سالا صاحب ہیں نا......!''

میرے آخری جملے نے گویا اس پر ایٹم بم گرا دیا تھا۔ وہ اتنی بڑی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا لہٰذا مریل سی آواز میں بولا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب لیکن حیدر آباد میں جو شادی چل رہی ہے ان لوگوں سے میری کچھ ناراضی ہے اس لیے رشتے داری کے باوجود بھی اس شادی میں شرکت کرنے نہیں گیا۔''

''یہ آپ کا خاندانی معاملہ ہے اور اس کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں بنتا چنانچہ اس ایشو پر بات کر کے میں عدالت کا وقت برباد نہیں کروں گا۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے تپانے والی نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اب تو ''محبت بغض'' والی بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہوگی باسط صاحب...... آپ کی ملزم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں لیکن چونکہ آپ الیاس کارپینٹر کے سالے صاحب ہیں اور الیاس کارپینٹر مقتول آنٹی خدیجہ سے ان دنوں بہت قریب چل رہا ہے اس لیے آپ نے سوچا کہ اگر آپ کی گواہی سے یہ معاملہ حل ہو جاتا ہے تو یہ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ''یہ بات بھی آپ اپنے موکلوں سے پوچھ لیں نا......''

''تو کیا آپ میرے موکل نہیں ہیں......؟'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔ ''آپ نے پہلے بھی تو مجھے بہت کچھ بتایا ہے...... بتایا ہے کہ نہیں؟''

وہ سٹ پٹائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''آپ کا موکل وہ رہا......'' اس نے ملزموں والے کٹہرے میں

کھڑے عابد کارپینٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''آپ اسے بچانے کی کوشش کریں۔''
''بخدا......'' میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔
''میں پچھلے تین ماہ سے اپنے موکل کی باعزت بریت کے لیے ہی کوشاں ہوں اور الحمدللہ، اس تگ ودو میں مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آپ کے تعاون کے لیے میں تہ دل سے شکرگزار ہوں۔''

قبل اس کے کہ عبدالباسط میری اس بات کے جواب میں کچھ کہتا، عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''یور آنر! اس کیس کی گاڑی اب پٹری پر دوڑنے لگی ہے۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ کم کم وقفے کی تاریخیں دے کر اس کیس کو جلد از جلد نمٹا دیا جائے۔''

''عدالت کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ کوئی کیس خوامخواہ طوالت اختیار نہ کرے۔'' جج نے کہا۔ ''حقائق اگر تعطل کا شکار ہو جائیں تو ان کا حلیہ بگڑنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔''

ان کلمات کے بعد جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ ملزم عابد کی بیوی نبیلہ ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتی تھی۔ ہم عدالت کے کمرے سے باہر نکلے تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

''وکیل صاحب! آپ اب تک کی عدالتی کارروائی سے مطمئن ہیں نا؟''

''آپ کو کیا لگتا ہے؟'' اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا میں نے اسی سے سوال کر ڈالا۔ ''آپ بھی تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں؟''

''میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ ہم دھیرے دھیرے کامیابی کی جانب بڑھ رہے ہیں۔'' وہ میرے ساتھ کوریڈور میں چلتے ہوئے بولی۔ ''لیکن ہماری رفتار کافی سست ہے۔ میں چاہتی ہوں، ہم جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔''

''میں آپ کی اس خواہش کو غلط نہیں کہوں گا کیونکہ آپ کے گھر کا سربراہ پچھلے تین ماہ سے پولیس اور عدالت کے چکروں میں پھنسا ہوا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر میں سمجھتا ہوں، ایک حوالے سے آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔''

''کس حوالے سے......؟'' وہ چلتے چلتے اچانک رک گئی۔ ''اور کیسی غلط فہمی؟''

''اس کیس کو عدالت میں لگے ابھی بہ مشکل تین ماہ ہوئے ہیں۔'' میں نے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔ ''اس قلیل مدت میں، میں نے کوشش کر کے کیس کو ایک خاص سمت میں ڈال دیا ہے ورنہ قتل کے مقدمات میں تو سال چھ ماہ ایسے ہی نکل جاتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''میرا ابھی عدالتی بکھیڑوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ یہ پہلا تجربہ ہے۔''

''انسان تجربات ہی سے سیکھتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور تلخ تجربات کچھ زیادہ ہی پڑھا سکھا کر جاتے ہیں۔''

''ہاں، یہ بھی ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''ابھی تک جتنی عدالتی کارروائی ہوئی ہے اس میں میری جرح کے نتیجے میں استغاثہ کی کمزوریاں اور اس کے گواہوں کی غلط بیانیاں عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ ہو چکی ہیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''ہمیں اپنے بندے پر فوکس رکھنا چاہیے۔ استغاثہ میں جتنے زیادہ ڈینٹ پڑیں گے، عابد کی بے گناہی اتنی ہی مضبوط اور مسلم ہوتی چلی جائے گی۔ میری یہ کوشش ہے کہ آپ کا شوہر اس کیس سے باعزت بری ہو جائے۔ آنٹی خدیجہ کو کس نے قتل کیا ہے یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے اور اگر......'' میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر اس کوشش میں قاتل بھی بے نقاب ہو جاتا ہے تو یہ اس کیس کا بونس ہوگا اور...... پولیس والوں پر ہمارا احسان بھی۔ میری بات آپ کی سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''

وہ اثبات میں گردن ہلا کر بولی۔ ''جی، سمجھ گئی!''

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے مقتول کی بیٹی مہ جبیں کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ مہ جبیں واجبی سی شکل صورت کی مالک ایک سانولی سی لڑکی تھی۔ اس کی عمر بیس کے قریب رہی ہوگی تاہم پائل بہ فربہی بدن کی بدولت وہ پچیس سے کم کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مہ جبیں کو دیکھ کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اس اللہ کی بندی نے گھر کی بالائی منزل پر سلمنگ اینڈ بیوٹی جیم صرف اور صرف اپنی خاطر کھولا تھا۔

مہ جبیں کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ نے چند سوالات میں اسے فارغ کر دیا۔ وکیل مخالف کی جرح کا فوکس ملزم کی غصیلی فطرت اور جھگڑالو طبیعت پر تھا۔ خاص طور پر اس نے ملزم کی خطرناک دھمکی کو ہائی لائٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اس کیس کا ایک نازک پہلو تھا۔

اگر کسی معاملے میں زید، بکر کو خوف ناک نتائج کی دھمکی دے اور اس طیش بھری دھمکی کی سماعت کے گواہ بھی موجود ہوں پھر چند روز بعد بکر کو قتل کر دیا جائے تو زید کی ذات کو شک کے دائرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی صورت حال میں پولیس سب سے پہلے زید ہی کو حراست میں لے گی۔ عابد کے معاملے میں بھی یہی سب ہوا تھا اور سونے پر سہاگا یہ کہ مقتول کے ورثا نے باقاعدہ میرے موکل کو قتل کی اس واردات کا ذمے دار بھی ٹھہرایا تھا۔

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا پھر کٹہرے میں کھڑی مہ جبیں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کیسی ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے ہلکے پھلکے انداز کو برقرار رکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''آپ کا جیم کیسا چل رہا ہے؟''

''ٹھیک ٹھاک۔'' اس نے دوبارہ مختصر بات کی۔

''آپ جیم میں کس قسم کی ٹریننگ دیتی ہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''بنیادی طور پر میں وہاں آنے والی خواتین کو صحت مند اور تندرست رہنے کی تربیت دیتی ہوں۔'' وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگی۔ ''اس میں ڈائٹنگ، ایروبکس اور یوگا سب شامل ہے۔''

''اوہ...... تو آپ یوگا کی کلاسز بھی لیتی ہیں؟'' میں نے دلچسپی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''جی بالکل۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''ایک ذاتی نوعیت کا سوال ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو پوچھ لوں......؟''

مہ جبیں کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ مجھے اپنی ذات کو چھونے کی اجازت نہیں دے گی لیکن چند لمحات کے تذبذب کے بعد وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''جی پوچھ لیں......''

میں نے پوچھا۔ ''مہ جبیں جی! آپ اس وقت گریجویشن کر رہی ہیں۔ اس حساب سے آپ کی عمر بیس کے آس پاس ہونا چاہیے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں اس وقت اکیسویں سال میں ہوں۔'' وہ رسانیت بھرے لہجے میں بولی۔ ''میرے میٹرک اور انٹر کے بیچ میں ایک سال کا گیپ ہے لیکن میں ابھی تک آپ کے سوال کے مقصد تک نہیں پہنچ پائی۔''

''میں پہنچاتا ہوں۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر اپنے مقصد کی سمت بڑھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''اگر میں اگین غلطی نہیں کر رہا تو آپ اپنی جسامت سے پچیس سے اوپر کی لگتی ہیں۔ کیا آپ کو خود پر توجہ دینے کا وقت نہیں ملتا؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل سرکار نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''عدالت میں اس وقت خدیجہ مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور میرے فاضل دوست یہاں جیم کھولے بیٹھے ہیں۔ میں ان کی چال کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ جج وکیل استغاثہ کے جواب میں کچھ کہتا، میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور خاصے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

''میرے محترم! کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ میں کس نوعیت کی سازش کرنے میں مصروف ہوں اور میری اس سازش سے زیر سماعت کیس پر کون کون سے مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں کیونکہ آپ نے ابھی دعویٰ کیا ہے کہ آپ میری چال کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں......''

''آپ استغاثہ کی گواہ کو غیر متعلقہ اور غیر ضروری

شوخیاں

☆ ہر فرد کسی نہ کسی کے لیے عجیب کے زمرے میں آتا ہے۔

☆ دوسروں کی غلطی سے سبق سیکھنا چاہیے کیونکہ یہ تمام غلطیاں آپ خود مختصر سی زندگی میں نہیں کر سکتے۔

☆ مشکل میں بھی اگر کوئی مسکرا رہا ہو تو جان لیں کہ اس کو مسئلے کا ذمے دار ٹھہرانے کے لیے کوئی اور مل گیا ہے۔

☆ جب کسی احساس کا قتل ہو جائے تو لاش کو سینے سے لگا کر بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ اسے وقت کے قبرستان میں دفنا کر گھر واپس چلے آؤ۔

☆ جو لوگ ہنسنا بھول جاتے ہیں وہ کھنڈر ہو جایا کرتے ہیں۔ ویران اور اجاڑ کھنڈر۔

☆ تین خواتین میں راز اس وقت راز رہ سکتا ہے جب ان میں دو انتقال کر جائیں۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بفل ہزارہ

باتوں میں الجھا کر اس کا موجودہ کیس سے دھیان ہٹانا چاہتے ہیں۔'' وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

''اگر استغاثہ کی گواہ کی توجہ زیرِ سماعت کیس سے چند لمحات کے لیے ہٹ جائے گی تو اس سے میرا کیا بھلا ہوگا؟'' میں نے ترکی بہ ترکی سوال کیا۔ ''اور آپ کو کون سا نقصان پہنچے گا؟''

وکیلِ استغاثہ میرے سوالات کے جوابات دینے کے بجائے خجالت آمیز انداز میں حاضرینِ عدالت کو دیکھنے لگا۔ جج نے اس موقع پر مداخلت کرتے ہوئے براہِ راست مجھ سے استفسار کیا۔

''بیگ صاحب! کیا جیم کے ذکر کا موجودہ کیس سے کوئی کنکشن ہے؟''

''بڑا مضبوط کنکشن ہے یور آنر!'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''نمبر ایک، استغاثہ کی گواہ مہ جبیں صاحبہ کا جیم جائے وقوعہ کے عین اوپر بالائی منزل پر ہے۔ نمبر دو، جس وقت یہ واقعہ پیش آیا تب مہ جبیں گھر میں موجود نہیں تھی.....'' میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کو خلط ملط کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا۔ ''نمبر تین، جب مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو وہ گھر میں اکیلی تھی۔ نمبر چار، مقتول ہائی بلڈ پریشر اور عارضۂ قلب میں مبتلا تھی لیکن مہ جبیں کی بتائی ہوئی کسی بھی ترکیب پر وہ عمل نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ مہ جبیں پر بھروسا نہیں کرتی تھی۔ نمبر پانچ.....''

''بیگ صاحب!'' جج نے میری بات پوری ہونے سے پہلے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ بڑی عجیب بات کر رہے ہیں۔ ایک ماں اپنی بیٹی پر بھروسا کیوں نہیں کرے گی.....؟''

''جنابِ عالی! یہ بڑا نازک اور اہم نکتہ ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے ڈرامے میں رنگ بھرتے ہوئے پراسرار لہجے میں کہا۔ ''اور میں اس کی وضاحت کرنے ہی والا تھا کہ وکیلِ استغاثہ نے بیچ میں ٹانگ پھنسا دی.....'' بات کے اختتام پر میں نے خفگی بھرے انداز میں وکیلِ مخالف کو گھورا۔

میری چال کامیاب رہی، میرا چلایا ہوا تیر عین نشانے پر جا کر بیٹھا تھا۔ جج نے معتدل انداز میں کہا۔

''بیگ صاحب! آپ جرح جاری رکھیں۔''

''مہ جبیں صاحبہ!'' میں دوبارہ استغاثہ کی گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''آپ اپنے وزن کی وجہ سے چار پانچ سال بڑی دکھائی دیتی ہیں۔ آپ دوسری عورتوں کو سلم اینڈ اسمارٹ رہنے کی ٹریننگ دیتی ہیں۔ آپ کو سب سے پہلے خود پر توجہ دینا چاہیے۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو آپ مجھے ٹوک دیجیے گا اور اگر آپ کو میرا سوال برا لگا ہو تو آپ مجھے روک دیجیے گا۔''

''آپ کے سوال سے مجھے کوئی ایشو نہیں ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔ ''باقی جہاں تک خود پر توجہ دینے کا معاملہ ہے تو یہ بات مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا لیکن میں اپنی دو کمزوریوں کے باعث مجبور ہو جاتی ہوں اور وزن کو کنٹرول میں رکھنا میرے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔''

''ماشاءاللہ! آپ کمزور دکھتی تو نہیں ہیں۔'' میں نے معنی خیز نظر سے اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''خیر، عدالت آپ کی ان دو کمزوریوں کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہے جن کا ابھی آپ نے ذکر کیا ہے؟''

''ایک تو مجھے کھانے پینے کا بہت شوق ہے۔'' وہ قدرے ندامت آمیز لہجے میں بتانے لگی۔ ''مجھے بھوک بہت زیادہ لگتی ہے اور جب بھوک لگتی ہے تو پھر مجھ سے صبر نہیں ہوتا اور میں تمام حدود کو پھلانگ جاتی ہوں۔ اس متجاوزانہ عادت کی وجہ سے ہفتہ دس دن کی محنت اکارت جاتی ہے۔ میں نے کڑی کوشش سے دو ہفتوں میں جتنا وزن کم کیا ہوتا ہے وہ ایک دو بار کی بدپرہیزی سے ٹھکانے لگ جاتا ہے۔''

''کھانا جن لوگوں کی کمزوری ہوتی ہے ان بے چاروں کے ساتھ یہ مسئلہ تو رہتا ہی ہے۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی ایک کمزوری عدالت کے ریکارڈ پر آچکی۔ اب آپ اپنی دوسری کمزوری کے بارے میں بھی بتا دیں؟''

''دوسری کمزوری میرا فیملی ایشو ہے۔'' اس نے کہا۔

''فیملی ایشو.....!'' میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''پلیز..... آپ آسان الفاظ میں اس کی وضاحت کر دیں۔''

میں نے نبیلہ کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں مقتول کے گھرانے پر اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی تھی اور مہ جبیں سے پوچھے گئے ہر سوال کے پیچھے میرا ایک خاص مقصد چھپا ہوا تھا۔ میں استغاثہ کے گواہ کی زبان سے عدالت کے ریکارڈ پر ایسے حقائق کو محفوظ کرانا چاہتا تھا جو کسی بھی حوالے سے میرے موکل کے لیے مفید اور ممد ثابت ہوں۔ وکلا حضرات عموماً اپنے گواہوں اور ان کے فراہم کردہ ثبوت وشواہد پر زیادہ بھروسا کرتے ہیں لیکن میری

ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ میں اپنی پُرمعنی جرح سے مخالف پارٹی کے گواہوں کو اس طرح مانجھتا ہوں کہ ان کی زبان سے اپنے حق میں باتیں اگلوا لیتا ہوں اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ میں نے ان کے ساتھ کون سا ہاتھ کر دیا ہے۔ اس وقت میں استغاثہ کی گواہ اور مقتول کی بیٹی مہ جبیں پر بھی یہی حربہ آزما رہا تھا۔ میرے استفسار کے جواب میں اس نے بتایا۔

''میرے ننھیال میں اوورویٹ کا مسئلہ پایا جاتا ہے......''

''ایک منٹ!'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور مصنوعی الجھن چہرے پر طاری کرتے ہوئے کہا۔ ''یعنی آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ کو مٹاپے کی خاصیت والدہ کی طرف سے ملی ہے؟''

''جی بالکل۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ننھیال کا مطلب والدہ اور اس کا خاندان ہی ہوتا ہے۔''

''لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے......!'' میں نے اپنی جرح کو معنی خیزی کا بگھار لگاتے ہوئے کہا۔

اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''یہ کیوں نہیں ہوسکتا؟''

''میری معلومات کے مطابق آپ کی والدہ یعنی مقتول خدیجہ تو ایک دھان پان سی عورت تھی۔'' میں نے حیرت کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اسے کسی بھی قیمت پر فربہ یا مائل بہ فربہی نہیں کہا جاسکتا تھا۔''

''آپ کی معلومات ادھوری ہیں وکیل صاحب۔'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''شاید نہیں بلکہ یقیناً آپ کو یہ بات معلوم نہیں کہ خدیجہ آنٹی میری سگی ماں نہیں تھیں۔'' اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

''کک......کیا......؟'' میں نے اپنی اداکاری جاری رکھی۔ ''یہ تو آپ نے بڑی عجیب اور انہونی بات کر دی۔''

مہ جبیں کے سنسنی خیز انکشاف نے جج، وکیل استغاثہ، آئی او سمیت تمام حاضرین عدالت کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور وہاں موجود لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔ اس موقع پر جج کو مداخلت کرنا پڑی۔

''آرڈر، آرڈر......'' جج نے بہ آواز بلند کہا۔ ''عدالت کے وقار کا خیال رکھا جائے۔ خاموشی پلیز......''

جج کی تحکمانہ اپیل پر اگلے ہی لمحے عدالت کے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ جج نے وال کلاک کی جانب دیکھنے کے بعد مجھ سے کہا۔

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ......!''

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں خشوع وخضوع کے ساتھ استغاثہ کی گواہ مہ جبیں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''تو آپ معزز عدالت کو یہ بتانا چاہتی ہیں کہ مقتول آنٹی خدیجہ آپ کی سگی والدہ نہیں تھیں؟''

''جی یہی حقیقت ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میری ماں کا نام یاسمین تھا۔''

''تھا......کا تو یہ مطلب ہوا نا کہ یاسمین صاحبہ اب اس دنیا میں باقی نہیں ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی، پانچ سال پہلے میری ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔'' وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''میری ماں کافی فربہ تھیں۔ ان کے انتقال کے ایک سال بعد ابو نے ایک بیوہ عورت سے شادی کرلی تھی یعنی آنٹی خدیجہ سے۔ آنٹی خدیجہ کا شوہر فرقان علی چھ سال پہلے اللہ کو پیارا ہوگیا تھا۔''

''مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ میں نے یاسمین صاحبہ کا تذکرہ چھیڑ کر آپ کو غم زدہ کر دیا ہے۔'' میں نے مہ جبیں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ میرے پیشے کی مجبوری اور عدالتی کارروائی کا تقاضا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ سادے سے لہجے میں بولی۔ ''آپ شرمندہ نہ ہوں۔''

''مقتول آنٹی خدیجہ سے لگ بھگ چار سال پہلے آپ کے والد نے شادی کی تھی۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''عدیل کی عمر اس وقت کم وبیش سات سال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عدیل آپ کے والد کی اولاد نہیں ہے......''

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''عدیل مقتول آنٹی خدیجہ اور مرحوم فرقان علی کی اولاد ہے۔ جب ابو نے آنٹی خدیجہ سے شادی کی تو عدیل محض تین سال کا تھا۔''

''مہ جبیں صاحبہ!'' میں نے اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ اپنے جِم میں یوگا کی کلاسز بھی لیا کرتی ہیں؟''

''جی، میں نے اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔'' اس نے کہا۔

''جہاں تک میری معلومات ہیں، یوگا انسان کے جسم کو صحت، توانائی اور خوب صورتی دینے کے علاوہ اس کے من کی

تطہیر بھی کرتا ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔'' باقاعدہ یوگا کرنے والے انسان کی آنکھوں میں مقناطیسی چمک پیدا ہو جاتی ہے، اس کی صورت میں تازگی اتر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی روح پاکیزہ اور دل آئینے کے مانند صاف وشفاف ہو جاتا ہے یعنی وہ ایک سچا اور کھرا انسان بن جاتا ہے...... ریاکاری سے پاک، ہر حال میں سچ بولنے والا اور سچائی کا ساتھ دینے والا۔''

''آپ کی معلومات صد فیصد درست ہیں وکیل صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''یوگا انسان میں ایسا ہی بدلاؤ لاتا ہے۔''

''یہ تو ہم ایک عام یوگا کرنے والے انسان کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کی بات کر رہے ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر کسی یوگا انسٹرکٹر کا ذکر کیا جائے تو ان خصائل کو سو سے تو لازمی ضرب دینا ہوگا۔ ہیں نا......!''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور متذبذب لہجے میں بولی۔ ''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

وہ بخوبی سمجھ گئی تھی کہ میرا اشارہ اسی کی جانب ہے اسی لیے میری بات سنتے ہی اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''مجھے ایک سیریس معاملے میں آپ کا تعاون درکار ہے...... سچا اور کھرا تعاون، ہر مصلحت سے پاک...... دروغ گوئی سے کوسوں دور......!''

''آپ کس سیریس معاملے کی بات کر رہے ہیں۔'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کھل کر بتائیں، میں پوری دیانت داری سے آپ کو جواب دوں گی۔''

''یہ پی سی والی ٹھنڈی ٹھار پرچی کا کیا قصہ ہے؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''معزز عدالت حقائق جاننا چاہتی ہے۔''

''اس حوالے سے ملزم عابد کا شک درست ہے۔'' وہ بے خوف وخطر مستحکم لہجے میں بولی۔ ''آنٹی خدیجہ نے واقعی عدیل کو ٹریپ کر رکھا تھا۔''

میں نے اچانک استغاثہ کی گواہ سے ایک عجیب سوال پوچھ لیا۔ ''کیا آپ کو ڈرائیونگ آتی ہے؟''

''جی!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے سوال کیا۔ ''کیا آپ نے بھی سکندر بھائی ہی سے ڈرائیونگ سیکھی تھی؟''

''اس مردود کا نام نہ لیں۔'' وہ اچانک بھڑک اٹھی۔ ''میں اس کمینے سے شدید نفرت کرتی ہوں......''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

☆☆☆

وٹنس باکس میں استغاثہ کا آخری گواہ یعنی مقتولہ آنٹی خدیجہ کا شوہر رؤف احمد کھڑا تھا۔ رؤف کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس وقت رؤف کے چہرے پر گہری سنجیدگی نے ڈیرا ڈال رکھا تھا اور یہ سنجیدگی پریشانی فکرمندی اور تذبذب کا مجموعہ نظر آتی تھی۔ میں نے رؤف سے جرح کے لیے بڑی خاص الخاص تیاری کی تھی۔ وکیل استغاثہ نے مقتولہ کے شوہر کو فارغ کیا تو میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میں مقتولہ کے شوہر سے بنیادی طور پر صرف ایک سوال کروں گا لیکن اس خاص سوال سے پہلے میں معزز عدالت کے روبرو ایک دلچسپ ڈیمو دینا چاہتا ہوں۔ مذکورہ ڈیمو انتہائی غیر متعلق اور غیر ضروری دکھائی دے گا لہٰذا فاضل وکیل سے میری درخواست ہے کہ وہ دوران اس مظاہرہ مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہ کریں۔''

جج نے وکیل استغاثہ کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''مجھے منظور ہے جناب عالی۔''

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے کہا۔ ''آپ ڈیمو شروع کر سکتے ہیں لیکن عدالت کے قیمتی وقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے......''

''آف کورس یور آنر۔'' میں نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میری یہ کوشش عدالت کا وقت بچانے کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔''

پھر میں اپنے بیگ کی جانب بڑھ گیا۔ اس روز میں اپنے ساتھ بریف کیس کے علاوہ ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ بھی لے کر آیا تھا جس کے اندر ڈیمو کا مخصوص سامان بھرا ہوا تھا۔ میں نے مذکورہ سامان کو باہر نکال لیا اور وٹنس باکس کے قریب چلا آیا۔

''یہ ڈو کلے (Dough Clay) ہے۔'' میں نے آٹے کی طرح گندھی ہوئی ایک مخصوص مٹی استغاثہ کے گواہ رؤف احمد کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟''

''زیادہ نہیں۔'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں نے بچوں کو اس مٹی سے کھیلتے دیکھا ہے۔''

''اتنی جان کاری بھی کافی ہے۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ مٹی انتہائی بے ضرر ہے کیونکہ یہ ننھے منے بچوں کے لیے ایک کھلونے کی حیثیت رکھتی ہے۔''

''جی، میں نے دیکھا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بچے مختلف سانچوں میں اس مٹی کو بھر کر اسی سانچے کی ساخت کے کھلونے تیار کرتے ہیں۔''

''واہ بھئی وا......!'' میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تو میری مشکل ہی آسان کر دی۔ لگتا ہے، آپ بھی میری طرح عدالت کا وقت بچانے کا ارادہ باندھ کر گھر سے نکلے ہیں۔ میں تو آپ کو سانچوں میں ڈو کلے بھر کر اس کھلونا سازی کا عملی مظاہرہ دکھانا چاہتا تھا۔ اس بیگ کے اندر کئی سائز اور ساخت کے پلاسٹک کے بنے ہوئے سانچے موجود ہیں......'' لحاتی توقف کر کے میں نے مذکورہ بیگ میں سے درجن بھر سانچے نکال کر گواہ کی آنکھوں کے سامنے لہرائے پھر انہیں دوبارہ ڈو کلے سمیت واپس بیگ کے اندر رکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن اب اس ڈیمو کی ضرورت نہیں رہی۔ آپ سانچوں اور ان کے اندر ڈھالی گئی اشیا کے عمل سے گہری واقفیت رکھتے ہیں...... ہیں نا؟''

''یہ کون سی راکٹ سائنس ہے وکیل صاحب!'' وہ ایک گہری اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''کسی سانچے میں جو بھی چیز بھریں گے، وہ اسی شکل کی تیار ہو کر نکلے گی۔ کیک، موم بتی، قلفی، صابن کی ٹکیا...... الغرض بے شمار چیزیں اسی عمل سے مختلف اشکال میں ڈھال کر تیار کی جاتی ہیں۔ سانچے ان اشیا کی تیاری میں قالب کا کردار ادا کرتے ہیں۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے رؤف صاحب۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''آپ تو ماشاءاللہ اچھے خاصے سمجھ دار انسان ہیں۔''

''اب وہ اکلوتا سوال......'' وکیلِ استغاثہ سے رہا نہ گیا۔ اپنی عادت سے مجبور ہو کر وہ بول ہی پڑا۔ ''ڈیمو کی تو ضرورت نہیں رہی......؟''

''ہاں، وہ اکلوتا سوال......'' میں نے خشمگیں نگاہ سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر اس کے پیٹ میں اٹھنے والے مروڑ کا شافی علاج کرنے کی خاطر میں استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''رؤف صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر اپنے وعدے کے مطابق سوال کیا۔ ''آپ کی بیٹی مہ جبیں ڈرائیونگ انسٹرکٹر سکندر بھائی سے شدید نفرت کرتی ہے۔ پچھلی پیشی پر مہ جبیں نے اس شخص کے لیے ''مردود اور کمینے'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ آپ کو یہ بندہ کیسا لگتا ہے؟''

''میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''حیرت کی بات ہے، یقین نہیں آرہا۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جس شخص کو آپ ناپسند کرتے ہیں اور آپ کی بیٹی جس سے نفرت کرتی ہے وہ بندہ آپ کی بیوی کو ڈرائیونگ سکھاتا رہا اور اب اس کا نام استغاثہ کے گواہوں میں شامل ہے......؟''

''خدیجہ نے مجھے بتائے بغیر اس کے ڈرائیونگ اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے خدیجہ کو روک دیا تھا اور جہاں تک استغاثہ کے گواہوں کی فہرست کا معاملہ ہے تو یہ سوال آپ جا کر پولیس سے کریں۔ میں نے ہرگز انہیں ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔''

''پولیس کے پاس جا کر پوچھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے کیونکہ پولیس تو چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہے۔'' میں نے تفتیشی افسر مقصود علی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا پھر رؤف سے پوچھا۔ ''آپ کے بقول آپ نے مقتول خدیجہ کو سکندر بھائی سے ڈرائیونگ سیکھنے سے روک دیا تھا لیکن یہ بندہ تو اس کے بعد بھی آپ کے گھر پر آتا رہا ہے......؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ بولنا شروع کیا۔ ''میرا موکل ایک بے گناہ شخص ہے۔ اسے ایک گہری سازش کے تحت قتل کے اس معاملے میں پھنسایا گیا ہے۔ پولیس کے پیش کردہ چالان میں موجود چند ایک سقم کی میں نشاندہی کر چکا ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ تاحال پولیس آلۂ قتل برآمد نہیں کر سکی۔ علاوہ ازیں استغاثہ کے گواہوں کے بیانات میں بھی بعض مقامات پر دروغ گوئی سے کام لیا گیا ہے جو میں مختلف پیشیوں پر وقتاً فوقتاً عدالت کے ریکارڈ پر لا چکا ہوں جس سے استغاثہ کی بدنیتی ظاہر ہوتی ہے۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ وہ ملزم عابد کو باعزت بری کرنے کے احکامات صادر کر دے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ملزم مزاجاً بہت غصہ ور

...اور جھگڑالو ہے۔ یہ غلط بات سن کر فوراً طیش میں آجاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملزم نے آنٹی خدیجہ کو قتل نہیں کیا۔ ہاں البتہ......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے جج کی طرف دیکھا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''اگر معزز عدالت کی اجازت اور تفتیشی افسر کی خواہش ہو تو میں آلۂ قتل کے سلسلے میں کچھ مدد کر سکتا ہوں۔''

انکوائری آفیسر، وکیلِ استغاثہ اور جج نے بیک وقت چونک کر کھوجتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ جج نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''بیگ صاحب! آپ کس قسم کی مدد کی بات کر رہے ہیں؟''

''یور آنر! میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ......'' میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ''قاتل نے جس خنجر کی مدد سے آنٹی خدیجہ کو موت کے گھاٹ اتارا اسے کبھی تلاش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ تحلیل ہو چکا ہے......''

''عدالت کو تفصیل سے بتائیں۔'' جج بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی بات اگرچہ عجیب سی محسوس ہو رہی ہے لیکن اس کے اندر وزن ہے۔''

''جناب میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ آلۂ قتل پانی کا بنا ہوا تھا۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''اسی لیے مقتول کے سینے سے خارج ہونے والا خون نسبتاً پتلا ہو گیا تھا کیونکہ اس خون کے اندر آلۂ قتل کا پانی بھی شامل ہو گیا تھا۔''

''بات بنی نہیں......'' جج کی استفساریہ نگاہ مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ ''عدالت جاننا چاہتی ہے کہ پانی سے بنا ہوا آلۂ قتل مقتول کے سینے میں کیسے اترا......؟''

''اس نازک اور حساس سوال کا جواب دورِ حاضر کے ایک بے نام سائنس داں سے پوچھتے ہیں۔'' میں نے اپنے بیگ کی طرف جاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس مسٹری کی ہسٹری وہی بتا سکتے ہیں۔''

عدالت کے کمرے میں موجود ہر نفس کی نظر مجھ پر جمی ہوئی تھی اور ماحول پر سکوت طاری تھا۔ تکنیکی اعتبار سے اسی نوعیت کی خاموشی کو ''پن ڈراپ سائلنس'' کہا جاتا ہے۔ میں نے اپنے بیگ کے اندر سے ایک بڑے سائز کا سانچہ نکال کر استغاثہ کے گواہ رؤف احمد کی نگاہ کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

''آپ اس سانچے کو پہچانتے ہیں؟''

میرے ہاتھ میں موجود مذکورہ سانچے کو دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''یہ......آپ کو کہاں......سے ملا......؟''

رؤف کے اضطراری اور اضطرابی ردعمل نے اس کیس کا پاسا پلٹ دیا۔ خنجر کے سائز اور ساخت کا وہ سانچہ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

''یہ سانچہ جائے وقوعہ پر تمہارے سامان کے اندر سے ملا ہے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ مریل سی آواز میں بولا۔ ''میں نے تو اسے گٹر میں پھینک دیا تھا۔''

''تو پھر سمجھ لو کہ تمہارا پھینکا ہوا سانچہ ابھی تک اسی گٹر میں کہیں پڑا ہوگا یا پانی میں بہہ کر سمندر کی گود میں سما چکا ہوگا۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اور تمہاری زبان کھلوانے کے لیے مجھے یہ ڈراما رچانا پڑا۔''

''پپ......پانی......'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

''تمہیں پانی پلانے کے لیے واٹر بورڈ کے آفس فون کر دیا گیا ہے۔'' میں نے کاٹ دار آواز میں کہا۔ ''اب تم جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے بیٹھ کر خوب پانی پینا اور اگر کوئی سانچہ مل جائے تو برف کے کھلونے بھی تیار کرنا......''

پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور اس کیس کو فائنل ٹچ لگاتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! مقتول کا شوہر ایک آئس کریم فیکٹری میں کام کرتا ہے لہٰذا یہ فریزنگ کے قواعد و ضوابط سے اچھی طرح واقف ہے۔ یہ اپنی بیوی کی بے وفائی سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اس نے بہت سوچا اور آخرکار اسی نتیجے پر پہنچا کہ برائی کی جڑ کو ہی اکھاڑ پھینکے۔ ایک سکندر بھائی کو ختم کرنے سے کوئی دوسرا سکندر بھائی پیدا ہو سکتا تھا۔ اس نے آنٹی خدیجہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے سخت برف کا ایک خنجر تیار کیا۔ پھر اپنا کام کرنے کے بعد اس نے سیلنگ فین کو فل اسپیڈ پر آن کر دیا تاکہ برف کا خنجر جلد از جلد پگھل کر پانی کی صورت اختیار کر لے۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس آلۂ قتل کو برآمد کرنے میں ناکام رہی اور مقتول کے لباس پر لگا ہوا خون اس کے اصل خون سے کافی پتلا تھا۔ میں نے اس کیس کو اتنا آسان کر دیا ہے کہ پولیس ایک گھنٹے کے اندر مقتول کے شوہر سے اقبالِ جرم کروا سکتی ہے۔ ویٹس آل یور آنر......!''

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل عابد کو باعزت بری کر دیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

شکنجہ

انجم فاروق ساحلی

بے شک علم بہت بڑی نعمت ہے مگر.. کیا کیا جائے جب قانون کے رکھوالے ہی اپنے علم اور عمل کے تضاد پر فخر محسوس کریں... اسے بھی سب معلوم تھا کہ کیسے جرم اور مجرم کو پکڑا جاسکتا ہے اور کیسے انہیں تحفظ دیا جاسکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر بار ہی اس کے کامیابی قدم چومتی... اور اس بار تو جب اپنے ہی دوستوں نے مجرمانہ کارروائیوں کی جانب اٹھنے والے تمام قدموں میں زنجیر ڈالی تو حیرت سے وہ گنگ رہ گیا۔

قانون کے شکنجے میں پھنسنے والے ایک پولیس آفیسر کا

دلچسپ ماجرا

ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ پڑتے ہی پرانی کار نے ایک زوردار جھٹکا لیا اور کچی سڑک پر مڑ گئی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس نے ہیڈ لائٹس جلا دیں۔ 93 ماڈل کی سیکنڈ ہینڈ مزدا تمام تر قوت سے ناہموار زمین پر دوڑ رہی تھی۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ کار کی رفتار تیز ہوتے ہی وہ غیر ارادی طور پر محتاط ہو گیا۔ آگے صنوبر کا گنجان سلسلہ تھا۔

”مجھے افسوس ہے ڈیئر!“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”کاش میرے پاس اتنی رقم ہوتی کہ تمہارے لیے کوئی قیمتی گھڑی خرید سکتا۔“

”چھوڑو بھی۔“ شیلا ناگواری سے بولی۔ ”تم جیسے شخص سے شادی کرنا میری سب سے بڑی حماقت تھی۔ شادی سے پہلے کتنی ڈینگیں مارا کرتے تھے کہ تمہارے لیے آسمان کے تارے بھی توڑ لاؤں گا۔ مگر اب ہونہہ......“

وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر شدید بیزاری کے آثار ابھرے۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

''میں بے حد مجبور ہوں شیلا۔'' سام ہینڈرسن کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔ ''ویسے میں جلد ہی تمہیں ایک رسٹ واچ گفٹ کروں گا۔''

''میں تو وہی گھڑی لوں گی جو ''اسکائی لارک'' میں دیکھی تھی۔'' شیلا نے ترش روئی سے کہا۔

''لیکن ذرا میری مجبوری پر بھی......''

''تم تو ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنی ازلی مجبوری کا دکھڑا لے کر بیٹھ جاتے ہو۔''

''ڈارلنگ! یہ حقیقت ہے۔''

''تم جیسے پیدائشی کاہلوں سے کوئی توقع نہیں۔'' شیلا نے منہ بنایا اور اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''اپنی گندی زبان بند کرو۔'' سام جھلا کر چیخا۔ ''ذرا اپنے متعلق بھی سوچ لو۔ نہ کام نہ کاج، نہ سلیقہ، نہ سگھڑ پن...... ہر وقت ٹی وی دیکھنا اور کچن پر توجہ نہ دینا تمہارا واحد مشغلہ ہے۔''

''تمہاری یہ بک بک سن کر تو میرے کان پک گئے ہیں۔'' شیلا چلا کر بولی۔ ''بڑے بنتے تھے کامیاب بزنس مین، ہونہہ...... صرف ایک سو اسی ڈالرز کی ادنیٰ گھڑی بھی نہیں خرید سکتے۔''

جواب میں سام نے اسے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا اور سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ کار گھنے جنگل میں سے گزر رہی تھی۔ ہر طرف بھیانک سناٹا مسلط تھا۔ خنک ہوا کھڑکی سے گزر کر اس کے رخسار تھپتھپانے لگی۔ وہ دونوں پکنک کیمپنگ کے بعد اپنے گھر لوٹ رہے تھے۔ ساری تفریح غارت ہو کر رہ گئی۔ شاید دو ہفتے کی چھٹیاں کسی معقول ہوٹل میں گزارنا ان کے مقدر میں نہ تھا۔ اس صورت میں اخراجات زیادہ ہوتے، سام کی آمدنی تھوڑی تھی۔ پیراڈائز سٹی میں رہائش ہونے کی بنا پر وہ یوں بھی اخراجات کے بوجھ تلے دبا رہتا تھا۔

وہ جنرل موٹرز میں دس سال سے سیلز مین کی حیثیت سے کام کر رہا تھا لیکن محنتی اور ذہین ہونے کے باوجود وہ کسی میدان میں ترقی نہ کر سکا۔ وہ اکثر بزنس کے خواب دیکھا کرتا مگر سرمایہ نہ ہونے کی بنا پر دل مسوس کر رہ جاتا۔ پکنک کیمپنگ کے لیے بے حد دشواری سے ضروری سامان کا انتظام ہوا تھا۔ اس کے ایک دوست نے اس کی تنگ دستی پر ترس کھا کر یہ اشیا اسے عاریتاً دے دیں، ان میں ایک چھوٹا سا خیمہ، کھانا پکانے کا سامان اور سلیپنگ بیگ شامل تھا۔ کیمپ میں شیلا نے کھانا پکانے کے سامان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ جل کر کہنے لگی کہ اگر تفریح کے دوران بھی وہ چولہا ہانڈی کرتی رہی تو پکنک کا کیا خاک مزہ آئے گا۔ اگر ہوٹل کے اخراجات اٹھانے کی سکت نہیں تو وہ خود ہانڈی چولہے سے نمٹ لے اور کیمپ کا خیال رکھے۔ وہ تو مزے سے سن باتھ کا لطف اٹھائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا بھی۔ وہ پکنک کے تمام عرصے میں مسلسل غسل آفتابی کے مزے لوٹتی رہی۔ سورج کی چمکیلی کرنیں دل کے نہاں خانوں کو منور کرتی رہیں۔

سام ایک فرماں بردار شوہر کی طرح کھانا پکانے کے چکروں میں مصروف رہا۔ وہ باقاعدگی سے گیس ٹکر جلاتا، برتن دھوتا اور اپنی قابلیت کے مطابق کھانا پکاتا۔ وہ ان معاملات میں بالکل اناڑی تھا، لہٰذا کھانے میں کمی کوتاہی ہوتی رہی۔ اشیا یا تو ادھ پکی رہ جاتیں یا پھر جل جایا کرتی تھیں۔ شیلا کو ان باتوں کی مطلق پروا نہ تھی۔ وہ سمندر کے کنارے، بھیگی ہوئی ریت پر لیٹی نیلگوں آسمان پر اڑتے ہوئے آبی پرندوں کا نظارہ کرتی یا اٹھلاتی ہوئی شفاف موجوں کے درمیان دوڑتی ہوئی دور تک نکل جاتی۔ یہاں تک کہ وہ پانی کے تیز بہاؤ میں تیراکی کا مظاہرہ کرنے لگتی۔ رات کو بھی وہ اپنے سلیپنگ بیگ میں سرِشام ہی گھس جاتی اور سام حسین بیوی کی دلگداز قربت سے شادکام ہونے کی تمنا دل ہی میں لیے رہ جاتا۔

شیلا دلکش اور سڈول جسم کی مالک ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے جنسی طور پر بھی سدا سرد لہر ہی ثابت ہوئی۔ کوئی پندرہ ماہ پہلے سام ہینڈرسن کیڈی لاک کی ڈلیوری کے لیے میامی کے ایک ذی حیثیت گاہک کے پاس گیا تھا۔ واپسی پر اسے اس امیر آدمی کی اولڈ ماڈل سیڈان کار جزوی قیمت کے طور پر ساتھ لانی تھی۔ میامی سے وہ سیڈان لے کر چلا تو کامیاب سودے کی خوشی میں وہ شب بسری کے لیے ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ دس بجے رات کو وہ عمدہ کھانے کے بعد اپنے کیبن میں سونے کے لیے چلا گیا۔ نرم اور آرام دہ بستر پر سفر کی تھکن اسے لوریاں دینے لگی۔ اس نے نیم غنودگی کی حالت میں لائٹ آف کی اور کروٹ بدل کر سو گیا لیکن اسے سونا نصیب نہ ہوا۔ ساتھ والے کیبن میں کسی نے ریڈیو آن کر دیا اور کسی فلم کی موسیقی بلند آہنگ آواز سے نشر ہونے لگی۔ اس نے بتی جلائی اور جسم پر گاؤن پہنے پڑوس کے کیبن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

ہلکا نیلا سویٹر اور ایک مختصر سا ریشمی جانگیہ پہنے شیلا دروازہ کھول کر سامنے آئی تو سام اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ مکمل

حسن کا نمونہ تھی۔ اس نے خوامخواہ اپنے چمک دار دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے سام سے تیز آواز میں ریڈیو بجانے پر معذرت کی اور اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ بستر پر اس طرح نیم دراز ہوگئی کہ اس کی سڈول رانیں نمایاں ہو کر قیامت ڈھانے لگیں۔

اپنے جبڑے کھجاتے ہوئے سام ہینڈرسن للچائی ہوئی نظروں سے اس کے جسم کے نشیب و فراز کا جائزہ لیتا رہا۔ چند رسمی باتوں کے بعد ہی شیلا اس سے بے تکلف ہوگئی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ سام بھی پیراڈائز سٹی جا رہا ہے تو اس نے بھی ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی۔ سام نے فوراً رضامندی کا اظہار کیا۔ وہ رات شیلا کی صحبت میں بسر کرنے کے بعد دوسری صبح سام، شیلا کو لے کر پیراڈائز سٹی کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں آٹھ ڈالر فی ہفتہ کے کمرے میں شیلا کو ٹھہرا کر سام کام پر چلا گیا۔ شام کو منیجر سے اجازت لیے بغیر وہ سیڈان لے کر اپنے بہترین اور جدید تراش کے سوٹ میں شیلا کے پاس پہنچا۔

سٹی کے مضافات میں واقع ایک خوب صورت اور معیاری ریسٹورنٹ میں ”سی فوڈ“ سے معدے کی تواضع کی گئی۔ شیلا اس گمان میں رہی کہ وہ ایک ادھیڑ عمر اور کامیاب بزنس مین سے معاشقے میں کامیاب رہی ہے۔

شیلا کے والدین جب بارہ سال کی عمر میں اسے شہر کی مرکزی شاہراہ پر چھوڑ کر چلتے بنے تھے...... اس وقت سے لے کر اب تک وہ بڑی عجیب سی زندگی گزارتی آ رہی تھی۔ اس وقت وہ بائیس سال کی عمر میں مختلف شعبوں سے منسلک ہونے کے بعد بالآخر میامی کی کال گرل بن گئی تھی۔ ایک سو پچاس ڈالرز میں سے جب اس کے پاس دس ڈالرز رہ گئے تو اس نے سام ہینڈرسن سے شادی کر لی لیکن اس شادی سے دونوں کو مایوسی ہوئی۔

شیلا کو پہلے دن ہی معلوم ہوگیا کہ سام نہ تو امیر ہے اور نہ ہی کامیاب بزنس مین...... وہ تو باپ کے چھوڑے ہوئے ایک چھوٹے اور خستہ حال بنگلے میں رہتا ہے۔ سام ہینڈرسن سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ شیلا ایک تندخو اور ہوس پرست لڑکی ہے۔ گھر گرہستی کے قطعی لائق نہیں۔ یوں ہی روتے روتے ایک سال گزر گیا۔ شیلا کو گھر کی پناہ اور باقاعدہ خوراک میسر تھی اور سام کو ادھیڑ عمری میں ایک خوب صورت بیوی جسے دیکھ کر دوست اس کی قسمت پر رشک کیا کرتے۔

سام نے ایک طویل جماہی لی۔ وہ بری طرح تھک چکا تھا۔ اس نے سامنے کی طرف دیکھا۔ گھنے جنگل کا سلسلہ ہنوز باقی تھا۔ چڑھائی آتے ہی کار کی رفتار کم ہوگئی تھی۔ اس نے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھایا لیکن کار کی رفتار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس نے گیئر بدل کر پھر کوشش کی لیکن نتیجہ صفر رہا۔ وہ گھبرا گیا۔ اگر گاڑی خراب ہوگئی تو شیلا زندگی اجیرن کر دے گی۔

”مسٹر کامیاب آدمی!“ شیلا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تمہیں جنگل کے مناظر پسند ہوں تو ہوں، میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی ہوں، سمجھے...... ذرا رفتار بڑھاؤ۔“

سام نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دل ہی دل میں جھنجلاتا رہا۔ کار اب چڑھائی عبور کر کے ڈھلوان پر رینگ رہی تھی۔ یہ علاقہ ”اسکومپ“ کے مضافات میں سے تھا۔ کار جھٹکے کھاتی، ڈولتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

فاصلہ کسی نہ کسی طرح رینگ رینگ کر طے ہوتا رہا۔ ایک جگہ چھوٹی سی چڑھائی پر سام نے ایکسلریٹر کو پریس کیا تو زور سے چیخ کر خاموش ہوگیا۔

”اب کیا ہوگا؟“ شیلا نے ڈرتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہیں باہر پھیلے ہوئے مہیب اندھیرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”انجن جواب دے گیا ہے۔“

”بس یہی کسر رہ گئی تھی۔“ شیلا دانت پیس کر بولی۔ ”تمہارے ساتھ باہر نکلنا خود کو جان کنی میں ڈالنا ہے۔“

”زیادہ حلق نہ پھاڑو۔“ سام نے جھنجلا کر کہا۔ ”میں نے خود سے تو گاڑی خراب نہیں کی۔“

کار کی ہیڈلائٹس روشن تھیں۔ اس نے گلوو کمپارٹمنٹ سے ٹارچ نکالی اور نیچے اتر آیا۔ صبح و شام اس کا واسطہ کاروں سے رہتا تھا۔ لہٰذا ہڈ کے اٹھاتے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ گیس پمپ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہاں کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ مایوس ہو کر اس نے کار کا ہڈ گرا دیا اور خلا میں پلک جھپکائے بغیر گھورنے لگا۔

”ہم یہاں پھنس کر رہ گئے ہیں۔“ سام نے شیلا کو پاس آتے دیکھ کر کہا۔ ”پمپ بیکار ہوگیا ہے، ہائی وے یہاں سے پانچ میل دور ہے۔ تم اگر یہاں ٹھہرو تو میں آخری بس پکڑ سکتا ہوں۔“

”یہاں......؟“ شیلا کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”اس جنگل میں...... میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔“

”تو پھر میرے ساتھ چلو۔“

”پیدل پانچ میل؟“

”ہاں، اب ہمارے لیے یہاں ہیلی کاپٹر کہاں سے آئے گا؟“

”واہ...... واہ۔“ شیلا نے تنک کر کہا اور ایک طرف جھاڑیوں کے پاس بڑھتی چلی گئی۔ سام غصے سے کھول کر رہ

گیا۔ اس نے باسکٹ سے بسکٹ کے پیکٹس نکالے اور کھانے لگا۔ اس کے پاس چار پیکٹس بھی تھے۔ دفعتاً شیلا حیرت سے چیخ پڑی۔ سام چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ جھاڑیاں ہٹائے اسے اشارے سے بلا رہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ گھنی جھاڑیوں کے درمیان ایک جدید ماڈل کی سیاہ بیوک کھڑی تھی۔ وہ چند لمحے ساکت وسامت کھڑا بیوک کو دیکھتا رہا۔ ''یہ بیوک یہاں کیسے آئی؟'' اس نے حیرانی سے کہا۔ وہ ابھی تک اس منظر کو خواب ہی سمجھ رہا تھا۔

''پتا نہیں، میں کیا جانوں۔'' شیلا نے کندھے اچکائے۔ ''ذرا دیکھو تو سہی یہ کار آمد بھی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ گاڑی چل سکتی ہے تو ہم اس میں......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''مگر......مگر......ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے ہوسکتا ہے کوئی؟''

''میں کہتی ہوں بند کرو یہ اخلاقیات کی باتیں۔'' شیلا چیختی ہوئی آگے بڑھی۔ ''آگے بڑھ کر دیکھو کہ یہ بیوک چل سکتی ہے یا نہیں۔ سمجھے۔ ہمیں کسی قیمت پر بھی رات یہاں نہیں گزارنی ہے۔'' اس کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

سام نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور جیب سے چابیوں کا سیٹ نکالا۔ ماسٹر کی......اس میں موجود تھی۔

☆☆☆

اینڈریو نے جھلا کر اپنے آپ کو ایک گندی سی گالی دی اور انتہائی مشکل سے گھسٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ شدتِ درد سے اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اس کا تمام جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ غار سے یہاں تک کا فاصلہ بمشکل بیس گز تھا لیکن اس کی قوت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ مزید گھسٹنے سے قاصر تھا۔ داہنے بازو کے زخم سے خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس پر نقاہت طاری ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنے حواس ایک بار پھر مجتمع کیے اور کسی نہ کسی طرح سامنے کی جانب سرکنے لگا۔ اسے ہر قیمت پر سرخ مزدا کے قریب پہنچنا تھا۔ بس چند قدموں کی دوری حائل تھی۔ وہاں پہنچ کر ہی وہ کار کا بغور جائزہ لے سکے گا۔ آخر یہ کس کی کار تھی؟ وہ کون لوگ تھے؟ جو اس کی سیاہ بیوک لے کر نو دو گیارہ ہو گئے تھے۔ بیوک کا خیال آتے ہی وہ خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ اگر وہ لوگ اس کے ہاتھ لگ جاتے تو وہ ان کی تکا بوٹی کر کے رکھ دیتا۔ انہوں نے اس کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔ اسے اپنا منصوبہ خاک میں ملتا ہوا نظر آیا۔

کیا وہ اب کبھی بیس لاکھ ڈالرز کا مالک نہیں بن سکے گا؟ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ آخر اس ویران اور اجاڑ جنگل میں کون ٹپک پڑا تھا۔ اس کی جھلاہٹ مزید بڑھ گئی۔

اس نے تیزی سے آگے بڑھنا چاہا لیکن بازو میں اٹھنے والی شدید ٹیس نے اسے نڈھال کر دیا۔ وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ سانس رک رک کر آنے لگا۔ منہ سے دبی دبی چیخیں نکلنے لگیں۔ وہ ہولے ہولے کراہتا رہا۔ اس کی قمیص خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ بیوک کو روانہ ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ پتا نہیں وہ اس وقت کہاں ہوں گے؟ بیوک کی ڈکی میں وہ آہنی بکس تھا جس میں کیسینو سے اڑائے ہوئے بیس لاکھ ڈالرز کے کرارے نوٹ بند تھے۔ اس خطیر رقم کے حصول کے لیے اسے کتنے عجیب اور خطرناک حالات سے گزرنا پڑا تھا مگر آج وہ دولت کسی اور کی دسترس میں تھی۔

زندگی میں پہلی بار اس کا جی چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے، اپنی بوٹیاں آپ ہی نوچ ڈالے۔ اب تک اس کا سارا پروگرام حسب منشا کامیاب ہوا تھا۔ کیسینو میں سخت پہرے کے باوجود وہ اپنے چاروں ساتھیوں کے ساتھ رقم اڑانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پولیس کے نرغے میں اپنے چاروں ساتھیوں کو چھوڑ کر وہ تنہا ہی رقم لے کر فرار ہو گیا اور جانے پہچانے طے شدہ راستوں سے ہوتا ہوا اس جنگل کی طرف بڑھتا چلا آیا۔ بھاگتے وقت اس کا تعاقب کیا گیا تھا اور سیکیورٹی کی ٹولی نے اسے زخمی کر دیا تھا لیکن وہ چالاکی سے انہیں ڈاج دے کر نکل آیا۔ اس گھنے جنگل میں اس نے سامنے والے غار میں پناہ لی تھی۔ بازو کا زخم ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ وہ غار کے اندر کمبلوں کے بستر پر چت لیٹ گیا۔ یہ اس نے ایک مسافر سے چھینے تھے۔ بہرحال وہ ایک محفوظ مقام پر پہنچ گیا تھا اور رات بھر آرام کر سکتا تھا۔ یہ غار بھی اس کے پلان کا ایک حصہ ثابت ہوا۔ ڈکیتی کے معاملات سرد ہونے تک یہاں پڑے رہنا ایک دانش مندانہ فعل تھا۔ وہ دم سادھے پڑا رہا۔ کبھی کبھی بازو کا درد اسے کسی زخمی پرندے کی طرح تڑپنے پر مجبور کر دیتا۔ ایسے میں ہاتھ لب بام رہ جانے پر اسے کمند ٹوٹتی ہوئی دکھائی دیتی۔ بازو کے زخم کے ساتھ دل کا درد بھی پریشان کر رہا تھا۔ رات آئی تو وہ بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔ ہاتھ پاؤں بالکل بے جان محسوس ہو رہے تھے۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے محسوس کیا جیسے کوئی اس کی بیوک کا دروازہ کھول کر اگنیشن میں چابی لگا

رہا ہے۔ وہ تڑپ کر اٹھا۔

شاید پولیس پہنچ گئی ہے...... اس نے سوچا کیا وہ اس کی کار لے جائیں گے اور وہ منزل پا کر بھی شکست خوردہ جواری کی طرح ساری عمر پولیس والوں سے منہ چھپاتا رہے گا؟ اپنی بے بسی پر وہ بری طرح جھنجلا گیا تھا۔ وہ بڑی دقت سے اٹھ پایا۔ گھسٹتا ہوا غار کے دہانے تک آیا۔ چاند کی مدھم روشنی میں اسے دور دھندلے ہیولے دکھائی دیے۔ غالباً ان میں ایک مرد اور ایک عورت تھی۔ وہ بیوک کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریوالور نکال لیا۔

مجھے فوراً دونوں کو ہلاک کر دینا چاہیے۔ وہ ان کا نشانہ لینے لگا۔ سیفٹی کیچ ہٹتے ہی اس کا دل زور سے کانپا، سینے میں درد کا بگولا سا اٹھا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس نے اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ دل بے بس پنچھی کی طرح پسلیوں کے قفس سے سر مار رہا تھا۔ پسینے کے بے شمار قطرے اس کے چہرے پر پھوٹ پڑے۔ اس نے سامنے نگاہ ڈالی، کوئی بیوک کا دروازہ کھولے کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے پھر ریوالور کا رخ اس آدمی کے خاکے کی طرف کر دیا۔ ٹریگر پر اس کی کانپتی ہوئی انگلی آئی۔ اچانک درد کا ایک دوسرا بگولا اٹھا۔ وہ درد سے دہرا ہو گیا۔ اس نے ضبط کرنے کی کوشش میں ایک ہاتھ سے سینے کو دبا رکھا تھا۔

اسی وقت بیوک کا انجن جاگا اور کار لہراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ وہ بے جان سا ہو کر غار کے ٹھنڈے فرش پر گر پڑا۔ غم و غصے سے سلگتا ہوا وہ پھر آگے کی سمت کھسکنے لگا۔ سرخ مزدا قریب آ چکی تھی۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ اس کا سر چکرا گیا۔ وہ ڈگمگایا، گرنے سے بچنے کے لیے اس نے بے ساختہ کار کا سہارا لیا۔ سانس بحال ہوئی تو وہ اسٹیئرنگ وہیل کی طرف آیا۔ شیشے پر چپکا ہوا نوٹ پڑھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ ان لوگوں کی کار خراب ہو گئی تھی اور وہ کار مستعار لے گئے تھے لیکن وہ واپس آئیں گے۔ اس نے سام ہینڈرسن کا پتا غور سے پڑھا۔ سام ہینڈرسن۔ 136۔ ڈبل پوائنٹ ایونیو۔ ساؤتھ اسکوائر پیراڈائز سٹی۔ اس نے طویل سانس لی اور اپنی حالت میں کچھ افاقہ محسوس کیا۔ دفعتاً نرم نرم گھاس پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ آواز اس کی پشت سے آئی تھی۔ وہ چونک کر مڑا۔

☆☆☆

بیوک برق رفتاری سے کولتار کی سڑک پر پھسل رہی تھی۔ ایک جگہ انہیں کافی دیر گاڑی روک کر راستہ صاف ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ ایک تیز رفتار کار ایک آئل ٹینکر سے ٹکرا کر الٹ گئی تھی۔ شیلا پر جھلاہٹ سی طاری ہو گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو لگا دیا۔ فضا میں اناؤنسر کی آواز ابھری۔

”چاروں مطلوبہ ڈاکوؤں کا سراغ مل گیا ہے لیکن پانچواں شخص ابھی تک لاپتا ہے۔ گمان کیا جاتا ہے کہ وہی شخص ان کا سربراہ ہے۔ اس کا نام اینڈریو لاک ہے۔ پولیس بڑی تندہی سے اس کی تلاش میں ہے۔ تمام راستوں کی ناکابندی کی جا چکی ہے۔ اس کا بچ نکلنا محال ہے۔ امید ہے اسے جلد ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ اینڈریو کا حلیہ یہ ہے۔ عمر چالیس سال...... قد پانچ فٹ دس انچ، بھورے بال اور بھوری آنکھیں، چہرہ ڈاڑھی اور مونچھوں سے بے نیاز۔ پولیس کو یقین ہے کہ آئی بی ایم کے مخصوص نشانات والی پیٹی اس کے پاس ہے۔ پیٹی میں کیسینو سے لوٹے ہوئے بیس لاکھ ڈالرز مالیت کے نوٹ ہیں۔ ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اینڈریو کو دیکھتے ہی پیراڈائز سٹی پولیس 7776 پر فوراً رابطہ قائم کیا جائے۔“

اچانک بیوک ڈول کر رہ گئی۔ اوورٹیک کرتی ایک کار نے زور سے ہارن بجایا۔ سام ہینڈرسن نے سنبھل کر بیوک کو قابو کیا۔ اس کے ہاتھ سختی سے اسٹیئرنگ پر جم کر رہ گئے۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت شیلا سے چھپی نہ رہ سکی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ شیلا جھنجلا کر بولی۔ ”ابھی ٹکر ہو جاتی تو؟“

”چپ رہو۔“ سام حلق کے بل چیخا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ سانس تیزی سے چلنے لگی۔ اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر کانپنے لگے۔

”خدا کے لیے ریڈیو بند کر دو۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ اس کے لہجے میں عجیب سی بے چارگی تھی۔

”آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ شیلا نے جھلا کر ریڈیو بند کر دیا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ کار کیسینو کے ڈاکوؤں کی ہی ہے۔“ سام نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ”رقم شاید ڈکی میں پڑی ہے۔ بہت جلد ہم کسی مصیبت کا شکار ہونے والے ہیں۔“

”کہیں دماغ تو نہیں چل گیا ہے؟“

”ڈکی میں آئی بی ایم کمپنی کے نشانوں والی پیٹی پڑی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کار جنگل میں چھپائی گئی تھی۔ اب کیا کیا جائے؟“ وہ دہشت سے گھگیا کر بولا۔ شیلا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔

”تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی کار ہے۔“ گہرے سناٹے کو چیرتے ہوئے شیلا نے سوال کیا۔

''ہاں...... ہاں...... اندھا نہیں ہوں میں۔'' سام جھلا کر بولا۔ ''بیوک کی تلاشی لیتے وقت ہی ڈکی میں رکھی ہوئی پیٹی مجھے دکھائی دی تھی۔ بہتر ہے کہ ہم پولیس ہیڈ کوارٹر چلیں۔''

''ہم ہر صورت گھر جائیں گے۔'' شیلا نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''اگر واقعی ڈکی میں رقم ہے تو ہم پولیس کو نہیں دیں گے...... سمجھے تم؟''

سام کا منہ احتجاجاً کھلا پھر بند ہوگیا۔ ٹریفک کی رفتار سست پڑ رہی تھی۔ وہ چونک پڑا۔ ''پتا نہیں کیا بات ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔ ''آگے روڈ بلاک ہے، ہر آنے جانے والی گاڑی کی چیکنگ ہو رہی ہے۔''

شیلا نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ''شاید ڈاکوؤں کی کار کی چیکنگ کے لیے پیہ نا کا بندی کی گئی ہے۔''

''بہتر ہے کہ ہم انہیں سب کچھ بتا دیں۔'' سام نے پھر سمجھایا۔ اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔

''اُفوہ، چپ بھی رہو۔ پہلے ہم گھر جائیں گے۔ آخر پتا تو چلے کہ پیٹی میں رقم ہے بھی یا نہیں۔''

بیوک روڈ بلاک کے قریب جا کے رک گئی۔ اس نے دیکھا کہ پیٹرول آفیسر جارج وہائٹ پیراڈائز میں داخل ہونے والی گاڑیوں کو چیکنگ کے بعد گزرنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ایک بار میں اکثر ساتھ پینے پلانے کی وجہ سے جارج اور سام میں کسی حد تک دوستانہ تعلقات بن گئے تھے۔ وہ اس سے بے تکلفی سے ملتا اور اکثر سیر و تفریح کے لیے بھی بضد ہو کر ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ ''نئی کار میں ہو؟'' جارج انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ ''اور سناؤ...... چھٹیاں کیسے گزریں؟''

سام کا حلق خشک ہوگیا، چہرے پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ شیلا نے اسے گھور کر دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر ایک جبری مسکراہٹ طاری کر لی اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر بولی۔ ''ہیلو جارج! بہت عرصے سے تمہیں دیکھا نہیں...... کیسے ہو؟''

جارج نے چندھیائی ہوئی نگاہوں سے شیلا کو دیکھا۔ وہ اس کے گداز اور سڈول جسم کا ابتدا سے ہی دیوانہ تھا۔ اس نے مسکرا کے اس کے سراپا پر اپنی نظریں جما دیں۔ ''تمہاری صحت تو پہلے سے بہت بہتر ہوگئی ہے۔ کہو چھٹیاں کیسے گزریں؟''

''بہت اچھی...... تھینک یو۔'' شیلا سیٹ پر اٹھلائی اور ایک لگاوٹ بھری مسکراہٹ نچھاور کرتے ہوئے بولی۔ ''تم ہمارے گھر کیوں نہیں آتے؟''

''بس ذرا فرصت کم ملتی ہے۔'' جارج نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جلد ہی آؤں گا۔'' شیلا کی آواز نے اس کے کانوں میں رس گھول دیا تھا۔

مگر اس مختصر سی گفتگو کے دوران اس کی نگاہ برابر نئی بیوک کا طواف کر رہی تھی۔ اسے شک تھا کہ وہ کار بھی بیوک ہے اور یہ بھی بیوک تھی۔ سام جیسے احمق شخص سے اسے کسی چالاکی کی توقع نہیں تھی۔

''سام! کیا یہ کار نئی خریدی ہے؟'' اس نے احتیاطاً پوچھ ہی لیا۔

''نہیں، میری کار خراب ہوگئی تھی۔ یہ کسی دوست سے مانگ کر لایا ہوں مگر یہ ہنگامہ کیا ہے؟''

''ہنگامہ...... کیا اخبار نہیں پڑھتے؟'' جارج نے حیرت سے کہا۔ ''بڑے کیسینو پر ڈاکا پڑا ہے۔ ڈاکو بیس لاکھ ڈالرز لے اڑے ہیں۔ اس لیے چیکنگ ہو رہی ہے۔'' پتا نہیں سام جیسے بدھو شوہر سے شیلا کس طرح نباہ کرتی ہوگی۔ اس نے سوچا۔

''بیس لاکھ ڈالرز؟'' شیلا نے حیرت ظاہر کی اور کھڑکی پر جھک آئی۔ اس کا گریبان دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ جارج، سام کی قسمت پر رشک کرنے لگا۔ کتنی حسین بیوی ملی ہے اسے۔ ہر رات نئی قربت کے مزے۔ نئی دل آویزیاں۔

''گاڑی چیک کرنا ہو تو کر لو۔'' شیلا نے ایک دل آویز مسکراہٹ اچھالتے ہوئے کہا۔ ''ہم بے حد تھکے ہوئے ہیں...... جلد گھر پہنچنا چاہتے ہیں۔''

''ارے اب اس کار کی کیا چیکنگ کروں؟'' جارج مسکرایا۔ ''سام! کار آگے بڑھاؤ۔''

''تھینک یو جارج۔'' سام نے گاڑی آگے بڑھائی۔ جارج دوسری گاڑی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کے ساتھی بھی متحرک تھے اور مختلف سواریوں کی چیکنگ میں مصروفِ عمل تھے۔

شیلا خوابوں کے حسین دھندلکوں میں پرواز کرنے لگی۔

☆☆☆

کرائے نشست میں پہنچ کر شیلا نے پیٹی کا ڈھکنا اٹھایا۔ کرارے نوٹوں کی بے شمار گڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ سام تھکے تھکے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔

''تم نے کبھی خواب میں بھی اتنی کثیر دولت نہ دیکھی ہوگی۔'' جگ مگ کرتی آنکھوں سے وہ نوٹوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی آواز میں خوشی کی بے پایاں جھلک نمایاں تھی۔ اس نے بے اختیار نوٹوں کی ایک گڈی کو سینے

سے لگالیا۔
''ہم اس کو ہضم نہیں کر سکیں گے۔'' سام نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔
اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ آنکھوں میں بے یقینی کے سائے لہرائے۔ شیلا نے غور سے سام کی گھبراہٹ کا اندازہ کیا۔ وہ گڈی کو پیٹی میں پھینک کر کیبنٹ کی طرف گئی اور مشروب کے دو جام بنا کر ایک اسے دیا اور اس کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی۔ دو ہفتے گزر چکے تھے مگر سام پر اب بھی خوف طاری تھا۔ وہ ہر وقت مضمحل اور مضطرب نظر آتا۔ حالانکہ رقم سے بھری ہوئی پیٹی گیراج میں پڑی رہی اور کوئی مسئلہ نہ ہوا۔ نہ پولیس کا کوئی آدمی پوچھ گچھ کے لیے آیا۔ آج وہ بڑی مشکل سے سام کو رضامند کر کے پیٹی کھلوا سکی تھی۔
''ہضم کیوں نہیں کر سکیں گے؟'' اس نے سام کے شانے تھپتھپائے۔ ''چلو یہ پیو۔ ہم اسے مشروب کے جام کی طرح ہضم کر لیں گے۔ یہ قدرت کا عطیہ ہے۔ ذرا سی دانش مندی سے رقم ہمارے پاس رہ سکے گی۔''
''فرض کرو ہم اسے رکھ لیتے ہیں، پھر بھی ہم اسے خرچ نہیں کر سکیں گے۔ ہماری مالی حالت کے بارے میں ہر ایک جانتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا ہوگا؟'' مشروب کے دو چار گھونٹوں نے سام کو تقویت پہنچائی۔
''چند ماہ کے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اتنی دیر ہم صبر کر لیں گے۔'' شیلا نے بھی مشروب کا ایک گھونٹ بھرا۔
''میرا تو خیال ہے کہ اب بھی وقت نہیں گزرا۔ ہم پولیس اسٹیشن کو فون کر دیں تو بہتر ہے۔''
''اے مسٹر! کان کھول کر سن لو۔'' شیلا نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گی۔ ایک سال تمہارے ساتھ رہ کر ہر اچھی چیز کو ترس گئی ہوں۔ اب اتفاق سے یہ خزانہ ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے جس کا کسی اور کو علم نہیں۔ ہم اسے ایمانداری کے نام پر دقیانوسی اصولوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیں گے۔ سنا تم نے؟ اس کا ہر ڈالر ہمارا ہوگا۔''
سام اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ شیلا کے سامنے وہ اپنے آپ کو مغلوب سا محسوس کر رہا تھا۔
''جیسی تمہاری خوشی۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''لیکن یہ بتا دوں کہ تم اپنے لیے خود قبر کھود رہی ہو۔ آخر اسے رکھا کہاں جائے گا؟''
''ہم اسے کچن کی کھڑکی کے قریب دفن کر دیں گے۔''
ٹھیک اسی وقت صدر دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ شیلا نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ''اس وقت کون ہو سکتا ہے؟'' وہ حیرت سے بولی۔
''جاؤ، جا کر دیکھو۔'' سام جلدی سے بولا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔
''دیکھتی ہوں۔'' شیلا نے بے پروائی سے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی راہداری طے کرنے لگی۔ مین گیٹ کے پاس پہنچتے ہی اس نے جھپٹ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر پولیس آفیسر جارج کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر ابھی تک سرکاری وردی تھی۔ شاید وہ اب بھی ڈیوٹی پر تھا۔ ''ارے جارج تم؟'' شیلا کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ''اندر آ جاؤ، کہو اس وقت کیسے آنا ہوا؟''
''تم لوگوں کا خیال یہاں کھینچ لایا۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''کہیں اس وقت میں مخل تو نہیں ہوا...... سام کہاں ہے؟'' شیلا کی جان میں جان آئی۔
''وہ اندر ہے، آؤ چلیں۔'' شیلا پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔
اب تو خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ جارج باہر ہی کھڑا تھا۔ ''میں دراصل اس رقم کے لیے آیا ہوں مسز ہینڈرسن جو تم چرا لائی ہو۔'' اس نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ شیلا کا جسم پتھرا گیا۔ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔
''مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں پریشان کر دیا۔'' جارج نے شیلا کے ردعمل سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' شیلا نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ ہکلا کر رہ گئی۔ اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر جارج خود ہی اندر آ گیا اور سٹنگ روم کی طرف بڑھا۔ شیلا بےخیالی میں اس کے پیچھے چلنے لگی۔
سام نے پیٹی کو بند کر کے سٹنگ روم کے ایک گوشے میں پرانے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے چھپا دیا تھا۔ جارج کمرے میں پہنچا تو وہ اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی سام تیزی سے آگے بڑھا۔
''ارے تم......'' وہ مضمحل انداز میں مسکرایا۔ ''کہو اس وقت کیسے آنا ہوا، شاید تم ڈیوٹی سے آ رہے ہو؟''
''وہ بیس لاکھ ڈالرز کی رقم کہاں چھپا رکھی ہے؟'' جارج کی بات سن کر سام کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا اور بولا۔ ''بیس لاکھ ڈالرز......! اس رقم سے ہمارا کیا تعلق؟''
''ڈارلنگ! انہیں شبہ ہے کہ یہ رقم ہم اڑا لائے ہیں۔'' شیلا نے سام کے کندھے سے لگ کر کہا۔
''پتا نہیں...... تم کس رقم کی بات کر رہے ہو؟'' سام

نے جارج کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔
''احمق نہ بنو۔'' جارج نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس رقم کی بات کر رہا ہوں جو بیوک کی ڈکی میں بند تھی اور وہ بیوک تم یہاں لے آئے ہو۔'' وہ باری باری دونوں کو گھورتے ہوئے بولا۔
''بیوک میں ایسی کوئی رقم نہیں تھی۔'' شیلا نے نظریں چرائیں۔ ''ہم اسے عاریتاً لے آئے تھے۔''
''سیدھی طرح مان جاؤ ورنہ ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔'' جارج کا لہجہ کرخت ہوگیا۔
''وہ پیٹی کہاں ہے؟''
''وہ اس کونے میں پڑی ہے۔'' سام نے فوراً بتادیا۔
شیلا نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ جارج اٹھ کر اس گوشے کی طرف گیا اور پرانے کپڑوں کے ڈھیر الٹنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے آئی بی ایم کمپنی کے نشانوں والی پیٹی اس کے سامنے تھی۔ اس نے جلدی سے ڈھکنا اٹھایا اور فرطِ مسرت سے نوٹوں کی گڈیوں کو ہاتھ میں لے کر اچھالنے لگا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں۔
''ہاہاہا...... اب یہ دولت کثیر بلاشرکت غیرے میرے قبضے میں ہے۔'' اس نے دیوانوں کی طرح زور سے قہقہہ لگایا۔ ''اس کے لیے میں نے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔'' وہ ہنستا رہا۔ شیلا کا چہرہ بجھ کر رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جارج کو دیکھ رہی تھی۔
''چلو اسے تھانے پہنچا دیں۔'' سام نے خوش دلی سے کہا جیسے اس کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ٹل گیا ہو۔
''تھانے......؟''
''ہاں...... تھانے میں ہم رپورٹ لکھوائیں گے کہ یہ رقم ہمیں کہاں سے ملی۔ اس میں ہمیں تمہاری مدد بھی چاہیے۔''
''خوب...... تمہاری سادگی کا بھی جواب نہیں۔ اگر اس رقم کو پولیس کے حوالے کرنا ہوتا تو میں تنہا نہ آتا۔ میرے ساتھ پولیس چیف تو ضرور ہوتا۔''
''کیا مطلب؟'' سام نے پھر حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے۔
''ارے...... تم کس قدر بھولے ہو۔'' جارج ہنس پڑا۔ ''بھائی یہ رقم تو میں نے ہی کیسینو سے چوری کروائی تھی۔ اب بھلا میں اسے تھانے کے سپرد کیوں کرنے لگا؟'' اس نے پیٹی سے ایک گڈی اٹھائی اور پیار سے اسے بوسہ دیا۔
''اور...... وہ...... اینڈریو لاک...... وہ ریڈیو پر اعلان؟'' شیلا فرطِ حیرت سے ہکلا کر رہ گئی۔

''وہ سب میرے ادنیٰ کارندے تھے۔'' جارج پھر ہنسا۔ ''پختہ اور کامیاب منصوبہ بنانے والے کبھی منظرِ عام پر نہیں آتے، کیا سمجھے؟'' اس نے ایک قہقہہ لگایا۔
''لیکن اینڈریو اور چار دوسرے ساتھی؟''
''کہا تو ہے کہ وہ سب میرے ساتھی تھے جو مار ڈالے گئے۔'' اس نے خوش دلی سے اعتراف کیا۔ ''چاروں پولیس کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گئے جبکہ اینڈریو زخمی حالت میں خود میرے پستول کا نشانہ بنا۔ میں اسے ہلاک کر کے ایک شاٹ کٹ راستے سے چیکنگ پوائنٹ (ناکے) پر آپہنچا۔ تم لوگ سڑک پر پیش آنے والے حادثے کی وجہ سے رکے ہوئے تھے۔ میں کسی شہادت کو سرے سے باقی رکھنے کا قائل ہی نہیں۔ تم نے ذاتی استعمال کے لیے چند نوٹ نکالے تو نہیں؟''
''بالکل نہیں۔'' سام جلدی سے بول اٹھا اور سامنے چھوٹی میز پر رکھے قلم دان سے کھیلنے لگا۔
''بہت اچھا۔'' جارج نے کہا۔ ''اس پیٹی کو بحفاظت جنگل سے نکال کر یہاں لانے کا شکریہ۔ دراصل اسے یہاں لانا بے حد دشوار تھا۔ اگر نہ لائی جاتی تو پولیس تلاش کرتے ہوئے خود وہاں پہنچ جاتی۔ اب اطمینان سے میں اسے اپنی گاڑی میں لے جاؤں گا۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ دو ہفتے میں معاملہ ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ نگرانی ختم ہو چکی ہے۔ اب میں ملازمت ترک کر دوں گا اور اس دولت کو لے کر بہت دور نکل جاؤں گا جیسے پیرس یا جرمنی۔ وہاں باقی زندگی ایک دولت مند شخص کی طرح حسن و رعنائی کے دلکش ہالے میں بسر کروں گا۔''
''چلو اب جلدی سے دور ہو جاؤ۔'' شیلا جل کر بولی۔ اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ وہ پھر محرومی کی دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔
جارج نے شیلا کی کیفیت کو بھانپ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ''ابھی اتنی بھی جلدی نہیں...... میں صبح سویرے یہاں سے نکل جاؤں گا۔ اس میں تمہارا ابھی فائدہ ہے۔ میں اس کے عوض تمہیں چند ڈالر دے دوں گا۔''
''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' سام بھی ہنسا۔ ''ابھی تمہارے استقبال کو بھی چند بااثر لوگ پہنچنے والے ہیں۔''
''کیا مطلب؟'' اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ اسے اس وقت سام کا لہجہ غیر مانوس سا لگا۔
''کھیل ختم ہو گیا جارج۔'' سام ہینڈرسن نے انتہائی سرد لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ اب اس کے داہنے ہاتھ میں

اعشاریہ چار پانچ کا آٹومیٹک پستول تھا جس کا رخ جارج کی طرف تھا۔ ''تم خود ہی اپنے جال میں پھنس گئے۔''

شیلا اچھل پڑی۔ یہ احمق اور بزدل سام کی آواز تو نہ تھی۔ وہ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ ''پتا نہیں تم کیا بک رہے ہو؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، دولت کے لالچی۔'' اس نے بائیں ہاتھ سے پتلون کی جیب سے ایک ...... کارڈ نکالا اور جارج کے سامنے پھینک دیا۔

''میرا تعلق ایف بی آئی کے لوکل کرائمز انویسٹی گیشن سے ہے۔ میں مدت سے اس گینگ کے پیچھے تھا جو بڑی کامیابی سے دن دہاڑے بینکوں اور ہوٹلوں کو لوٹ رہا مگر اب تک ایک فرد بھی پولیس کی گرفت میں نہ آسکا تھا۔ پولیس انٹیلی جنس نے تنگ آکر ایف بی آئی کی خدمات حاصل کیں۔ اس کیس کا انچارج مجھے بنایا گیا۔ میں نے ہر لحاظ سے اس معاملے میں رازداری برتی اور چپکے چپکے ایک موٹر کمپنی میں سیلز ایجنٹ کی حیثیت سے اپنے طور پر تفتیش کرتا رہا۔ پکنک اسپاٹ پر ہی مجھے کیسینو کے ڈاکے کی اطلاع بذریعہ ٹرانسمیٹر ملی۔ واپسی پر جب تم نے بیوک کو مشکوک حالت میں دیکھ کر بھی چیک نہ کیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ تم اسے دانستہ نظرانداز کر رہے ہو۔ چنانچہ میں شیلا کے سامنے ایک فرمانبردار شوہر اور بزدل شخص کی اداکاری کرتے ہوئے اس بیٹی کو اپنے گھر میں رکھنے پر رضامند ہوگیا۔ مجھے امید تھی کہ معاملہ ٹھنڈا ہوجانے پر تم خود ادھر کا رخ کرو گے۔''

''یہ سب بکواس ہے۔''

''یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔'' سام زور سے بولا۔ ''میں ابتدا سے ہی تمہارے پیچھے لگا رہا۔ مجھے تم پر اس وقت شبہ ہوا تھا جب تم مجھے بار میں ملا کرتے تھے اور بہت فراخ دلی سے خرچ کیا کرتے تھے۔ ایک معمولی پیٹرول آفیسر کی تنخواہ بھلا اتنی کہاں ہوا کرتی ہے کہ یوں بے دردی سے پیسا خرچ کرے۔ میں نے زمانے کی نظروں سے بچنے کے لیے خود پر حماقت اور غیر معمولی بزدلی کا خول چڑھالیا اور شیلا تو کیا تم جیسا مکار بھی دھوکا کھا گیا۔''

شیلا حیران نظروں سے اسے دیکھے جارہی تھی۔ یہ اس کا احمق شوہر تو ہرگز نہیں تھا۔ اس کا سر بری طرح چکرانے لگا کہ کہیں یہ خواب تو نہیں ہے۔ ''بولتے رہو، تمہاری اس بکواس پر کون یقین کرے گا؟'' جارج حقارت سے ہنسا۔

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے جارج۔'' سام نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''تم اب کسی طرح بھی بچ نہیں سکتے۔''

''ہاہاہا...... تم قیامت تک یہ ثابت نہیں کرسکتے کہ میں ہی ڈاکوؤں کا سرغنہ ہوں۔'' جارج مسکرایا۔ ''اول تو میں نے اب تک کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑا جو مجھے ڈکیتی کے اس کیس میں شہادتی طور پر ملوث کرسکے۔ دوم اگر بالفرض محال کوئی شبہ بھی ہوا تو سرکار کی دی ہوئی پوزیشن اور وردی میری حفاظت کے لیے کافی ہوگی۔ ابھی تم میری ذہانت تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں نے درجنوں ڈاکے ڈالے ہیں مگر پولیس میرا کچھ نہ بگاڑ سکی۔''

''تم ہار گئے جارج۔'' سام کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ''یہ تمہارے سامنے موجود ...... چھوٹی میز پر جو قلم دان رکھا ہوا ہے، وہ حقیقت میں قلم دان نہیں بلکہ ایک ننھا سا طاقتور ٹرانسمیٹر ہے۔ اس کے ذریعے ہماری گفتگو براہِ راست ایف بی آئی ہیڈکوارٹر کے کرائم انچارج کے کمرے میں ریکارڈ کی جارہی ہے۔ احمق کہیں کے! تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ آخر اس میز پر قلم دان کا کیا کام ہوسکتا ہے۔ جب شیلا تمہیں دروازے پر ریسیو کر رہی تھی، اسی وقت میں نے اسٹڈی روم سے یہ قلم دان لاکر اس میز پر رکھ دیا تھا تاکہ تمہاری باتوں کو ریکارڈ کیا جاسکے۔ بہرحال تم دھوکا کھا گئے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ چالاک سے چالاک مجرم بھی قانون کے شکنجے میں آہی جاتا ہے۔''

شیلا نے جارج کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ بار بار اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ خود شیلا کی حالت بھی غیر تھی۔ وہ بوکھلا کر سام کو تکے جارہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی ازلی بے وقوف سام ہے جسے وہ بات بات پر چٹکیوں میں اڑا دیا کرتی تھی۔ تو کیا وہ سب فریب تھا؟ وہ حماقت محض ایک اداکاری تھی؟

اسی وقت پولیس کار کے سائرن کی آواز قریب آتی سنائی دی۔ سام آواز کی طرف متوجہ ہوگیا لیکن اس کے پستول کا رخ اب بھی جارج کی طرف تھا اور ٹریگر پر رکھی ہوئی انگلی کسی وقت بھی حرکت میں آسکتی تھی۔

''شیلا! ذرا جاکر دروازہ کھول دو۔ یہ لوگ ایف بی آئی کے آدمی ہوں گے۔''

سام نے نرمی سے اسے ہدایت کی مگر وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ جارج نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ دفعتاً اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ وہ دو چار بار لہرایا اور فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

محفل شعر و سخن

❋ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان......فورٹ عباس
رات کے سناٹے میں ہم نے کیا کیا دھوکے کھائے ہیں
اپنا ہی جب دل دھڑکا تو ہم سمجھے وہ آئے ہیں

❋ بابر عباس، مسز بابر عباس......گلیانہ روڈ کھاریاں
میں اپنی ذات کے اندر بھی جھانک لیتا ہوں
کہ حیرتوں سے بھرا اک جہاں ہے یہ بھی
کچھ اس طرح تیرا غم اٹھائے پھرتا ہوں
کہ جیسے دھوپ میں سائبان ہے یہ بھی

❋ محمد یونس چودھری......سلطان پورہ، لاہور
ہجر کی ماری ان آنکھوں کو اشکوں کی تمہید مبارک
جن آنکھوں میں تم بستے ہو ان آنکھوں کو عید مبارک

❋ پری، فضل عباس......گلیانہ روڈ کھاریاں
شام ڈھلے جب سارے پرندے لوٹتے ہیں رو پڑتے ہیں
اس کی قسمیں اس کے وعدے سوچتے ہیں رو پڑتے ہیں
اجڑا کمرا، بکھری چیز، بوجھل دل اور بھیگی پلکیں
اپنی حالت دیکھ کے ہنستے ہیں رو پڑتے ہیں

❋ محمد ہمایوں تنولی......مانسہرہ
عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

❋ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
اس کی قدرت کے خزانوں میں نہیں ہرگز کمی
جس نے جو مانگا وہی اس نے مہیا کر دیا

❋ سنیہ منظور......یوحنا آباد، لاہور
نصیب جن کو تیرے رخ کی دید ہوتی ہے
وہ خوش نصیب ہیں خوب ان کی عید ہوتی ہے

❋ عبدالجبار رومی انصاری......گگو منڈی
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

❋ ریاض بٹ......حسن ابدال
تلخیاں بڑھ گئیں جب زیست کے پیمانے میں
گھول کے درد کے ماروں نے پیا عید کا چاند

❋ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......خانیوال
اس کی دیوار پہ حیران کھڑا ہے کب سے
چاند بھی میری طرح حسن شناسا نکلا

❋ چلبلی ہیر......جھنگ، صدر
میں تماشا ہوں مجھے دیکھ رہی ہے دنیا
تم تو اپنے ہو مجھے ڈھانپ کیوں نہیں دیتے

❋ حسنین عباس، کمیل عباس......گلیانہ روڈ، کھاریاں
مت پوچھ کہ میرے صبر کی وسعت کہاں تک ہے
تو آزما کے دیکھ لے تیری طاقت کہاں تک ہے
وہ اور ہوں گے جنہیں تم سے امید وفا ہوگی
ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ تو ظالم کہاں تک ہے

❊ زرین خان آفریدی......حیدرآباد
اسی لیے تو میری شاعری مہکتی ہے
کہ میں نے ربط رکھا خوشبودار لوگوں سے

❊ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

❊ محمد شاہد نواز......عبدالحکیم، ضلع خانیوال
مکاں کے ساتھ مکیں بھی دیے ہیں تحفے میں
یوں ہی کہا نہیں سیلاب کو خداحافظ
زمین پر یہ مرا آخری تماشا تھا
تمام حلقۂ احباب کو خداحافظ

❊ احمد عالم......اسلام آباد
بہتے ہوئے اشکوں کی روانی میں مرے ہیں
کچھ خواب مرے عین جوانی میں مرے ہیں
قبروں میں نہیں ہم کو کتابوں میں اتارو
ہم لوگ محبت کی کہانی میں مرے ہیں

❊ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
ہو نہ بے تاب غم ہجر بتاں میں مومن
دیکھ دو دن بس اب فضلِ خدا ہوتا ہے

❊ فضل محمود......کوئٹہ
ایک موہوم ثقافت کے علمبرداروں
ایک بے رحم صداقت کا گنہگار ہوں میں
ایک خوابیدہ مشیت کے پرستار ہو تم
ایک تابندہ حقیقت کا خریدار ہوں میں

❊ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
دوستو! رختِ سفر باندھ کے لیکو، کہ یہاں
جو پڑاؤ کے لیے رکتے ہیں، رک جاتے ہیں
نخل جو دھوپ سے بچ کر کوئی سایہ ڈھونڈیں
خوب ابھرتے نہیں پاتے ہیں کہ جھک جاتے ہیں

❊ ایم شفیق حسین......سندھی ہوٹل، کراچی
اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِعام رکھ دیا

❊ انیلہ رشید سیال......خیرپور، میرس
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکون ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

❊ ذیشان نیازی......راولپنڈی
یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

❊ دانش عمیر......گلشن اقبال، کراچی
گنوائی کسی کی تمنا میں زندگی میں نے
وہ کون ہے جسے دیکھا نہیں کبھی میں نے
ترا خیال تو ہے پر ترا وجود نہیں
ترے لیے تو یہ محفل سجائی تھی میں نے

❊ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
جو تھے دشمن تری امنگوں کے
کب انہیں بے گرفت چھوڑا ہے
ہم نے اپنے درشت لہجے سے
آمروں کا غرور توڑا ہے

❊ محمد آریز ملک......گلستان جوہر، کراچی
نہ وہ نشاطِ تصور کہ لو تم آ ہی گئے
نہ زخم دل کی ہے سوزش کوئی جو سہنی ہو
نہ کوئی وعدہ و پیماں کی شام ہے نہ سحر
نہ شوق کی ہے کوئی داستاں جو کہنی ہو

❊ وزیر محمد خان......بفل ہزارہ
شور کرتی ہے جب بھی خاموشی
بھیڑ میں جاکر بیٹھ جاتا ہوں

❊ مدحت......کراچی
نہ پوچھو عہدِ الفت بس اک خواب پریشاں تھا
نہ دل کو راہ پر لائے نہ دل کا مدعا سمجھے

❊ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
آنسو بہا بہا کر بھی ہوتے نہیں کم
کتنی امیر ہوتی ہیں آنکھیں غریب کی

❊ محمد اقبال......سرگودھا
مجھے وہ کیف گوارا نہیں جو فانی ہو
کوئی بتائے کہ اب کون سا گناہ کروں
کلی کلی کی رگوں میں رواں ہے میرا لہو
کسے گلے سے لگاؤں، کسے تباہ کروں

❊ محمد یوسف......کوئٹہ
بربادیوں کا جائزہ لینے کے واسطے
وہ پوچھتے ہیں حال میرا کبھی کبھی

❋ وردہ ملک.....کراچی
ہر حقیقت فریب لگتی ہے
جب کوئی اعتبار کھو بیٹھے

❋ صغیر احمد.....بہاولپور
جینے میں اک تڑپ ہو تو مرنے میں اک وقار
انسان کا نکھار اسی رقصِ نو میں ہے

❋ حفیظ الرحمٰن.....فیصل آباد
جن کی تخلیق سے ہے حسن کی قدروں میں دوام
ان کے ہاتھوں کی خراشیں تو مثالوں پہلے

❋ طارق نصیر.....کراچی
یہ پوچھنا ہے، کب آدم زمیں پہ اترے گا
جو لے چلے کوئی کامل، خدا کے پاس ہمیں

❋ افشاں گل.....حیدر آباد
تلاشِ حسن کہاں لے چلی، خدا جانے
امنگ تھی کہ فقط زندگی کو اپنائیں

❋ مہتاب احمد.....حیدر آباد
حال یہ ہے کہ خواہشِ پرسشِ حال بھی نہیں
اس کا خیال بھی نہیں اپنا خیال بھی نہیں

❋ اسماء ممتاز.....کراچی
ایک تو اتنا حبس ہے پھر میں سانسیں روکے بیٹھا ہوں
ویرانی نے جھاڑو دے کے گھر میں دھول اڑائی ہے

❋ منیر شگفتہ.....وہاڑی
جو کچھ تو نے سمجھا ہے اوروں کو سمجھایا کیا
بال بکھیرے بیٹھا ہے، ڈوب گیا سرمایہ کیا

❋ افشین نیازی.....پشاور
آج ہم خواب میں مل سکتے ہیں
نیند کرنے کی مشقت کرلو

❋ مہوش کنول.....ٹنڈوالہ یار
بس یونہی دل کی سہولت کے لیے
کرلیے دکھ بھی گوارا میں نے

❋ امتیاز احمد.....منڈی بہاؤالدین
دیکھ کر شہر کی یہ ویرانی
مجھ کو تو دشت بھی لگا آباد

❋ شگفتہ ادریس.....نواب شاہ
دور سے کرکے سفر آتے ہیں
ان پرندوں کو اڑا مت دینا

❋ محمد علی.....میانوالی
میں نہ گر نیند سے باہر آتا
خواب آنکھوں پہ حکومت کرتے

❋ میمونہ.....گوجرانوالہ
کچھ اس طرح میں ترا غم اٹھائے پھرتا ہوں
کہ جیسے دھوپ نہیں سائبان ہے یہ بھی

❋ کہکشاں علی.....سیالکوٹ
کب تک یوں پردے پردے میں حسن محبت کو جھٹلاتا
موت کا دن بھی حشر کا دن ہے، چھپنے والو! سامنے آؤ

❋ لبنیٰ احمد.....کوئٹہ
سنا ہے آج مشیت پہ ڈالتا ہے کمند
وہ آدمی جو ازل سے ستم رسیدہ رہا

❋ یونس احمد.....چنیوٹ
وہ آئے بھی تو بگولے کی طرح آئے گئے
چراغ بن کے جلے جن کے انتظار میں ہم

❋ سرفراز علی.....کراچی
گلوں کے اڑتے ہوئے رنگ کی تلاش میں ہوں
یہی نہ ہو مرے ذوقِ جمال کا انجام

❋ امبرین.....ملتان
خدا کا شکر، مرا رستہ معین ہے
کہ کارواں بھی تمہی، میرِ کارواں بھی تمہی

❋ برہان شکیل.....اسلام آباد
آرزو کے کنول کھلے ہی نہ تھے
فرض کرلو کہ ہم ملے ہی نہ تھے

کوپن برائے شمارہ اگست 2018

محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --

زندگی میں بعض اوقات ایک ٹوٹا ہوا انسان کسی دوسرے کمزور انسان کا اتنا بڑا سہارا بن جاتا ہے کہ زندگی کی نیا پار لگ جائے مگر... افسوس کبھی کبھی انسان احساس برتری میں مبتلا ہو کر اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو یکسر نظرانداز کر دیتا ہے اور بس یہی وہ پل ہوتا ہے جب قدرت کا اندازِ نظر بدل جاتا ہے۔ وہ بھی جب قدرت کی اس آزمائش میں قید ہوا تو احساس ہوا مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

دھتکارے ہوئے لوگوں پر احسان جتانے والے ایک کم ظرف کی روداد

دھتکار

جام مظہر سلیم

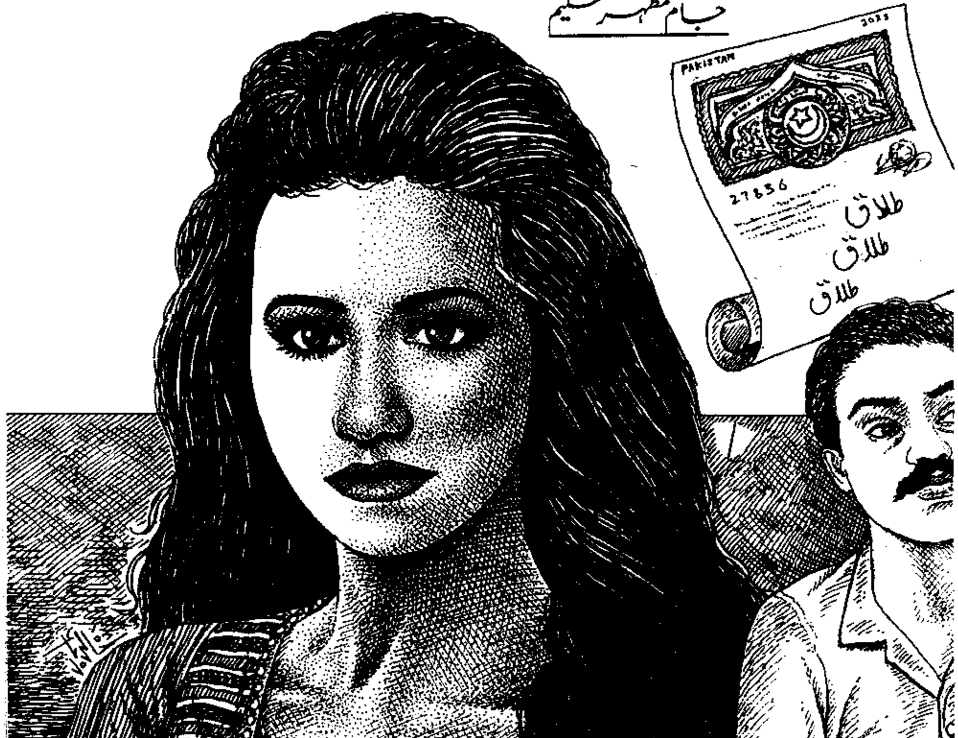

شام کا ملگجا اندھیرا شب کی سیاہی میں ڈھل رہا تھا۔ شکیلہ نے ایک ایک کر کے تار سے دھلے ہوئے کپڑے اتارے اور انہیں تہ کرنے لگی۔ راشد کے کپڑے تہ کر کے اس نے الماری کھول کر راشد کے استعمال کی چیزیں ترتیب سے ایک طرف رکھیں پھر کپڑے الماری میں رکھنے لگی تو ایک بھاری لفافہ شکیلہ کے پیروں میں آن گرا۔ اس نے سرسری انداز میں لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں کچھ پرانی تصویریں تھیں، شاید راشد کے کالج کے وقت کی۔ پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر بھی تھی کسی لڑکی کی۔ شکیلہ نے تصویر کا رخ پلٹ کر دیکھا، وہاں لکھا ہوا تھا...... اونلی فار راشد، فرام سیما!

''راشد کی دوست ہوگی کوئی۔'' وہ سوچ کر مسکرا دی۔ راشد وجیہہ ہی اتنا تھا کہ کوئی بھی لڑکی اس سے محبت کر سکتی تھی۔ اس نے کبھی شکیلہ سے اپنے کسی افیئر سے متعلق بات نہیں کی تھی۔ 'کتنا کم گو ہے وہ۔' اس نے سوچا۔

راشد کے کپڑے وہ ہمیشہ الگ دھوتی تھی۔ جب کبھی غلطی سے اس کا کوئی کپڑا باقی کپڑوں کے ساتھ دھل جاتا اور اس کپڑے کو ہلکا پھلکا رنگ کسی دوسرے کپڑے کا لگ جاتا تو راشد سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ کہتا تو وہ کچھ بھی نہیں تھا لیکن کافی دیر وہ چپ چپ سا رہتا اور وہی خاموشی شکیلہ کے لیے سوہان روح ہوتی۔ وہ سوچتی کتنا پیارا لگتا ہے وہ جب مسکراتا ہے۔ مسکراتے وقت اس کے گالوں میں پڑنے والے ڈمپل اس کی وجاہت کو دو چند کر دیتے لیکن وہ کبھی کھل کر نہیں ہنسا تھا۔ بس مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا لیتا تھا۔

شکریہ ادا کرتے وقت اس کا رنگ کتنا سیندوری ہو جاتا تھا۔ اگر اس کے بال کالے نہ ہوں اور وہ شکر جیسی میٹھی اردو نہ بولے تو پہلی نظر میں دیکھنے والے اسے انگریز سمجھنے لگیں۔ شکیلہ الماری میں چیزیں ترتیب سے رکھتے ہوئے راشد کے خیالوں میں گم ہو گئی۔

شکیلہ کی جان پہچان والی لڑکیاں اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں کہ کتنا وجیہہ شوہر ملا ہے تمہیں...... وہ بھی دوسری بار جیسے اس کی قسمت کھل گئی ہو۔

اسے خود بھی یقین نہیں آیا تھا جب راشد نے اسے دیکھتے ہی رشتے کے لیے ہاں کر دی تھی۔ ہلکا سا مسکرایا تھا وہ اور شکیلہ کے دل میں کلیاں کھل اٹھی تھیں۔ کیسا رنگ روپ تھا اس کے چہرے پر۔ لمبا قد، چھریرا جسم، ہر وقت مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ پیشانی کو چومتی ہوئی بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے کو اور بھی چوڑا بنا دیتی تھیں۔ مضبوط قد کاٹھ کا وہ بنا بنایا ہیرو تھا۔ شکیلہ تو اس کے سامنے بچی لگتی تھی۔ اس وقت وہ روتے روتے ہنس پڑی تھی جب گھر سے رخصتی کے وقت وہ باپ کے گلے لگ کر رو رہی تھی اور راشد نے اسے بچوں کی طرح اٹھا کر کار کی سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔

''چند میل کا فاصلہ نہیں ہے اور خوامخواہ سارے گھر کو دکھی کر رکھا ہے۔'' راشد نے کہا تو برات میں موجود لوگوں کے قہقہے بکھر گئے۔

شکیلہ کو اچھا لگا تھا، راشد کا یوں بانہوں میں اٹھانا۔ اسے لگا تھا جیسے وہ پھولوں کی طرح ہلکی ہو گئی ہو اور اس کے تن من کا سارا درد راشد کے ایک لمس نے ختم کر دیا ہو۔

وہ لمس شکیلہ کبھی نہ بھول سکی۔ اسے یاد تھا اس کی ماں نے ایک بار کہا تھا۔ ''بیٹی! آدمی ڈھنگ کا ہو تو عورت کے لیے یہ دنیا ہی جنت ہے۔''

شکیلہ کو پہلے ماں کی یہ بات بہت ہی فضول اور بے معنی لگتی تھی۔ آدمی کا ذکر ہوتے ہی اس کے سامنے دانش کا چہرہ آجاتا تھا تو اس کی آنکھوں میں نفرت کے الاؤ دہکنے لگتے۔

دانش...... وہ شخص جس نے اس کی زندگی تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ ماں باپ کی ضد اور بہن بھائیوں کی نصیحتوں کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی تھی۔ دوران تعلیم ہی اس کے رشتے کی بات پکی کر دی گئی تھی۔

''تمہیں پڑھا لکھا دیا یہی کافی ہے۔'' اس کی ماں نے کہا تھا۔ ''ہم نے کون سا تم سے نوکری کروانی ہے۔ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ تو ہماری فکریں ختم ہوں۔'' ماں اسے سمجھاتے ہوئے کہتی۔

اس نے گھر کے تمام افراد سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی اس کی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ جیسے سب اس کی شادی کے انتظار میں بیٹھے ہوں۔ سب بہن بھائی اس پر جان دیتے تھے لیکن شادی کے معاملے میں ایک ووٹ بھی اسے نہ ملا۔ والدین نے اپنا ہم پلہ دولت مند گھرانا دیکھ کر بہت شان و شوکت سے اس کی شادی کر دی تھی۔

سب خوش تھے کہ بیٹی کو رخصت کر کے سرخروئی حاصل ہوئی۔ شادی کے بعد چھ ماہ تو خوشی خوشی گزر گئے پھر دانش کا اصل روپ سامنے آ گیا۔ روشن چہرے کے پیچھے تاریک ذہن عیاں ہو گیا۔ وہ کئی کئی دن گھر نہ آتا، پھر جب آتا تو لڑکیوں کے فون آنا شروع ہو جاتے۔ شکیلہ اسے کئی بار دبی زبان میں کہہ چکی تھی کہ جہاں اس کی جاب ہے، وہ اس کے ساتھ وہاں جانا چاہتی ہے لیکن ہر بار دانش ٹال جاتا۔

اپنی سالگرہ والے دن بھی وہ گھر نہ آیا تو شکیلہ اسے سرپرائز دینے کے لیے اس کے ہوٹل پر چلی گئی جہاں دانش بطور منیجر کام کرتا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے دانش کے اپارٹمنٹ کے بارے میں پوچھا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے ڈور بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پھولوں کا گلدستہ اس نے اپنے پیچھے چھپا لیا۔

اس نے سوچا پہلے وہ دانش کا ہاتھ پکڑ کر چومے گی پھر گلدستہ پیش کرے گی۔

دانش نے تیسری گھنٹی پر تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اس کا بالائی جسم برہنہ تھا۔ وہ شکیلہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''اوہ یو؟'' وہ ایک دم پیچھے ہٹا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو مائی لو!'' شکیلہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

''ہو از دیئر دانی ڈارلنگ؟'' دانش کے عقب میں خمار آلود ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

دانش نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اتنی دیر میں شکیلہ کمرے

میں پہنچ چکی تھی۔ دانش کے بیڈ پر ایک لڑکی نیم برہنہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر شکیلہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ وہ تحیر آمیز انداز میں کبھی دانش کو دیکھتی اور کبھی اس لڑکی کو۔ دروازہ کھلنے سے پہلے والے منظر کا تصور اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ رہا تھا۔ اس کے اعتماد کی عمارت میں رخنہ پڑ گیا تھا۔

''کون ہے یہ لڑکی؟'' شکیلہ نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جو بیڈ کی چادر اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر ہونق بنی اسے دیکھ رہی تھی۔

''میری دوست ہے......'' دانش نے آنکھیں جھکا لیں۔

''دوست ہے تو یہ تمہارے بیڈ پر کیا کر رہی ہے؟'' اس نے دانش کو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''ریسٹ کر رہی ہے تھکی ہوئی تھی اور تم کوئی اتنی اونچی چیز ہو جو شور کر رہی ہو۔'' دانش کے حلق سے بہ مشکل آواز نکلی۔

''تم جیسی نہیں ہوں میں کہ بیوی گھر میں کیک لیے بیٹھی رہے اور تم یہاں تھرڈ کلاس غیر لڑکیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے رہو۔'' شکیلہ پوری قوت سے چیخی۔

''تھرڈ کلاس یہ نہیں تم ہو جو بن بلائے یہاں آگئیں۔'' دانش سے اس لڑکی کی تذلیل برداشت نہ ہوئی۔

''میں تو بن بلائی ہوں، کیا اس لڑکی کو برات یہاں لائی ہے؟'' شکیلہ نے نفرت سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔

''یہ تو شروع سے ہی میرے ساتھ ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔'' دانش نے بے فکری سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''جب تمہارے پاس پہلے ہی ایک عورت تھی تو تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟'' غم و غصے کی شدت سے شکیلہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

''تمہارے گھر والے ہی پیچھے پڑ گئے تھے۔'' دانش نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے یہ فرسودہ خیالات کی لڑکیاں پسند نہیں ہیں، بہت بے عزتی کر لی میری اب دفع ہو جاؤ۔'' اس نے سگریٹ کے تین چار طویل کش لیے اور باقی رہ جانے والا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

''بے عزتی ان کی ہوتی ہے جن کی کوئی عزت ہو، تم جیسے تھرڈ کلاس بندے کو بے عزتی کی کیا پروا؟ ہر وقت تمہاری گرل فرینڈز کی کالز آتی رہتی ہیں۔ کبھی کسی بندے کا فون نہیں آیا۔ کیا بات ہے تمہارا کوئی مرد دوست نہیں ہے؟'' شکیلہ نے پھولوں کا گلدستہ فرش پر دے مارا۔

''بی ہیو یور سیلف۔ تم جیسی بدتمیز لڑکی کے ساتھ میں نہیں رہ سکتا۔ اب میں سوچوں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' دانش نے طیش کے عالم میں اسے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف دھکا دیا۔

''دانش! میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو ہر حالت میں مرد کے ساتھ چپکی رہتی ہیں۔ تم تو سوچو گے لیکن میں نے سوچ لیا ہے۔ آج سے میرا، تمہارا رشتہ ختم۔ طلاق کے کاغذات بھیج دینا ورنہ میں خلع کے لیے عدالت تک جاؤں گی۔'' وہ شدید غصے کی حالت میں باہر نکل گئی۔

سسرال جانے کے بجائے وہ سیدھی ماں باپ کے گھر چلی گئی۔

''میں اس کے گھر واپس نہیں جاؤں گی ابو!'' وہ باپ کے گلے لگ کر رو پڑی۔

''نہ جاؤ بیٹا لیکن پہلے مجھے یہ تو بتاؤ کہ ہوا کیا ہے۔ ایسے اچانک گھر چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس کا باپ شاید مزید کچھ کہتا لیکن اس کی ماں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

گھر والوں کے خیال میں ایسے ہی بچپنا دکھا رہے ہیں دونوں میاں بیوی...... لیکن ایک ہفتہ بیت گیا۔ نہ دانش آیا، نہ اس نے فون کیا اور نہ اس کے گھر والوں نے کوئی خیر خبر لی۔ شکیلہ کے باپ نے اس کے سسر کو فون کر کے بات کرنی چاہی تو انہوں نے کہا۔

''وہ خود گھر چھوڑ کر گئی تھی ہمیں بتائے بغیر۔ آپ چھوڑ جائیں، ہم میں سے کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر دانش کے باپ نے کال کاٹ دی۔

''بہت دکھ کی بات ہے۔ چند ماہ پہلے ہی تو شکیلہ کی شادی ہوئی تھی۔'' اس کے باپ نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ جب اس کے دونوں بھائیوں کو پتا چلا تو وہ خاموش ہو گئے۔

''اگر تم لوگوں کو شرمندگی ہوتی ہے تو میں خود شکیلہ کو چھوڑ آتا ہوں یا پہلے اُن سے بات کر کے آتا ہوں۔'' اس کے باپ نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اس آہ میں ہزاروں درد پوشیدہ تھے۔ جب نو بیاہتا بیٹی ازدواجی مسائل سے دلبرداشتہ ہو کر میکے میں بیٹھ جائے تو والدین کی پریشانیاں فزوں تر ہو جاتی ہیں۔

شکیلہ آگے بڑھ کر باپ کے گلے سے لگ کر رو پڑی۔ آنسو اس کے دامن کو تر کر رہے تھے۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں مر جاؤں گی اگر آپ میرے لیے کسی کی چوکھٹ پر بھیک مانگنے کے لیے گئے تو! غلطی دانش کی ہے معافی اسے مانگنی چاہیے اور اس کے باپ کو۔ آپ کیوں جائیں گے اس کے گھر؟'' وہ اُٹھی اور شدتِ غم سے نڈھال اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

گھر کے افراد نے کافی دن تک اس سے کوئی بات نہیں کی۔

باپ چُپ چُپ سا رہنے لگا تھا۔ ماں پیروں فقیروں کے پاس جانے لگی تھی۔

ایک دن شکیلہ فریج سے پانی کی بوتل لینے کے لیے کچن میں گئی تو لاؤنج میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ اس سے پہلے کہ وہ جا کر ریسیور اُٹھاتی، اس کی بھابی نے کال ریسیو کر لی۔ شکیلہ کچن میں چلی گئی۔ اس کی بھابی کی باتوں کی آواز کچن میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ پہلے تو اس نے کوئی توجہ نہ دی لیکن جب بھابی کی زبان سے اپنا نام سنا تو کچن سے واپس آتے ہوئے ٹھٹک کر رک گئی۔ ''لڑکیوں کو بڑے دکھ کاٹنے پڑتے ہیں۔'' بھابی کہہ رہی تھی۔ ''ایسا تو نہیں ہوتا کہ چھوٹی سی بات پر گھر چھوڑ دیا جائے۔ کیا سسرال میں ہمیں باتیں نہیں سُننی پڑتیں ابھی تک ساس سسر سے ڈرتے ہیں۔ چائے کا ایک کپ بنا کر پینے کا حکم نہیں ہے لیکن یہ شکیلہ! اسے تو بھائیوں نے سر پر چڑھا رکھا تھا۔ مجھے تو پہلے ہی پتا تھا یہ چند دن بڑی مشکل سے گزارے گی سسرال میں۔ جس کے ماں باپ کے گھر میں کسی سے مزاج نہیں ملتے وہ سسرالیوں کو کیسے برداشت کرتی۔'' بھابی نے لمحاتی توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''چلو اچھا ہے میرے ساتھ ظلم ہوتا تھا یہاں، اب معلوم ہوگا جب اپنی بیٹی کی طرف دیکھیں گے یہ لوگ۔''

شکیلہ، بھابی کی باتیں سُن کر سکتے کی کیفیت میں آگئی۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ زبان کے نیچے شکر رکھ کر بات کرنے والی بھابی پیٹھ پیچھے یوں زہر اگلے گی۔

وہ اپنے کمرے میں آ کر صوفے پر ڈھے سی گئی۔ ایک عجیب سی اُداسی نے اسے گھیر لیا۔ اس دن کسی سے بات کرنے کو اس کا دل نہیں چاہا۔ اسے لگتا تھا جیسے گھر کا ہر فرد اس سے نظریں چُرا رہا ہو، کسی کے پاس اس سے کہنے کے لیے ایک لفظ تک نہیں تھا۔ جیسے وہ بہت بڑا گناہ کر بیٹھی ہو۔

ایسی کون سی عورت ہے جو اپنے مرد کا بٹوارا برداشت کرلے؟ ''کیا میں اتنی بے وقعت ہوں کہ میری جگہ کسی اور کو بڑی آسانی کے ساتھ دے دی دانش نے اور اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی اسے پشیمانی کا احساس نہیں ہوا۔'' اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔

ماں باپ کے گھر میں افرادِ خانہ کی خاموشی بے حسی کے لبادے میں لپٹی محسوس ہوتی تھی تو دانش کی بے وفائی اور اس سے جڑی تلخ یادیں سوہانِ روح تھیں۔ ان خارزار یادوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے وہ بڑی بہن کے پاس کچھ دن کے لیے لندن آگئی۔ بہن کے بچے عمر میں اس سے چند سال چھوٹے ہی تھے لیکن قد کاٹھ میں اس کے برابر تھے۔ شکیلہ کو دیکھ کر وہ پھولوں کی طرح کھل اُٹھے۔ بھول گئی کہ وہ دھتکاری ہوئی عورت ہے۔ سارا دن قہقہے لگاتی اور باہر سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتی۔ بہن کا گھر اس کے لیے کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ شاید نرسری میں پڑھتی تھی جب اس کی بہن کی شادی ہوئی تھی اور بہنوئی اسے اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ جب ان کے بچے ہو گئے تو وہ بچوں کی دوست زیادہ اور خالہ کم تھی۔

شکیلہ نے بہن کو صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ واپس دانش کے پاس نہیں جائے گی۔

''کوئی بات نہیں، نہ جاؤ...... تمہارے لیے رشتوں کی کمی ہے؟'' آپی نے کہا۔ ''چھوڑو اسے اگر نہیں مانتا تو، ہم ڈھونڈیں گے تمہارے لیے اچھا سا رشتہ۔ تم ہمارے بچوں کی طرح ہو۔'' آپی کے لہجے میں ممتا کی حلاوت تھی۔ شکیلہ کے ذہن سے بھاری پتھر ہٹ گیا۔ اس نے وہیں سے دانش سے طلاق لے لی۔ طلاق ہو گئی تو یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

اس کے لیے رشتے داروں سے ملنا جلنا مشکل ہو گیا۔ کسی خوشی غمی کے موقع پر لوگ جان بوجھ کر اس سے پوچھتے۔

''ایسا کیا ہوا تھا کہ علیحدگی ہو گئی؟''

اس کا دل چاہتا وہ چیخ چیخ کر ساری دنیا سے کہے۔ ''مجھے میرے شوہر نے نہیں چھوڑا، میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔'' لیکن کس کس کے منہ پر ہاتھ رکھتی۔ کسے سمجھاتی کہ عورت بھی مرد کو چھوڑنے کا اتنا ہی حق رکھتی ہے جتنا ایک مرد رکھتا ہے۔ لیکن وہ چپ ہو جاتی۔

وقت لمحوں کو سمیٹتا اپنی دھن میں گزرتا رہا۔ گھر والوں نے اس کے لیے کئی رشتے دیکھے لیکن شکیلہ جو دودھ کی جلی تھی، چھاچھ کو بھی پھونک مار کر پی رہی تھی۔ نہ اس کی نگاہ میں کوئی جچ رہا تھا اور نہ وہ کسی کی نگاہ میں جچ رہی تھی۔ ہر بار بات بیچ میں رہ جاتی۔ گھر والے اس سے تنگ آگئے تھے۔

''خود کو دیکھو شکیلہ! اب پہلے والی بات نہیں رہی۔ پہلے تم کنواری تھیں تو اور بات تھی، اب تمہارے دامن پر طلاق کا داغ لگ چکا ہے۔'' ایک دن ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''داغ؟ کیا میں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوں؟ کسی بینک میں ڈاکا ڈالا ہے یا کوئی میرے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے؟ میری نہیں بنی اس شخص کے ساتھ بات ختم ہو گئی۔'' شکیلہ نے توجیہہ پیش کی۔

''تم تو اپنی بات کر کے بے فکر ہو جاتی ہو، ہر طرف سے باتیں تو مجھے سُننی پڑتی ہیں۔''

''امی! اس شخص نے غیر عورت کے سامنے مجھے بے عزت کرتے ہوئے کہا تھا۔ مجھے سب پتا ہے کہ تم کیا کرتی پھرتی ہو۔ غلط کام سے روکنے پر اس نے مجھے آوارہ اور بدچلن کہہ دیا اور بھائی کہتے ہیں ایسی کیا آفت آگئی تھی۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

ماں کافی دیر چپ بیٹھی رہی پھر آنچل کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''ویسے تو تمہاری مرضی ہے بیٹا! لیکن تمہاری بہن کہتی ہے شکیلہ میرے گھر کم کم ہی آیا کرے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں شکیلہ! تمہارے سب بہن بھائی اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ چار چار جماعتیں پڑھی لڑکیاں میرے بیٹوں کے گھر میں راج کر رہی ہیں اور تم فقیروں کی طرح دردر بھٹک رہی ہو۔ اپنے گھر میں خوش ہوتیں تو مجھے آرام ملتا اور تمہارے ابو کے سر سے بھی بوجھ اترتا۔'' ماں کی لحہ بہ لحہ گھٹتی آواز سسکیوں میں بدل گئی۔

شکیلہ نے پہلی بار محسوس کیا بات اتنی چھوٹی بھی نہیں جتنی وہ سمجھ رہی تھی۔ اس کی وجہ سے ماں کتنی پریشان اور دکھی ہے، اسے اندازہ ہوگیا۔

''ٹھیک ہے امی! آپ کا جس لڑکے کے ساتھ دل چاہے میری شادی کردیں۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گی۔ پلیز مجھے معاف کردیں۔'' ماں کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھ کر وہ اپنے کمرے میں آگئی اور آپی کی بات سوچ کر کافی دیر روتی رہی۔

شکیلہ کی زبان سے ہاں سن کر اس کی ماں خوش تو ہوگئی لیکن یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ خوشی کی اوٹ میں دبکے غم نے شب خون مارا اور اس کی ماں کی زندگی کا چراغ گل کرگیا۔ ہارٹ اٹیک نے اسے زیادہ جینے کی مہلت نہ دی اور وہ بیٹی کا گھر بسنے کی آس لیے ہی منوں مٹی تلے جا سوئی۔ وہ روح سے عاری ماں کے جسدِ خاکی سے لپٹ لپٹ کر روتے ہوئے کئی بار بے ہوش ہوئی تھی۔

ماں چلی گئی، گھر کے در و بام اداسی کی لپیٹ میں آگئے۔ شکیلہ اپنے کمرے میں پڑی روتی رہتی۔ افرادِ خانہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے مگر اس کے آنسو تھمتے ہی نہیں تھے۔

''لڑکیوں کے بڑے بوجھ ہوتے ہیں ذہن پر۔ یہ اس کے مرنے کے دن تو نہیں تھے۔ ابھی تو صحت مند تھی۔ لڑکی کا غم کھا گیا۔'' پرسے کے لیے آنے والی ہر عورت یہی بات کرتی اور وہ احساسِ ندامت سے پانی پانی ہوجاتی۔ وہ خود کو ہی ماں کی موت کا ذمے دار سمجھنے لگی۔

آپی کی بات احساس کو کچوکے لگاتی کہ اس نے کہا تھا

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

خوشیوں سے لبریز لمحات
جاسوسی کی دلنشین سوغات

اولین صفحات

الیکشن کی گہما گہمی اور سیاست کدہ میں رونما ہونے والے تغیرات...... محبت اور سیاست کے اتار چڑھاؤ۔ **ایچ اقبال** کے قلم سے

انگارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا **طاہر جاوید مغل** کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک ــــ نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی ســرگزشــت......
عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

مسیحا اور مسیحائی کے ہاتھوں دردوں دکھوں کی خرید و فروخت کا دردناک احوال

دل ناتواں سے حالات کا مقابلہ کرنے والوں کا دل گداز فسانہ

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھٹائیں

شکیلہ میرے گھر نہ آئے سسرالی خاندان کے سامنے مجھے سبکی محسوس ہوتی ہے۔

اگر کسی سے اس کا بات کرنے کو دل چاہتا تو وہ اس کے بہنوئی تھے جو اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک شکیلہ نہ کھالیتی۔

چھ ماہ گزر گئے۔ وہ ماں کی جدائی کے غم سے سنبھل گئی تو گھر والوں نے پھر سے رشتے دیکھنے شروع کر دیے لیکن ماں کے انتقال کے بعد جیسے شادی کا لفظ ہی اس کے لیے اذیت بن گیا تھا۔

آپی نے اپنے سسرالی خاندان میں ایک لڑکے کا رشتہ دیکھا تھا لیکن اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ ''مجھے نہیں پسند۔''

''کیوں نہیں پسند؟ آخر مجھے بھی تو پتا چلے میری گڑیا کو کیسا لڑکا پسند ہے؟'' آپی نے اسے بانہوں میں بھرلیا۔

''دُلہا بھائی جیسا۔'' شکیلہ نے شرارت سے کہا۔

''پھر ان کے ساتھ ہی کرلو۔ میں تو تمہاری خاطر یہ قربانی دینے کے لیے بھی تیار ہوں۔'' آپی ایک دم غصے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔

''آپی......!'' شکیلہ چیخ مار کر بہن سے چپک گئی۔ ''میں تو مذاق کر رہی تھی۔''

''چیختی کیوں ہو؟ چوری اور سینہ زوری۔'' آپی کے لہجے میں تلخی در آئی۔ اس کے دونوں بچے ماں کی آواز سن کر اندر آ گئے۔

''بچو......! آج سے شکیلہ تمہاری ممی ہے۔ تمہارے پاپا کے ساتھ اس کی شادی ہوگی۔'' وہ دیوار سے سر ٹکرانے لگی۔

''آپی......!'' شکیلہ چیخ مار کر بہن کے پاس بھاگی۔ دونوں بچے ماں سے لپٹ کر تنفر سے اس کی طرف دیکھنے لگے جیسے سچ مچ وہ ان کی سوتیلی ماں ہو۔

وہ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی لیے اٹھی اور ابو کو فون کر دیا کہ آ کر مجھے لے جائیں۔

شکیلہ کو تیسری اولاد سمجھنے والی آپی نے جھوٹے منہ بھی نہیں کہا تھا ''شکیلہ تم نہ جاؤ!'' بچے خدا حافظ تک نہیں کہنے آئے۔ وہ دل پر بوجھ لیے گھر واپس آ گئی۔

شوہر کے سامنے احتجاج، اس کا جرم بن گیا تھا۔ ایک دن اس کی ایک دوست اس سے ملنے کے لیے آئی جو دورانِ تعلیم اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔ شاہین نام تھا اس کا۔ وہ کسی این جی او سے وابستہ تھی جو غریب اور نادار لوگوں کے لیے کام کرتی تھی۔ شکیلہ اسے مرجھائی مرجھائی سی لگی تو وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ شکیلہ اس کے ساتھ جا کر کچھ دیر کے لیے اپنا غم بھول گئی۔ کئی ماہ بعد اس کے لب مسکرائے تھے۔

''یہ کیا حالت کرلی ہے تم نے اپنی؟ لگتا ہی نہیں کہ تم وہ شکیلہ ہو جو کالج میں تتلی کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ ٹیک اٹ ایزی یار! موت برحق ہے، مجھے تمہاری والدہ کے انتقال کا بہت افسوس ہے لیکن مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جاسکتا۔''

''میری ماں کچھ دن اور جی لیتیں، میری طلاق نے ان کی جان لے لی...... میں اپنی ماں کی قاتل ہوں۔'' وہ شاہین کے کاندھے پر سر رکھ کر رو پڑی۔

شاہین نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بس یہیں پر عورت مار کھا جاتی ہے۔ خاص طور پر مشرقی عورت خواہ وہ لندن میں رہتی ہو یا پاکستان میں، طلاق کو کبھی قبول نہیں کرتی۔ دانش جب بھانت بھانت کی لڑکیوں کے ساتھ عیاشی کرتا رہتا تھا اور تمہیں پوچھتا تک نہیں تھا تو تم کیا کرتیں؟'' شاہین نے پوچھا۔

شکیلہ نے ایک پل کے لیے نظریں اٹھا کر شاہین کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکاتے ہوئے شکستہ لہجے میں بولی۔ ''شاہین! مجھے لگتا ہے میں سیکنڈ ہینڈ ہوگئی ہوں۔ اہلِ خانہ سمجھتے ہیں کچھ نہیں ہوا، سب لوگ مجھے ہی قصوروار سمجھتے ہیں۔ میری ہی غلطی ہے۔ میں ہی اپنے شوہر کو نہیں سنبھال سکی۔ مجھے گھر سنبھالنا نہیں آیا۔''

''سب سے پہلے اپنی سوچ بدلو پھر کسی اور کی...... پہلے خود میں تبدیلی لاؤ۔ اگر تمہیں طلاق ہوگئی ہے تو کیا ہوا۔ جو بندہ تمہارے لائق تھا ہی نہیں اس کا کیا افسوس کرنا۔ تم کون سا بڑھاپے کی دہلیز پر بیٹھی ہو کہ تمہارے رشتے نہیں آئیں گے یا اس دنیا سے مرد ناپید ہو گئے ہیں۔'' شاہین نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم بس اپنے بارے میں اچھا سوچو اور یہ افسردگی کا لبادہ اتار پھینکو۔''

شکیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر میں کیا کروں؟''

''گھر سے باہر نکلو۔'' شاہین نے کہا۔ ''ٹھیک ہے جاب نہ کرو۔ خدمتِ خلق تو کر سکتی ہو؟'' شاہین نے کہا۔ ''ہمارے سینٹر میں آ جایا کرو وہاں غریب اور نادار لوگوں کے دکھ بانٹ لینے سے تم اپنے غم بھول جاؤ گی۔ مجھے امید ہے تمہیں وہاں سکون ملے گا۔''

شکیلہ کو یہ تجویز اچھی لگی۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ شادی کے بعد جن دوستوں سے رابطہ کٹ گیا تھا، ان سے ملنے لگی۔ وہ بھانت بھانت کی عورتوں سے ملتی، بزرگوں کا حال احوال دریافت کرتی، بچوں سے کھیلتی۔

اُن کے دکھ بانٹتے بانٹتے وہ اپنے دکھ بھولنے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ زندگی کی رونقوں کی طرف لوٹ رہی تھی۔ وہ

سینٹر میں منعقد ہونے والی تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔

شاہین کے زور دینے پر اس نے دوبارہ پڑھنے کا فیصلہ کرلیا۔ ہمت اور قابلیت کی بنیاد پر سینٹر میں اسے سوشل ورکر کے طور پر منتخب کرلیا گیا۔ وہ زندگی سے خوشیاں کشید کر رہی تھی۔ تعلیمی مصروفیات اور سینٹر کے معاملات کی دیکھ بھال میں وہ یہ بھی بھول گئی کہ کبھی اس پر بھی غم کے پہاڑ ٹوٹے تھے۔ شاہین ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ایک اچھی مخلص دوست ثابت ہوئی تھی۔

ایک دن اسے ایک فرم کی طرف سے پُرکشش تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ روپے پیسے کی پہلے بھی اس کے پاس کمی نہیں تھی لیکن اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا الگ ہی مزہ ہوتا ہے۔ اس نے ملازمت کی پیشکش قبول کرلی۔ اس کی شخصیت میں سنجیدگی اور وقار آگیا تھا۔

اسے دانش کی حرکتیں بہت چھوٹی لگتیں جب اس سے ملنے والی بے سروساماں خواتین اسے بتاتیں کہ ہم سے چار چار بچے پیدا کروا کر ہمارے مرد دوسری شادی کر کے سوتنیں ہمارے سروں پر مسلط کر دیتے ہیں یا باہر دوسری عورتوں سے ملتے ہیں۔ شکیلہ کو لگتا کہ اس کے ساتھ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔

شاہین سچ ہی تو کہتی تھی۔ ''تمہارا کیا بگڑا ہے؟ تمہاری ذات کا نقصان تو تب ہوتا جب تم اپنی ہار مان کر دانش کے پاؤں پکڑ لیتیں۔ اس کے دو چار بچے پیدا کرلیتیں اور ساری عمر ان بچوں کو پالتیں اور خون کے آنسو روتیں۔''

شکیلہ سوچتی کتنا اچھا کیا تھا میں نے کہ ایک دم ہی دانش کو چھوڑ دیا تھا۔

اس کے بھائیوں نے دبے دبے لفظوں میں کئی بار شادی کی بات کی تھی۔

اسی لیے شکیلہ کو گھر کا ماحول پھر سے بوجھل لگنے لگا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ گھر کی فرد ہوکر بھی گھر والوں پر بوجھ ہے۔ وہ گھر کا حصہ نہیں رہی۔

وہ مجبوری کے تحت گھر میں رکھے ہوئے سامان کی طرح خود کو محسوس کرنے لگی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی شیلٹر ہوم میں رہ رہی ہو جس کے مالک اسے رکھنا بھی نہ چاہتے ہوں اور جانے کے لیے بھی نہ کہتے ہوں۔

کتنا فرق آگیا تھا اس کی پوزیشن میں۔ ایک وقت تھا جب اس کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا تھا اور اب وہ گھر میں پڑے کاٹھ کباڑ جیسی تھی جسے کوئی بھی اٹھا کر ایک کونے سے دوسرے کونے میں رکھ دے۔

'لعنت ہے ایسی زندگی گزارنے پر.....' اس نے تلخی سے سوچا۔

جلد ہی اس نے اپنے آفس کے قریب ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔ اہلِ خانہ سے بھی کہا کہ یہاں سے آفس دور پڑتا ہے۔ ویسے اسے یہ بات کسی سے کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ زندگی کا ہر رخ وہ دیکھ چکی تھی۔ لہٰذا اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اسے اچھی خاصی تنخواہ ملتی تھی۔ وہ ایک آرام دہ اور پُرسکون زندگی گزار سکتی تھی۔

گھر والوں سے اس نے تقریباً ناتا ہی ختم کرلیا۔

گھر والوں کی دیکھا دیکھی اس کی جان پہچان کے لوگوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ ویسا ہی ہوتا تھا۔ کچھ لوگ اسے دیکھتے ہی اس کی نجی زندگی سے متعلق سوال کرنے لگتے تھے۔

ایک دن........ اس کے آفس کی جھاڑ پونچھ کرنے والی عورت آفس آئی تو اس کی ایک آنکھ کے نیچے چوٹ کا نشان تھا۔ شکیلہ نے چوٹ دیکھ کر پوچھا۔ ''سکینہ! یہ تمہاری آنکھ کے نیچے زخم کیسے لگا؟''

شکیلہ کے ہمدردی کرنے پر اس عورت کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے' وہ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔

''باجی! یہ تو روز کی بات ہے جی میرا بندہ مجھے روز مارتا ہے۔''

''روز مارتا ہے لیکن کیوں؟'' شکیلہ نے متحیر ہوکر پوچھا۔

''بس جی باجی! بات صرف اتنی ہے کہ ادھر فیصل آباد میں میری ماں بیمار ہے۔ میں نے وہاں جانے کے لیے ٹکٹ کے پیسے مانگے تو گالیاں نکالتا ہوا مجھے مارنے لگا۔''

''تم اپنی تنخواہ کے پیسوں سے چلی جاؤ نا۔'' شکیلہ نے تجویز دی۔

سکینہ آنچل کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''میری ساری تنخواہ وہ لے لیتا ہے۔ میں تو جی اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتی۔''

شکیلہ کو سکینہ پر بڑا ترس آیا۔ اس نے اپنے بیگ سے کچھ پیسے اسے نکال کر دیے اور دفتر سے کچھ دن کی چھٹی بھی لے کر دی۔ سکینہ اسے دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی اور پندرہ دن ماں کے پاس رہ کر واپس آگئی۔

کئی ماہ گزر گئے۔ ایک دن شکیلہ شام کے وقت آفس سے نکل کر خارجی راستے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اپنا نام سن کر ٹھٹک کر رک گئی۔ سکینہ اور دفتر کی ایک دوسری ملازمہ باتیں کر رہی تھیں۔ شکیلہ قدرے تاریکی میں کھڑی ہوکر ان کی باتیں سننے لگی۔

''شکیلہ نے شادی کیوں نہیں کی؟'' سکینہ کے ساتھ کام

کرنے والی دوسری ملازمہ کی آواز سنائی دی۔
"ہوئی تھی شادی، شوہر نے چھوڑ دیا۔" سکینہ قہقہہ مار کر ہنسی۔
"یہ اکیلی کیوں آتی ہے دفتر؟ اسے کوئی چھوڑنے کیوں نہیں آتا؟ کوئی بھائی بند نہیں ہے کیا؟" ملازمہ نے دوسرا سوال کیا۔
"لو بتاؤ! اکیلی کو کیا ہوتا ہے۔" سکینہ نے کہا۔ "بہت بڑی افسر لگی ہوئی ہے۔ بیس پھرتے ہیں آگے پیچھے۔ اکیلی کہاں سے ہوگئی، بھلے ایک چھوڑ کر دوسرا پکڑ لے۔ کوئی تمہارے، میرے جیسی نہیں ہے کہ اپنے بندے سے مار کھاتی جائے اور ان کے بچے بھی پالتی رہے۔"
"لگتی تو نہیں ہے ایسی۔" ملازمہ کو یقین نہ آیا۔
"ایسی لڑکیاں نقصان میں نہیں رہتیں۔" سکینہ بولی۔ "ایک باس چھوڑ کر دس کو اپنے بس میں کر لیں۔ نہ باسوں کی کمی نہ نوکریوں کی۔ مجھے تو لگتا ہے اسے نوکری بھی ایسے ہی ملی ہوگی۔ ان کو تو نوکری بھی مسکرانے پر مل جاتی ہے۔ بات تو ہم جیسوں کی ہے۔"
"نہ بہن! رب نہ دلائے ایسی نوکری۔" ملازمہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔
"شوہر چاہے صبح شام مارتا رہے پر آدمی تو اپنا ہے۔"
شکیلہ کو احساس ہوا اس کی سوچ اور حالات بدلنے کے باوجود لوگوں کی سوچ وہی ہے۔ لوگوں کی نظروں میں وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ دھتکاری ہوئی عورت......!
وہ کئی دن اداس رہی۔ ایسے کئی پل تھے جنہیں باوجود کوشش کے بھی وہ بھلا نہیں پائی۔ جب بستر پر لیٹتی تو لوگوں کی باتوں کی بازگشت اس کی سماعتوں کو مجروح کرتی۔
اس کی ہر سوچ کے آگے بے بسی سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہو جاتی۔
اس نے تو ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ بھی عام لڑکیوں جیسی بے فکری کی زندگی جیے گی۔ سیدھا سادہ سا ایک پیار کرنے والا شوہر ہوگا جس کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزر جائے گی لیکن انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ حالات اس کی مٹھی سے ریت کے ذروں کی طرح نکل گئے۔
"یہ دنیا بھی کیا چیز ہے۔" وہ افسردگی سے سوچتی اور شادی تو جیسے معاشرے میں رہنے کا سرٹیفکیٹ تھی۔ انسانی فطرت بھی عجیب ہے۔ شادی سے پہلے لوگ آنے والے لمحات کے بارے میں سوچ کر خوش ہوتے ہیں اور شادی کے بعد بیتے لمحوں کو یاد کر کے روتے ہیں۔

شاید وہ، یہ بوجھ ساری عمر اپنے کاندھوں پر اٹھائے چلتی رہتی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسے ابو کے ہارٹ اٹیک کی اطلاع ملی تو وہ سب کام چھوڑ کر گھر کی طرف بھاگی۔ ابو بہت کمزور ہو گئے تھے۔ شکیلہ نے ان کی حالت دیکھی تو رو پڑی۔
"شکیلہ بیٹی! تمہاری ماں تمہارے گھر بسنے کا ارمان لیے منوں مٹی تلے جا سوئی اور اب میں بھی......" اس کے والد کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔
"نہیں ابو! ایسا مت کہیں۔" وہ ابو کے سینے پر سر رکھ کر کافی دیر روتی رہی۔
"بیٹی! میرے دوست کا بیٹا انگلینڈ سے پاکستان آیا ہوا ہے۔ اگر تم کہو تو میں تمہارے رشتے کی بات کروں؟" ابو نے جیسے آخری خواہش کا اظہار کیا۔ شکیلہ چپ بیٹھی رہی۔
"اچھے خاندان کا لڑکا ہے۔" ابو نے کہا۔ "وہ لوگ بہو، بیٹیوں، بیویوں کی عزت کرتے ہیں۔ راشد تمہیں دانش کی طرح دکھ نہیں دے گا۔"
"جیسا دل میں آئے کریں ابو۔" شکیلہ زبردستی مسکرائی۔ وہ ماں کا دکھ بھولی نہیں تھی۔ اب باپ کی بیماری نے اسے سرتاپا ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی کہ کل کو لوگ اسے باپ کا بھی قاتل کہیں۔
اس وقت شکیلہ کے لیے وقت رک گیا تھا، جب اس نے راشد کو دیکھا۔ وہ بولی کچھ نہیں تھی۔ شاید زندگی میں پہلی بار وہ شرمائی تھی اور پہلی بار ہی اس کے اندر کی عورت بیدار ہوئی تھی۔
پھر اس کا دل بدل گیا۔ اس کے خیالات بدل گئے۔ اس کی زندگی میں کلیاں کھل گئی تھیں۔ اداسیاں خواب و خیال بن گئیں۔ شادی کے بعد راشد اسے اپنے ساتھ انگلینڈ لے آیا تھا۔
راشد میں سب کچھ انوکھا تھا۔ نہ زیادہ بولنا، نہ لڑنا۔ نہ عام مرد کی طرح ہر وقت حکم دیتے رہنا۔ وہ منتظر رہتی کہ راشد اسے کسی کام کے لیے کہے۔ اس کے ساتھ کبھی خفا ہو جائے اور وہ اسے منائے۔ لیکن اس کا تو خمیر ہی کسی اور مٹی سے اٹھا تھا۔ شکیلہ اس کی عادات، پسند ناپسند جان گئی تھی۔ اس کے کچھ بغیر کہے ہی اس کے تمام کام کر دیتی تھی۔ راشد کے علم میں لائے بغیر وہ ڈھیر ساری چیزیں پاکستان میں اس کے بہن بھائیوں کے پاس بھیجتی رہتی تھی۔
راشد نے اپنی کمائی سے دو بہنوں کی پاکستان میں شادی کر دی تھی۔ چھوٹے بھائیوں کو پڑھا رہا تھا اور چھوٹے موٹے کاموں کے لیے وہ گھر والوں کی مدد کرتا رہتا تھا۔ شکیلہ نے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ اسے راشد کی ایک عادت بڑی پسند

تھی۔ وہ کبھی کسی کو ناراض نہیں کرتا تھا۔

کام کے وقت شکیلہ کی پیشانی پر پسینا بھی اس سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھلا وہ اپنی قسمت پر نازاں کیوں نہ ہوتی۔

آج وہ راشد کی الماری میں کسی لڑکی کی تصویر دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ جیسے اسے پورا یقین تھا کہ وہ اس کا ہے، صرف اس کا۔

رات کو جب وہ گھر آیا تو شکیلہ کے چہرے پر عجیب سی شرارت تھی۔ راشد نے لباس تبدیل کیا اور کھانا کھا کر حسبِ عادت کتاب پڑھنے لگا۔ شکیلہ نے چائے بنا کر کپ بیڈ کے ساتھ رکھی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ راشد نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔

''میں نے آپ کے کپڑے دھو کر الماری میں رکھ دیے ہیں کہ کہیں آپ خود نہ دھونے بیٹھ جائیں۔'' شکیلہ کے لبوں پر شریر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ راشد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''یہ آپ بولتے کیوں نہیں؟'' وہ اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''ہاں بولو۔'' راشد نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

''کیا بات ہے؟ بڑے اداس ہیں آج۔ کیا سیما یاد آرہی ہے؟'' شکیلہ نے بدستور شرارت کے انداز میں کہا۔

راشد نے اچانک کتاب سے نظریں ہٹا کر شکیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر اس کی طرف سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر کتاب پڑھنے لگا۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' شکیلہ پھر چہکی۔

''کیا جواب دوں......؟'' راشد نے آہستگی سے کہا۔

''سیما کی یاد آگئی کیا؟'' اس نے راشد کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''سیما...... بھولی ہی کب تھی کہ یاد آئے گی۔'' راشد نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو یاد ہے وہ؟'' شکیلہ نے پوچھا۔ ''آپ نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا۔'' خوش فہمی کا فانوس ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

''میں نے کبھی تمہارے بارے میں تم سے پوچھا؟'' وہ زیرِلب مسکرایا۔

''میرے بارے میں تو آپ سب جانتے ہیں۔'' شکیلہ کی آواز میں آنسوؤں کی کڑواہٹ گھل گئی لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔

''میرے بارے میں بھی تمہیں پتا تو ہے۔ مزید کیا جاننا چاہتی ہو؟'' راشد نے چائے کا کپ اٹھا کر ایک سِپ لیتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سیما کون تھی؟ کیوں چھوڑ دیا اُسے؟ کیا قصور تھا اُس کا یا اس نے کسی اور سے شادی کر لی؟'' شکیلہ نے ایک ہی سانس میں متعدد سوال کر دیے۔

''کسی نے کسی کو نہیں چھوڑا شکیلہ! زندگی کی کچھ مجبوریوں کا عذر تھا۔ مجھے انگلینڈ آنا پڑا۔''

''مجبوریاں...... کیسی مجبوریاں؟'' شکیلہ کو حیرت ہوئی۔

''مسائل کے انبار میں دب گیا تھا میں اور وہ کسی خیال کی طرح وہیں رہ گئی۔ ایک مڈل کلاس فیملی میں، میں کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں گھوم رہا تھا۔'' راشد نے کہا۔ ''بہنوں کی شادیاں کیں، بھائیوں کو پڑھایا۔ مکان بنوایا، تمہارے سامنے کتنے کام کیے انگلینڈ آنے کے بعد۔ پاکستان میں زیادہ سے زیادہ سرکاری ملازمت مل جاتی یا کسی پرائیویٹ فرم میں لگ جاتا۔ اس سے دو وقت کی روٹی تو مل جاتی لیکن دیگر مسائل تلوار کی طرح سر پر لٹکتے رہتے۔ پھر والد صاحب کب تک کام کرتے۔'' راشد نے پہلی بار اپنی زندگی کے کچھ گوشوں سے پردہ سرکایا۔

''اس کا مطلب ہے آپ کو انگلینڈ پسند نہیں ہے۔ ایسے ہی مجبوری میں آپ یہاں رہ رہے ہیں؟'' شکیلہ کو راشد کی باتیں سُن کر دھچکا سا لگا۔

''مجبوریاں ہی تو مارتی ہیں شکیلہ! ورنہ کون کسی دھتکاری ہوئی عورت سے شادی کرتا ہے۔'' راشد نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''دھتکاری ہوئی عورت۔ کیا مطلب دھتکاری ہوئی عورت؟'' شکیلہ نے اُٹھ کر حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں چھوڑی ہوئی، سیکنڈ ہینڈ سامان جیسی...... استعمال شُدہ چیز، جسے صرف سمجھوتا کرتے ہوئے بحالتِ مجبوری قبول کیا جاسکتا ہے۔'' راشد نے چائے کا خالی کپ سائیڈ پر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

''آپ کو محسوس ہوا ایسا میرے بارے میں؟'' شکیلہ کی آواز جیسے پاتال کی گہرائیوں سے آئی۔

''محسوس تو ہوا ہے۔ انسان ہوں میں بھی...... ایک کمزور سا انسان۔'' راشد نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔

شکیلہ کو یوں محسوس ہوا جیسے راشد نے اپنا سر نہیں کوئی بھاری پتھر اس کے دامن میں رکھ دیا ہو۔ ایک ایسا بھاری پتھر جس کا وزن راشد سے شادی کے بعد اسے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔

قسط نمبر: 16

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری ...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

قت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمرِ رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے ۔کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی' اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

گزشتہ افسانے کا خلاصہ

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ''علی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔اس کی اپنی بیوی ریٹا میگڈالین سے علیحدگی ہوچکی تھی۔ وقتِ رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی لفنی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد ایسا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا۔یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے ایبنگلٹن میں واقع ''سرکل اے'' نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ''سرکل اے'' میں گھس آئے۔تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔علی کا دامن صاف تھا۔پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔بعدازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو فی نکس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔''وِنی لاؤنج'' نامی ایک ریسٹورنٹ میں ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔اس دل نشیں مہ جبیں نے علی کے دردِل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ایک رات وِنی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔اس مارا ماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر رخصت ہوگئی...... اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہوگیا تھا۔آنے والے دنوں میں علی اور لیونارڈو کے غنڈوں میں گاہے بہ گاہے مڈھ بھیڑ ہوتی رہی۔لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔وِنی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ایک روز جب شارو اسٹیلے اسٹورز سے گروسری خریدنے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیبلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر پیبلو، شارو اور لیونارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر پیبلو کو ادھ موا کر دیا۔آئندہ روز پیبلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہوسکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور لیک جیکسن سے بوسٹن پہنچ گیا۔اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے علی کو پیبلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال......علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہوگیا۔پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی......اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آرک باروخ لاؤ اور ایما ایپل بام سے علی کی ملاقات بھی کروادی۔تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ''اسکل اینڈ بونز'' سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہوگئے تھے۔ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ''اسکل اینڈ بونز'' کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے سٹی اپنے انکل کے پاس آگیا۔یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔علی سلطان نے ایک گارجین کی

حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہوگئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہوجانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کرسکتا تھا۔ علی نے تیاری کی اور بوسٹن سے کراچی آگیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نئے ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ائرپورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جاکر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنادیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہوگئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگالیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہوگئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہوگیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے وزٹ ویزا کے حصول کے لیے کوشش شروع کردی۔ کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کرکے علی کی والدہ کو قتل کردیا۔ علی نے تہیہ کرلیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا۔ علی نے تمام حقیقت بینا کو بھی بتادی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور ہمراز بن گئی تھی۔ علی کو اس کی رہائشگاہ کے پتے پر ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کے قتل کا اعتراف کیا گیا تھا۔ علی نے نادر شاہ کو چیک کرنے کا ارادہ کیا۔ علی نے عظیم کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ نادر شاہ کو اغوا کرکے اس سے سچ اگلوایا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادر شاہ کو اغوا کرایا۔ تاہم اس میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کرکے بتایا کہ ان کے آدمیوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ نادر شاہ اور اغوا کنندگان پولیس کی تحویل میں پہنچ گئے تھے۔ علی نے فوری طور پر بنگلا چھوڑ دیا اور بینا کے ہمراہ اس کے فلیٹ پر آگیا۔ علی نے بنگلے پر جمشید کو چھوڑا تھا اور خاص نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ علی کو دو جرمن شیفرڈ کی مدد سے تلاش کیا جارہا تھا۔ اس کے درپردہ ڈیلفینا کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ کسی بھی طرح علی کو قابو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کرکے پولیس کو پیچھے لگادیا تھا جو بڑی شدومد سے علی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ علی نے نادر شاہ کو سبق سکھانے کے لیے اسے قابو کیا اور بدترین تشدد کرکے اسے محتاجی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا اور اپنی ماں کے بنگلے کو نذرِ آتش کردیا۔ علی، بینا کے ساتھ ساحلِ سمندر پر چہل قدمی کررہا تھا کہ ایک عورت نے علی کو مدد کے لیے نام لے کر پکارا۔ علی کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

اس عورت نے جس طرح براہِ راست میرا نام لے کر درخواست کی تھی، اس نے میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ اس وقت ہم جس نوعیت کے سنگین حالات میں گھرے ہوئے تھے اس میں مذکورہ عورت کا یہ عمل رگ و پے میں سنسنی دوڑا دینا تو رہا ایک طرف، دماغ کی چولیں ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ میں اسے ہرگز نہیں جانتا تھا۔ تشویش کی بات یہ تھی کہ وہ میری شناسا کیسے ہوگئی؟ میں نے اس کی التجا پر توجہ دیے بغیر قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''کون علی......؟''

میں نے آنکھوں پر سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ وہ ایک لمحے تک بڑی گہری اور ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ''سوری بھائی! گھبراہٹ میں میرے منہ سے شوہر کا نام نکل گیا......''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کے شوہر کا نام علی ہے؟''

''میرے شوہر کا نام ریاض علی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن میں انہیں ''علی'' کہہ کر ہی مخاطب کرتی ہوں۔ آئی ایم ریئلی ویری سوری!'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں نے پریشانی میں آپ کو ''علی'' کہہ دیا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' بینا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر اس عورت سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام شائلہ ہے۔'' اس نے بہ دستور میری جانب دیکھتے ہوئے بینا کے سوال کا جواب دیا۔

شائلہ درمیانی عمر کی ایک دلکش اور حسین عورت تھی تاہم اس وقت حواس باختگی نے اس کی شگفتگی کو گہنا رکھا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں بے پناہ اضطراب اور تشویش دکھائی دی۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''شائلہ! آپ کے ساتھ کیا پرابلم ہے؟''

''ہم تمہاری کیا مدد کرسکتے ہیں؟'' بینا نے بھی اضافہ کیا۔

''میرا بچہ نہیں مل رہا......'' وہ روہانسی ہوگئی۔

مجھے اس دکھیاری ماں پر بڑا ترس آیا۔ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کا بچہ مل جائے گا......انشاءاللہ!''

بینا نے استفسار کیا۔ ''تمہارا بچہ کہاں گم ہوا ہے؟''

''وہ ادھر ہی غبارا لینے آیا تھا......'' وہ ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے بولی پھر متلاشی نظر سے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے خودکلامی کی۔ ''پتا نہیں، کاشف کہاں چلا گیا۔''

کاشف یقیناً شائلہ کے گم شدہ بچے کا نام تھا۔ اس نے جس جانب اشارہ کیا تھا، وہاں ایک غبارے بیچنے والا کھڑا تھا۔ ساحل کے اس حصے میں لوگوں کا زیادہ رش نہیں تھا۔ وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین چار فیملیز موجود تھیں۔

''آپ کے بچے کی عمر کتنی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کاشف پانچ سال کا ہے۔'' اس نے بتایا۔

بینا نے قدرے برہمی سے سوال کیا۔ ''تم نے اسے اکیلا کیسے چھوڑ دیا؟''

''ہم ماں بیٹا اکثر ادھر آتے رہتے ہیں۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''لیکن پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا......'' اس نے ایک مرتبہ پھر بے چین انداز میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی پھر دہائی دینے والے انداز میں بولی۔ ''ہائے میرا بچہ......!''

''آپ نے مجھ سے کہا...... پلیز، میری مدد کرو۔'' میں نے ایک نہایت ہی اہم اور برمحل سوال کیا۔ ''بتائیں، اس سلسلے میں، میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''دراصل میں علی کو...... میرا مطلب ہے، اپنے شوہر ریاض کو کاشف کی گمشدگی کی اطلاع دینا چاہتی ہوں لیکن میرے موبائل میں بیلنس ختم ہوگیا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ اپنے موبائل سے فون کرکے ریاض سے میری بات کروادیں تو بہت احسان ہوگا۔''

''اوکے! یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' بینا نے معتدل انداز میں کہا۔ ''تم مجھے اپنے شوہر کا نمبر بتاؤ۔ میں ابھی اس سے تمہاری بات کروادیتی ہوں۔''

شائلہ کی درخواست جائز تھی لہٰذا بینا نے بھی موقع محل کی مناسبت سے متعاون ردِعمل کا اظہار کیا تھا۔

''ٹھہریں، میں ابھی آپ کو ریاض کا نمبر بتاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور نمبر دیکھنے لگے۔

چند سیکنڈ کے بعد شائلہ نے اپنے شوہر کا کانٹیکٹ نمبر بینا کو بتادیا۔ بینا نے اپنے سیل فون سے ریاض کا نمبر ملایا پھر دوسری جانب کال ریسیو کیے جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اس دوران میں شائلہ متلاشی نگاہ سے اپنے گردونواح کو کھوج رہی تھی۔

رابطہ ہونے پر بینا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہیلو! ریاض صاحب بات کررہے ہیں؟''

دوسری جانب سے یقیناً تصدیقی جواب دیا گیا ہوگا جبھی بینا نے کہا۔

''لیں...... آپ اپنی وائف سے بات کریں۔''

پھر بینا نے اپنا سیل فون شائلہ کی طرف بڑھادیا۔

شائلہ نے بینا کے ہاتھ سے سیل فون لے کر اپنے کان سے لگایا پھر بھرائی ہوئی آواز میں کاشف کی گمشدگی کا احوال اپنے شوہر ریاض علی کو سنانے لگی۔ دوسری جانب ریاض اس سے کیا کہہ رہا تھا، وہ سب ہماری سماعت کی پہنچ میں نہیں تھا۔ لگ بھگ ایک منٹ کے بعد شائلہ نے یہ کہہ کر بات ختم کردی۔

''آپ جلدی پہنچیں، میں بہت پریشان ہوں۔''

پھر وہ بینا کا سیل فون اسے واپس کرتے ہوئے تشکرانہ انداز میں بولی۔ ''بہن! آپ کا بہت شکریہ۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔''

''آپ کے شوہر نے کیا کہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس، ریاض چند منٹ میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔'' وہ مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔''

''شائلہ! میری دعا ہے کہ کاشف جلد از جلد آپ کو مل جائے۔'' میں نے صدقِ دل سے کہا۔

وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔''

''آمین......!'' بینا نے کہا۔

ریاض سے بات ہوجانے کے بعد شائلہ کی پریشانی میں کافی حد تک کمی واقع ہوگئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اللہ کرے اس کا بچہ مل جائے۔ بے چاری بہت پریشان ہے۔''

''ظاہر ہے...... یہ بات ہے ہی پریشانی والی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''چھوٹے بچوں کا معاملہ بڑا حساس ہوتا ہے۔ ذرا سی کوتاہی اور بے پروائی کوئی بڑی مصیبت کھڑی کرسکتی ہے۔''

ہم تھوڑی دیر تک شائلہ اور اس کے گم شدہ بچے کاشف کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے پھر سیل فون اسنیچرز زیر بحث آگیا۔

غروب آفتاب کے بعد ہم نے واپسی کی راہ لی کیونکہ اس وقت تک ساحل ویران ہوچکا تھا اور اس کا سبب تھا، ماہ رمضان۔ عام دنوں میں یقیناً یہاں دیر تک چہل پہل رہتی ہوگی۔

''میرا خیال ہے، ڈنر کرکے ہی چلتے ہیں۔'' بینا نے تجویز پیش کرنے والے انداز میں کہا۔

''نیک خیال ہے۔'' میں نے گردن کو تائیدی جنبش

دیتے ہوئے کہا۔ ''ویسے مجھے کچھ زیادہ بھوک نہیں ہے۔''

''بھوک تو مجھے بھی کوئی خاص نہیں ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ''لیکن کھانا تو بہرحال کھانا ہے نا۔''

''چلو، کوئی لائٹ سی چیز لے لیتے ہیں۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

باہمی اتفاق کے بعد ہم ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں آبیٹھے۔ بینا نے کہا۔ ''اس ریسٹورنٹ میں کوالٹی فوڈ ملتی ہے۔''

''تم آرڈر کرو۔ میں واش روم کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''اپنے پرس میں سے پرفیوم والی بوتل بھی نکال کر مجھے دو۔'' میں نے اس کی الجھن کو رفع کرتے ہوئے کہا۔ ''تاکہ میں اس جرمن شیفرڈ کپل اور اپنے بیچ میں دیوار برلن کھڑی کرسکوں۔''

''دیوار برلن تو کب کی گرائی جاچکی ہے۔'' بینا نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''دیواریں اٹھانے اور گرانے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

بینا کی معنی خیزی میں اضافہ ہوگیا۔ وہ فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔ ''سوائے ایک دیوار کے......!''

''تم کون سی دیوار کی بات کررہی ہو...؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''وہی ایک دیوار جس کے گرجانے سے مستقبل قریب میں اسد علی اور ڈیلفینا بھی کسی گول میز کانفرنس میں ایک دوسرے کے کان سے منہ لگائے سرگوشیاں کرسکتے ہیں۔'' اس نے شرارت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے...... آمین!'' میں نے اس کے ہاتھ سے کولون والی بوتل لیتے ہوئے زندہ دلی سے کہا۔ ''کیونکہ میں نے اب چڑنا چھوڑ دیا ہے...... بینا! تمہارا شکریہ۔''

اس نے مجھے پیار سے گھورنے پر اکتفا کیا۔ جواباً میں بھی مسکراتے ہوئے واش روم کی سمت بڑھ گیا۔

چائنیز ڈنر کے دوران میں ہمارے بیچ ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ اچانک مجھے نادیہ کا خیال آگیا۔ میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''بینا! عظیم کی چشما تو اور میری لاتو رترا کی کوئی خیر خبر ہے؟''

''کیا نادیہ کی یاد آرہی ہے......؟'' وہ میری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''اس کی یاد تو تب آئے گی ناجب وہ گئی ہوگی۔'' میں نے بینا کی مدھوشالا آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''نادیہ اسلام آباد گئی لیکن اس کی یاد......!''

''اس کی یاد کیا؟'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولی۔

میں نے اپنے سینے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''نادیہ کی یاد یہاں کروٹیں بدل رہی ہے......''

''بدتمیز کہیں کے۔'' وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ''سڑیل یہیں کی......''

''ایسا کرو مجھے بھول جاؤ...... اور جو بھی کرنا ہے اسی کے ساتھ کرو۔'' وہ نیم برہمی سے اپنا سیل فون میری جانب کھسکاتے ہوئے بولی۔ ''اس میں نادیہ کا نمبر موجود ہے۔ تم خود اس کا حال چال معلوم کرلو۔''

''اس کا نمبر میرے سیل فون میں بھی فیڈ ہے اور مجھے زبانی بھی یاد ہے۔'' میں نے اسے بتاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں ریفرنس کا پاس کرنا جانتا ہوں۔ نادیہ سے بات ہوگی تو تمہارے ہی توسط سے ہوگی ورنہ نہیں ہوگی۔''

''اگر تمہاری بکواس ختم ہوچکی ہو تو گھر چلیں؟'' وہ میٹھی ناراضی سے مستفسر ہوئی، پھر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

''غصہ مجھ پر آرہا ہے تو معدے کے ساتھ زیادتی نہ کرو۔'' میں نے کہا۔ ''کھانا جاری رکھو۔ میرا کیا ہے، چھیڑ چھاڑ تو میری ہابی ہے۔''

''تمہاری ہابی گئی پانی میں، میں تمہاری باتوں سے اب چڑنے والی نہیں ہوں۔'' وہ بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔''

''ویری گڈ......!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ شرما کر رہ گئی۔

☆☆☆

رات اپنا نصف سفر طے کرچکی تھی۔ میں دن کے ابتدائی حصے میں کم وبیش دس گھنٹے سوچکا تھا لہٰذا نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی لیکن بینا کو دن بھر سونے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ گفتگو میں میرا ساتھ تو دے رہی تھی لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ اضمحلال کا شکار ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

''اگر تمہیں نیند آرہی ہے تو نادیہ والا بیڈروم خالی ہے۔ تم وہاں جاکر آرام سے سوسکتی ہو۔''

''اور تم......؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

’’میں ابھی تھوڑی دیر اور جاگوں گا۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’کیا کرنے کا ارادہ ہے......؟‘‘

’’کچھ نہیں...... جب نیند آئے گی تو سو جاؤں گا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تب تک حالاتِ حاضرہ پر غور و فکر کروں گا۔‘‘

’’یہ تو اچھی بات ہے۔‘‘ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی پھر ایک خمار آلود جماہی کا اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’کیا سونے کے لیے میرا دوسرے بیڈ روم میں جانا ضروری ہے؟‘‘

’’یہ کوئی ایشو نہیں ہے۔ میں تو تمہارے آرام کے لیے کہہ رہا تھا۔‘‘

’’مجھے تمہاری قربت میں آرام ملتا ہے۔‘‘ وہ بوجھل آواز میں بولی۔ ’’میں تمہاری عادی ہوگئی ہوں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں ادھر ہی سو جاتی ہوں۔‘‘

’’میں اعتراض کرنے والا بھلا کون ہوتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ تمہارا اپارٹمنٹ ہے۔ اس کی ہر چیز تمہاری ہے۔ اس کے جس حصے میں تمہارا دل چاہے، تم سو سکتی ہو۔‘‘

وہ میرے نزدیک بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے بولی۔ ’’لائٹ آف کرنے سے تمہاری سوچ بچار میں کوئی خلل تو واقع نہیں ہوگا؟‘‘

’’ہرگز نہیں۔‘‘ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’غور و فکر کرنے کے لیے بصارت کی نہیں، بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔‘‘

اپنی بات ختم کر کے میں اٹھا اور بیڈ روم کی لائٹ آف کردی پھر بینا کے پہلو میں نیم دراز ہوگیا۔

وہ میرے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ ’’مجھے یہاں سونا ہے۔‘‘

’’اوکے......نو ایشو۔‘‘ میں نے کہا۔

’’علی! تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا کہ یہ میرا اپارٹمنٹ ہے۔ اس کی ہر چیز میری ہے؟‘‘

’’ہاں...... اس میں کوئی شک نہیں۔‘‘ میں نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

’’تم بھی تو اس اپارٹمنٹ کے اندر ہی ہو۔‘‘ وہ مخمور لہجے میں بولی۔ ’’کیا تم میرے نہیں ہو......؟‘‘

اس نے ایک نازک موقع پر ذہانت بھرا سوال کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ’’بے شک! اس وقت میں بھی تمہارا ہی ہوں۔‘‘

’’صرف اس وقت نہیں، میں ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنا بنا کر رکھنا چاہتی ہوں۔‘‘ وہ جذبات سے لبریز آواز میں بولی۔ ’’کیا تم میرے بن کر نہیں رہ سکتے؟‘‘

’’میں لمحۂ موجود میں زندہ ہوں بینا۔‘‘ میں نے اس کی رخشندہ پیشانی پر ایک بھرپور بوسہ ثبت کرتے ہوئے کہا۔ ’’اگلے لمحے میں کیا ہونا ہے، مجھے نہیں معلوم۔ یہ صرف میرا مالک جانتا ہے لہٰذا میں تم سے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کرسکتا جو میرے بس میں نہ ہو۔ میں اپنے مالک کے سامنے بے اختیار ہوں۔‘‘

’’قدرت پر کسی کا اختیار نہیں چلتا علی۔‘‘ وہ کسمساتے ہوئے مخمور آواز میں بولی۔ ’’میں تو لمحۂ موجود کی بات کر رہی ہوں۔ ایسے لمحات کا تو وعدہ کر سکتے ہو نا......‘‘

’’وعدہ!‘‘ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ’’جس لمحے میں تمہیں میسر رہوں گا، تمہارے تصرف میں رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔‘‘

سینے پر سر رکھے رکھے اس نے بڑی کاریگری کے ساتھ اپنے ایک بازو کو میری کمر کے نیچے سے گزارا اور بڑے اعتماد سے گویا ہوئی۔ ’’انشاء اللہ! میں اس نوعیت کے لمحۂ موجود نکالتی رہوں گی۔‘‘

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چپ چاپ لیٹا اس کے بدن کی ہیجان خیز تپش کو اپنے وجود میں جذب کرتا چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے اپنی کمر پر سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ بینا میرے نیچے دبے ہوئے، اپنے ہاتھ سے کسی مرمریں کارروائی میں مصروف تھی۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

’’یہ کیا کر رہی ہو......؟‘‘

’’اس ہنٹر والی کمینی کے کرتوت چیک کر رہی ہوں۔‘‘ وہ بکھری ہوئی سانسوں کے ساتھ بولی۔

’’کون ہنٹر والی؟‘‘ اس کے جواب نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

’’وہی نامراد ہسپانوی ستم گر حسینہ جو تمہیں ہنٹر سے پیٹتی رہی ہے۔‘‘ وہ اپنی پراسرار کارروائی کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ’’تمہارے زخموں کی مرہم پٹی بھی ضروری ہے نا......‘‘

وہ میری مذاق میں کہی ہوئی بات کو سچ سمجھ بیٹھی تھی۔ میں نے اسے چڑانے کے لیے ڈیلفینا کے حوالے سے ایک فیک واقعہ سنایا تھا۔ میں نے اپنے تشنہ لبوں کو بینا کے شنگرفی ہونٹوں میں پیوست کر دیا۔ اس نے چشم زدن میں دوسرا بازو میرے اوپر سے گزار کر مجھے اپنی بانہوں کی گرم جوش گرفت میں جکڑ لیا پھر میری پیاس بجھانے کے لیے اس نے باڑ پر آئی ہوئی ندی کا روپ دھار لیا۔ میں اس کے دھارے میں بے سمت بہتا چلا گیا۔

وقت گویا ایک جگہ تھم گیا تھا۔ حالات و واقعات کا پہیا ایک مقام پر پہنچ کر رک گیا تھا۔ صرف ہماری سانسیں چل رہی تھیں، رگوں میں لہو رواں تھا اور سینے میں دل جواں تھا۔

شاید وقت یونہی تھما رہتا اور ہم جاں سے گزر جاتے کہ بینا کے سیل فون کی گھنٹی نے ہمارے کیف و سرور کے کانچ محل کو کرچی کرچی... کرڈالا۔

"اس وقت کس کی کال ہو سکتی ہے؟" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

میں خود بھی متعجب ہوا تھا۔ ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ بیڈ پر دراز ہونے سے پہلے ہم نے اپنے سیل فون کو سائیلنٹ موڈ پر سیٹ نہیں کیا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے، یہ نادیہ کی کال ہو......"

"امپاسیبل!" وہ پوری قطعیت سے بولی۔ "یہ نمبر میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔" اس نے سیل فون کے اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اجنبی نمبر......" وہ بڑبڑائی۔

اچانک میرے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ میں نے کہا۔ "یہ شمائلہ کا فون ہوگا۔"

"کون شمائلہ؟" اس نے پوچھا۔

"ارے یار...... وہ پریشان حال عورت جس کا بچہ غبارا خریدتے ہوئے گم ہو گیا تھا۔" میں نے یاد دلانے والے انداز میں کہا۔ "ممکن ہے، اس کا بچہ مل گیا ہو اور اس نے تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے کال کیا ہو۔ اس نے تمہارے سیل فون سے اپنے شوہر کو فون کیا تھا، اس طرح تمہارا نمبر اس کے شوہر کے پاس چلا گیا تھا۔"

"ہاں، یہ ممکن ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی پھر مجھ سے پوچھا۔ "کیا میں کال اٹینڈ کروں؟"

اس دوران میں وہ کال مسلسل آ رہی تھی۔ لگتا تھا، کالر نے نمبر ڈائل کرنے کے بعد اسے ری ڈائل کے آپشن پر ڈال دیا تھا۔ بینا کے سوال کے جواب میں، میں نے کہا۔

"کال اٹینڈ نہیں کرنا۔ فون مجھے دو۔"

اس نے اپنا سیل فون میری جانب بڑھا دیا۔ اسی وقت وہ کال آنا بند ہو گئی۔ شاید کالر مایوس ہو گیا تھا۔ اگر وہ مایوس نہیں بھی ہوتا تو میں نے اس کی کال کو کاٹ کر پہلے یہ چیک کرنا تھا، آیا یہ اسی مصیبت کی ماری عورت کا فون ہے یا نہیں۔

میں نے جو کرنا تھا، وہ کر ڈالا اور پتا یہ چلا کہ یہ کوئی اور نمبر تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ ممکن ہے، یہ اسی پریشان حال عورت کا فون ہو کیونکہ اس کے فون میں اس وقت بیلنس نہیں تھا جبھی اس نے بینا سے مدد کی درخواست کی تھی۔ اب جو بھی تھا، فون خاموش ہو چکا تھا۔

ادھر میں نے یہ سوچا، ادھر بینا کے نمبر پر دوبارہ کال آنے لگی۔ اب اس کالر سے نمٹنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے کال کاٹ کر اسے ٹیکسٹ میسج کیا۔

"آپ کون؟"

فوراً اس کا ریپلائی موصول ہوا۔ "تمہارا ایک خیر خواہ۔"

"میں تمہیں نہیں جانتا۔" میں نے لکھا۔ "تم نے میرا نمبر کہاں سے حاصل کیا؟"

"تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔" اس کا جواب آیا۔ "میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں...... تمہارا دوست ہوں۔ دوستوں کے نمبر حاصل کرنا کوئی مشکل تو نہیں ہوتا۔"

"تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" ہمارے درمیان باقاعدہ ٹیکسٹ چیٹنگ شروع ہو گئی۔ "جانتے ہو تو بتاؤ، میں کون ہوں؟"

"تمہارا نام اسد علی ہے۔" وہ مجھ پر ایٹم بم گراتے ہوئے بولا۔ "تم امریکا سے یہاں آئے ہو۔ تمہارے پیچھے عیار لوگ اور خطرناک کتے لگے ہوئے ہیں۔ تم اپنی ایک دوست کے ساتھ اس وقت چائنا ٹاؤن کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ میں موجود ہو...... اتنا کافی ہے یا کچھ اور بھی بتاؤں؟"

بینا بھی میرے ساتھ ہی یہ ٹیکسٹ میسج پڑھ رہی تھی۔ اس خدا کے بندے نے ہم دونوں کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کر دیا تھا۔ اس کا کہا ہوا ایک لفظ بھی غلط نہیں تھا لیکن میں جس نوعیت کے حالات سے گزر رہا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ میں اپنے سائے پر بھی اعتبار نہ کروں۔ یہی بات میں نے ٹیکسٹ میسج کی صورت میں اسے بھیج دی۔

"تم جو کوئی بھی ہو، میں آنکھیں بند کر کے تم پر بھروسا نہیں کر سکتا۔"

"آنکھیں کھول کر مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

اس کے ہر ٹیکسٹ سے بلا کا اعتماد جھلکتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے لیکن میرے لیے حیرت اور تشویش کی بات یہ تھی کہ مجھے کراچی میں قدم رکھے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے پھر وہ میرے بارے میں اتنی گہری معلومات کیونکر رکھتا تھا؟ ایک لمحے کے لیے میرا دھیان عظیم کی طرف بھی گیا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ عظیم مجھ سے اس نوعیت کا مذاق نہیں کر سکتا تھا اور وہ بھی رات کے اس پہر اور پھر ہمارے بیچ ٹیکسٹ چیٹنگ بینا والے سیل فون پر ہو رہی تھی۔ اگر وہ

واقعتاً میرا دوست اور سچا خیرخواہ تھا تو اس نے اپنے دعوے کے مطابق میرے بجائے بینا کا نمبر کیوں حاصل کیا تھا؟

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں نے اس نامعلوم مہربان کے ٹیکسٹ کا ریپلائی کچھ ان الفاظ میں کیا۔

''میں سارے کام آنکھیں کھول کر ہی کرتا ہوں۔ تمہارے سوال کا جواب تو اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب تم میری نظر کے سامنے...... میرے روبرو موجود ہو گے۔''

پھر میں نے بینا سے کہا۔ ''بینا! یہ کوئی دوست نہیں ہوسکتا۔ لگتا ہے ہمارے ساتھ کوئی ہاتھ ہوگیا ہے اور اب...... کوئی شدید نوعیت کا ہنگامہ برپا ہونے والا ہے۔''

''تم کس قسم کے ہاتھ کی بات کر رہے ہو؟'' وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''شائلہ نامی وہ عورت ہرگز پریشان نہیں تھی۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس نے اپنے بچے کی گمشدگی کا ڈراما رچا کر تمہاری ہمدردی حاصل کی اور تمہارے سیل فون سے اس نے کسی کو کال کی۔ اس طرح تمہارا نمبر اس بندے کے پاس پہنچ گیا جو مجھ سے خیرخواہی کا دعوے دار ہے۔''

''اگر ایسا ہی ہے تو پھر تمہاری جان کو خطرہ ہے علی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اس قسم کی ڈرامے بازی کوئی دوست نہیں کرسکتا۔'' بات کے اختتام پر اس نے اپنا پرس اٹھالیا اور اس کے اندر کچھ تلاش کرنے لگی۔

اسی وقت سیل فون کے اسکرین پر اس بندے کا ٹیکسٹ ابھرا۔ ''اگر میرے دوست کی یہی خواہش ہے تو میں پانچ منٹ میں تمہارے سامنے ظاہر ہوجاتا ہوں۔''

''یہ تمہارے لیے ممکن نہیں ہوگا۔'' میں نے لکھا۔ ''کیونکہ میرے بارے میں لگائے گئے تمہارے سارے اندازے درست نہیں ہیں۔ تم کسی بھی طرح پانچ منٹ میں میرے پاس نہیں پہنچ سکتے۔''

''میرے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے اسد علی!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''بائی داوے، تمہارے خیال میں، میرا کون سا اندازہ درست نہیں ہے؟''

جس پرس میں سے بینا پرفیومز کی بوتلیں نکال کر میری جانب بڑھایا کرتی تھی، اب کی بار اس نے پرس کے اندر سے ایک خوب صورت سلم ماڈل گن نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اسے تم اپنے پاس رکھ لو۔ یہ پوری طرح لوڈ ہے۔ میں نے بھی حالات کی سنگینی کو محسوس کرلیا ہے۔''

بات کے اختتام پر وہ اٹھ کر گیلری کی سمت بڑھ گئی۔

''تمہارے بیان کے مطابق میں اس وقت کراچی میں ساحلِ سمندر پر واقع ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں، اپنی ایک دوست کے ساتھ قیام پذیر ہوں۔'' میں نے اس نامعلوم شخص کے استفسار کے جواب میں کپوز کیا۔ ''تمہارا یہ اندازہ سراسر غلط ہے کیونکہ میں اس وقت اسلام آباد میں ہوں۔ کراچی کو خیرباد کہے تو کئی گھنٹے گزر گئے۔''

''تم جرمن شیفرڈز کو الو بنا سکتے ہو لیکن مجھے نہیں......'' اس کے ٹیکسٹ سے سنجیدگی جھلکتی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، بینا گھبرائی ہوئی بیڈروم کے اندر داخل ہوئی پھر بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''علی! میں نے گیلری کے ایک کونے سے جھانک کر نیچے دیکھا ہے۔ بلڈنگ کے گیٹ پر ایک پولیس موبائل کھڑی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دو لگژری گاڑیاں بھی موجود ہیں۔''

''لگژری گاڑیوں کی موجودگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔'' میں نے بستر چھوڑتے ہوئے ریڈ الرٹ لہجے میں کہا۔ ''لیکن پولیس موبائل کی آمد تشویش ناک ہے۔ لگتا ہے، ڈی ایس پی سکندر کی مراد بر آئی ہے۔''

پھر میں نے ٹیکسٹ کا ریپلائی کردیا۔ ''اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو تم سپرمین کی منت کر کے اس کی پیٹھ پر سوار ہوجاؤ اور پانچ منٹ میں کراچی سے اسلام آباد آجاؤ۔ پھر ملتے ہیں......''

''اگر ڈی ایس پی سکندر نے دھاوا بولا ہوتا تو جرمن شیفرڈز والی سیاہ ویگو بھی اس کے ساتھ ہوتی۔'' بینا نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ''مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔''

''میرا ذہن تو ہنٹر والی کی طرف جارہا ہے۔'' میں نے بینا کے دیے ہوئے پسٹل کا میگزین چیک کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹیکسٹ میسج کرنے والے کی معلومات صد فیصد درست ہیں۔ ہمارے پاس صرف چار منٹ ہیں۔ ایکشن کے لیے ریڈی ہوجاؤ...... اس نے میرا پاسپورٹ ٹریک کرلیا ہے۔''

''وہ ایسا نہیں کرسکتی۔'' بینا پورے یقین سے بولی۔

بینا کے لہجے میں موجود چٹانی اعتماد نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''ڈیلفینا ایسا کیوں نہیں کرسکتی؟''

''کیونکہ میں نے تمہارا پاسپورٹ فلش کردیا ہے۔''

وہ انکشاف انگیز انداز میں بولی۔
''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں ہکابکا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔
''میں نے ......'' وہ میری جانب انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ ''تمہارے پاسپورٹ کو...... جلا کر...... اس کی راکھ کو...... فلش میں بہا دیا تھا...... نادیدہ مائیکرو چپ سمیت......''
''تت...... تم نے ایسا کیوں کیا؟'' میری حیرت میں غصے کی آمیزش تھی۔
''تاکہ وہ انسانی شکل والی کتیا، منحوس چڑیل ڈیلفینا تم تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ اس کے انداز سے دیوانگی ٹپکتی تھی۔ ''میں تمہارے تحفظ کی خاطر ایک پاسپورٹ تو کیا، پوری دنیا کو بھی آگ لگا سکتی ہوں۔''
اس کے الفاظ کی سنگینی نے میرے اندرون کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان لمحات میں بینا ایک بپھری ہوئی شیرنی دکھائی دیتی تھی جو میری حفاظت کی خاطر موت سے بھی ٹکرانے کا عزم رکھتی تھی۔ وہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اس کی ''کارروائی'' پر کوئی لمبی چوڑی بحث چھیڑ کر بیٹھ جاتا۔ اس نے جو بھی کیا تھا، میری محبت میں کیا تھا اور اس کی جاں نثاری کے بارے میں جی ایم سر نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ میں حیرت اور دلچسپی سے بینا کو دیکھ ہی رہا تھا کہ بینا والے سیل فون پر میسج ٹون بجی۔ میں پچھلے چند منٹ سے اسی فون پر دوستی کے دعوے دار اس پراسرار اجنبی سے ٹیکسٹ چیٹ کر رہا تھا۔
''میں تمہارا دوست ہوں اور دوست ہی رہوں گا۔'' اس کا ٹیکسٹ موصول ہوا۔ ''اگرچہ میں تمہارے دشمنوں کے اندر بیٹھا ہوا ہوں۔ تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ فوراً سے پیشتر اپارٹمنٹ چھوڑ دو......''
''اس اپارٹمنٹ میں کوئی ایمرجنسی ایگزٹ ہے؟'' میں نے بینا سے سوال کیا۔
''نہیں!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اپارٹمنٹ میں انٹری اینڈ ایگزٹ کے لیے بس یہی ایک مین ڈور ہے۔''
''بلڈنگ کا انٹرکام سسٹم کام کر رہا ہے؟'' میں نے تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔
''ابھی چیک کر کے بتاتی ہوں......'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔
''ٹیم ارائیوڈ......'' میرے خیر خواہ نے ٹیکسٹ کے ذریعے مجھے اطلاع دی۔ ''یو ہیو اونلی تھری منٹس......''
اسی لمحے بینا گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی اور سراسیمہ لہجے میں بتایا۔ ''علی! انٹرکام سسٹم ڈیڈ پڑا ہے۔''
''اوہ......'' میں نے تشویش بھرے انداز میں ایک گہری سانس خارج کی۔ ''انٹرکام سسٹم ڈیڈ، نو ایمرجنسی ایگزٹ اینڈ ٹیم ارائیوڈ۔''
''ٹیم ارائیوڈ؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے میری جانب دیکھا۔
دوستی کے دعوے دار اس شخص کا آخری ٹیکسٹ بینا کی نظر سے نہیں گزرا تھا اسی لیے اس کی آنکھوں میں ''ٹیم ارائیوڈ'' کے حوالے سے متعدد سوالات سر اٹھائے کھڑے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پوری بلڈنگ کا انٹرکام سسٹم ڈیڈ نہیں ہوگا۔ یہ امتیازی سلوک صرف بینا والے اپارٹمنٹ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ میں نے بینا کے استفسار کا جواب دینا ضروری نہیں جانا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''ہم اس وقت اپارٹمنٹ بلڈنگ کے آٹھویں فلور پر ہیں۔ اس سے اوپر اور کتنے فلور ہیں؟''
''تین!'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ گیارہ فلورز کی رہائشی عمارت ہے۔''
''اور لفٹس؟''
''دو لفٹس ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک یہی جس سے ہم اوپر نیچے آتے جاتے ہیں اور دوسری بلڈنگ کے دوسرے حصے میں ہے۔''
''تم اپنا سیل فون میرے پاس چھوڑ دو اور میرا فون تم لے جاؤ۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اپنا بچاؤ کرنے کے لیے ہمارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔''
وہ عجیب سی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں کہاں چلی جاؤں؟''
''تم اپنے اپارٹمنٹ سے نکل کر زینوں کے ذریعے ٹاپ فلور پر جاؤ گی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر راہداری سے گزرتے ہوئے تم بلڈنگ کے اس حصے میں پہنچ جاؤ گی جہاں دوسری لفٹ ہے۔ تم ادھر گیلری میں کھڑے ہو کر میری کال کا انتظار کرو گی۔ میں اس مصیبت سے نمٹنے کے بعد تم سے رابطہ کروں گا۔'' پھر میں نے گن اس کی سمت بڑھاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''یہ تم اپنے پاس رکھ لو۔''
''ہرگز نہیں!'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اٹل لہجے میں بولی۔ ''ہمارا دکھ سکھ اور جینا مرنا ایک ساتھ ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ تمہاری طرف آنے والی

گولی میرے سینے سے گزرنے کے بعد تم تک پہنچے گی......''

پینا کا انداز اس قدر حتمی اور فیصلہ کن تھا کہ جی ایم سر کے الفاظ میری سماعت میں تازہ ہو گئے۔ ''آپ کے ساتھ جو میڈم آئی ہیں۔'' انہوں نے پینا کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''انہیں آپ کے ساتھ وہی کچھ ہو گیا ہے جو آپ کو اپنی گمشدہ دوست کے ساتھ ہو چکا ہے۔ محبت کرنے والے لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ یہ کسی کی خاطر جان دینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاتے۔''

جی ایم سر کے الفاظ سونے کے قلم سے لکھے جانے کے قابل تھے۔ ان نازک لحات میں پینا کا عزم اس امر کا بین ثبوت تھا۔ وہ جاں نثاری کی آخری منازل کو چھونے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں نے اس سے کوئی بحث نہیں کی اور آنکھیں بند کر کے جی ایم سر کی اس ہدایت پر عمل کرنے لگا۔

''آپ جب بھی کسی ہنگامی صورتِ حال سے دوچار ہوں تو اپنے ماحول اور سچویشن کو فیل کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کو موقع محل کی مناسبت سے فوراً جواب مل جائے گا۔''

پانچ سیکنڈ کے اندر ایک طاقتور فیل آئی۔ میں نے محسوس کیا، دو مسلح افراد ایک نوعمر بچے کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو کر آٹھویں فلور کی طرف آ رہے ہیں۔ میرے محسوسات نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ تینوں افراد ہمارے دشمن ہیں اور ان کی منزل پینا کا اپارٹمنٹ ہی ہے۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور پینا کو ہاتھ سے پکڑ کر اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ لفٹ اور گراؤنڈ سے آٹھویں فلور تک پہنچنے میں چند سیکنڈ ہی لگتا تھے۔ اسی قلیل مدت میں، میں نے آنے والوں کے استقبال کا بندوبست کر لیا۔ میں نے سلم ماڈل گن پینا کو تھماتے ہوئے اسے ایک ایسی جگہ پر کھڑا کر دیا جہاں سے وہ بہ آسانی آنے والوں سے مکالمہ کر سکتی تھی لیکن وہ چوبی داخلی دروازے کے فریم سے لگ بھگ آٹھ انچ دور دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ یہ دیوار کا وہ حصہ تھا جدھر سے دروازہ کھلتا تھا۔

''ابھی اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجے گی۔'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''تم نے ردِعمل ظاہر کرنے میں اتنا وقت لگانا ہے کہ محسوس ہو، گھنٹی کی آواز پر تم بیڈروم سے نکل کر داخلی دروازے تک پہنچی ہو۔ میری بات سمجھ رہی ہو؟''

''سمجھ گئی۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی پھر سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اور تم......؟''

''میں بھی تمہارے نزدیک ہی موجود رہوں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کسی بھی قیمت پر تم نے دروازہ نہیں کھولنا اور غلطی سے بھی آئی گلاس کے ساتھ آنکھ لگا کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرنا کہ باہر کون کھڑا ہے......او کے؟''

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی پھر بولی۔ ''او کے!''

''گن کو پرس میں رکھنے کا مطلب ہے، تم اسے چلانا بھی جانتی ہو۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''لہٰذا اگر حالات ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں تو تم اپنی حفاظت کی خاطر اس گن کو بے دریغ استعمال کر سکتی ہو۔''

''تم فکر نہ کرو۔ ایسا ہی ہو گا۔'' وہ گن کو ریڈی موڈ پر لاتے ہوئے جذبات سے عاری لہجے میں بولی۔

پینا نے جتنے اعتماد کے ساتھ این پی۔ تھرٹی فور سلم ماڈل نائن ایم ایم پسٹل کو کاک کیا تھا، اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے اگر اپنی حفاظت کے پیشِ نظر اس گن کو اپنے پرس میں رکھا ہوا تھا تو ضرورت پڑنے پر وہ اس کے استعمال میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گی اور نہ ہی کوئی کوتاہی برتے گی۔ پینا کو ہدایات دینے کے دوران میں، میں کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسٹور روم سے ایلومینیم کی فولڈنگ گھوڑی (سیڑھی) بھی اٹھا لایا تھا۔ اس فولڈنگ سیڑھی کی اونچائی آٹھ فٹ تھی۔ گزشتہ روز میں نے مذکورہ سیڑھی اسٹور روم میں پڑی دیکھی تھی۔

میں نے سیڑھی کو کھول کر اردو کے ہندسے آٹھ کی شکل میں بہ آہستگی ایک دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ یہ وہی دیوار تھی جس پر الیکٹرک پینل لگا ہوا تھا۔ اگر دروازہ کھولا جاتا تو وہ آ کر اسی دیوار کے ساتھ لگتا یعنی دروازہ کھلنے کی صورت میں فولڈنگ سیڑھی دروازے کے پیچھے چھپ جاتی۔ میں چونکہ سیڑھی کی ٹاپ پر نشست جما چکا تھا لہٰذا میں دروازے سے اندر داخل ہونے والے کسی شخص کی نگاہ میں فوری طور پر نہیں آ سکتا تھا اور جب تک اس کا دھیان میری طرف آتا، میں اپنا کام کر چکا ہوتا۔

میں ایلومینیم کی فولڈنگ سیڑھی کے بالائی حصے پر ہر نوعیت کے سنگین ایکشن کے لیے ایک دم تیار تھا کہ اپارٹمنٹ کی ڈور بیل بج اٹھی۔

میری فیل کے مطابق دو مسلح افراد ایک نوعمر بچے کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو کر ہمارے اپارٹمنٹ کی طرف آئے تھے۔ میں نے سانس روک لی اور آنکھوں کے اشارے سے پینا کو حرکت میں آنے کا سگنل دے دیا۔ دس سیکنڈ کے بعد دوبارہ گھنٹی بجی۔ پینا نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے بھرائی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"کون ہے......؟"

اس نے ظاہر یہی کیا تھا جیسے وہ نیند سے اٹھ کر داخلی دروازے تک پہنچی ہو تاہم اس نے اپنی آواز کو قدرے بلند رکھا تھا۔ بینا کے سوال کے جواب میں باہر ایک بچے کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

"آنٹی! میں عدنان ہوں......پلیز، دروازہ کھولیں......"

بینا نے ایک لمحے کے لیے نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا پھر باہر موجود بچے سے پوچھا۔ "کون عدنان؟"

"آنٹی...... ہم آپ کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔" عدنان نام بتانے والے اس بچے نے فریادی لہجے میں کہا۔ "ڈیڈی اس وقت گھر میں موجود نہیں ہیں اور ہمارے کچن میں آگ لگ گئی ہے۔ ممی کی جان خطرے میں ہے۔ پلیز......آپ ہماری مدد کریں۔"

بینا نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"بچے! تم انٹرکام پر سیکیورٹی گارڈ کو انفارم کرو۔" بینا نے عدنان نامی اس لڑکے سے کہا۔ "وہی تمہاری مدد کرسکتا ہے۔"

بینا کے چپے جواب کے بعد اس لڑکے نے مزید کچھ نہیں کہا۔ ایک لمحے کے لیے باہر کوریڈور میں خاموشی چھا گئی۔ اگلے ہی لمحے مخصوص "کھٹ" کی آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی دروازے کے وسط میں نصب آئی گلاس کے مقام پر ایک خوف ناک سوراخ ہوگیا۔

دروازے کے باہر سے سائیلنسر لگی گن کی مدد سے آئی گلاس پر فائر کیا گیا تھا۔ فائر کرنے والے کو یقین تھا کہ بینا اپارٹمنٹ کے اندر آئی گلاس سے آنکھ لگائے اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ میری ہدایت کے سبب بینا محفوظ رہی تھی ورنہ اس وقت وہ اپنی ایک آنکھ سے محروم ہوچکی ہوتی اور عین ممکن تھا کہ بے آواز گولی اس کی آنکھ کے راستے سے گزر کر سیدھی اس کے دماغ میں جا گھستی اور اس کی زندگی کا چراغ ہی گل کر دیتی۔

فائر کرنے والے نے محض آئی گلاس کو اڑانے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ اس کا اگلا نشانہ دروازے کا لاک تھا۔ آنے والے ہر قیمت پر اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہونا چاہتے تھے اور ان کا مطلوبہ شخص میں تھا۔ اب اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ بالآخر ڈیلفینا نے مجھے ڈھونڈ نکالا تھا۔ اتنی بڑی کارروائی اسی کے ایما پر کی جارہی تھی۔ اس بات کا مجھے اطمینان تھا کہ وہ لوگ میری جان نہیں لیں گے لیکن بینا کی سلامتی کو شدید ترین خطرات لاحق تھے۔

دروازے کے لاک پر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے گئے اور یہ دونوں گولیاں سائیلنسر لگی گن سے چلائی گئی تھیں۔ نتیجے کے طور پر لاک کا کباڑا ہوگیا۔ اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ سٹنگ روم میں کھلتا تھا۔ میں نے بینا کو اشارہ کیا کہ وہ ایک صوفے کے پیچھے پناہ لے لے۔ اس نے فوراً سے پیشتر میری خاموش ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے دو اسٹیپ نیچے اتر کر الیکٹرک پینل میں موجود مین سوئچ کو آف کر دیا۔

اپارٹمنٹ کے اندر یکا یک تاریکی چھا گئی۔ اسی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دو گن بردار افراد اپارٹمنٹ کے اندر گھس آئے۔ کوریڈور میں لگے بلب کی روشنی اپارٹمنٹ کے اندر بھی پہنچ رہی تھی لہٰذا وہ مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے تاہم روشنی سے اندھیرے میں آنے کے بعد وہ بوکھلا گئے تھے۔ بینا صوفے کے پیچھے پوزیشن لیے بیٹھی تھی اور میں فولڈنگ سیڑھی کے وسط میں، دروازے کے پیچھے موجود تھا۔ اگر سٹنگ روم کی لائٹ آن بھی ہوتی تو تب بھی آنے والے فوری طور پر ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔

وہ دونوں تھوڑا فاصلہ رکھ کر محتاط قدموں سے بیڈروم کی سمت بڑھنے لگے۔ انہیں کسی کارروائی کی مہلت دینا عقل مندی نہیں تھی۔ میں نے لات مار کر دروازہ بند کیا اور ایلومینیم کی فولڈنگ سیڑھی کو اٹھا کر ان پر حملہ آور ہوا۔

میں نے ان کی پوزیشن کو ذہن نشین کرلیا تھا لہٰذا دروازہ بند ہوجانے کے بعد بھی میں اندھیرے میں ان کی لوکیشن سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ میں نے سیڑھی کو فضا میں ہیلی کاپٹر کے پنکھے کے مانند حرکت دے کر ان پر وار کردیا۔

وہ اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد سے نروس ہوگئے اور انہوں نے بے دریغ مجھ پر فائرنگ کردی۔ ان کی گن پر چونکہ سائیلنسر لگے ہوئے تھے لہٰذا سٹنگ روم کی فضا میں محض "ٹھک ٹھک" کی آوازیں ابھریں اور اس ٹھک ٹھک کے اختتام پر فائرنگ کرنے والے دونوں افراد کے حلق سے تکلیف دہ چیخیں برآمد ہوئیں۔ میں ان کی خاموش گولیوں کی زد میں نہیں آیا تھا کیونکہ ان پر سیڑھی کا وار کرنے کے بعد میں نے چشم زدن میں فرش پر لوٹ لگا دی تھی اور رولنگ کرتے ہوئے ان کے بہت قریب پہنچ گیا تھا لیکن وہ میرے وار کی زد میں آگئے تھے اسی لیے اذیت ناک انداز میں چلائے تھے۔

میں نے پھر انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ ایلومینیم کی سیڑھی کے خوف ناک وار نے انہیں گن سے محروم کردیا تھا۔

میں نے ہاتھ پاؤں کا استعمال کر کے ان کی درگت بنانا شروع کردی۔ اس دوران میں بینا نے صوفے کے پیچھے سے نکل کر مین سوئچ کو آن کر دیا تھا۔ اپارٹمنٹ کے سٹنگ روم میں روشنی ہوئی تو وہاں کا ماحول مجھ پر آشکار ہوگیا۔ بینا حملہ آوروں کو اپنی گن کے نشانے پر رکھے ایک جانب کھڑی تھی۔ وہ دونوں بری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ میرے لات گھونسے نے ان کی ناک اور منہ سے خون جاری کر دیا تھا۔ وہ نفرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی گنز میرے قدموں میں پڑی تھیں۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے مذکورہ گنز کو بینا کے نزدیک پہنچا دیا پھر ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے خوں خوار لہجے میں استفسار کیا۔

''کون ہو تم...... تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''

انہوں نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ مشکوک انداز میں اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کسی کی آمد کی توقع کر رہے تھے۔ یقیناً ان کے پیچھے ٹیم کے دوسرے افراد بھی موجود ہوں گے۔ یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں ان دو کے ساتھ ''کبڈی، کبڈی'' کھیل کر ان کے مددگاروں کی آمد کا انتظار کرتا اور انہیں خود پر حاوی ہونے کی سہولت فراہم کرتا۔ میں نے بینا کے قریب پہنچ کر فرش پر سے سائیلنسر لگی ایک گن کو اٹھالیا پھر ''ٹھک ٹھک'' کی یکے بعد دیگرے آوازوں کے ساتھ ان دونوں کے گھٹنوں کا سوا ستیاناس مار دیا۔ وہ چلاتے اور کراہتے ہوئے زمیں بوس ہو گئے۔ میں نے انہیں ایسی حالت میں پہنچا دیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر ہمارا تعاقب نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے گن کو ادھر ہی پھینکا اور بینا سے کہا۔

''ہمارے پاس چند سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں ہے۔ اپارٹمنٹ سے جو بھی اٹھانا ہے، اپنے پرس میں رکھ لو۔ ہم فوراً یہاں سے نکل رہے ہیں۔ اگر ان کے ساتھی یہاں پہنچ گئے تو کوئی ہماری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکے گا۔''

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور میرے ساتھ بیڈروم کی جانب بڑھ گئی لیکن ہمیں بیڈروم کے اندر داخل ہونے کا موقع نہیں ملا۔ ہم بیڈروم کے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ کوریڈور میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھریں۔ یقیناً وہ ان دونوں کے ساتھی تھے۔ اگلے ہی لمحے میرے اس اندازے کی تصدیق بھی ہوگئی۔

''سفیان...... زوبی......'' کسی نے بہ آوازِ بلند پکارا۔

''اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔ اگر میری بات ختم ہونے پر تم دونوں نے جواب نہیں دیا تو ہم دروازہ توڑ کر اندر آ جائیں گے۔''

وہ جس دروازے کو توڑنے کی بات کر رہے تھے، وہ بے چارہ تو پہلے ہی زخم خوردہ اور ستم رسیدہ تھا۔ یقیناً سفیان اور زوبی بھی دونوں افراد تھے جنہیں میں نے زمین پر لٹا دیا تھا...... بلکہ وہ لٹا دینے کے مرحلے سے کئی قدم آگے گزر کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے تھے۔ درد کی شدت نے ان کے ہوش و حواس چھین کر انہیں اتنا غفیل کر دیا تھا۔ وہ باہر موجود اپنے ساتھیوں کی آواز پر لبیک کہنے کی حالت میں نہیں تھے۔ یہ بہت ہی واہیات اور خطرناک صورتِ حال تھی۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ اندر والوں کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر باہر والے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ کسی ہیوی گن نے اپنا دہانہ کھول دیا تھا۔ خوفناک گرج کے ساتھ گولیاں چوبی دروازے کو چھید کر سٹنگ روم میں پہنچنے لگیں۔ ہماری خوش قسمتی کہ ان نازک لمحات میں ہم دروازے کے سامنے یعنی فائرنگ رینج میں نہیں تھے ورنہ دروازے کی تقلید میں ہمارے جسم بھی چھلنی ہو چکے ہوتے۔

اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے میں لاتعداد ہوادان نمودار ہو چکے تھے۔ میں نے تشویش بھری نظر سے بینا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی متوحش انداز میں مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ ہمارے پاس کہنے اور سننے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ بینا نے سراسیمہ نگاہ سے چھلنی دروازے کی طرف دیکھا پھر این پی۔ تھرٹی فور پسٹل میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے سلم ماڈل نائن ایم ایم گن کو دروازے کی سمت سیدھا کرتے ہوئے سانس روک لی۔ یہ ایسے سنگین لمحات تھے کہ اپنی بقا کے لیے دشمن کی جان سے کھیلنا ہم پر لازم ٹھہرا تھا۔ اس سوراخ دار دروازے سے ہماری موت کو نمودار ہونا تھا اور میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ میں موجود گن کا میگزین پوری طرح لوڈ تھا اور میں اسے استعمال کرنے میں کوئی غلطی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اگلے ہی لمحے میری توقع پر پانی پھر گیا۔ میں امید کر رہا تھا کہ چھلنی دروازہ ایک دھکے سے کھلے گا اور مسلح افراد بھرا مار کر اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہو جائیں گے لیکن اس کے برعکس دروازے کے سوراخوں میں سے پے در پے تین شیل فائر کیے گئے جنہوں نے اندر پہنچتے ہی تیز رفتاری سے دھواں خارج کرنا شروع کر دیا تھا۔ یقیناً یہ ٹیئر گیس کے شیل

تھے۔ ان شیل میں سے نکلنے والا سفید دھواں بڑی تیزی سے اپارٹمنٹ کے اندرونی حصے میں بھرنا شروع ہوگیا تھا۔

میرا ایک اور اندازہ بھی غلط ہوگیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ آنسو گیس کے شیل ہیں جن کا دھواں ہماری آنکھوں میں مرچیں بھر دے گا اور ہمارے آنسو اس فراوانی سے جاری ہوں گے کہ ہم ایک انچ دور کی چیز دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہیں لیکن نہ تو مجھے اپنی آنکھوں میں مرچوں کی جلن محسوس ہوئی اور نہ ہی دم گھٹنے کا احساس۔ یہ دھواں کسی اور ہی نوعیت کا تھا۔ اس گیس میں دماغ کو غفلت کی وادیوں میں دھکیلنے والا کوئی کیمیکل شامل تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں کو مٹی ہوتا محسوس کیا۔ یوں لگتا تھا، مجھ پر خوف ناک نیند نے حملہ کر دیا ہے۔ میرے ہاتھ میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ میں گن کا ٹریگر دبا سکتا۔ اس زہریلے دھوئیں نے میرے اعصاب کو جامد اور حواس کو معطل کر کے رکھ دیا تھا۔ بس میری ایک ہی خواہش تھی کہ دھڑام سے فرش پر گروں اور صدیوں کے لیے گہری نیند میں چلا جاؤں۔

بینا کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مدہوشی کے عالم میں کسی کٹے ہوئے درخت کے مانند مجھ پر گری۔ میں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو لپیٹے ہوئے صوفے کے پشتے سے ٹکرائے پھر سٹنگ روم کے فرش پر جا گرے۔ میں نے اپنے دماغ کو غروب ہوتا محسوس کیا۔ یوں لگ رہا تھا، میرا آخری وقت آگیا ہے...... زندگی کے خاتمے کا وقت!

عالم ہوش کی سرحد پر میری سماعت نے جو آخری آواز وصول کی، وہ ایک خوف ناک، دہشت طاری کر دینے والی غراہٹ تھی...... ''غوں...... بھوں، بھوں!''

یہ کھلے تھوبڑوں اور نکیلے دانتوں والے جرمن شیفرڈز کی للکار تھی۔ یہ گلی محلے کے آوارہ کتے نہیں تھے جو میرے ''ہش'' کرنے سے دم دبا کر بھاگ جاتے۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ ان لمحات میں میرے اندر ''ہش'' کرنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ میں نے اس اعلیٰ حسب ونسب جوڑی کو بہت دھوکے دیے تھے۔ وہ میرے ایک ایک عمل کا حساب چکتا کرنے آن پہنچے تھے۔

چشم تصور سے میں نے جرمن شیفرڈز کو خود پر لپکتے اور اپنا تیا پانچا کرتے دیکھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا......!

ڈوبنا اور ابھرنا انسانی زندگی کا حصہ ہے۔ بعض چیزیں تاریکی میں ڈوب جاتی ہیں اور روشنی میں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں جبکہ بعض چیزوں کے ڈوبنے سے ماحول پر تاریکی چھا جاتی ہے اور ان کے ابھرنے سے فضا میں اجالا بھر جاتا ہے۔ انسانی ذہن بھی انہی میں سے ایک قسم کی چیز ہے۔ جب انسانی ذہن عالم بے ہوشی سے ہوش مندی کی طرف آتا ہے تو اس کے حواس خمسہ کام کرنے لگتے ہیں اور عموماً سب سے پہلے بصارت حرکت میں آتی ہے۔ انسان آنکھ کھول کر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پر پایا۔ یہ بینا کا اپارٹمنٹ نہیں تھا۔ میری نگاہ کے سامنے ایک تختوں والی چوبی چھت تھی اور میں کسی بیڈ پر چت لیٹا ہوا تھا۔ میں نے نگاہ گھما کر دائیں بائیں کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ وہ نیچی چھت والا ایک چھوٹا سا کمرا تھا...... یعنی مذکورہ کمرے کی چھت، دیواریں اور سب کچھ لکڑی کے چھوٹے بڑے تختوں کی مدد سے تیار کیے گئے تھے۔ اس نامانوس ماحول نے مجھے الجھا کر رکھ دیا اور یکبارگی میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

اگلے ہی لمحے میری یہ سعی ناکام ہوگئی۔ یہ محسوس کرنے میں مجھے ذرا سی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ میرے جسم کو اس بستر پر باندھ کر رکھا گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں، میں یہ جان چکا تھا کہ میرے بدن پر دو بندشیں تھیں۔ چمڑے کی ایک بیلٹ کی مدد سے میرے سینے کو بیڈ کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ ایسی ہی ایک دوسری بیلٹ کو میری رانوں کے اوپر سے گزار کر بیڈ کے ساتھ فکس کیا گیا تھا۔ دونوں بیلٹ کی گرہیں یا بکل بیڈ کے نیچے کسی مقام پر تھے۔ اگرچہ میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے تاہم ان بیلٹ کو اتنی مضبوطی کے ساتھ کس کر باندھا گیا تھا کہ میں اپنے بدن کو دائیں بائیں حرکت دینے کے قابل بھی نہیں تھا لہٰذا ان بیلٹ کو کھولنا فی الحال میرے بس کی بات نہیں تھی۔

بیڈ کے اوپر اپنی حالت کا اندازہ لگانے کے لیے میں نے جتنی حرکت کی، اس کے نتیجے میں مجھے ایک تکلیف سے گزرنا پڑا اور اس درد کا مرکز میرا پیٹ تھا۔ مجھے اپنے پیٹ کے زیریں حصے میں ٹیسیں سی اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔ بے اختیار میرا ایک ہاتھ اذیت کے مقام تک چلا گیا۔ میں گردن اٹھا کر اس مقام کو دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن میرے ہاتھ نے چشم زدن میں یہ پتا چلا لیا کہ میرے پیٹ کے اس حصے پر ایک دبیز پٹی بندھی ہوئی تھی۔ گویا میرے بدن کا وہ حصہ

زخمی تھا جبھی وہاں بینڈیج کی گئی تھی اور تبھی میری حرکت کے نتیجے میں وہاں ٹیسیں اٹھی تھیں۔ اپنی اس تکلیف کو سردست بھول کر میں حالات کا جائزہ لینے لگا۔ میرے لیے مقامِ شکر تھا کہ میں زندہ تھا اور سوچنے سمجھنے کے قابل بھی۔ میرا دماغ ورکنگ آرڈر میں تھا، صرف میرے پیٹ کے زیریں حصے پر کوئی چوٹ لگی تھی۔

اس چوبی کمرے کا ماحول گرم تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ مصنوعی حرارت سے اس کمرے کو گرم رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بینا والے اپارٹمنٹ میں جو ہنگامی حالات پیش آئے تھے، ان کا ایک ایک سین، ایک ایک شاٹ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ حملہ آوروں نے اس اپارٹمنٹ کے سٹنگ روم میں ایسے شیل فائر کیے تھے جن سے خارج ہونے والے دھوئیں نے ہمیں اور ہمارے حواس کو بے بس کرکے عالم بے ہوشی میں پہنچا دیا تھا۔ میری سماعت نے جو آخری آواز سنی تھی وہ جرمن شیفرڈ کپل کی غراہٹ بھری ''غوں...... بھوں، بھوں'' تھی۔ بلاشبہ پولیس ڈاگ کے۔ نائن (K-9) نے مجھے ڈھونڈ نکالا تھا۔ حملہ آوروں سے نمٹنے کے دوران میں مجھے اچھی خاصی کسرت کرنا پڑی تھی۔ اس دھینگا مشتی میں میرے جسم کے مساموں نے ڈھیروں پسینا اگلا تھا جس کی وجہ سے بدن اور لباس پر اسپرے کی گئی خوشبویات کا اثر زائل ہو گیا تھا۔ تبھی زبردست سنفنگ پاور رکھنے والے جی ایس ڈی (جرمن شیفرڈ ڈاگز) نے میرا سراغ لگالیا تھا۔

جرمن شیفرڈ کی وہ جوڑی اور اسپینش دوشیزہ ڈیلفینا کا آپس میں گہرا ربط ضبط تھا۔ ڈیلفینا کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دھیان آپوں آپ بینا کی طرف چلا گیا۔ اس کمرے میں، میں اکیلا ہی تھا۔ بینا کو اپنے پاس نہ پاکر مجھے گہری تشویش نے آگھیرا۔ میں نے بڑی شدت سے بینا کو مس کیا۔ ان لمحات میں بینا کے لیے میرے جو جذبات تھے وہ میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیے تھے۔ کسی بھی چیز کی عدم موجودگی اور عدم دستیابی اس کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ پہلی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا کہ بینا میری زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔

میں اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ کمرے کے باہر مجھے کسی کی آمد کا احساس ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے میرا یہ احساس حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ ایک مخصوص چرچراہٹ کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے گرم سوٹ کے اوپر ایک گرم جیکٹ بھی پہن رکھی تھی اور ایک ہاتھ میں اس نے ایک اٹیچی کیس اٹھا رکھا تھا۔ مذکورہ شخص نے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولا۔

''ویل کم ٹو دی راس آئی لینڈ......!''

''راس آئی لینڈ......'' میں نے زیرِلب دہرایا پھر الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''یہ نام پہلے کبھی سنا نہیں۔''

''اس وقت دنیا کی آبادی لگ بھگ سات بلین ہے۔'' وہ شخص ایک کرسی کھینچ کر میرے بیڈ کے نزدیک بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ مجھے بتانے لگا۔ ''لیکن ان سات بلین افراد میں سے بہ مشکل سات سو افراد نے اس جزیرے کا نام سنا ہوگا مگر دیکھا شاید سات افراد نے بھی نہ ہو۔ راس آئی لینڈ (Ross island) اس دنیا کے نقشے پر ستتر اعشاریہ تین صفر ڈگری عرض البلد جنوب اور ایک سو اڑسٹھ ڈگری طول البلد مشرق میں واقع ہے۔ ہم تمہیں راس آئی لینڈ کو اچھی طرح دیکھنے اور کچھ عرصہ یہاں گزارنے کا موقع فراہم کررہے ہیں۔''

اس شخص کی عمر ستر سے متجاوز تھی۔ اس کے چہرے کی جھریاں بتاتی تھیں کہ وہ بہتر اور اسی کے بیچ کہیں کھڑا ہے۔ گوری رنگت، نیلی آنکھیں اور شاندار شخصیت کے مالک اس شخص کی آنکھوں اور چہرے پر بڑی پراسرار مسکراہٹ تھی۔ وہ سرد و گرم چشیدہ دکھائی دیتا تھا۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے بیزاری بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''تم کون ہو اور مجھے جزیرہ راس پر کیوں لے کر آئے ہو؟''

''میرا نام نیل کریمر ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اور میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔''

''تو کیا تم میرے دوست ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''فی الحال میں تمہارا دوست بھی نہیں ہوں۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔ ''لیکن اگر تم دانش مندی کا ثبوت دو تو ہمارے بیچ پائیدار دوستی کا رشتہ قائم ہوسکتا ہے۔''

وہ پوری طرح کھل کر بات نہیں کررہا تھا۔ ''تم نے میرے سوال کا ادھورا جواب دیا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''صرف نام بتا دینے سے تعارف مکمل نہیں ہوجاتا اور تم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ تم مجھے راس آئی لینڈ پر کس مقصد سے لے کر آئے ہو؟''

''مقصد تو یہ ہے کہ تمہیں اس پُرسکون جزیرے پر بیٹھ کر غور و خوض کرنے کا موقع دیا جائے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور جہاں تک میرے تعارف کی بات ہے تو اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ میرا تعلق ''اسکل اینڈ

بونز'' سے ہے۔''

''اوہ......'' میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ ساری کہانی میری سمجھ میں ٹھیک ٹھیک بیٹھ گئی تھی۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''تو یہ سب ڈیلفینا کا کیا دھرا ہے؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ ''ڈیلفینا کہاں ہے؟''

''کیا تمہیں ڈیلفینا کی یاد آرہی ہے؟'' میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

میں نے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بھی بھلا کوئی بھولنے کی چیز ہے۔''

''مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تمہاری توانائی بحال ہو رہی ہے۔'' نیل کریمر نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ ''تم ہماری دوستی کا ہاتھ تھام کر ہمارے ہو جاؤ، ڈیلفینا تمہاری ہو جائے گی۔ ایک ڈیلفینا پر ہی کچھ موقوف نہیں۔ ہماری سوسائٹی کو جوائن کرنے کے لیے تم ''برادر ہڈ'' کے سرکل میں شامل ہو جاؤ گے۔ برادر ہڈ (بھارئی چارے) کا حصہ بننے کے بعد تم جس حسینہ پر ہاتھ رکھو گے، سمجھو وہ تمہاری ہو گئی۔''

پریسٹن ہالو (ڈیلس) والے بنگلے پر ربی آترک باروخ لاؤ نے بہتر گھنٹے کے لیے ڈیلفینا کو جس مقصد کے لیے سائے کی طرح میرے ساتھ لگایا تھا، نیل کریمر بھی اسی طرح کی بات کر رہا تھا۔ پریسٹن ہالو میں، میں ڈیلفینا کی پیشکش کو جوتے کی نوک پر مار آیا تھا۔ جبھی سے وہ میرے تعاقب میں تھی اور بالآخر مجھے چھاپنے میں سرخرو بھی ہو گئی تھی لیکن جزیرہ راس پر نیل کریمر میرے ساتھ کیا کرنے والا تھا، اس کے بارے میں قبل از وقت کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ راس آئی لینڈ دنیا کے کس حصے میں واقع تھا۔ نیل کریمر نے لاٹی چیوڈ اینڈ لیٹی چیوڈ کی مدد سے راس آئی لینڈ کی لوکیشن واضح کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سچی بات یہ کہ میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔ یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں نے کہا۔

''ڈیلفینا کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ وہ میرے پیچھے امریکا سے پاکستان آئی تھی اور کراچی پہنچ کر اس نے مجھے کھوجنے کے لیے ایک جرمن شیفرڈ کپل کا سہارا لیا تھا......''

''اور اس کپل کو تم نے خوب دھوکے دیے۔'' وہ معنی خیز نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''تم ایک ذہین اور باتدبیر نوجوان ہو، اسی لیے تو ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔''

میں نے اس کے خیالات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یک ٹک نیل کریمر کو دیکھتے ہوئے میں اپنے پیٹ کے اس حصے پر ہاتھ پھیرنے لگا جہاں بینڈیج بندھی ہوئی تھی۔ اس دوران میں میرا ذہن تیز رفتاری سے ایک خاص زاویے پر سوچ رہا تھا۔

''ہم اتنے ظالم نہیں ہیں کہ تمہارا گردہ نکال لیں......''

نیل کریمر کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی تو میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔ ان لمحات میں واقعتاً میں یہی سوچ رہا تھا کہ کہیں ان کم بختوں نے آپریشن کر کے میرا گردہ تو نہیں نکال لیا۔ میری چوری پکڑی گئی تو میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اضطراری انداز میں دریافت کیا۔

''کیا تم سوچ پڑھنا جانتے ہو؟''

''نہیں......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اپنے گردے کے بارے میں سوچ رہا ہوں؟'' میرے لہجے میں بے پناہ الجھن بھری ہوئی تھی۔

''میں قیافہ شناس ہوں۔ فیس ریڈنگ کرتا ہوں۔'' اس نے متحمل انداز میں جواب دیا۔ ''میں نے تمہارے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ قائم کیا تھا۔''

''زبردست!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی جانب دیکھا۔ ''تمہارا علم لاجواب ہے۔''

اس نے کرسی چھوڑ دی پھر میرے نزدیک آکر بولا۔

''میں تمہاری بندشیں کھول رہا ہوں۔ اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔''

وہ بڑی مہارت کے ساتھ میرے سینے اور رانوں کے اوپر بندھی چرمی بیلٹ کو کھولنے لگا تو میں نے پوچھا۔ ''کیا تم لوگوں کو میرے فرار کا خطرہ تھا جو یوں مجھے بیڈ پر جکڑ کر رکھا گیا ہے؟''

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس نے نفی میں جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ ''یہ سب انتظام تمہاری حفاظت کے پیش نظر کیا گیا تھا۔ تم بے ہوش تھے اور تمہیں بالکل خبر نہیں تھی کہ تمہارے پیٹ پر ایک گہرا گھاؤ ہے۔ تم ہوش میں آنے کے بعد اپنے بدن کی کسی الٹی سیدھی جنبش سے اس گھاؤ کو خراب کر سکتے تھے۔''

''مجھے یہ چوٹ کیسے لگی؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرے ساتھ ایسا کون سا واقعہ پیش آیا تھا جو یہ بینڈیج کرنا پڑی؟ جب میں بے ہوش ہو رہا تھا تو تب تک تو مجھے ایسا کوئی زخم

نہیں آیا تھا۔''

''یہ انہی لمحات کا واقعہ ہے۔'' وہ مجھے دونوں بندشوں سے آزاد کرنے کے بعد دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''چند روز پہلے جب تمہیں ہماری ایک خاص ٹیم نے کراچی کے ایک ساحلی اپارٹمنٹ سے پکڑا تو بے ہوش ہونے سے پہلے تم ایلومینیم کی سیڑھی پر اس بری طرح گرے تھے کہ سیڑھی کا ایک کونا تمہارے پیٹ میں لگا اور وہاں ایک گہرا زخم آ گیا۔ ہم نے تمہیں حاصل کرنے کے بعد تمہارے زخم کو اعلیٰ درجے کا ٹریٹمنٹ دیا ہے۔ چند روز میں تمہارا گھاؤ ٹھیک ہوجائے گا۔''

میری یادداشت میں بے ہوش ہونے کا منظر کچھ اس طرح نقش تھا۔ بینا مدہوشی کے عالم میں کٹے ہوئے درخت کے مانند مجھ پر گری تھی۔ میں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو لیتے ہوئے صوفے کے پشتے سے ٹکرائے تھے پھر سٹنگ روم کے فرش پر جا گرے تھے۔ اس کے بعد میں نے اپنے دماغ کو غروب ہوتا محسوس کیا تھا۔ اس تناظر میں تو نیل کریمر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کیونکہ جس ایلومینیم کی سیڑھی کا اس نے ذکر کیا، وہ سٹنگ روم کے فرش پر ہی پڑی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے اسی سیڑھی کی مدد سے سفیان اور رزوبی نامی دو حملہ آوروں پر ایک خطرناک وار کیا تھا۔ یہ سب اپنی جگہ درست مگر نیل کریمر کی ایک بات نے مجھے گہری تشویش میں ڈال دیا تھا۔ اسی حوالے سے میں نے پوچھا۔

''تم نے ابھی بتایا کہ چند روز پہلے میں تم لوگوں کے ہتھے چڑھا تھا مگر مجھے تو وقت گزرنے کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا۔''

''تم بے ہوش تھے۔ اسی دوران میں ہم نے تمہاری ایک مائنر سرجری کی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ چار پانچ روز پہلے کا واقعہ ہے۔''

''میری ساتھی کہاں ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''کون سی......'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''شارو یا بینا؟''

''شارو تو ہوانا (کیوبا) میں ہے۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''میں نے بینا کے بارے میں پوچھا ہے۔ کراچی کے ساحلی اپارٹمنٹ میں وہ میرے ساتھ تھی۔''

''اب نہ تو بینا کراچی میں ہے اور نہ ہی شارو ہوانا میں ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''اس وقت تمہاری دونوں ساتھی ہماری تحویل میں ہیں۔''

''کیا وہ دونوں بھی راس آئی لینڈ پر ہی ہیں؟'' میرے لہجے سے بے پناہ بے قراری جھلکتی تھی۔

''نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میرا اضطراب سوا ہو گیا۔ ''پھر وہ کہاں ہیں؟''

''وہ جہاں بھی ہیں ان کی جان سلامت اور عزت محفوظ ہے۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''وہ ہماری ذمے داری ہیں اور تمہاری ایک امانت کی حیثیت سے ہمارے پاس ہیں اور اس بات کا یقین رکھو کہ سوسائٹی نہ تو امانت میں خیانت کرتی ہے اور نہ ہی خیانت کرنے والوں کو معاف کرتی ہے۔ ہمارے ہاں بے وفائی اور بدعہدی کا ایک ہی مطلب ہے...... بھیانک موت!'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''بینا اور شارو پر ہم بعد میں بات کریں گے، پہلے میں تمہیں راس آئی لینڈ کے حوالے سے چند اہم باتیں بتا دینا چاہتا ہوں کیونکہ تم نے یہاں پر چالیس دن گزارنا ہیں۔''

اس نے ''چالیس دن'' کا ذکر اس انداز میں کیا تھا جیسے مجھے راس آئی لینڈ پر چالیس دن کا کوئی چلہ کاٹنا ہو یا پھر اسکل اینڈ بونز والوں نے میرے چہلم کے لیے اس جزیرے کا انتخاب کیا ہو۔ بہرحال، جو بھی صورت تھی، میں متذبذب نظر سے نیل کریمر کو دیکھتے ہوئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہ گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔

''راس آئی لینڈ بنیادی طور پر چار آتش فشانی چٹانوں کے اوپر واقع ہے یا یوں سمجھ لو کہ چار آتش فشانوں کے دہانوں سے نکلنے والے لاوے نے اس جزیرے کو تشکیل دیا ہے۔ اس جزیرے کا کل رقبہ دو ہزار چار سو ساٹھ مربع کلومیٹر ہے۔ پورا جزیرہ برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس برفانی پہاڑ کی چوٹی کی اونچائی تین ہزار سات سو چورانوے میٹر ہے۔ ایریبس ایک ایکٹیو وولکانو (متحرک آتش فشاں) ہے۔ راس آئی لینڈ کی آبادی موسم گرما میں لگ بھگ ایک ہزار اور موسم سرما میں کم و بیش ڈیڑھ سو نفوس ہے۔ یہاں کا درجۂ حرارت کم از کم منفی پچاس ڈگری سینٹی گریڈ اور زیادہ سے زیادہ دس ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ اس جزیرے کا ٹائم جی ایم ٹی (GMT) سے بارہ گھنٹے آگے ہے۔ یعنی لندن کے ٹائم میں بارہ گھنٹے جمع کریں تو راس آئی لینڈ کا وقت نکل آتا ہے (پاکستان کا ٹائم جی ایم ٹی سے پانچ گھنٹے آگے ہے۔ اس حساب سے راس آئی لینڈ کا ٹائم پاکستان کے ٹائم

سے سات گھنٹے آگے ہے) اس جزیرے سے... کسی ملک کی سرحد نہیں ملتی۔ یہاں سے نزدیک ترین ملک ارجنٹائن اور چلی ہے۔ دوسرا قریب ترین ملک نیوزی لینڈ ہے۔ نیوزی لینڈ کے شہر کرائسٹ چرچ سے پانچ گھنٹے کی فلائٹ راس آئی لینڈ لے آتی ہے۔ میں تمہیں جو معلومات فراہم کررہا ہوں، اس کا ایک ایک پوائنٹ ذہن نشین کرلو کیونکہ تم آئندہ چالیس دن اسی جزیرے پر گزارنے والے ہو اور قدم قدم پر تمہیں ان معلومات کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس میں سے ایک بھی لفظ بے معنی اور غیر ضروری نہیں ہے۔'' وہ چند لمحات کے لیے تھما، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''راس آئی لینڈ کے ایک کنارے پر امریکا کا سب سے بڑا ریسرچ سینٹر ہے جس کا نام میکرڈو (Mcmurdo) ہے۔ یہ ایک ایکٹیو ریسرچ اسٹیشن ہے جو گرما اور سرما دونوں موسموں میں اپنا کام جاری رکھتا ہے۔ امریکا یہاں پر نیشنل سائنس فاؤنڈیشن (NSF) کے تحت تجرباتی کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ میکرڈو اسٹیشن پر زیادہ تر تابکار عناصر کے تجربات کیے جاتے ہیں یعنی خطرناک ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری اور چیکنگ وغیرہ۔ انہی ایٹمی ایکسرسائز کی وجہ سے قطب جنوبی کی برف پگھلنے کے خطرات پوری دنیا کے ملکوں کے سر پر منڈلا رہے ہیں۔ کیونکہ ان تجربات کے نتیجے میں ایک تو دنیا کے سمندروں کی سطح خوفناک حد تک بلند ہوجائے گی۔ دوسرے اوزون لیئر (Ozone Layer) کے متاثر ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ بہرحال ہونے والی چیز کو کون روک سکتا ہے۔''

اتنا کہہ کر نیل کریمر خاموش ہوا تو میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''راس آئی لینڈ کا تعارف مکمل ہوگیا؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میرے خیال میں اتنا ہی کافی ہے۔ باقی تم خود دریافت کرلو گے۔''

''تو پھر اب بینا اور شارو کی بات کریں؟''

''نہیں...... ابھی نہیں۔''

''پھر کب؟'' میں مچل کر رہ گیا۔

''چند ضروری باتیں کرنا ابھی باقی ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''شارو اور بینا کا تذکرہ آخر میں آئے گا۔''

میں نفسیات کا طالب علم تھا اور نیل کریمر خود کو نفسیات کا استاد ثابت کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ میرے نازک پہلوؤں سے بخوبی آگاہ تھا لہٰذا وہ بڑی آسانی سے میرے جذبات کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کون سی ضروری باتیں؟''

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے اپنا اٹیچی کیس کھول لیا پھر اس میں سے جنیوا میڈ ایک قیمتی رسٹ واچ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بڑی رسان سے بولا۔ ''یہ گھڑی اعلیٰ نسل اور کام کی چیز ہے۔ حالات اور ماحول چاہے کتنا بھی ناسازگار کیوں نہ ہو، اس کی کارکردگی میں سرِمو فرق نہیں آتا۔ یہ بیک وقت دن، تاریخ، مہینا، سال بتاتی ہے اور درست وقت بتانا تو اس کی گھٹی میں شامل ہے۔ اس گھڑی کی مدد سے تم چالیس دنوں کے روز و شب کا حساب رکھ سکو گے کیونکہ موسم اور وقت کے لحاظ سے تو راس آئی لینڈ کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔ میں نے اس بار نیل کریمر کو ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ چند لمحات کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''راس آئی لینڈ پر صرف دو موسم ہوتے ہیں یعنی موسم سرما اور موسم گرما۔ ان دونوں موسموں کی گنگا بھی الٹی ہی بہتی ہے۔ جب دنیا کے بیش تر ممالک میں موسم گرما ہوتا ہے تو یہاں موسم سرما ہوتا ہے جیسا کہ آج کل یہاں ونٹر (موسم سرما) ہے۔ اس جزیرے پر چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہے تاہم نہ تو دن ہی روشن چمک دار ہوتا ہے اور نہ ہی رات گہری تاریک۔ تم دن کو ملگجا اجالا اور رات کو ملگجی تاریکی کہہ سکتے ہو۔ موسم سرما کے وسط میں یعنی جون، جولائی کے مہینوں میں دو ہفتوں کے لیے سورج کا نام ونشان نظر نہیں آتا یعنی یہ مکمل تاریکی کے دو ہفتے ہوتے ہیں۔ اسی طرح موسم گرما کے وسط میں یعنی دسمبر، جنوری کے مہینوں میں سورج مسلسل چوبیس گھنٹے آسمان پر موجود رہتا ہے، یعنی یہ مکمل اجالے کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں۔ اب تم خود اندازہ لگالو کہ میں نے تمہیں جو گھڑی دی ہے وہ ان حالات میں کتنی مفید ثابت ہوگی؟''

''واقعی......'' میں نے تشکرانہ نظر سے نیل کریمر کی طرف دیکھا۔

وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہٹ تین کمروں پر مشتمل ہے۔ ایک بیڈروم جہاں تم اس وقت موجود ہو، اس کے پہلو میں ایک اسٹور روم ہے جہاں پر تمہارے چالیس دن کا راشن موجود ہے۔ اگر تم زیادہ خوش خوراکی کا مظاہرہ نہیں کرو تو یہ راشن بڑے آرام سے چالیس دن چل جائے گا۔ اسٹور کے اندر ہی مختلف قسم کا اسلحہ بھی رکھا

ہوا ہے جو کسی ہنگامی صورتِ حال میں تمہارے کام آئے گا۔ تیسرا کمرا کچن نما ہے جہاں تمہیں اپنے لیے خود کھانا تیار کرنا ہوگا۔ اس کچن کے اندر ہی کیروسین آئل کا بھی اچھا خاصا اسٹاک موجود ہے جو کھانا پکانے اور بیڈروم کو گرم رکھنے کے کام آئے گا۔ اس بیڈروم میں تم بڑے آرام سے لیٹے ہوئے ہو۔ تم تصور بھی نہیں کرسکتے کہ باہر کس بلا کی ٹھنڈ ہے......''

''اور واش روم؟'' میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''راس آئی لینڈ پر واش روم کا کوئی تصور نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''کسی بھی طرف منہ اٹھا کر چل پڑو۔ جہاں من چاہے، تھوڑی سی برف کو کھود کر ننھا سا گڑھا بناؤ اور اپنے پیٹ اور مثانے کے بوجھ کو اتار پھینکو۔ جب تک تم واپس ہٹ میں پہنچو گے، برف زدہ ہوائیں تمہارے بول و براز کو بڑی صفائی سے ڈھک چکی ہوں گی۔''

''رفع حاجت کا یہ خاصا بے ہودہ طریقہ ہے۔'' میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''جیسا دیس، ویسا بھیس۔''

''ایک بات سچ سچ بتاؤ نیل کریمر!'' اس تروتازہ بڈھے کو میں نے اس کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمام تر تفصیلات بتاتے وقت تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ ڈر محسوس نہیں ہوا یا یہ خوف محسوس نہیں ہو رہا کہ میں تمہیں زیر کر کے یہاں سے فرار ہو جاؤں گا؟''

''پہلی بات تو یہ کہ ہمیں تمہاری جانب سے اس قسم کا کوئی خوف یا اندیشہ لاحق نہیں ہے۔'' وہ اطمینان بھرے انداز میں بولا۔ ''ہم نے تم پر اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی ہے۔ علاوہ ازیں میں نے ابھی تمہیں اس جزیرے کی جو تفصیل بتائی ہے، اس کی روشنی میں تم سے ایسی کسی حماقت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ بفرضِ محال، تمہارا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور تم کسی جان لیوا مہم جوئی کا ارادہ باندھ لیتے ہو۔ تم مجھے زیر کر کے یا قتل کر کے اس ہٹ سے فرار ہو جاتے ہو، تب یہ سوال پیدا ہوگا کہ تم جاؤ گے کہاں؟'' اس نے لمحاتی توقف کر کے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''راس آئی لینڈ آئس شیٹس، آئس شیلوز اور آئس برگز کے ایک طویل سلسلے کے ذریعے سفاک براعظم انٹارکٹیکا سے جڑا ہوا ہے جن میں سے بعض آئس شیٹ، آئس شیلف اور آئس برگ سیکڑوں کلومیٹر طویل ہیں اور ان برفانی چٹانوں کی موٹائی دو سے چار کلومیٹر تک ہے۔ یوں سمجھ لو کہ راس آئی لینڈ، انٹارکٹیکا ہی کا ایک حصہ بن چکا تھا اور انٹارکٹیکا......'' اس نے ایک جھرجھری لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انٹارکٹیکا کا رقبہ ایک کروڑ چالیس لاکھ مربع کلومیٹر ہے یعنی چودہ ملین مربع کلومیٹر۔ اس خوفناک براعظم کا قطر پانچ ہزار پانچ سو کلومیٹر ہے۔ اگر تم نے یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا ہی لیا تو تمہیں انٹارکٹیکا کو عبور کرنا پڑے گا۔ اگر تم نے ناک کی سیدھ میں زیادہ سے زیادہ پانچ کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے سفر جاری رکھا تو اس براعظم کے دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لیے تمہیں ایک ہزار ایک سو گھنٹے لگیں گے یعنی چھیالیس دن لیکن تم کسی بھی صورت میں نہ تو مسلسل چھیالیس دن اس برف زار میں سفر جاری رکھ سکتے ہو اور نہ ہی تمہاری رفتار پانچ کلومیٹر فی گھنٹا ہوسکتی ہے۔ اگر تم نے اس مہم جوئی کا ارادہ کر ہی لیا تو میرے محتاط اندازے کے مطابق اس برف زار میں تم اپنی موت کو دعوت دو گے۔ ایک ایسی عبرت ناک موت کہ جس پر نہ تو کسی ذی روح کے ہاتھ کھڑے ہوں گے اور نہ ہی کہیں تمہارا مزار تعمیر ہوگا۔ دنیا کے دیگر ملکوں میں تو خاکی انسان خاک میں مل کر خاک ہو جاتا ہے لیکن انٹارکٹیکا کی نگری میں خاکی انسان کو برف میں مل کر برف ہونا پڑتا ہے۔ ویسے اگر تمہیں یہاں سے فرار ہونے کا شوق چرا رہا ہے تو میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ میرا کام تھا تمہیں سمجھانا اور میں نے اپنا کام مکمل کردیا ہے۔ آخر میں بس میں تمہیں ایک مخلصانہ مشورہ ہی دے سکتا ہوں......'' نیل کریمر نے ایک بار پھر توقف کیا، اس کے بعد بولا۔

''ان چالیس دنوں میں تم نے ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہماری دوستی کو قبول کر کے تم نے قادرانہ زندگی بسر کرنا ہے یا اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے اس آئی لینڈ پر حسرت ناک موت مرنا ہے۔ تمہارے پاس کوئی تیسرا آپشن نہیں ہے۔ میری صلاح یہی ہے کہ ہمارا برادر ہڈ (Brother Hood) جوائن کرلو۔''

اگرچہ نیل کریمر نے اپنے لہجے کو خاصا نرم رکھا تھا تاہم وہ جو کہنا چاہتا تھا، وہ مجھ تک پہنچ گیا تھا۔

''میں تمہاری پیشکش کے بارے میں چالیسویں دن سوچوں گا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''اس سے پہلے کے انتالیس دن میں معصوم پینگوئنز کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلوں گا۔''

''زندہ دلی اچھی چیز ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے سپاٹ آواز میں بولا۔ ''لیکن تمہیں پتا نہیں کہ بعض پینگوئن کتنے وحشی اور خطرناک ہوتے

ہیں۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ اس سرد خانے سے صرف اور صرف ہم ہی تمہیں نکال سکتے ہیں۔ باقی جہاں تک پینگوئنز کے ساتھ کھیلنے کا معاملہ ہے تو اگر تم نے یہ بات مذاق میں کہی ہے تو میں بھی اسے مذاق ہی سمجھوں گا۔‘‘

’’انٹارکٹیکا کے بارے میں مجھے کافی کچھ پہلے سے معلوم ہے لیکن راس آئی لینڈ کے حوالے سے پہلی بار سنا ہے۔‘‘ میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ’’تم نے میری بھیانک اور حسرت ناک موت کی منظرکشی کرکے مجھے ڈرانے کی کوشش کی ہے۔ سمجھ لو کہ میں ڈر گیا۔ اب بتاؤ کہ تم لوگوں نے مجھ پر کس قسم کی ریسرچ کر رکھی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تم نے ایسی کوئی بات کی تھی۔‘‘

’’ہمیں جس نوجوان کی تلاش تھی، اب تک کے زمینی حقائق یہ بتاتے ہیں کہ وہ تم نہیں ہو۔‘‘ وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ’’ہمارے ساتھ تو وہی معاملہ ہوا کہ...... آگ کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے اور پیغمبری مل گئی۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں؟‘‘ میں نے الجھن زدہ انداز میں نیل کریمر کی طرف دیکھا۔

’’مطلب یہ کہ تم ہمارے مطلوبہ نوجوان تو نہیں ہو......‘‘ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ’’لیکن تم مذکورہ نوجوان سے دس ہاتھ آگے کی چیز ہو۔ گویا ہم جس چیز کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے اس سے کئی گنا زیادہ مل گیا۔‘‘

’’یہ تو ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے اس کی بات کی تہ میں پہنچتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن ’اب تک کے زمینی حقائق‘ سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا تم میرے حوالے سے جس نتیجے پر پہنچ چکے ہو، وہ آگے چل کر بدل بھی سکتا ہے؟‘‘

’’ہم ہمیشہ اچھے کی امید رکھتے ہیں اور ہر وقت کسی بھی گڑبڑ کے لیے تیار رہتے ہیں۔‘‘ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ’’فی الحال جو زمینی حقائق ہمارے سامنے ہیں، وہ ہمارے بعض اکابرین کو ہضم نہیں ہو پا رہے۔ ان کا خیال ہے کہ تم ہی وہ نوجوان ہو جس کی ماں غریدہ کا تعلق راولپنڈی کے ایک بیوروکریٹ خاندان سے تھا اور جو پورے تینتیس ماہ تک سان ڈیاگو (کیلی فورنیا) کے ’’سیون الیون‘‘ اسٹور کی فرنچائز منیجر رہی ہے۔ اسی غریدہ نے ایک عیسائی مرد الفریڈ سے شادی کی اور تم ان کی واحد اولاد ہو جس کی ہمیں تلاش تھی۔ جب تم ایک سال کے تھے تو میڈم غریدہ اور الفریڈ تم سمیت اچانک غائب ہوگئے اور......‘‘

’’تمہارے بعض اکابرین اب بھی اس انداز میں کیوں سوچتے ہیں؟‘‘ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

’’جبکہ ڈیلفینا نے راولپنڈی اور اسلام آباد کی خاک چھان کر یہ رپورٹ پیش کردی ہے کہ غریدہ اور الفریڈ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے اور یہ کہ جب وہ پاکستان آئے تھے تو ان کے ساتھ کوئی بچہ نہیں تھا۔ علاوہ ازیں میرے حوالے سے تمام حقائق بھی تم لوگوں کے علم میں آچکے ہیں۔ میں حیدر علی اور سلمٰی حیدر کا اکلوتا بیٹا ہوں اور ظاہر ہے، میں وہ نوجوان نہیں ہوں جس کی تلاش میں تم لوگ برسوں سے دشت وصحرا کے چپے چپے کو سونگھتے پھر رہے ہو؟‘‘

اس نے بڑے تحمل سے میری بات سنی پھر معتدل انداز میں بولا۔ ’’پہلی بات تو یہ کہ ہم اپنے اکابرین کو کسی بھی مخصوص انداز میں سوچنے پر نہ تو مجبور کرسکتے ہیں اور نہ ہی روک سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر وہ ایسا سوچ رہے ہیں تو اس سلسلے میں ان کے پاس ٹھوس دلائل بھی ہیں۔‘‘

’’کیسے دلائل؟‘‘ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

’’وہ کہتے ہیں، ممکن ہے تمہارے حوالے سے کوئی ڈیل ہوگئی ہو......‘‘

’’ڈیل...... کیسی ڈیل؟‘‘ میں نے الجھن زدہ نظر سے نیل کریمر کو دیکھا۔ ’’میں کچھ سمجھا نہیں۔‘‘

’’ان کا خیال ہے کہ یہ ناممکن نہیں کہ میڈم غریدہ اور الفریڈ نے امریکا چھوڑنے سے پہلے جاوید واسطی یا مرزا عامر بیگ یا پھر علی سلطان کو بھاری رقم دے کر کوئی ڈیل کرلی ہو۔‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ’’یعنی میڈم سلمٰی حیدر اور حیدر علی کے امریکا پہنچائے جانے والے ایک سالہ بچے کو میڈم غریدہ اور الفریڈ کے ایک سالہ بچے سے تبدیل کردیا گیا ہو یعنی علی سلطان نے انیس سال تک جس بچے کی پرورش اور نگہداشت کی، وہ ہمارا مطلوبہ بچہ ہی ہو اور...... پاکستان سے امریکا پہنچائے جانے والے بچے کو خاموشی سے ٹھکانے لگا دیا گیا ہو۔‘‘

’’اگر تمہارے بعض اکابرین ایسا سوچتے ہیں تو میں ان کی ایسی سوچ پر اظہارِ افسوس ہی کرسکتا ہوں۔‘‘ میں نے بیزارکن انداز میں کہا۔ ’’جبکہ حقیقت یہی ہے کہ میں سلمٰی حیدر اور حیدر علی کا بیٹا ہوں۔‘‘

اس نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اپنے اٹیچی کیس کو کھول کر اس کے اندر سے ایک لیپ ٹاپ برآمد کرتے ہوئے بڑی رسان سے بولا۔ ’’بیٹا اس وقت آسٹریلیا کے شہر میلبورن میں ہے اور شارو بویریا (Bavaria) کے شہر میونخ (Munich) میں۔ تمہاری یہ دونوں دوست ہماری کسٹڈی میں انتہائی خوش اور محفوظ ہیں۔ میں نے تمہاری تسلی

اور اطمینان کے لیے ان دونوں کے ویڈیو کلپ ریکارڈ کیے ہیں۔ لو، تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔“

اپنی بات کے اختتام پر اس نے اٹھ کر مذکورہ لیپ ٹاپ میری نگاہ کے سامنے کر دیا۔ میں نے دیکھا، پہلے ویڈیو کلپ میں بیتا میلبورن کے ایک ”سیون الیون“ اسٹور میں کھڑی تھی۔ اس ویڈیو میں بیتا نے ہاتھ ہلا کر مجھے یہ پیغام دیا تھا۔ ”علی! میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں لیکن تمہارے بغیر زندگی پھیکی ہے۔ جلد از جلد مجھ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نکالو......“

دوسرے ویڈیو کلپ میں شارو مجھے بویریا کے صدر مقام میونخ میں دکھائی دی۔ آسٹریلیا اور میلبورن کا نام ہر خاص و عام کے لیے شناسا ہے لیکن بویریا کے بارے میں شاید بہت کم لوگ معلومات رکھتے ہوں گے۔ بویریا دراصل جرمنی کی سب سے بڑی اسٹیٹ ہے اور جرمنی کے اندر اس کی حیثیت ایک آزاد ریاست کی ہے۔ سیکرٹ سوسائٹیز نے اول اول اسی آزاد جرمن ریاست کے بطن سے جنم لیا تھا۔ آپ اسے ”اسکل اینڈ بونز“ کا شکم سمجھ لیں۔ میونخ، کنگڈم آف بویریا کا کیپٹل ہے۔ شارو، میونخ کی ایک تاریخی عمارت کے صدر دروازے پر کھڑی اسپینش میں مجھے یہ پیغام دے رہی تھی۔

”ہیلو! ڈارلنگ...... میرے دوست، آئی لو یو، آئی وانٹ یو۔ ہم بہت جلد ملیں گے۔“

شارو کے چہرے پر نظر آنے والے اطمینان بھرے تاثرات اور اس کی آواز میں موجود اعتماد نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ لیونارڈو کے قبضے سے نکل آئی ہے اور اس وقت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ میں شارو کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ نیل کریمر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بے حد مستحکم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”چالیس دن کی سوچ بچار کے بعد اگر تم ہم سے دوستی کا فیصلہ کر لیتے ہو یعنی ہمارے برادرہڈ کا حصہ بن جاتے ہو تو بیتا اور شارو کو تمہارے سپرد کر دیا جائے گا لیکن اس سے پہلے ہم تمہیں ایک ایسا تحفہ دینے والے ہیں جسے پا کر تمہارا دل باغ باغ ہو جائے گا۔“

”کیسا تحفہ؟“ میں نے استفساریہ نظر سے نیل کریمر کی طرف دیکھا۔

”تحفے کی بات بعد میں......“ وہ سسپنس پھیلانے والے انداز میں بولا۔ ”پہلے یہ دیکھو۔“

اس کے بعد نیل کریمر نے لیپ ٹاپ کے ڈسپلے پر مجھے ایک فوٹیج دکھائی اور پوچھا۔ ”اسے جانتے ہو؟“

پیر صاحب کا جواب

مشہور مصنف محترم، احمد ندیم قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں ایک پیر صاحب کے پاس بیٹھا تھا جو کہ ایک کسان کو اولاد نرینہ کے لیے تعویذ لکھ کر دے رہے تھے۔ کسان کے جانے کے بعد میں نے پیر صاحب سے پوچھا کہ اگر اس کسان کے ہاں بیٹا پیدا نہ ہوا تو یہ کہیں آپ کے خلاف انتقامی کارروائی نہ کر بیٹھے۔ پیر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس ہر قسم کی صورت حال کا حل موجود ہے۔ اگر بیٹا پیدا ہو گیا تو ہمارے وارے نیارے اور اگر نہیں ہوتا تو صاف ظاہر ہے کہ اس نے تعویذ باوضو ہو کر نہیں باندھا ہوگا اور تعویذ بندھے ہوئے ہونے کی صورت میں بری باتوں سے اجتناب نہیں کیا ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہمارا کاروبار ہمارے آباؤ اجداد کے دور سے ایسے ہی چل رہا ہے اور آئندہ صدیوں تک ایسے ہی چلتا رہے گا۔“

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاکپتن شریف

نفرت کا نشانہ

شہر میں ہندوؤں اور سکھوں میں فساد برپا تھا۔ ہندوؤں کو ایک علاقے میں ایک سکھ مل گیا۔ اس پر انہوں نے خوب تشدد کیا۔ سر، ڈاڑھی کے بال اور مونچھیں کاٹ دیں۔ اسے بے عزت کر کے چھوڑ دیا۔

اسی شام ایک ہندو سکھوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ اسے بھی سکھوں نے کھمبے سے باندھ کر خوب مارا۔ وہ چیخ چیخ کر کہتا رہا کہ میں ہندو نہیں سکھ ہوں مگر اس کی کسی نے نہ سنی۔

اگلے روز دونوں علاقوں کے اخبار میں ایک ہی تصویر لگی تھی اور دونوں تصویریں ایک ہی آدمی کی تھیں۔

مرسلہ۔ محمد افضل شاہین، ہارون آباد

''ہاں، جانتا ہوں۔'' میں نے فیمیل کی تصویر پر نگاہ پڑتے ہی اضطراری لہجے میں کہا۔ ''اس خوب صورت عورت کا نام شائلہ ہے۔ جس رات مجھے چھاپا گیا، اس شام ساحلِ سمندر پر شائلہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بے حد پریشان تھی۔ اس کا پانچ سالہ بیٹا گم ہو گیا تھا۔ اس نے بیٹا کے سیل فون سے اپنے شوہر سے بات بھی کی تھی۔''

''نہ تو اس کا نام شائلہ ہے اور نہ ہی اس کی کوئی اولاد ہے کیونکہ یہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔'' نیل کریمر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہمارے سسٹم کا ایک معمولی سا پرزہ ہے جسے ہم نے ایک غیر معمولی انسان یعنی تمہیں ٹریپ کرنے کے لیے استعمال کیا تھا اور اس نے کامیابی سے اپنا کام کر دکھایا۔''

''اور وہ بندہ کون تھا جو خود کو میرا خیر خواہ ظاہر کر رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ ٹیکسٹ چیٹنگ کی مدد سے مجھے خطرات سے آگاہ کر رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ میں فی الفور وہ اپارٹمنٹ چھوڑ دوں؟''

''وہ بھی ہمارے سیٹ اپ کا آدمی ہے اور تمہیں اپارٹمنٹ سے باہر نکالنا ہمارا ''پلان A'' تھا۔'' نیل کریمر نے کہا۔ ''ہم اپارٹمنٹ کے اندر ہنگامہ آرائی کے حق میں نہیں تھے۔ تم اگر اس شخص کی بات پر بھروسا کر کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آتے تو فوراً دھر لیے جاتے۔ تم نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا لہٰذا ہمیں ''پلان B'' کو بروئے کار لانا پڑا اور مجبوراً زبردست مارا ماری کے بعد تم ہمارے ہاتھ لگ گئے۔''

یہ کم بخت میری سوچ سے زیادہ میرے معاملات کے بارے میں جانتا تھا۔ میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی لیکن کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ لیپ ٹاپ کو ڈاؤن اسکرول کرتے ہوئے اس نے مجھے ایک اور فوٹیج دکھائی اور پھر وہی سوال دہرایا۔ ''اس بندے کو پہچانتے ہو؟''

''یہ خبیث الاخبث، نطفۂ ناتصدیق نادر شاہ ہے۔'' میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں اس حرام الدہر کو کیسے نہیں پہچانوں گا۔ اس کے اشارے پر میری ماں کی ٹارگٹ کلنگ کی گئی......''

''تم نے بھی اس کے ساتھ بڑا یادگار سلوک کیا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس کی دائمی اپاہجی اور ابدی محتاجی دیکھنے والوں کو درسِ عبرت دیتی رہے گی۔ خیر......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لیپ ٹاپ کے ڈھکنے کو ڈاؤن اسکرول کرنے لگا۔

اگلے ہی لمحے خرانٹ چہرے والے ایک ادھیڑ عمر شخص کی فوٹیج میری نگاہ کے فریم میں آگئی۔ میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''یہ کون ہے؟''

''کیا تم اسے نہیں جانتے؟'' نیل کریمر نے پوچھا۔

''نہیں...... بالکل نہیں۔'' میں نے نفی میں جواب دیا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں اس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے تھوڑی دیر پہلے تمہیں ایک تحفہ دینے کا ذکر کیا تھا......''

''ہاں، ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''یہ شخص ہی وہ تحفہ ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''مگر یہ ہے کون......؟'' میری الجھن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

جواب دینے سے پہلے نیل کریمر نے لیپ ٹاپ کا ڈھکنا (ڈھپلے) بند کیا اور دوبارہ اسی کرسی پر جا بیٹھا جہاں تھوڑی دیر پہلے بیٹھا وہ مجھ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان اور سلیقے سے لیپ ٹاپ کو واپس اٹیچی کیس میں رکھا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے ڈرامائی انداز میں بولا۔

''یہ تمہاری ماں کی بربادی کا ذمے دار اور تمہارے باپ کا قاتل...... چنگیز خان ہے۔''

''کیا......؟'' میں یکبارگی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس میکانکی جنبش کے نتیجے میں میرے پیٹ کے زیریں حصے میں ایک ٹیس اٹھی اور درد کی شدت تاثرات کی صورت میرے چہرے سے جھلکنے لگی۔ نیل کریمر نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''ری لیکس...... تمہارا زخم ابھی کچا ہے۔ غصے کو قابو میں رکھو۔ تمہیں اپنے اعصاب اور جذبات پر جس قدر کنٹرول رہے گا، تم اتنی ہی جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

نیل کریمر کے انکشاف نے میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ مجھے اپنے پورے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ چنگیز خان کی فوٹیج کو دیکھ کر میرے دل و جگر کے داغ جل اٹھے تھے، انیس سال پرانے تمام زخم ہرے ہو گئے تھے اور ان دائمی زخموں کے سامنے میرے پیٹ کی موجودہ تکلیف کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ میں دوبارہ بستر پر چت لیٹ گیا اور نیل کریمر سے سوال کیا۔

''میری معلومات کے مطابق تو چنگیز خان ترکی کی

جیل میں تھا......؟''

''کسی بھی شخص کو جیل میں ڈلوانا اور نکلوانا ہمارے لیے بچوں کا کھیل ہے۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''چنگیز خان تمہارا دشمن نمبر ون ہے۔تم اسے اپنی مرضی اور اپنی پسند کی موت مارنے کے لیے آزاد ہو۔''

''مگر چنگیز خان اس وقت ہے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے ترکی کی جیل سے نکال کر بیونس آئرس (ارجنٹائن) پہنچا دیا گیا ہے۔'' نیل کریمر نے بڑی رعونت سے کہا۔'' آئندہ دو روز کے اندر کسی بھی وقت اس بندے کو راس آئی لینڈ پر لا کر چھوڑ دیا جائے گا، تمہارے ہٹ کے نزدیک کسی بھی مقام پر......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر معتدل انداز میں بولا۔

''تحفے تحائف کا تبادلہ دوستی کے رشتے کے لیے آکسیجن ایسی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ چنگیز خان کا تحفہ تمہیں پسند آئے گا۔''

ادھر اس کی بات ختم ہوئی، ادھر ہٹ کے باہر ہیلی کاپٹر کی مخصوص آواز سنائی دی۔ نیل کریمر اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اٹیچی کیس کے اندر سے ایک لفافہ نکال کر کرسی پر رکھتے ہوئے بولا۔''اب مجھے جانا ہوگا۔ میری سواری آگئی ہے۔ اس لفافے کے اندر تمہارے لیے کچھ اہم معلومات ہیں۔ تمہیں جب بھی فرصت ملے، اس لفافے کو کھول کر پڑھ لینا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔ وہ اٹیچی کیس اٹھا کر دوستانہ انداز میں بولا۔

''اگر میری رخصت کا نظارہ کرنا چاہتے ہو تو تھوڑی ہمت کر کے اس کھڑکی تک پہنچو۔'' اس نے دو ضرب دو فٹ کی ایک دیوار گیر کھڑکی کی سمت اشارہ کیا۔ ''مجھے یقین ہے، یہ منظر تمہیں بہت پسند آئے گا۔''

ہیلی کاپٹر کی آواز لحہ بہ لحہ قریب آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی برفیلی ٹھنڈی ٹھار فضا میں اس کے انجن کا شور بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پھر مجھے ہٹ کے باہر ہیلی کاپٹر کے رکنے کا احساس ہوا۔ نیل کریمر نے مجھ پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی پھر اپنے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

''آل دی بیسٹ مسٹر علی......!''

اپنی بات کے اختتام پر وہ ہٹ سے نکل گیا۔

اس طویل سٹنگ کے دوران میں نیل کریمر نے مجھ سے جتنی بھی گفتگو کی تھی، اس میں ایک لفظ بھی فضول یا فالتو نہیں تھا۔ میں نے اس کے کہے ہوئے ایک ایک جملے کو توجہ سے سنا تھا کیونکہ یہ میری زندگی کے گزرے ہوئے اور آنے والے حقائق تھے۔''اسکل اینڈ بونز'' اب کھل کر سامنے آگئے تھے۔ اس لق و دق برف زار یعنی جزیرہ راس پر میری موجودگی انہی کا ایک اسائنمنٹ تھا۔ گویا میں اب ان کے ''چینل'' پر تھا۔ یہ بڑی سنسنی خیز اور تحیر آمیز صورت حال تھی۔ نیل کریمر کی آخری پیشکش میرے حافظے سے چپک کر رہ گئی تھی۔ اس نے مجھے دعوت دی تھی کہ میں اٹھ کر کھڑکی کے راستے اس کی رخصتی کا منظر دیکھوں۔ یقیناً وہ مجھے اس بہانے کوئی خاص الخاص چیز دکھانا چاہتا تھا ورنہ جب وہ اس کمرے سے نکلا تھا تو میرے لیے یہ اس کی رخصتی کا منظر ہی تھا۔

میں نے احتیاط کے دامن کو مضبوطی سے تھاما اور تھوڑی سی کوشش کر کے بہ آہستگی بیڈ سے نیچے اتر آیا۔ اس عمل میں مجھے کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ اس کا مطلب تھا، میرے زخم کی حالت تسلی بخش تھی۔ اگر میں کوئی الٹی سیدھی یا اونگی بونگی حرکت نہیں کرتا تو زخم کے معاملات کو نارمل ہی رہنا تھا۔ اگر نیل کریمر نے مجھے دعوتِ نظارہ دی تھی تو پھر یہ بات بھی یقینی تھی کہ جب تک میں کھڑکی کھول کر اسے دیکھ نہیں لیتا، اسے وہاں سے رخصت نہیں ہونا تھا۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے مذکورہ کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ کھڑکی پر اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ ہٹ کے باہر ہیلی کاپٹر کی مخصوص آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بہ سہولت کھڑکی کی کنڈی ہٹائی اور اس کے دونوں پٹ وا کر دیے۔

اگلے ہی لمحے یخ بستہ برفیلی ہوا کا ایک تھپیڑا میرے منہ پر لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے وزنی ہتھوڑے کی مدد سے میرے چہرے پر ایک طوفانی ضرب لگائی ہو۔ میرے چہرے کے عضلات سن ہو کر رہ گئے۔ منفی پینتالیس ڈگری سینٹی گریڈ درجۂ حرارت بڑا قیامت خیز ہوتا ہے۔ پانی کا نقطۂ انجماد صفر درجہ سینٹی گریڈ ہے یعنی اس درجہ پر پانی جم کر برف میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور منفی پینتالیس درجے کا مطلب ہے نقطۂ انجماد سے بھی پینتالیس درجے آگے۔ پھر میں بیڈ روم کے گرم ماحول سے اٹھ کر اچانک باہر کے رگوں میں خون منجمد کر دینے والے ٹھنڈے ٹھار ماحول سے آشنا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا، اگر میں مزید چند سیکنڈ کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا تو راس آئی لینڈ کی طلسماتی ہوا کے اثر سے برف کا ہو جاؤں گا۔

میں جس مقصد سے وہاں آکر کھڑا ہوا تھا، اسے حاصل کیے بغیر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ میں

نے اپنی سن ہوتی ہوئی آنکھوں کو بہ جبر میچ کر اس طرف دیکھا جدھر سے ہیلی کاپٹر کی آواز آرہی تھی۔ برف برف یخ بستہ فضا میں مجھے وہ ہیلی کاپٹر نظر آگیا۔ جب میری نگاہ ہیلی کاپٹر پر پڑی تو وہ دھیرے دھیرے اوپر اٹھ رہا تھا۔ میں نے دفعتاً ہیلی کاپٹر کے اندر نظر دوڑائی اور نیل کریمر کی دعوت کا راز مجھ پر آشکار ہوگیا۔

نیل کریمر تو ہیلی کاپٹر کے اندر موجود تھا ہی، میرے لیے حیرت اور تعجب کا باعث ہیلی کاپٹر کو اڑانے والا انسان تھا۔ پائلٹ کی مخصوص سیٹ پر ایک شناسا چہرے کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ اس کے کانوں پر مخصوص ہیڈفون اور آنکھوں پر سیاہ گاگلز تھے۔ وہ کوئی اور نہیں...... فتنہ پرداز، ہنگامہ پرور اور حشر برپا کردینے والی اسپینش دوشیزہ ڈیلفینا عرف ڈیلفی تھی۔

ڈیلفینا نے گردن گھما کر فاتحانہ انداز میں میری جانب دیکھا اور ہیلی کاپٹر کو دھند بھری فضا میں بلند کردیا۔ ڈیلفینا کے ہونٹوں پر سجی دلفریب مسکراہٹ نے مجھے اندر باہر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس مسکراہٹ میں جیت کا نشہ تھا اور اکسانے والا چیلنج جیسے وہ بہ زبانِ مسکان مجھ سے کہہ رہی ہو۔ ''کیچ می اف یو کین؟''

میں چونکہ ایسا نہیں کرسکتا تھا اس لیے میں نے زور سے کھڑکی کو بند کیا اور بیڈ پر چت لیٹ کر ہانپنے لگا۔ ڈیلفینا نے مجھے اس سرد خانے راس آئی لینڈ میں پہنچا کر اپنی پریسٹن ہالو والی انسلٹ کا بدلہ لے لیا تھا۔ بہ زبانِ خاموشی وہ مجھے یہ کہہ گئی تھی...... کیوں حیران ہوتے ہو انٹارکٹیکا کے زندانوں میں۔ اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں۔

میں نے ابھی جو تھوڑی بہت کسرت کی تھی، اس نے مجھے نڈھال کردیا تھا۔ میں بستر پر لیٹا ہوا کافی کمزوری محسوس کررہا تھا۔ پچھلے پانچ چھ روز میں میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے تھے، میں ان سے آگاہ نہیں تھا۔ نیل کریمر کے مطابق میں نے یہ عرصہ گہری بے ہوشی میں گزارا تھا۔ نیل کریمر کی بات پر اعتبار کرنے کے سوا میرے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کیونکہ میری یادداشت کے مطابق میں بینا والے اپارٹمنٹ واقع کراچی، پاکستان میں انٹاغفیل ہوا تھا اور آج جب میری آنکھ کھلی تو میں نیل کریمر کے بقول راس آئی لینڈ نامی اس فریزر مثال جزیرے کے ایک ہٹ میں تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

اچانک مجھے نیل کریمر کی دی ہوئی رسٹ واچ کا خیال آگیا۔ میں نے مذکورہ گھڑی اٹھالی اور بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک بیش قیمت سوئس گھڑی تھی۔ اس وقت گھڑی کا ڈائل نصف شب یعنی رات کے بارہ بج کر تینتیس منٹ کا وقت بتارہا تھا اور تاریخ تھی تیئس جولائی۔ یہ تاریخ تینتیس منٹ پہلے شروع ہوئی تھی اور کم وبیش اتنا ہی وقت میں نے نیل کریمر کے ساتھ گفتگو کی تھی۔ گویا وہ تیئس جولائی کے آغاز پر اس کمرے میں داخل ہوا تھا اور چالیس دن کے لیے مجھے اس جزیرے پر چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ نادیہ تیرہ جولائی بروز اتوار کراچی سے اسلام آباد روانہ ہوئی تھی اور اس سے اگلے دن یعنی چودہ جولائی بروز پیر کی رات بینا کے اپارٹمنٹ پر نصف شب کے بعد میں ہنگامی حالات سے گزر کر دنیا ومافیہا سے بےخبر ہوگیا تھا۔ اگر واقعتاً اس گھڑی کا وقت، دن، مہینا سب کچھ درست تھا تو پھر اس حساب سے میں۔ لگ بھگ نو دن اپنے ماحول اور حالات سے بےخبر رہا تھا۔ زندگی میں اس سے پہلے میں نے کبھی اتنے دن خودفراموشی میں نہیں گزارے تھے۔

یہ سب سوچتے ہوئے میرا دماغ دکھنے لگا۔ اس وقت گھڑی آدھی رات کے بعد کا وقت بتارہی تھی اور یقیناً یہ راس آئی لینڈ کا مقامی وقت تھا۔ میں اتنی دیر تک سوچ چکا تھا کہ اس وقت نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں ایک برف زاد اور برف زار جزیرے پر تن تنہا پڑا تھا۔ اکیلے پن کے احساس نے مجھے قدرے اداس کردیا لیکن میں نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا کیونکہ اگر کچھ دیر تک یہ کیفیت مجھ پر طاری رہتی تو یہی اداسی، مایوسی میں بدل جاتی اور مایوسی میرے نزدیک ایک سنگین گناہ ہے جو انسان کو یا تو بےراہ روی کی طرف لے جاتا ہے اور یا پھر خودکشی پر مائل کردیتا ہے۔

میں نے اپنے ذہن کو بٹانے اور اس کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لیے بستر کو چھوڑ دیا اور سبک قدموں سے چلتے ہوئے اس ہٹ کا جائزہ لینے لگا۔ جس کمرے میں میری آنکھ کھلی تھی، وہ ایک طرح کا بیڈروم تھا۔ میں بیڈروم سے نکل کر کچن کی جانب بڑھ گیا۔ کچن کے اندر دو اسٹوو اور ضرورت کے تمام برتن موجود تھے۔ مسالا جات کے مختلف ڈبے اور امورِ خانہ داری میں استعمال ہونے والا سامان بھی ادھر ہی رکھا تھا۔ وہیں پر دو ڈرمز کے اندر کیروسین آئل کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا جو اسٹوو جلانے اور لالٹین وغیرہ کو روشن کرنے کے کام آسکتا تھا۔ کچن کے

ایک شیلف پر مجھے دو درجن سے زیادہ ماچس بھی رکھی نظر آئیں۔ کچن کے ایک کونے میں مجھے کنگ سائز ڈیپ فریزر بھی پڑا ہوا دکھائی دیا۔ ڈیپ فریزر کو اس ہٹ میں پا کر مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔ جس مقام پر درجۂ حرارت اتنا زیادہ گرا ہوا ہو کہ وہاں کی فضا اور ماحول بھی برف مکانی ہو چکے ہوں تو ایسی جگہ پر ڈیپ فریزر کا کیا کام اور وہ بھی بجلی کی عدم موجودگی میں......

میں نے اندرونی تجسس سے مجبور ہو کر اس ڈیپ فریزر کا ڈھکنا اٹھا کر اندر جھانکا۔ امید تو یہی تھی کہ ڈیپ فریزر کے اندر برف سے سامنا ہوگا لیکن اس وقت میری امید پر پانی پھر گیا جب میں نے ڈیپ فریزر کے اندر نصف درجن کے قریب پانی سے بھرے ہوئے کین رکھے دیکھے۔ اس ڈیپ فریزر کے ڈھکنے کے اندرونی طرف نوٹ نما ایک چھوٹی سی عبارت بھی لکھی نظر آئی۔ پرمانٹ مارکر کی مدد سے یہ الفاظ درج تھے...... ''جس چیز کو جمنے سے بچانا ہو اسے اس ڈیپ فریزر میں ڈال دیں اور پھر آن نہ کریں۔ آپ جس شے کو جس حالت میں، ڈیپ فریزر کے اندر رکھیں گے، وہ ہمیشہ اپنی حالت برقرار رکھے گی۔''

میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پانی سے بھری بوتلوں کا جائزہ لینے لگا۔ ان میں سے ہر کنگ سائز بوتل یعنی کین کے اوپر ''ڈرنکنگ واٹر'' لکھا ہوا تھا اور یہ الفاظ بھی درج تھے۔ ''اس جزیرے کی برف ہر قسم کے نمکیات سے پاک ہے لہٰذا اس برف کو پگھلا کر ڈرنکنگ واٹر تیار کیا جاسکتا ہے۔'' میں نے ڈیپ فریزر کا ڈھکنا بند کیا اور اسٹور روم میں گھس گیا۔

اسٹور روم کے اندر نوڈلز، دلیا، چاول اور اسی طرح کے مختلف خشک اناج کا ایک وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ علاوہ ازیں شیشے کے مرتبانوں میں بادام، اخروٹ، مونگ پھلی، کاجو اور چھوہارے بھی بھرے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ تمام ڈرائی فروٹس جسم کو توانائی بہم پہنچانے کا ایک عمدہ ذریعہ تھے۔ ان تمام خشک میوہ جات کو باقاعدہ چھیل کر کانچ کے ان مرتبانوں میں محفوظ کیا گیا تھا۔ اس ذخیرہ خوراک کے علاوہ مذکورہ اسٹور روم میں مختلف سائز اور کیلیبر کا آتشیں اسلحہ بھی موجود تھا۔ اس ہٹ نوردی نے مجھے یہ اطمینان دلا دیا کہ میں بھوکا پیاسا بے بسی اور بے کسی کی موت تو ہرگز نہیں مروں گا۔

میں دوبارہ بیڈ روم میں آ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ نیل کریمر کی عطا کردہ گھڑی کو میں نے کلائی پر باندھ لیا تھا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو پتا چلا کہ رات کے دو بجنے والے تھے۔ یہ گھڑی میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ مجھے نیند تو نہیں آ رہی تھی تاہم میں اچھی خاصی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور پینا وشارو کے بارے میں سوچنے لگا، پھر ڈیلفینا بھی چھم سے میری سوچ میں داخل ہوگئی۔ اس کافر ادا، نسخۂ جفا اسپینش حسینہ نے اپنی ذہانت اور طاقت کے بل بوتے پر مجھے عارضی شکست سے ہمکنار کر دیا تھا۔ ڈیلفینا کے تصور نے میری سوچ میں کڑواہٹ بھر دی۔ قبل اس کے کہ میں خیالوں ہی خیالوں میں ڈیلفی کو کھری کھری سنا ڈالتا، ایک عجیب سی آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کرلی۔

''آووو...... ہاووو...... ہووو......!''

اس صدا میں بلا کا درد اور کرب پایا جاتا تھا۔ میں جتنے بھی جانوروں کی آوازوں سے آشنا تھا، ان میں یہ آواز بھیڑیے کی آواز سے گہری مشابہت رکھتی تھی لیکن میری مستند معلومات کے مطابق قطب جنوبی یعنی انٹارکٹیکا پر پولر بیئر، موس، رینڈ بیئر اور بھیڑیے بالکل نہیں پائے جاتے تھے۔ تو پھر یہ بھیڑیے جیسی ''آووو......'' کس جانور کی تھی؟

نیل کریمر کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں میرا ذہن قطب جنوبی کے باسی تمام خطرناک جانوروں کے نام دہرانے لگا...... اسکوا، وانڈرنگ البٹ راس، کلر وہیل، ڈسکی ڈولفن، ایلیفینٹ سیل اور سالمن شارک...... ان میں سے کون تھا جو رات کے اس پہر بین سے مشابہ آواز میں نوحہ گری کر رہا تھا؟

میرے لیے سب سے زیادہ تشویش کا پہلو یہ تھا کہ مذکورہ سوگوار آواز لحہ بہ لحہ میرے ہٹ کے قریب آ رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا یا تھی، اس سے مجھے تن تنہا ہی نمٹنا تھا اور اس ''نمٹاؤ'' کے لیے اس ہٹ کے اسٹور روم میں ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ نیل کریمر نے کہا تھا، یہ اسلحہ کسی بھی نوعیت کی ہنگامی صورتِ حال میں تمہارے کام آئے گا اور شاید...... ہنگامہ برپا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

میں نے بستر چھوڑ دیا اور پرعزم انداز میں اسٹور روم کی جانب بڑھ گیا......!

امنگوں حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی، کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

دعوت نامہ دروازے کے نیچے بچھے میٹ پر دوسرے کاغذات کے ساتھ پھینکا گیا تھا۔ یہ ایک کریم رنگ کا باریک لفافہ تھا جو کافی مہنگا معلوم ہوتا تھا۔ ڈنکین نے اسے چھوڑا اور باقی کاغذات کو کھول کر دیکھنے لگا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ کام کے دوران سب سے اہم چیز وہ آخر میں دیکھنا پسند کرتا تھا۔ اس نے نہایت سلیقے سے چاقو سے اس لفافے کو ایک طرف سے کاٹا اندر سے ایک سنہری رنگ کے حاشیے والا کارڈ باہر نکالا جس کے درمیان میں بڑے بڑے حروف میں اس کا نام رومن زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس نے پڑھنا شروع کیا۔

''دنیا کا سب سے پرفیکٹ کلب نہایت احترام کے ساتھ ''مسٹر ڈنکین ڈریفیلڈ......'' جو ایک ثابت شدہ پرفیکشنسٹ ہے، کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ اپنا مہمان بناتے ہوئے جمعہ اکتیس جنوری سات بج کر تیس منٹ سے آٹھ بجے تک کے لیے کھانے پر مدعو کرتا ہے۔ رابطہ بعد میں کیا جائے گا۔''

وہ چوکنا ہوگیا۔ یہ کوئی مارکیٹنگ کا نیا طریقہ ہوسکتا تھا کیونکہ ابھی کچھ عرصہ پہلے اسے گاڑیوں اور فرنیچر کے ڈیلرز نے نہایت چالاکی کے ساتھ پارٹیوں میں بلایا تھا۔ دعوت

باریک بین

زبیر حسن

اتنی خوب صورت کائنات تخلیق کرکے بھی اللہ نے اس میں ایک ادھورا پن رکھ چھوڑا ہے مگر ایک انسان ہے کہ... اسے اپنے ہر کام، اپنی ذات پر کچھ ایسا اندھا بھروسا ہوتا ہے جیسے وہ ہی ایک کامل ہنر مند ہے... اور اس کا کیا ہوا ہر کام پرفیکٹ ہے۔ اسے بھی خود پر کچھ ایسا ہی گمان تھا مگر پھر اس ایک نقص نے اس کی زندگی کی بازی ہی مات کر ڈالی۔

اپنی ہر سوچ پر خوب صورتی سے عمل کرنے والے ایک پرفیکشنسٹ کا قصہ

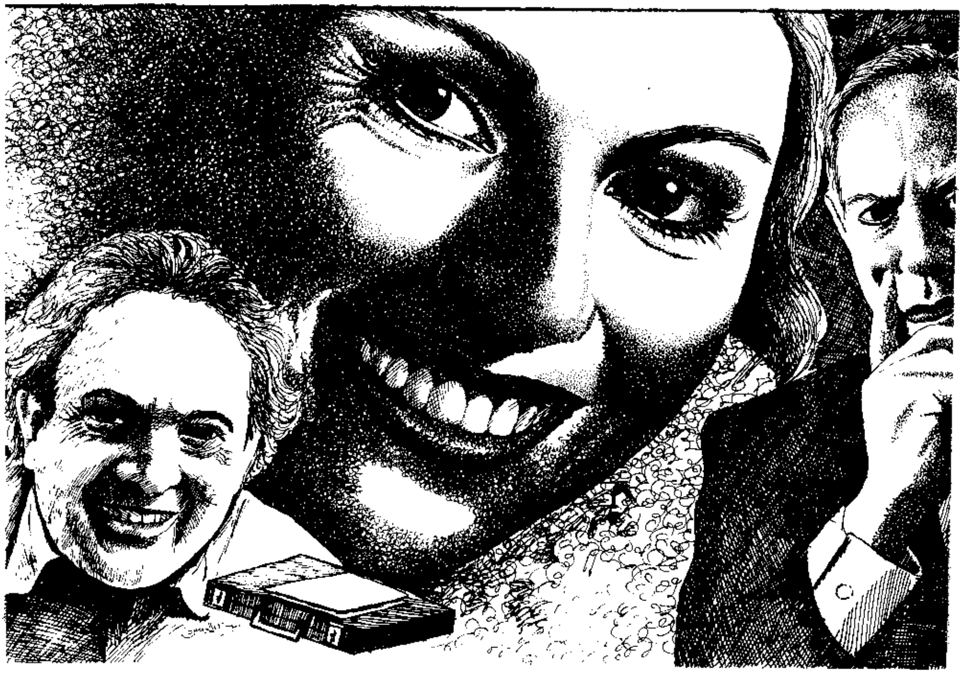

نامے پر کسی بھی کمپنی کا کوئی نام درج نہیں تھا اور وہ ایسی کسی تقریب میں جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے دعوت نامے کو بار بار پڑھا۔ اسے اپنے لیے استعمال کیے گئے الفاظ پسند آئے۔ ثابت شدہ پرفیکشنسٹ...... کیونکہ وہ تھا ہی ایسا۔ ہر چیز میں پرفیکشن تلاش کرنے والا۔ اور اسے یہ بار بار پڑھ کر اچھا لگ رہا تھا لیکن دعوت نامے پر کسی کلب کا نام یا پتا نہ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ پریشان بھی تھا۔ کیونکہ وہ ایک محتاط شخص تھا جو کہیں آنے جانے سے پہلے ایسی چیزوں کو بغور دیکھتا تھا۔

شام آٹھ بج کر تیس منٹ کے قریب اس نے ایک کال ریسیو کی۔ بہت ہی خوبصورت اور بھاری بھرکم آواز میں اس کا نام پکارا گیا۔

''جی......؟''

''آپ نے یقیناً اکتیس جنوری کو کھانے کا ایک دعوت نامہ موصول کیا ہوگا۔''

''کون سا دعوت نامہ؟'' ڈنکین نے جواب دیا جیسے وہ پہلے ہی بہت سے دعوت نامے وصول کر چکا ہو۔

''سنہرے حاشیے والا کارڈ...... جس پر آپ کو ایک ثابت شدہ پرفیکشنسٹ قرار دیا گیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اسے ضرور قبول کریں گے۔''

''آپ لوگ کون ہیں...... مجھے صحیح بتایئے گا۔''

''ہم کچھ لوگ ہیں...... بالکل آپ جیسی ذہنیت رکھنے والے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ ہم میں بالکل فٹ رہیں گے۔''

''کیا یہ کوئی شعبدہ بازی ہے؟ مجھے کوئی شوق نہیں فارغ لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کا۔''

''ہم فارغ نہیں ہیں مسٹر ڈنکین۔''

''تم لوگوں نے میرا نام کہاں سے لیا؟''

''آپ کا نام کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا اور آپ ایک مضبوط امیدوار کے طور پر ابھرے ہیں۔''

''سچ میں؟'' اس کو اب غصہ آرہا تھا۔ ''کیا آپ وضاحت کریں گے؟''

''اگر آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں آپ کو کچھ بیچنے جارہا ہوں تو ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''میں تقریر نہیں کرنا چاہتا۔''

''ہم بھی تقریروں میں الجھنے والے نہیں ہیں۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ آپ کو گاڑی بھی بھجوائی جائے گی۔''

''آپ اپنا نام بتانے کی زحمت کریں گے؟''

''ضرور۔ میرا نام ڈیوڈ ہوپکنز ہے اور اب میں امید کرتا ہوں کہ آپ ہاں کہنے جارہے ہیں۔''

''کیوں نہیں،' ڈنکین نے سوچا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر ہوپکنز۔''

''بہت خوب۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ چھ بج کر تیس منٹ تک تیار ہوجائیں گے جیسے کہ ایک پرفیکشنسٹ ہوتا ہے۔ اگر آپ کچھ پریشان ہیں تو میں آپ کو بتادوں کہ یہ صرف کھانا ہے اور آپ کالا کوٹ اور کالی ٹائی پہنیں گے۔ میں آپ کو لینے خود آؤں گا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ آپ مجھے صرف ڈیوڈ بلا سکتے ہیں۔''

کال کے بعد ڈنکین اس سوچ میں تھا کہ کیسے اس ڈیوڈ ہوپکنز کو ڈھونڈا جائے۔ فون ڈائریکٹری اور میڈیکل رجسٹری کی مدد سے وہ تین ڈیوڈ ہوپکنز کے نمبر تلاش کرچکا تھا اور جب ان سے فون پر بات ہوئی تو تینوں کی آوازوں میں اور پہلے والے ڈیوڈ ہوپکنز کی آواز میں بہت فرق تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر کس نے اس کا نام کمیٹی کے سامنے رکھا ہوگا۔ اور یہ بہت دلچسپ ہوگا جب وہ مسٹر ڈیوڈ ہوپکنز کو بذاتِ خود دیکھے گا۔

یہ جنوری کا آخری جمعہ تھا۔ ڈاکٹر ڈیوڈ ہوپکنز ایک دبلا پتلا اور گہرے رنگ کا آدمی تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب اور قد درمیانی تھا۔ اس نے ہاتھ ملایا۔

''کیا آپ مجھے اپنے ساتھ کچھ لے جانے دیں گے۔ ایک مشروب کی بوتل ہی سہی۔''

''نہیں، آپ ہمارے مہمان ہیں مسٹر ڈنکین۔''

مسٹر ڈیوڈ کی شخصیت نے اسے متاثر کیا تھا۔ اب وہ ایک خاص شام کی امید لگائے بیٹھا تھا۔

وہ دونوں جب باہر نکلے تو باوردی ڈرائیور کے ساتھ ایک کالے رنگ کی کار ان کی منتظر تھی۔

''ہم وہاں مشروب سے لطف اندوز ہوں گے مسٹر ڈنکین...... اور یہ بھی غلط ہوگا اگر میں کہوں کہ ہم وہاں صرف مشروب پینے ہی جارہے ہیں۔''

جب وہ دونوں گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھے تو ڈیوڈ نے ایک بٹن دبا دیا جس سے گاڑی کی تمام کھڑکیوں، ڈرائیور اور ان کے درمیان کالے رنگ کا شیشہ حائل ہوگیا۔ ڈنکین اب باہر نہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی ڈرائیور کو۔

''یہ آپ کے فائدے کے لیے ہے۔''

''ایسا کیوں ہے؟''

''ہم اپنے مہمانوں کو ہمیشہ کلب کی پرائیویسی کو احترام کی نظر سے دیکھنے کا کہتے ہیں۔ اگر آپ یہ نہیں جانتے کہ ہم

کہاں جارہے ہیں تو اس سے آپ کی پریشانی کم ہوجائے گی۔''
''ٹھیک ہے۔ اب ہم اکیلے ہیں اور میں ساتھ آنے پر رضامند بھی ہوں۔ کیا اب آپ کچھ اور بتانا پسند کریں گے؟''
''تھوڑا بہت۔ اصل میں ہم آپ جیسے ہی ہیں۔''
''پرفیکشنسٹ؟''
''یہ ہماری چند خاصیتوں میں سے ایک ہے۔'' وہ مسکرایا۔
''میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے کیوں بلوایا جارہا ہے...... کیا میں کسی کلب کے رکن کو جانتا ہوں؟''
''مجھے نہیں لگتا۔''
''پھر کیسے؟''
''جو کچھ آپ نے حاصل کیا، یہ اس کی وجہ سے ہے۔''
ڈنکین سوچنے لگا کہ اس نے آخر ایسا کیا حاصل کرلیا جس کی وجہ سے وہ ان کی نظروں میں آگیا۔ وہ سول سروس میں اپنا ایک اچھا ماضی رکھتا تھا۔ وہ دوران ملازمت ملنے والے اپنے انعامات کو بھی سوچ رہا تھا کہ شاید ان میں سے کسی وجہ سے اس ہائی کلاس کلب کی اس پر نظر پڑ گئی ہو۔
''کلب میں اور کتنے رکن ہیں؟''
''ہمارے معیار پر بہت کم لوگ اترتے ہیں۔''
''لیکن ابھی کتنے ہیں؟''
ابھی پانچ ہیں۔''
''یہ تو کچھ بھی نہیں۔''
''ہم کم ہیں لیکن خاص ہیں۔''
''مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگوں نے مجھے کیوں دعوت دی۔''
''جلد معلوم ہوجائے گا۔''
کچھ اور چھوٹے چھوٹے سوالوں کے جوابات حاصل کرنے میں ڈنکین کامیاب رہا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ کلب سو سال پرانا ہے۔ وہ صرف اسی صورت میں کلب کو جوائن کر سکتا تھا جب کلب کے باقی ارکان اس کی منظوری دیتے۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں یہ کوئی احمق لوگ ہی نہ نکل آئیں۔ پھر تقریباً ایک گھنٹے سے پہلے ہی گاڑی رک گئی اور ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ گاڑی سے نکلتے ہی ڈنکین نے غور سے ڈرائیور کو دیکھا۔ وہاں اندھیرا تھا لیکن یہ بات تو ڈنکین پر واضح تھی کہ وہ لندن مین شہر میں ہی ہیں۔ وہاں گھروں کے باہر درخت لگے ہوئے تھے۔ ڈنکین جگہ تو پہچان نہ پایا کیونکہ لندن میں کئی جگہیں ایسی ہی تھیں۔
''سیدھا چلتے ہیں۔'' ڈیوڈ نے کہا۔ ''دروازہ کھلا ہی ہے۔''

وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو وہاں شیشے ہی شیشے تھے اور ہر طرف رنگ برنگی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے ڈنکین کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ڈیوڈ نے اس کا بازو پکڑا ... اور ساتھ ہی ایک اور دروازہ کھول کر اسے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔
''میرے معزز ساتھیو!'' ڈیوڈ نے اونچی آواز میں کہا۔ ''میں پیش کرنے جارہا ہوں آپ کے سامنے مسٹر ڈنکین ڈریفیلڈ کو......''
یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ چار آدمی ہاتھوں میں مشروب کے گلاس لیے ان کا انتظار کررہے تھے۔ وہ چالیس سال کے قریب تھے جبکہ دو قدرے بوڑھے تھے۔ ایک قدرے جوان شخص نے ایک لمبا سا چوغہ پہن رکھا تھا۔ ایک بوڑھے شخص نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھایا۔ ''جوئے فرینک...... میں یہاں کا صدر ہوں جو کہ ایک خاص طریقہ کار کے بعد باقیوں کو شکست دینے کے بعد بنا ہوں۔''
ان سب کے چہروں پر ایک خاص قسم کی مسکراہٹ تھی۔
جوئے فرینک آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ ''میں انیس سال کا تھا جب انیس سو چونتیس میں، میں نے اس کلب کی ممبر شپ حاصل کی۔ لیکن کاغذات کے مطابق میں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کلب کو جوائن کیا۔''
ڈنکین کے پاس کھڑے ڈیوڈ نے کچھ نہ کہا۔
''اور یہ میرے ساتھ کھڑے اس کلب کے باقی کے ممبران ہیں۔'' جوئے فرینک بولا۔ ''یہ مسٹر ویلے ونٹروپ، وہ پہلے شخص جنہوں نے رائسن زہر کو ایک منافع بخش کاروبار بنایا اور اب یہ ایک بہت ہی کامیاب کاروباری چین پورے یورپ میں چلارہے ہیں۔''
''کیا آپ رائس یعنی چاول کی بات کررہے ہیں؟'' ڈنکین نے پوچھا۔
''نہیں رائسن ...... یہ ایک ویجی ٹیبل زہر ہوتا ہے۔''
یہ ایک مشکل کام تھا۔ زہر اور کامیاب کاروباری چین کے تعلق کو سمجھنا۔ ویلے ونٹروپ نے ڈنکین سے ہاتھ ملایا۔
جوئے فرینک نے چوغے والے شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہیں ایلکس میکفی۔ ہمارے سب سے نوجوان ممبر۔ جو اس کلب کو سب سے زیادہ عطیہ دیتے ہیں۔ تقریباً سات سال سے یہ ہمارے ساتھ ہیں ...... کیوں ایلکس؟''
''تقریباً اتنے ہی......'' ایلکس نے کہا۔
ایلکس کا کاروبار ایک نہایت خوبصورت اور دلکش چاقو

بنانے سے متعلق تھا جسے امراء رکھنا پسند کرتے تھے۔

''اور اب وقت ہے مسٹر مائیکل پٹ اسٹرڈتھر سے ملنے کا۔ دنیا کے مانے ہوئے مارشل آرٹ کے ماہر۔ ذرا دھیان سے مسٹر مائیکل سے ہاتھ ملائیے گا۔''

ہر طرف ہلکے ہلکے قہقہے بلند ہوئے اور پھر مائیکل کے ہاتھ ملانے کے طریقے سے ہی ڈنکین کو اس کی مہارت کا اندازہ ہوگیا۔

''اور آپ ہمارے آخری ممبر ڈاکٹر ڈیوڈ ہوپکنز سے پہلے ہی مل چکے ہیں جن سے اچھا جلد کا ڈاکٹر دنیا میں موجود نہیں۔''

ڈنکین نے ایک بار پھر سب کو دیکھا اور بولا۔'' کتنے ماہر لوگ جمع ہیں یہاں لیکن آپ سب میں مشترکہ یا ملتی جلتی بات کیا ہے جس کی وجہ سے آپ یہاں اکٹھے ہیں؟''

جوئے فرینک نے اس کا جواب دیا۔'' ہم سب جو یہاں موجود ہیں، ہم میں سے ہر ایک، ایک پرفیکٹ قتل کر چکا ہے۔''

یہ جواب ڈنکین کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ اس بار کوئی مسکرا بھی نہیں رہا تھا۔

''اب ہمیں کھانے کی میز پر جانا چاہیے۔'' جوئے فرینک نے مشورہ دیا۔

کچھ دیر بعد وہ سب اگلے کمرے میں موجود گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈنکین اس سوچ میں تھا کہ اگر یہ سب درست ہے تو آج کھانا وہ ایک قاتلوں کے گروپ کے ساتھ کھانے والا ہے۔ وہ پولیس کو مطلع کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن ایک مارشل آرٹ اور... چاقو میں مہارت رکھنے والے اشخاص کے درمیان بیٹھ کر یہ خیال صرف خیال ہی ہوسکتا تھا۔

ایک ویٹر نے آکر سب کے گلاسوں میں مشروب انڈیلا۔

''یہ ہنگری سے ہے۔'' جوئے فرینک نے ویٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ انگلش نہیں جانتا۔''

اس کے بعد جوئے نے مشروب سے بھرا گلاس اٹھایا اور بولا۔''یہ ہے تھامس ڈی کیونسی کے نام...... جس نے ایک بہت پیارے قتل پر مضمون لکھا تھا اور جس میں بتایا تھا کہ قتل کرنا ایک بہت خاص قسم کا ہنر ہے۔ خاص کر جب کسی کو معلوم ہی نہ ہو پایا کوئی یہ جان نہ سکے کہ قاتل کون ہے۔''

''تھامس ڈی کیونسی۔'' سب نے مل کر کہا۔ صرف ڈنکین کی آواز قدرے آہستہ تھی۔

''تم یقیناً حیران ہوگے کہ ہم نے تمہیں کیوں بلوایا ہے؟'' ویلے ونٹروپ نے کہا جو کہ دوسری سائڈ پر بیٹھا تھا۔ ''تم یہ بھی سوچ رہے ہوگے کہ ہم اپنے راز ایک دوسرے کے سامنے کیوں کھول رہے ہیں؟ ہم یہ اس لیے کر رہے ہیں کہ اس کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ ہم اپنے راز یہاں بتا کر سکون محسوس کرتے ہیں مسٹر ڈنکین! جب ہم قتل کرتے ہیں اور پھر بہت سا وقت اس پریشانی میں گزرتا ہے کہ اچانک پولیس کا سائرن سنائی دے گا اور پولیس ہمارے دروازے پر ہوگی۔ پھر کچھ مہینے گزر جاتے ہیں اور آپ کا راز راز ہی رہتا ہے لیکن پھر آپ بور ہوجاتے ہیں۔ آپ کچھ اور کرنا چاہتے ہیں پھر کچھ سالوں میں یہ کلب آپ کو جوائن کر لیتا ہے اور آپ یہاں کھانے پر اکٹھا ہوتے ہیں۔''

ڈیوڈ ہوپکنز نے بھی بات میں حصہ ڈالا۔'' پھر آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جو کیا، اس میں آپ اکیلے نہیں ہیں اور اس کی دنیا میں کہیں کوئی اہمیت بھی ہے جہاں آپ کھل کر راز شیئر کر سکتے ہیں۔ بہت خوب...... آخر کوئی تو جگہ ہے جہاں آپ اپنے کیے گئے قتل کو کھل کر بیان کر سکتے ہیں۔''

''آپ کیسے ایک دوسرے پر اتنا یقین کر سکتے ہیں؟'' ڈنکین نے بلاتوقف پوچھا۔

''یہاں ہم سب کے مختلف راز ہیں۔ اگر کوئی ہم میں غداری کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بھی ساتھ ڈبو دے گا کیونکہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔''

جوئے فرینک نے اور وضاحت کی۔'' یہی حفاظتی تدابیر ہیں جو سو سال سے چلتی آرہی ہیں۔ سب سے پہلے ممبر کا نام جیک تھا جو اس کلب کا کرتا دھرتا تھا۔ اگر وہ اور اس کی شناخت سو سال سے معاشرے سے چھپی رہی تو ہماری کیوں نہیں چھپ سکتی۔''

''یہ تو بہت ہی کمال کی بات ہے۔ ویسے جیک تھا کون؟''

''کوئی بھی اس کے بارے میں منہ نہیں کھول سکتا۔'' میکنفی نے کہا۔

''کیا میں کچھ اور بھی پوچھ سکتا ہوں اس کے بارے میں؟''

''نہیں جب تک تم باقاعدہ اس کلب میں شمولیت نہیں اختیار کر لیتے۔'' جوئے فرینک نے کہا۔

ڈنکین اس حوالے سے کچھ پریشان تھا۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس کلب کو جوائن نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس نے کبھی کسی کو قتل ہی نہیں کیا تھا لیکن اس کے اندر ایک آواز اسے خاموش رہنے کا کہہ رہی تھی کیونکہ یہ سب ممبر اسے اپنے جیسا ہی سمجھ رہے تھے۔ شاید اس حوالے سے انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی تھی اور وہ سچ بتا کر کوئی نیا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

''ہمارے کچھ اصول ہیں......'' ویلے ونٹروپ نے کہا۔
جوئے فرینک نے بات آگے بڑھائی۔ ''ہمیں یقین ہے کہ تم بھی اس کلب کو جوائن کرنا چاہو گے لیکن ہمیں اصولوں کو بھی لے کر چلنا ہے۔ تم کسی کو اس شام کے بارے میں نہیں بتاؤ گے اور اس کلب کے ہونے کا تو بالکل بھی ذکر نہیں کرو گے۔ یہ بہت احمقانہ عمل ہوگا اگر کوئی ہمارا راز کھولے گا تو...''
''اور وہ اصول کیا ہیں؟'' ڈنکین نے پوچھا۔
''ایک تو یہی ہے کہ کسی ممبر کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گے۔''
''میرے ہونٹ ہمیشہ بند رہیں گے۔'' ڈنکین نے جواب دیا۔
کھانا لگ چکا تھا اور اب سب کھانے کے ساتھ ساتھ جرائم پر مبنی ناولز کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ جیسا کہ ''سائلنس آف لیمب''...... پھر وہ اس کا انجام بھی زیر بحث لائے کہ جو اس کلب کے بارے میں کسی کو کچھ بتائے گا۔ ڈنکین کو اب کوئی شک نہیں تھا کہ تمام ممبر اسے بھی ایک قاتل تصور کر رہے ہیں۔
کھانے کے آخر میں بالآخر ڈنکین بولا۔ ''یہ ایک خوبصورت شام تھی۔ کیا میں اس کلب کی شمولیت اختیار کر سکتا ہوں؟''
''تم شامل ہونا چاہو گے؟'' جوئے فرینک نے کہا۔ ''یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔''
''یہ تمہارے لیے ایک کلب ممبر کی حیثیت سے بہت ہی اچھا رہے گا۔'' ویلے نے کہا۔ ''لیکن تمہیں ہمیں کوئی ثبوت دینا ہوگا کہ تم واقعی ہم میں سے ایک ہو......ایک قاتل۔''
ڈنکین نے بڑے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ ''کیا آپ لوگوں کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے؟ مجھے تو لگا کہ آپ کے پاس پہلے سے ہی کچھ ہے؟''
''دیکھو، ہمارے پاس کیا ہے اور تم ہمیں کیا دیتے ہو......اس میں فرق ہے۔''
''یہ آسان نہیں ہے۔'' ڈنکین نے کہا۔
''لیکن یہ اصول ہے۔''
ڈنکین بولا۔ ''کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ کیسے آپ نے مجھے قاتل سمجھا اور دعوت نامہ بھیجا؟''
''تجربہ......'' جوئے فرینک بولا۔ ''ہمارے پاس پولیس سے بڑھ کر تجربہ ہے۔''
مائیکل جواب تک خاموش تھا بولا۔ ''ہمیں معلوم ہے کہ اس شام تم وہاں تھے اور وہاں تم سے بڑھ کر ایسا کوئی نہیں تھا جو یہ کام کرتا۔''

''لیکن ہمیں پھر بھی کوئی نہ کوئی ثبوت تو چاہیے۔'' ویلے نے کہا۔
''ہتھیار!'' میکلی نے کہا
''ہتھیار میں نے پھینک دیا تھا۔'' ڈنکین نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا کیونکہ صورتِ حال بہت گمبھیر ہو چکی تھی۔
''آپ لوگوں کے پاس کچھ تو ہوگا۔''
''نہیں......'' میکلی نے کہا۔ ''ہم نے کہا نا کہ ہمارے پاس صرف تجربہ ہے۔''
''ٹھیک ہے بوڑھے آدمی۔'' ویلے نے کہا۔ ''یہ اب تمہارے اوپر ہے کہ تم ہمیں کیسے ثبوت مہیا کرتے ہو۔''
''کتنا وقت ہے میرے پاس؟''
''اگلی ملاقات جولائی میں ہوگی۔ اس وقت ہم تمہیں مستقل ممبر بنا دیں گے۔''
پھر کچھ اور باتیں چلتی رہیں۔ آخر میں کافی کا دور چلا اور وہ شام اختتام کو پہنچی۔ ڈیوڈ نے کہا کہ کار باہر انتظار کر رہی ہے۔ واپسی پر ڈنکین بہت پریشان تھا لیکن وہ ڈیوڈ پر اپنی حالت ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔
''یہ ایک بہت اچھی شام تھی لیکن مجھے ایک مسئلہ درپیش ہے۔''
''کیسا مسئلہ؟''
''مجھے یہ معلوم نہیں ہو رہا کہ میرے کس قتل کے بارے میں آپ لوگ بات کر رہے تھے؟''
''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم ایک اجرتی قاتل ہو؟''
ڈنکین نے اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ کافی عرصہ ہو چکا ہے۔''
''ہم جیکب دی ڈرنک واٹر کے قتل کی بات کر رہے ہیں جو 1995ء کی سول سروس کانفرنس کے دوران ہوا تھا۔''
جیکب دی ڈرنک واٹر......ڈنکین کو یاد آیا کہ ہاں وہ اس انٹرنیشنل کانفرنس میں شریک تھا اور پھر اگلی صبح وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں مردہ پایا گیا تھا۔
''لیکن وہ تو ہارٹ اٹیک تھا۔''
''کاغذوں میں......'' ڈیوڈ نے کہا۔
''تو تم نے کیا سنا اس کے بارے میں؟''
''اس کی سیکیورٹی نے اصل بات چھپائی تھی کیونکہ وہاں بہت بڑا ہنگامہ ہو سکتا تھا۔ تم نے یہ کیسے کیا؟ مجھے لگتا ہے تم نے زہر اس کے آفٹر شیو میں مکس کیا ہوگا۔''
''یہ میرا ایک راز ہے۔'' ڈنکین نے چالاکی سے کہا۔
''یقیناً......بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تم اس سے ناخوش تھے۔ کئی سال پہلے تم اس کے نیچے کام بھی کر چکے تھے۔''

ڈنکین کو یاد آیا کہ اس کا ایک باس بھی تھا۔ چارلی ڈرنک واٹر جس نے اس کی نوکری کو نقصان بھی پہنچایا تھا لیکن جیکب ڈرنک واٹر کو تو وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ شاید ناموں کی مماثلت کی بنا پر کلب کے ممبران کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔

''تو تم لوگوں نے کیسے جانا کہ میں اس کانفرنس میں تھا؟''

''تم اسی فلور پر تھے جہاں اس کا کمرا تھا اور پھر تم کسی طرح اس کے کمرے میں داخل ہوئے اور زہر کسی چیز میں شامل کردیا۔''

''تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں نے زہر کہاں سے لیا؟''

ڈیوڈ نے قہقہہ لگایا۔ ''ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے گھر میں لاریل کے پودے ہیں۔ ان کی پتیوں میں زہر ہوتا ہے۔ تم نے انہیں خشک کیا اور پیس کر زہر بنایا۔''

''میں اپنا یہ راز کھولنا نہیں چاہتا۔'' ڈنکین نے کہا۔ ''اگر مجھے کلب میں شمولیت اختیار کرنی ہے تو مجھے لازماً کوئی نہ کوئی ثبوت دینا ہوگا۔''

''اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ سب تمہیں پسند کرتے ہیں اور تمہیں اپنے ساتھ کلب میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔''

''اور اگر میں کلب میں شامل ہونا نہ چاہوں تو؟''

''کیوں؟''

''میری کچھ ذاتی وجوہات ہوسکتی ہیں۔''

ڈیوڈ نے اسے غور سے دیکھا اور کہا۔ ''ہم بہت سنجیدہ لوگ ہیں ڈنکین۔ ہم نے تمہیں دعوت دی کیونکہ تم ایک پرفیکشنسٹ ہو۔''

''لیکن تم لوگوں نے کوئی وضاحت نہیں دی مجھے۔''

''اس کو تم کلب کے نظریے سے دیکھو۔ اب تمہاری اہمیت پہلے والی نہیں رہی۔ ہم خطرناک لوگ ہیں ڈنکین۔ اب اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں کہ تمہیں ہم سے تعاون کرنا ہوگا۔''

''لیکن اگر میں ثابت ہی نہ کرسکا کہ قتل میں نے کیا تھا تو پھر؟''

''تمہیں کرنا پڑے گا اور اگر نہ ثابت کرسکے تو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔''

اور پھر اس شام کا اختتام ہوگیا۔

اگلے تین ہفتوں تک اسے ٹھیک سے نیند بھی نہ آسکی۔ جب بھی اس کی آنکھ لگتی تو خواب میں اسے کوئی اپنا گلا دباتا نظر آتا۔

اگر وہ ان کو بتاتا کہ جیکب ڈرنک واٹر کا قتل اس نے نہیں کیا تو کلب والے اسے اپنی رازداری کے لیے ایک خطرہ محسوس کرتے اور اگر وہ جعلی ثبوت بناتا تو پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ وہ بھی کوئی عام لوگ نہیں تھے اور ویسے بھی جعلی ثبوت بنانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ سب نہایت زیرک انسان تھے۔

''تمہیں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑے گا۔'' ڈیوڈ ہوپکنز کی بات اسے یاد آئی۔

وہ برٹش نیوز پیپر لائبریری میں گیا اور جیکب ڈرنک واٹر کے متعلق جتنی بھی خبریں اور رپورٹس تھیں، اس نے سب پڑھ لیں مگر اس سے اس کی پریشانی میں اضافہ ہی ہوا۔ انسداد دہشت گردی اسکواڈ اور ایم آئی فائیو...... سب کی رپورٹس نے جیکب کی موت کی وجہ ہارٹ اٹیک بیان کی تھی۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کیسے ثبوت تیار کرے۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ یہ تو ڈنکین پر واضح ہوچکا تھا کہ کلب ممبران کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کبھی اس کا دل کرتا کہ وہ کلب ممبران کو سچ بتادے لیکن پھر وہ خوف کی وجہ سے کچھ اور سوچنے لگتا۔ مئی کی صبح اسے ایک بہت زبردست خیال آیا۔ یہ خیال اس کو ڈیوڈ ہوپکنز کی اس بات پر آیا تھا جب اس نے کہا تھا۔ ''کیا تم اجرتی قاتل ہو؟''

خیال یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ وہ جیکب کے قتل کا کوئی ثبوت بنائے، کیوں نا وہ کسی اور قتل کا ثبوت لے کر کلب کے سامنے پیش ہوجائے۔ آئے روز کوئی نہ کوئی غریب لندن میں خودکشی کرتا تھا۔ کیوں نا ایسے ہی کسی خودکشی کرنے والی لاش سے کچھ ثبوت حاصل کرکے وہ کلب ممبران کے سامنے پیش کردے اور یہ باور کرائے کہ وہ ایک اجرتی قاتل ہے۔ جو اس طرح قتل کرتا ہے کہ قتل، قتل نہ لگے بلکہ خودکشی نظر آئے جس کے بعد اسے کلب میں شامل کرلیا جائے گا۔ کچھ عرصے بعد وہ خود کو اس کلب سے آہستہ آہستہ الگ کرلے گا اور کسی کو اس پر اعتراض نہ ہوگا کیونکہ تب تک کلب ممبران کو اس بات کا یقین ہوچکا ہوگا کہ وہ ان کے کلب کی رازداری کے لیے کوئی خطرہ نہیں بن سکتا۔ سارا کھیل کچھ وقت گزارنے کا تھا۔

اب اسے انتظار تھا کہ شہر میں کوئی شخص خودکشی کرلے اور وہ وہاں پہنچ کر کوئی ثبوت حاصل کرلے۔ اب وہ سارا دن اخبارات پڑھتا کہ شہر میں کسی نے کوئی خودکشی کی ہو لیکن ابھی تک ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ جون کا مہینا ختم ہوا اور اسے ویسا ہی ایک دعوت نامہ پھر موصول ہوا جو ویسے ہی لفافے میں بند تھا۔

''دنیا کا پرفیکٹ ترین کلب، بہت ہی احترام سے ''مسٹر ڈنکین ڈریفیلڈ'' کو شام کے کھانے کی دعوت دیتا ہے جو کہ جولائی انیس کو سات بج کر تیس منٹ سے...... آٹھ بجے کے درمیان ہوگی۔ رابطہ بعد میں کیا جائے گا۔''

اس بار دعوت نامے کے الفاظ اسے متاثر نہ کرسکے۔ وہ تھوڑا ڈرا ہوا تھا کیونکہ اگر وہ وقت پر ثبوت نہ پیش کرسکا تو وہ اسے قتل کرسکتے تھے۔ اب بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ اگلے دو ہفتوں میں وہ خودکشی کرلیتا۔

اس دن اس نے ایک کے بجائے تین اخبار خریدے لیکن کوئی کامیابی نہیں ملی۔ پھر آخر کار خودکشی کی ایک خبر اس تک پہنچ گئی۔ لیکن یہ خبر اسے اخبار سے نہیں بلکہ فون کال سے موصول ہوئی جو اس کے ایک ریٹائرڈ ساتھی ہیری بیچ مین کی تھی جو اس کے ساتھ سول سروس میں تھا۔ ان کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، بڑے دنوں بعد اس نے اس کی آواز سنی۔

''ایک بری خبر ہے۔'' ہیری نے کہا۔ ''تم جانتے ہو نا...... بلی فشر کو؟''

''کیوں نہیں۔ میں جانتا ہوں۔'' ڈنکین نے کہا۔ ''ہم نے بارہ سال ایک ساتھ کام کیا ہے۔''

''اس نے کل رات ہوٹل کی بالکونی سے چھلانگ لگا کر اپنے آپ کو ختم کرلیا۔''

''بلی نے؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''جب میں نے سنا تھا، مجھے بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ کچھ دنوں سے پریشان تھا۔ آفس میں تو وہ ہمیشہ سب کو ہنساتا تھا۔ کیا آدمی تھا وہ......''

''اس کی بیوی تو بہت پریشان ہوگی۔'' ڈنکین نے کہا۔

''وہ اس وقت اپنی بہن کے ساتھ ہے۔ ہر کوئی اس سے ہمدردی کا اظہار کررہا ہے۔ تم بھی اس سے رابطہ کرلو۔''

''ٹھیک ہے...... تم نے کہا کہ یہ کل ہوا ہے؟''

''ہاں...... کل شام ہی۔''

''کیا تم بتاسکتے ہو کہ کون سے ہوٹل میں؟''

''دی ایکسیلزیور۔ کمرا نمبر 1313۔ لوگ کہتے ہیں کہ 13 کا ہندسہ منحوس ہوتا ہے۔ مجھے اب یقین ہوا۔''

یہ ایک بری خبر تھی لیکن ڈنکین کے لیے یہ ایک زبردست واقعہ تھا۔ بلی اس کے ساتھ کام کرچکا تھا اور اب اس کی موت سے ڈنکین فائدہ اٹھاسکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس نے کمرا سیل کردیا ہوگا لیکن اب وہ اپنا منصوبہ بناچکا تھا۔ وہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے بس بلی فشر کے اس کمرے سے کچھ چیزیں اٹھانا تھیں جنہیں کلب کے ممبران کے سامنے پیش کرکے وہ یہ ثابت کرسکے کہ اس نے ہی اپنے پرانے کولیگ کو قتل کیا ہے۔

وہ پانچ بج کر پچیس منٹ پر لندن شہر روانہ ہوا۔ دو گھنٹے میں وہ مین سٹی میں تھا پھر ایک ٹیکسی کے ذریعے وہ ہوٹل پہنچا۔ ہوٹل ایک اونچی عمارت تھی۔ ہر کمرے کے باہر لوہے کی بالکونیاں تھیں جو زیادہ فاصلے پر نہ تھیں۔ اس نے بغور عمارت کا جائزہ لیا۔

وہ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچا۔ کوئی بھی آتے جاتے اسے غور سے نہیں دیکھ رہا تھا جس سے وہ کچھ اور پراعتماد ہوگیا۔ اب اسے کمرا نمبر 1313 کی تلاش تھی اور وہ اسے جلد ہی مل گیا۔ کوئی پولیس والا وہاں موجود نہیں تھا اور کمرا ابھی سیل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ واپس آیا اور کاؤنٹر سے کمرا نمبر 1312 کی چابی مانگی۔ یہ کمرا اس کے ساتھ والا کمرا تھا اور خالی تھا۔ اس کی چابی اسے آسانی سے مل گئی۔ وہ دوبارہ تیرھویں فلور پر آیا اور کمرا نمبر 1312 میں داخل ہوگیا۔ وہ اس کمرے کی بالکونی سے ساتھ والے کمرے یعنی 1313 کی بالکونی پر جاکر اس کمرے کے اندر سے کوئی ثبوت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا منصوبہ بڑی آسانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچ رہا تھا۔ اس نے کمرے کی بتیاں نہیں جلائیں اور اندھیرے میں ہی بالکونی کی طرف بڑھ گیا۔ اچانک اس کا پاؤں ایک سوٹ کیس سے ٹکرایا جو کسی بے فکرے مسافر نے دروازے کے قریب ہی رکھا ہوا تھا۔

تبھی اندھیرے میں ابھرنے والی ایک نسوانی آواز نے اسے منجمد کردیا۔ ''المیر! کیا یہ تم ہو؟''

وہ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہا۔ یہ اس کے منصوبے کا حصہ نہیں تھا لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی اس کمرے میں موجود ہو کیونکہ وہ ابھی ابھی اس کمرے کی چابی نیچے کاؤنٹر سے لے کر آیا تھا۔

''جان! کیا تم وہ لے آئے ہو جس کے لیے تم باہر گئے تھے......؟'' لڑکی کی آواز دوبارہ ابھری۔

ڈنکین بری طرح پھنس چکا تھا۔ اس بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

''تم روشنی کیوں نہیں جلاتے؟ میں بستر پر لیٹ چکی ہوں۔''

آواز اسے مسلسل پریشان کیے جارہی تھی۔ وہ کیا کرے؟ اگر وہ کچھ بولتا تو لڑکی چیخ پڑتی۔ وہ اٹھ کر خود سے لائٹ جلاسکتی تھی اور اس کا منصوبہ ختم ہوجاتا۔

''المیر......'' اب کی بار آواز میں کچھ شک بھی تھا۔

سول سروس کی تربیت میں اسے ہر طرح کی صورتِ حال میں خود کو سنبھالنے کی خاص مہارت سکھائی گئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنے آپ سے کہا کہ سب ٹھیک ہے۔ پھر تیزی سے ایک تکیہ اٹھایا اور آواز کی سمت لپکا اور تکیے سے بستر پر لیٹی اس لڑکی کے چہرے کو دبا دیا۔ کچھ دبی دبی آوازیں ابھریں۔ لڑکی پھڑپھڑائی۔ اس نے اور زور سے دبایا اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا مگر جلد ہی اسے ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا۔ اس کے ہاتھ سے اب واقعی میں ایک قتل ہو چکا تھا۔ وہ کسی کو مار چکا تھا۔ یہ ایک نیا احساس تھا۔ وہ اپنے ذہن کو جھٹک رہا تھا اور مسلسل سوچ رہا تھا۔ المیر کسی بھی وقت واپس آسکتا تھا۔ اسے فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ بالکونی ہی اس وقت سب سے محتاط راستہ تھا۔ اس نے شیشے کا دروازہ پار کیا اور بالکونی میں قدم رکھ دیا۔ اس بالکونی میں اور کمرا نمبر 1313 کی بالکونی میں ایک میٹر کا فرق تھا۔ یہ ایک مشکل کام تھا لیکن جیسے تیسے اس نے یہ فاصلہ طے کیا اور 1313 کی بالکونی میں اتر گیا۔ وہ جیسے ہی کمرا نمبر 1313 میں داخل ہوا، ایک دم کمرے کی روشنیاں جل اٹھیں۔ کمرا کچھ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ پولیس والے نہیں تھے اور نہ ہی ہوٹل اسٹاف..... کچھ جانے پہچانے چہرے تھے اور وہ سب مسکرا رہے تھے۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ ”تم پکڑے گئے ڈنکین میرے پیارے دوست.....“ یہ بلی فشر تھا۔

”تم.....؟“ ڈنکین نے کہا۔

”مر چکا ہوں نا..... نہیں میرے دوست نہیں۔“ بلی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ لو مشروب کا گلاس..... پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ کیا ہے۔“

اس نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھام لیا۔ سب چہرے جانے پہچانے تھے اور سب مسکرا رہے تھے۔

”کیا سوچ رہے ہو دوست.....“ بلی نے کہا۔ ”تم ان سب سے مل چکے ہو۔ یہ سب اداکار ہیں۔ تھوڑے سے پیسوں کے عوض اداکاری کرتے ہیں لیکن تم انہیں ”پر فیکشنسٹ“ کے طور پر جانتے ہو۔ اس شام یہ ذرا مہنگے کپڑوں میں تھے۔“

ڈنکین ان سب کو پہچان چکا تھا۔ ڈاکٹر ڈیوڈ ہوپکنز، میکفی شاندار چاقو والا، جوئے فرینک قاتل، ویلے ونٹروپ زہر بیچنے والا، مائیکل مارشل آرٹ کا ماہر۔ وہ سب جینز ٹی شرٹ میں ملبوس نہایت خوشگوار موڈ میں تھے۔

”تمہیں اب مان لینا چاہیے کہ ان کی اداکاری بہت کمال کی تھی۔“ بلی نے کہا۔ ”ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی بہت بورنگ ہو گئی تھی۔ میں نے سول سروس میں حاصل کی گئی اپنی مہارت کو استعمال کیا اور یہ ڈراما تیار کیا اور تمہیں بھی اس کا حصہ بنایا۔“

”مجھے کیوں.....؟“

”کیونکہ میں پرانے دنوں کی طرح کچھ کرنا چاہتا تھا اور ہیری..... کہاں ہو تم ہیری؟“

”میں یہاں ہوں۔“ پیچھے سے آواز آئی۔

”میں نے اور ہیری نے یہ منصوبہ بنایا۔ ہم نے کرائے پر گاڑیاں حاصل کیں اور پھر ایک عمارت کرائے پر حاصل کی اور ان اداکاروں کے ذریعے اس شام کے ڈنر کا پروگرام پلان کیا۔ اور یاد ہے وہ ہنگری کا ویٹر؟ وہ میں تھا۔ نقلی مونچھیں لگا کر میں نے تمہیں سرو کیا تمہیں پتا ہی نہ چلا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ایک سنجیدہ انسان ہو ڈنکین۔ تم اس ڈرامے میں پھنس جاؤ گے۔ اور ایسا ہی ہوا پھر مجھے معلوم ہوا کہ تم کسی خودکشی والے ... کیس کی تلاش میں ہو۔ سو میں نے اپنی خودکشی کی خبر تم تک پہنچائی۔“ اس نے تفصیل بیان کی اور قہقہہ لگایا۔

”تم جانتے تھے کہ میں یہاں آؤں گا؟“

”ہاں، ہمیں یقین تھا کیونکہ تم ثبوت کی تلاش میں تھے تاکہ تم اسے قتل ثابت کر کے کلب میں شمولیت حاصل کر کے اپنی جان بچا سکو اور جب تم نے ہیری سے پوچھا کہ کس کمرے میں خودکشی ہوئی ہے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ تم ضرور آؤ گے۔“

”کمینے لوگ.....“ ڈنکین نے گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

”اور وہ ساتھ والے کمرے میں موجود جو لڑکی ہے، وہ بھی اداکارہ ہے نا؟“

”کون سی لڑکی.....؟“

”اوہ بہت ہو چکا۔“ ڈنکین بولا۔ ”تم بتا چکے ہو کہ یہ سب ڈراما تھا“

”ہاں تھا تو ڈراما..... لیکن ہم سوچ رہے تھے کہ تم سامنے والے دروازے سے آؤ گے مگر تم بالکونی سے کیسے آگئے؟“ بلی نے کہا۔ ”اور یہ تم کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟“ اور پھر انہیں ساتھ والے کمرے کا دروازہ توڑنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

ڈنکین کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے کانوں کو ڈھانپ لیا۔

”اسے کیا ہوا؟“ بلی کہہ رہا تھا۔

سفر بخیر

منظر امام

اکثر مناظر اتنے پرفریب ہوتے ہیں کہ آنکھیں اور دل دونوں دھوکا کھا جاتے ہیں... وہ جو نظر آرہی تھی وہ تھی نہیں اور جو وہ دیکھ رہا تھا محض ایک دھوکا تھا... کیونکہ گندگی کے ڈھیر سے جب کنول کھلتا ہے تو یقین ذرا بے یقینی کا شکار ہو ہی جاتا ہے۔

اپنی ذات اور حالات میں الجھے ایک مسافر کی بدگمانی

اکبر کی نگاہیں اس عورت پر جم کر رہ گئی تھیں۔

وہ ایک باوقار عورت تھی۔ اس کی عمر پچاس سے زیادہ ہی ہوگی لیکن اس میں بلا کا چارم تھا۔ اس کی چال اور اس کے انداز میں ایسی خود اعتمادی تھی جو دولت ہی سے آیا کرتی ہے۔

اس نے خوبصورت ساڑی باندھ رکھی تھی۔ اکبر کے اندازے کے مطابق اس ساڑی کی قیمت ہی بیس پچیس ہزار ہوگی۔ وہ پارک میں واک کر رہی تھی۔ اس کے قدم بہت سج سج کر ایک وقار کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔ اس کے

ساتھ ایک دوسری عورت بھی تھی۔ جو اس کی ملازمہ معلوم ہوتی تھی۔

اس عورت نے اس ملازمہ سے کچھ کہا اور وہ اشارے میں جواب دیتی ہوئی ایک طرف جا کر ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ شاید اس نے کہا ہوگا کہ تم جا کر بنچ پر بیٹھ جاؤ اور وہ چلی گئی تھی۔

اکبر پہلی بار اس پارک میں آیا تھا۔ یہ شہر کے ایک پوش علاقے کا پارک تھا۔

یہاں آنے والے عام طور پر قریبی کوٹھیوں کے مکین ہوا کرتے تھے... جو واک کے لیے یا جاگنگ کے لیے آیا کرتے۔ خواتین کو اپنا مٹاپا دور کرنے کی فکر ہوتی تھی تو مردوں کو شوگر لیول کم کرنا ہوتا تھا۔

اکبر کو اس کے باس نے کسی کام سے اپنے گھر پر بلایا تھا۔ اسے اکبر کے ہاتھ کوئی پارسل کہیں بھجوانا تھا۔

باس کا گھر اسی علاقے میں تھا۔ یہاں شاندار کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ خود باس کا گھر بھی بہت زبردست تھا۔ اکبر ایسے گھروں کے صرف خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔ باس کے گھر جا کر جب اس کے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھتا تو دل مسوس کر رہ جاتا۔

موازنہ کرنے لگتا کہ خود اس کے گھر میں کیا تھا۔ در و دیوار سے محرومیاں ہی ٹپکتی تھیں۔ دو کمرے تھے۔ ایک کمرا اس نے اماں کو دے رکھا تھا، دوسرا اس کے پاس تھا۔ ایک کچا آنگن۔ اتنے پیسے ہی نہیں ہوتے تھے کہ تیسرا کمرا بنوایا جائے۔ حالانکہ صحن اچھا خاصا بڑا تھا۔

اس صبح بھی باس نے اسے گھر ہی بلا لیا تھا، پارسل دینے کے لیے۔ اس دن باس کو دفتر نہیں آنا تھا۔ وہ پارسل وصول کر کے سامنے والے پارک میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اس شاندار عورت کو اسی پارک میں دیکھا تھا۔

وہ پوش ایریا اس کے علاقے سے بہت فاصلے پر تھا۔ اگر اس کے پاس بائیک نہیں ہوتی تو اس کا آنا جانا مشکل تھا۔ یہ بائیک بھی دفتر والوں ہی نے اسے دلائی تھی۔

وہ اس عورت کو دیکھتا رہا۔ وہ واک کرتی ہوئی اس کی بنچ کے سامنے سے گزرنے لگی۔ اکبر اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دولت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔

اس کی ماں بھی ایک عورت ہی تھی اور شاید اس کی عمر اس شاندار عورت کے برابر ہی ہوگی لیکن دونوں میں کتنا فرق تھا۔

یہ عورت حسن اور صحت مندی کا اشتہار تھی جبکہ اس کی ماں ایک بیمار عورت تھی۔ جان لیوا کھانسی نے اس کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا جسم بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اس کو کئی طرح کی بیماریاں تھیں جن کے علاج کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے۔

وہ عورت واک کرتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر گئی۔ اکبر اس کی باوقار اور دلکش چال کو دیکھتا ہی رہا۔

ایک راؤنڈ لے کر وہ عورت ایک بار پھر اس کے سامنے سے گزری اور اس بار اس عورت نے بھی اکبر کی توجہ کا نوٹس لے لیا۔ وہ رک کر اکبر کی طرف دیکھنے لگی۔ اکبر کو ڈر ہوا کہ وہ کہیں اس کی محویت سے ناراض نہ ہو گئی ہو لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا... اور پھر آگے بڑھ گئی۔

اکبر اس وقت کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ وہ کیا کرے۔ خود اٹھ کر چلا جائے یا اس عورت کو دیکھتا رہے؟

وہ بیٹھا رہا۔ وہ عورت گھومتی ہوئی پھر اس کے سامنے سے گزرنے لگی۔ اس بار بھی اس عورت نے اسے دیکھا اور رک گئی۔ وہ بہت غور سے اکبر کو دیکھ رہی تھی۔ اس بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی تھی۔

پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ یہ بس ایک لمحے کی بات تھی۔

اکبر اب وہاں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے ایک نظر اس عورت پر ڈالی اور بنچ سے اٹھ گیا۔ گیٹ پر پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ عورت اب بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شام کو اکبر اپنے محلے کے ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

اس قسم کے محلوں میں اس قسم کے ہوٹل ہی تفریح کا ذریعہ ہوا کرتے ہیں جہاں ہر قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کی جاتی ہے۔ ملکی اور غیر ملکی حالات پر تبصرے ہوتے ہیں۔ دیگر معاملات بھی اسی قسم کے ہوٹلز میں طے ہوتے ہیں۔ دوست بھی ایک دوسرے سے ان ہی ہوٹلوں میں ملا کرتے ہیں۔

کچھ دیر بعد اکبر کا دوست اسلم آیا تو اس نے اسے ساری صورت حال بتا دی۔ اس نے کہا۔ ''تم شاید پاگل ہو گئے ہو۔ کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو...... اپنے آپ کو سنبھالو۔ اس قسم کی دولت مند عورتوں کے کھیل بہت اونچے ہوا کرتے ہیں۔''

''ہاں یار! سنا تو میں نے بھی ہے۔'' اکبر نے کہا۔

''بس تو پھر سن لے کہ کچھ ایسا ہی معاملہ تیرے ساتھ ہونے والا ہے۔ وہ عورت تجھے پھانس لینا چاہتی ہے۔

کیونکہ تو جوان بھی ہے اور خوبصورت بھی۔''

''یار! اس شہر میں مجھ جیسے تو بہت سے ہوں گے۔''

''ہیں تو لیکن تیرے جیسی مفلسی کسی کے چہرے پر نہیں لکھی ہوگی۔ تیرا چہرہ ہی بتا رہا ہے کہ تو ایک ضرورت مند انسان ہے۔ ایسی عورتیں تجھ جیسوں کی ہی تاک میں رہتی ہیں۔ تو اس کے لیے اچھا شکار ثابت ہوگا۔ اب تیری مرضی تو دوبارہ اس طرف جاتا ہے یا نہیں۔''

اکبر نے اپنے دوست سے تو کہہ دیا تھا کہ وہ دوبارہ اس طرف نہیں جائے گا لیکن اس کا دل کچھ اور کہہ رہا تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے بھی زندگی میں محرومیوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ اگر اس بہانے اس عورت سے فائدہ ہو جائے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ عورت اسے شادی کی آفر کرے گی اور وہ اس سے شادی کر کے اپنی زندگی بنا لے گا۔ بہت ہو چکی مفلسی۔

ایک ہفتے بعد وہ پھر اسی پارک میں پہنچ گیا جو اس کے گھر سے بہت دور تھا۔ جس جگہ اس کا باس رہتا تھا...... جس پارک میں اس نے اس شاندار عورت کو دیکھا تھا...... جو اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔

وہ ایک خالی بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جاگنگ کرنے والے جاگنگ کر رہے تھے۔ عورتیں واک کر رہی تھیں۔ گپ شپ کرتی ہوئی اس کی بنچ کے برابر سے گزر رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ پھر اس نے اس عورت کو دیکھ لیا۔

وہ پہلے کی طرح اپنی ملازمہ کے ساتھ تھی۔ ملازمہ نے اس کا سامان اٹھا رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ملازمہ پہلے کی طرح ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گئی جبکہ وہ عورت تنہا واک کرتی رہی۔ واک کرتے ہوئے وہ اس بنچ کے سامنے سے گزرنے لگی جس پر اکبر بیٹھا تھا۔

اکبر کو دیکھ کر وہ چونک اٹھی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی مہربان سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے کچھ سوچا پھر آگے بڑھ گئی۔ اکبر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ تیسرے چکر میں وہ اکبر کی بنچ کی طرف آگئی۔ اکبر بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کھڑے کیوں ہو گئے؟''

اکبر اسی طرح بوکھلا کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی اسی کے ساتھ بنچ پر بیٹھ گئی۔ ''کیا تم کہیں قریب میں رہتے ہو؟'' اس عورت نے پوچھا۔

''نہیں میڈم! میں یہاں سے بہت فاصلے پر رہتا ہوں۔ اس طرف میرے باس کی کوٹھی ہے۔ میں صبح ان کی طرف آتا ہوں... اور کچھ دیر کے لیے اس پارک میں آکر بیٹھ جاتا ہوں۔''

''نام کیا ہے تمہارا؟'' اس عورت نے پوچھا۔

''اکبر۔'' اکبر نے بتایا۔

''مجھے تو تم اکبر اعظم لگتے ہو۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

اکبر نے گردن جھکا لی۔ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر اس نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ ''اور ......اور آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام صفیہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا میں آپ کو میڈم صفیہ کہہ سکتا ہوں؟'' اکبر نے پوچھا۔

''چلو میڈم صفیہ کہہ لیا کرو۔''

اس دوران میں اس کی ملازمہ اس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ صفیہ کھڑی ہوگئی۔ ''اچھا میں چلتی ہوں۔ امید ہے تم دوبارہ اس طرف آؤ گے۔''

''ضرور میڈم۔'' اکبر بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ کہہ دیتا کہ میں تو اسی پارک میں اپنا ڈیرا ڈال لوں گا۔

وہ عورت چلی گئی۔ اکبر پھر اس کی دلکش چال میں الجھ کر رہ گیا۔

زندگی میں پہلی بار اسے ایسی کامیابی ملی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ ایک دولت مند عورت تھی۔ اس کا رکھ رکھاؤ یہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس بہت کچھ ہے۔ اس کی ملازمہ...... اس کا لباس...... یہ سب کچھ اس بات کی علامت تھا... کہ وہ اس دنیا کی نہیں ہے جس دنیا سے اکبر کا تعلق تھا۔ اکبر کی دنیا میں سوائے مفلسی، محرومیوں اور پریشانیوں کے اور تھا ہی کیا۔ وہاں کے بچے فاقہ زدہ تھے۔ وہاں کی لڑکیوں کے چہروں پر مایوسی لکھی ہوئی تھی۔ وہاں کی عورتیں سارا دن ایک دوسرے سے لڑتی رہتی تھیں۔ وہاں کے مرد فیکٹریوں میں کام کر کے اپنا خون پسینا ایک کرتے تھے۔ تب جا کر دو وقت کی روٹی ملتی تھی۔ جبکہ وہ عورت جس طبقے کی تھی، وہاں محرومی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

شام کو ہوٹل میں بیٹھ کر اس نے اپنے دوست اسلم کو بھی اس پروگریس کے بارے میں بتا دیا۔ اسلم بہت پُرجوش ہو گیا تھا۔ ''دیکھ لیا نا میں نے کیا کہا تھا۔ اس نے اپنا جال تیری طرف پھینک دیا ہے......''

''یار! کچھ بھی ہو۔ عورت ہے بہت زبردست اور بہت پیسے والی بھی ہے۔'' اکبر نے کہا۔ ''یار! میں تو سوچ رہا

ہوں کہ اس سے شادی کرلوں۔''
''اس چکر میں مت پڑ جانا۔'' اسلم نے سمجھایا۔
''ایک تو وہ تیرے اور میرے طبقے کی نہیں ہے۔ بہت فرق ہے۔ اس کی برادری کچھ اور ہے، تیری برادری کچھ اور ہے۔ ان لوگوں کے انداز کچھ اور ہوتے ہیں، ہم جیسوں کے کچھ اور...... اسی لیے شادی وادی کی بات بھی مت کرنا۔''
''تو پھر فائدہ کیسے اٹھاؤں؟'' اکبر نے پوچھا۔
''یار! زندگی بھر کا فائدہ مت سوچ۔'' اس نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔ ''بس جو کچھ ہو رہا ہے وہی کرتا رہ۔ اس سے پیسے سمیٹ اور نکل لے۔ ورنہ مصیبت کھڑی ہوجائے گی۔''
اکبر کی سمجھ میں آگیا تھا کہ اسلم کہنا کیا چاہتا تھا۔
ایک صبح وہ پھر اسی پارک میں پہنچ گیا۔ اس بار بھی اسے باس نے اپنے گھر بلایا تھا۔ اکبر کے لیے یہ بہت سنہری موقع تھا۔ وہ باس کو نمٹا کر اسی پارک میں پہنچ گیا۔ وہ عورت جس نے اپنا نام صفیہ بتایا تھا، وہیں موجود تھی۔ اس دن اس کی بائیک بھی اس کے پاس نہیں تھی۔ اس میں کچھ خرابی ہوگئی تھی۔
اکبر کو دیکھ کر وہ خود ہی اس کے پاس آگئی۔ اکبر نے سلام کیا۔
وہ اکبر کے ساتھ ہی بنچ پر بیٹھ گئی۔ ''کیا بات ہے، تم دو چار دنوں سے اس طرف نہیں آئے؟'' اس نے پوچھا۔
''جی ہاں۔ باس کا کوئی کام نہیں تھا۔ اسی لیے آنا نہیں ہوا۔'' اکبر نے بتایا۔
''تمہاری ایجوکیشن کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''میں گریجویٹ ہوں میڈم۔'' اکبر نے بتایا۔
''مینجمنٹ کا کام تو کرسکتے ہونا؟''
''کیوں نہیں میڈم۔ بہت محنت سے کرسکتا ہوں۔''
''تم نے گلوبل انٹر پرائز کا نام سنا ہے؟''
''یس میڈم! وہ بہت بڑی فرم ہے۔'' اکبر نے بتایا۔ ''ایک بار وہاں بھی جاب کی ٹرائی کر چکا ہوں لیکن کامیاب نہیں ہوا۔''
وہ مسکرا دی۔ ''کوئی بات نہیں، تم وہاں چلے جاؤ۔ تمہاری جاب ہوجائے گی... کیونکہ وہ میری ہی فرم ہے۔''
''آپ کی..... فر..... فرم ہے میڈم؟''
''اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ کیا میری فرم نہیں ہوسکتی؟''
''کیوں نہیں میڈم!'' وہ جلدی سے بولا۔
''تمہاری عمر کتنی ہوگی؟'' اس نے پوچھا۔
''اس مہینے کی سترہ تاریخ کو میں پورے پچیس سال کا ہوجاؤں گا۔'' اکبر نے بتایا۔
''اب سمجھی۔ یعنی سترہ تاریخ کو تمہاری سالگرہ ہوگی۔''
''ارے نہیں میڈم! کہاں کی سالگرہ اور کہاں کی برتھ ڈے۔ ہم غریبوں کی زندگی بس کسی طرح گزر ہی جائے تو بہت ہے۔ میں نے آج تک اپنی برتھ ڈے سیلیبریٹ نہیں کی۔'' اکبر نے پہلا جال پھینک دیا تھا۔
''چلو اس بار تمہاری برتھ ڈے ہماری طرف سے ہوگی۔'' اس نے کہا۔
''کیا؟'' اکبر حیران رہ گیا تھا۔ ''لیکن کیوں؟''
''اس لیے کہ ہم جس کو اپنا سمجھ لیتے ہیں اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرہی سکتے ہیں۔'' وہ مسکرا رہی تھی۔
اکبر نے دل ہی دل میں خود کو مبارک باد دی۔ اس کا خیال تھا کہ ان مرحلوں میں بہت دن لگ جائیں گے لیکن اس عورت نے خود ہی پہلا قدم بڑھا دیا تھا۔ اب کیا پریشانی تھی۔
جب یہ عورت اس کے ہاتھ میں آنے والی تھی تو اس کے ساتھ اس کی دولت کا کچھ حصہ تو اس کے پاس بھی آجاتا۔ اس کے علاوہ اس نے اکبر کو ایک بڑی فرم میں جاب بھی آفر کر دی تھی۔ وہ ایسی فرم تھی جس میں ہر کوئی کام کرنے کی خواہش کرتا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ اس فرم میں کام کرنے والوں کے پاس دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی بھی آجاتی ہے۔
''چلو میں تم کو اپنا گھر دکھا دوں۔'' اس نے کہا۔ ''سترہ تاریخ کو وہیں آنا ہے۔''
وہ اکبر کو پارک سے باہر لے آئی۔ چلتے ہوئے اس نے اکبر کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اکبر کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔
شاید اپنی طرف سے اسے کچھ کہنے یا کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس نے خود ہی پہل کر دی تھی۔ گیٹ سے باہر کالے رنگ کی ایک شاندار مرسڈیز کھڑی تھی... جس کے پاس باوردی ڈرائیور بھی موجود تھا۔ ڈرائیور نے اس عورت کو دیکھتے ہی کار کا دروازہ کھول دیا تھا۔
''بیٹھ جاؤ۔'' اس عورت نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔
اکبر ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ عورت نے پچھلی سیٹ سنبھال لی تھی۔ ڈرائیور نے اسے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ ہو۔ یہ عورت اس پارک سے پہلے بھی نہ جانے کتنوں کو اسی طور سے اپنے ساتھ لے جا چکی ہو۔
اسلم کی باتیں درست ہوتی جارہی تھیں۔

راستے میں خاموشی رہی۔ اکبر بھی چپ ہی رہا۔ اس کے پاس بولنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر سفر کے بعد گاڑی ایک شاندار سے مکان کے گیٹ پر آکر رک گئی۔ ہارن بجانے پر گارڈ نے جلدی سے گیٹ کھول دیا تھا۔ گاڑی اندر چلی گئی۔

عورت نے اکبر سے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

اکبر کچھ دیر کے لیے دنگ رہ گیا تھا۔ وہ مکان اس کے پاس کے مکان سے بھی زیادہ شاندار تھا اور اس کا ڈرائنگ روم بھی اسی مناسبت سے شاندار تھا۔ وہ اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اس عورت نے انٹرکام پر کسی کو آرڈر دیا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”ہاں اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔“ اس نے کہا۔

”کیا بتاؤں میڈم! بس کسی طرح زندگی گزر رہی ہے۔“

”تم کل گلوبل چلے جانا۔ تمہاری جاب ہو جائے گی۔ میں نے وہاں کہہ دیا ہے۔“

”آپ کا بہت شکریہ میڈم۔“

”ارے کس بات کا شکریہ۔ جو پیار کرے اس کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔ اور ہاں......“ اس نے صوفے پر رکھا ہوا بیگ اٹھا کر اس میں سے کچھ نوٹ نکال کر اکبر کی طرف بڑھا دیے۔

”یہ لو، یہ بیس ہزار ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اپنی برتھ ڈے پر تمہیں نئے سوٹ میں آنا ہے۔ تم ایک بدلے ہوئے انسان دکھائی دو گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”ج...... جی ہاں۔“ اکبر سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

”اب جاؤ۔ ڈرائیور تمہیں پہنچا دے گا۔“

اکبر ایک شاندار مرسیڈیز میں اپنے محلے میں واپس آیا تھا۔ اتفاق سے اسلم ہی نے اسے گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ لپک کر اکبر کے پاس آگیا۔ ”کیا ٹھاٹھ ہیں تیرے۔ یہ کس کی گاڑی ہے؟“

”چلو چل کر ہوٹل میں بیٹھتے ہیں۔“

ڈرائیور بہت ادب سے سلام کر کے واپس چلا گیا۔ اسلم حیران پریشان سا اس کے ساتھ چل پڑا۔ ”یار! اب تو تیرے ٹھاٹھ ہی الگ ہیں۔ کیا ہاتھ مارا ہے۔“

دونوں ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ اکبر نے نوٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھ...... ابے جب قسمت مہربان ہوتی ہے تو حالات یوں بدلتے ہیں۔“

”کیا اتنے روپے اسی نے دیے ہیں؟“ اسلم نے پوچھا۔

”ہاں یار! اور جانتے ہو کس لیے؟ تاکہ میں اچھے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ جولائی 2018ء کی جھلکیاں

غلام آقا

اسلام کی راہ میں سب سے زیادہ تشدد برداشت کرنے والے کی ایمان افروز داستانِ حیات

بابائے کراچی

اس نے کراچی کی ترقی کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ محسن کراچی کا تذکرہ

چارہ گر

گھر والوں کے منع کرنے پر بھی اس نے تعلیم عام کرنے کا بیڑا اٹھایا اور عالمی شہرت حاصل کی

منفرد نغمہ نگار

لازوال گیتوں کا خالق مگر جب وہ کسی محفل میں اپنے گیتوں کا تذکرہ کرتا تو لوگ اس کی عمر دیکھ کر کہتے، میاں جھوٹ نہ بولو

ماں صدقے

ماں اور بیوی میں کیا فرق ہوتا ہے، اس کی تشریح کرتی ایک دلچسپ سچ بیانی

اس کے علاوہ

بھی بہت سی معلوماتی تحریریں، سچے واقعات، سچی داستانیں، سچ بیانیاں

اچھے سوٹ بنوالوں۔'' اکبر نے بتایا۔'' ایک بات اور سن لو۔اس مہینے میری برتھ ڈے اسی کی کوٹھی میں ہوگی۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' اکبر نے ملاقات کی ساری کہانی اسے سنادی۔

اسلم گہری سانسیں لے کر رہ گیا۔'' جا بھائی! تیرا تو کام ہوگیا۔''

''ہاں یار۔'' اکبر ہنس پڑا۔'' ایک بات اور بتا دوں......اس نے میری جاب کا بندوبست اپنی ہی فرم میں کر دیا ہے۔ ملک کی بہت بڑی فرم ہے۔ میں خود ایک بار وہاں انٹرویو دے چکا ہوں۔''

''ہاں ۔پھر کیا مسئلہ ہے۔ سیاں بھئے کوتوال تو ڈر کا ہے کا۔''

اسلم سے باتیں کرنے کے بعد اکبر گھر آ گیا۔ گھر جاتے ہوئے اس نے اپنی ماں کے لیے بہت سے پھل بھی لے لیے تھے۔

دوسرے دن اس نے دفتر سے چھٹی کر لی۔ اسے سوٹ خریدنے تھے۔اس نے دوسوٹ، جوتے اور دو تین شرٹس لیں۔ایک اچھا سا پرفیوم لیا۔اس کے علاوہ اپنی ماں کے لیے ساڑی لی اُس کی دوائیں لیں۔اس کے پاس جتنے پیسے تھے، ان پیسوں میں وہ یہ سب کر سکتا تھا اور ابھی تو آغاز تھا۔اگر اس عورت کی مہربانیاں جاری رہتیں تو وارے نیارے ہوجاتے۔ بات صرف اتنی تھی کہ اسے بہت احتیاط سے چلنا تھا۔ اپنے آپ کو چھچھورا ثابت نہیں کرنا تھا۔ اگر محبت کا اظہار بھی کرنا تھا تو بہت سلیقے کے ساتھ۔

دوسری صبح اس نے اس پارک تک جانے کے لیے کرائے کی گاڑی منگوالی۔وہ اپنی بائیک پر نہیں جانا چاہتا تھا۔

اس نے اس صبح کے لیے سرمئی رنگ کے سوٹ کا انتخاب کیا تھا۔ یہ رنگ اس کی رنگت پر بہت سوٹ کرتا تھا۔ یہ سوٹ اس نے انہی پیسوں سے خریدا تھا جو پیسے اس عورت نے دیے تھے۔

وہ معمول کے مطابق واک کرنے کے لیے پارک میں موجود تھی۔ اکبر جب اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تو وہ حیرت سے اکبر کو دیکھتی رہ گئی۔

''کیسا لگ رہا ہوں میں؟'' اکبر نے مسکرا کر پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کے جذبات تھے۔اس نے صرف اتنا کہا۔''چلو میرے ساتھ۔''

وہ اکبر کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئی۔ اسی شاندار گھر میں جہاں اکبر پہلے بھی آ چکا تھا۔ اس نے اکبر کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا۔'' تم بیٹھو، میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک باکس تھا۔''یہ دیکھو۔''

اس نے باکس کھول کر دکھایا۔اس باکس میں ایک ایسی چیز تھی جو اکبر کے لیے انجانی نہیں تھی۔ وہ ایک امام ضامن تھا۔ اس کی ماں بھی اسے اس وقت باندھا کرتی تھی جب اس کا باس اسے دفتر کے کام سے شہر سے باہر بھیجا کرتا تھا۔

اس عورت نے بولنا شروع کیا۔ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ اس میں درد گھلا ہوا تھا۔'' میرے بیٹے کو اکثر کاروباری سلسلے میں بیرونِ ملک جانا ہوتا تھا۔''

''آپ کا بیٹا؟''

''ہاں۔'' اب اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔'' وہ اکثر باہر جایا کرتا تھا۔ میں اسے امام ضامن باندھا کرتی تھی۔ میں اس کے لیے امام ضامن ہر وقت تیار رکھتی تھی۔ نہ جانے کس وقت اسے جانا پڑ جائے۔ بس یہ آخری امام ضامن اسے باندھ نہیں سکی کیونکہ اس سے پہلے ہی ایک سفر میں اس کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ مر گیا۔''

''کیا؟'' اکبر کو جیسے شاک سا لگا تھا۔

''ہاں۔ وہ مر گیا اور یہ امام ضامن رکھا رہ گیا۔ اس دن جب میں نے تمہیں پارک میں دیکھا تو ایسا لگا کہ میرا بیٹا واپس آ گیا ہو۔ بالکل ویسا ہی انداز......وہی خدوخال اور وہی عمر، تم ہوبہو میرے بیٹے کی طرح ہو......تمہیں دیکھ کر میرے دل پر کیا گزر رہی ہوگی اس کا تم یا کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ میں تمہیں دیکھتی رہی پھر خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔میری مامتا مجھے تمہارے پاس لے گئی۔''

وہ رونے لگی تھی۔ اکبر سناٹے میں تھا۔

''بیٹا! میں نے جو کچھ تمہارے لیے کیا ہے یا کروں گی، وہ کسی اور کے نہیں اپنے بیٹے کے لیے کروں گی۔ بیٹا اب یہ امام ضامن تمہیں باندھ رہی ہوں کیونکہ تم بھی سفر کرتے رہتے ہو۔''

وہ رو رہی تھی۔ اکبر لرز رہا تھا۔ اس نے بھی رونا شروع کر دیا۔ دل ہی دل میں اپنے خیالات پر خود کو ملامت کر رہا تھا۔

ایک ماں نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو امام ضامن باندھ دیا تھا۔

یشوع بن نون بستیوں میں گئے اور اپنی قوم کو بتایا کہ عمالیقی ہمارے سروں پر آ گئے ہیں۔ اگر اس وقت ان سے مقابلہ نہیں کیا تو وہ ہم پر چھا جائیں گے۔

وہ لوگ ڈرے کہ ہم کس طرح مقابلہ کریں گے۔

''ہمارے پاس ہتھیار تو ہیں لیکن عمالیقی وحشی قوم ہے اور ہم ان سے کیسے لڑ سکتے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہم مصر کو واپس چلے

حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا... یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا... ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سر فہرست ہے... حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارے دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بنا کر اشارہ دے دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے... جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی ''اس کو دودھ پلا... پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔'' سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

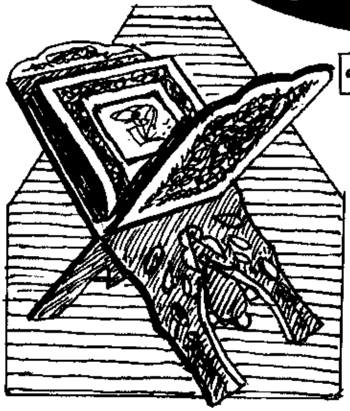

ساتواں حصہ

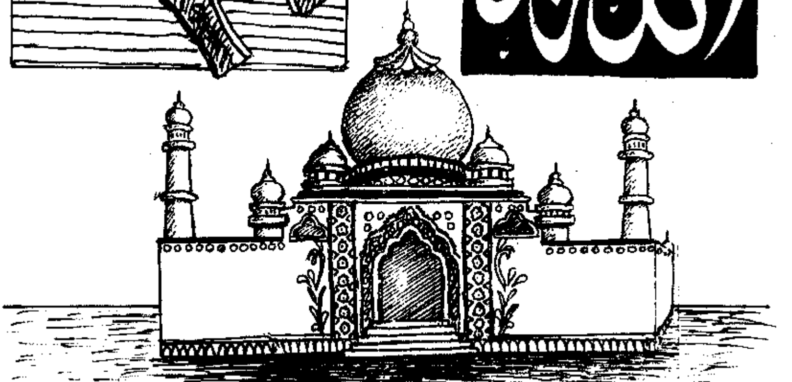

جائیں۔ اب وہاں فرعون تو رہا نہیں جو ہم پر ظلم کرتا تھا۔ ہم اپنے گھروں میں آباد ہو جائیں گے۔ یہاں بیابانوں میں بھٹکتے رہے تو ہر قوم اسی طرح ہم پر حملہ آور ہوتی رہے گی۔ ہم کس کس سے لڑیں گے۔''

''اے میری قوم کے لوگو! خدا کی ذات سے مایوس کیوں ہوتے ہو۔ اس نے ہماری مدد ہمیشہ کی ہے۔ اس جنگ میں بھی فتح ہماری ہوگی۔''

''موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اس جنگ میں ہمارے ساتھ کیوں نہیں؟ انہوں نے تمہیں کیوں بھیجا ہے؟''

''وہ پہاڑ پر اپنے رب سے دعا کرنے گئے ہیں۔ جب تک ہم عمالیقیوں پر غالب نہیں آجاتے اس وقت تک وہ خدا کے ذریعے ہماری مدد کرتے رہیں گے۔''

''کہیں وہ ہمیں چھوڑ کر چلے تو نہیں گئے؟''

''تم عمالیقیوں سے لڑتے ہوئے خود دیکھ لوگے کہ وہ موجود ہیں یا نہیں۔''

بنی اسرائیل تو یہی چاہتے تھے کہ باتوں میں اتنا وقت گزر جائے کہ جنگ ٹل جائے جبکہ یوشع بن نون کو جلدی تھی۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح انہوں نے بنی اسرائیل کے تن مردہ میں جان ڈال دی اور انہیں آمادۂ جنگ کر کے آگے بڑھے تاکہ عمالیقیوں کو آگے بڑھنے سے روکیں۔ وہ بوڑھوں کو پیچھے چھوڑ کر جوانوں کو آگے لے کر بڑھے۔ اس وقت تک بنی اسرائیل کا ایک قبیلہ عمالیقیوں کو روکے کھڑا تھا مگر پھر بھی ان کا بہت کچھ نقصان ہو چکا تھا۔ یہ تازہ کمک پہنچی تو عمالیقیوں نے بھی نئے جوش کے ساتھ حملہ کیا۔

عمالیقی صحرائی جنگ لڑنے کے ماہر تھے۔ دوسری طرف بنی اسرائیل راستوں سے ناواقف، کمزور اور بے ہمت۔ سر پر آپڑی تھی، بہادری سے لڑ رہے تھے لیکن پھر بھی عمالیقی غالب آنے لگے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ بلند کیا تو اچانک عمالیقیوں پر ایسا خوف طاری ہوا کہ بنی اسرائیل غالب آنے لگے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ نیچے کرلیا۔ عمالیقی پھر غالب آگئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ پھر بلند کیا۔ اسرائیلی پھر غالب آنے لگے۔ اب حال یہ ہوا کہ جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام ہاتھ اٹھائے رہتے بنی اسرائیل غالب رہتے اور جب ہاتھ لٹکا دیتے تو عمالیقی غالب آجاتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کب تک ہاتھ اٹھائے رہتے۔ اوپر کیے کیے ان کا ہاتھ تھک گیا اور اوپر رکھنا ممکن نہ رہا۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے جو ان کے ساتھ ہی پہاڑ کی چوٹی پر موجود تھے، ایک پتھر رکھ دیا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام بیٹھ گئے پھر حضرت ہارون علیہ السلام ان کا ہاتھ سنبھالے رہے۔

میدان میں تلواریں چل رہی تھیں۔ کئی عمالیقی موت کی نیند سو گئے تھے۔ بنی اسرائیل انہیں برابر پیچھے دھکیلتے جا رہے تھے لیکن یہ جب تک تھا جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ بلند تھا۔ حضرت ہارون علیہ السلام ان کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور دعا کر رہے تھے کہ کہیں وہ بھی نہ تھک جائیں کیونکہ یہ ہاتھ لٹکا تو بنی اسرائیل کو شکست ہو جائے گی۔

غروبِ آفتاب تک وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کو سنبھالے رہے۔ بالآخر بھاری جانی نقصان اٹھانے کے بعد عمالیقی شکست سے دوچار ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

بنی اسرائیل کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کسی جنگ میں فتح یاب بھی ہو سکتے ہیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ان کا کھویا ہوا اعتماد پھر سے بحال ہو گیا۔

خدا کا حکم آیا کہ یوشع کو میرا عہد سنا دے کہ میں عمالیق کا نام و نشان دنیا سے بالکل ہی مٹا دوں گا۔ یہ میری قسم ہے کہ عمالیقیوں سے نسل در نسل جنگ کرتا رہوں گا۔

خدا کا یہ عہد آئندہ زمانوں میں پورا ہوا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے انہیں یہاں تک گھٹا دیا کہ وہ نہ ہونے کے برابر رہ گئے اور بنی شمعون نے ان باقی عمالیقیوں کو جو بچ رہے تھے، قتل کیا۔

آثارِ قدیمہ نے ابھی تک ان کے متعلق کوئی شہادت پیش نہیں کی۔

اہلِ کتاب کے نزدیک یہ قصہ بھی مروی ہے کہ مدین شہر کے کاہن — جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر تھے (مسلمان علماء کی اکثریت نے ان کا نام حضرت شعیب بتایا ہے اور یہ کاہن نہیں نبی تھے) یہ سن کر کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے مقابلے میں فتح حاصل ہوئی ہے تو وہ ان کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زوجہ اور دونوں بیٹے بھی تھے

جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قیام مصر کے دوران میکے بھیج دی گئی تھیں۔

اہلِ کتاب لکھتے ہیں۔ ''اور موسیٰ کا خسر اس کے بیٹوں اور بیوی کو لے کر بیابان میں آیا اور موسیٰ سے کہا میں تیرا خسر تیری بیوی اور دونوں بیٹوں کو لے کر آیا ہوں۔ تب موسیٰ .... اپنے خسر سے ملنے کو باہر نکلا اور کورنش بجالا کر اسے چوما اور وہ ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھتے ہوئے خیمے میں آئے اور موسیٰ نے اپنے خسر کو بتایا کہ خداوند نے اسرائیلیوں کی خاطر فرعون کے ساتھ کیا کیا اور ان لوگوں پر راستے میں کیا کیا مصیبتیں پڑیں اور خداوند ان کو کس کس طرح بچاتا آیا۔

''اور موسیٰ کے خسر نے سوختنی قربانی اور ذبیحے چڑھائے اور ہارون اور اسرائیل کے سب بزرگ موسیٰ کے خسر کے ساتھ کھانا کھانے آئے۔''

اہلِ کتاب ہی کے مطابق جب ان کے خسر نے یہ دیکھا کہ جھگڑوں کے نمٹاتے وقت بنی اسرائیل سب ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں اور تمام فیصلے انہی کو نمٹانے پڑتے ہیں تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مشورہ دیا کہ آپ کچھ افراد جو امانت دار اور متقی ہوں ان کو منتخب کریں جو رشوت اور خیانت سے نفرت کرتے ہوں اور ان کو ہزار ہزار اور سو سو اور پچاس پچاس اور دس دس آدمیوں پر حاکم بنا دیں کہ وہ ہر وقت لوگوں کا انصاف کیا کریں۔ آپ کے پاس صرف بڑے مقدمے آیا کریں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا فیصلہ وہ خود ہی کر دیا کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مشورے کو پسند کیا اور ایسے اشخاص منتخب کر کے انہیں قاضی بنا دیا لہٰذا یہ قاضی فیصلے کرنے لگے۔ کوئی مشکل مسئلہ ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ جاتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی منزل سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے خسر رفیدیم سے رخصت ہو کر مدین چلے گئے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ میرے پاس سینا کے میدان میں آ جا اور وہیں پہاڑ کے نیچے ڈیرے ڈال دے۔ اسے میدان ''تیہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

انہوں نے قوم کو حکم دیا کہ چلنے کی تیاری کریں۔ اب ہم رفیدیم سے نکلیں گے۔ بنی اسرائیل ایک مرتبہ پھر پریشان ہوئے کہ اب نہ جانے کہاں جانا ہو۔ کیا ہمیں یونہی زندگی بھر بیابانوں میں گھومنا پڑے گا۔ وہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ انہیں یہیں رہنے دیا جائے۔ یہاں جس حال میں بھی ہیں۔ اب ہم کوئی فرمائش نہیں کریں گے۔

''تم اللہ کی محبوب امت ہو۔ یہ جگہ تمہارے لائق نہیں۔ آگے چلو اور بہت سی نعمتیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔''

بنی اسرائیل خاموش تو ہو گئے لیکن دل میں ایک آرزو سی موجزن رہنے لگی کہ دیکھیں موسیٰ جن نعمتوں کا ذکر کر رہے ہیں وہ کیا ہوتی ہیں۔

چھ لاکھ سے زیادہ لوگوں پر مشتمل یہ قافلہ رفیدیم کے بیابان سے نکلا۔ حسرت سے ان چشموں کی طرف دیکھتا جاتا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے نکالے تھے۔ کیا اس نعمت سے بڑھ کر بھی کوئی نعمت ہے جو موسیٰ ہمیں دینے والا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مصر سے لے کر سینا تک اصنام پرستی کی جا رہی تھی۔ ان اسرائیلیوں نے جب راہ میں بت کدے دیکھے اور دیکھا کہ بت رکھے ہوئے ہیں اور پجاری ان بتوں پر جھکے پڑتے ہیں تو ان میں سے بہت سوں کو مصر یاد آ گیا۔

اگرچہ بنی اسرائیل نبیوں کی اولاد تھے اور ابھی تک ان میں وہ اثرات ایک حد تک باقی بھی تھے جو ان کو باپ دادا سے ورثے میں ملے تھے تاہم صدیوں سے مصری بت پرستوں میں بود و ماند کرنے اور ان کے حاکمانہ اقتدار میں غلام رہنے کی وجہ سے ان میں صنم پرستی کا جذبہ سرایت کر چکا تھا۔ اب جو صنم کدوں میں پجاریوں کو دیکھا تو یہ جذبہ ابھر کر سامنے آ گیا۔

بہت سے غیر بنی اسرائیل بھی تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغام سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ چلے آئے تھے۔ انہوں نے اسرائیلیوں کے ایک گروہ کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔

''مصر چھوڑنے میں ایک برائی تو ہمارے ساتھ یہ ہوئی ہے کہ ہمارے بت ہم سے چھن گئے جن کے آگے ہم منتیں مانتے تھے اور ہماری منتیں پوری ہوتی تھیں۔ اس بیابان میں کوئی دیوتا ہمارے ساتھ نہیں۔ ہم تو بالکل اکیلے رہ گئے ہیں۔ موسیٰ کا خدا بھی عجیب ہے۔ نہ وہ نظر آتا ہے، نہ ہم اسے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ بت ہمارے سامنے ہوتے تھے تو ہمیں احساس تو رہتا تھا کہ ہمارے سامنے کوئی ہے۔''

ان غیر بنی اسرائیلیوں نے جب اس طرح کی باتیں کیں تو بنی اسرائیل میں سے بھی ایک بڑی تعداد کے دل میں بھی جذبۂ صنم پرستی نے سر ابھارا۔

''چلو موسیٰ کے پاس چلتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں ہمارے لیے ''بت'' بنادیں۔ اگر ہم میں شامل مصریوں نے اپنے بت بنالیے اور ان کی پرستش شروع کردی تو ہم بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔ ہم موسیٰ سے کہیں گے کہ اگر وہ دیوتاؤں کے خلاف ہے تو اپنے خدا کا ہی بت بنادے۔ ہم دیکھیں تو سہی اس کا خدا کیسا ہے۔ ہم تو بنا دیکھے ہی اس کے خدا پر ایمان لے آئے۔''

مصر میں صدیوں تک ایک بت پرست قوم کے درمیان رہنے کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ وہ ایسا بے ہودہ مطالبہ لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گئے اور ان سے یہ مطالبہ کرڈالا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی زبانی یہ مشرکانہ مطالبہ سنا تو ان کی اس ذہنی پستی پر سخت برہم ہوئے۔ جن آفتوں سے بچا کر وہ اپنی قوم کو یہاں تک لائے تھے، یہ آفتیں ان کے ساتھ لگی چلی آئی تھیں۔

''بدبختو! خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر بتوں کی پوجا پر مائل ہوا اور خدا کی نعمتوں کو فراموش کربیٹھے۔ تم ان باپ دادا کی اولاد میں سے ہو جو پیغمبروں میں سے تھے۔ جو خدائے واحد کی پرستش کرتے تھے اور تم کہتے ہو میں تمہارے لیے معبودوں کے بت بنادوں۔ تم یہ مطالبہ مجھ سے کررہے ہو جس نے فرعون کے گھر میں رہتے ہوئے فرعون کو سجدہ نہیں کیا۔ خدا نے تمہیں نجات کا رستہ دکھایا اور تم پھر اسی طرف جارہے ہو۔ اس مطالبے سے باز آؤ اور خدا کے غضب کو دعوت مت دو۔ خدا جس سے ناراض ہوتا ہے، اسے ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔''

پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر ان کا گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے۔ ''اے موسیٰ ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنادے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں۔ موسیٰ نے کہا..... تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ یہ لوگ جس طریقے کی پیروی کررہے ہیں وہ تو برباد ہونے والا ہے اور جو عمل وہ کررہے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔'' پھر موسیٰ نے کہا۔ ''کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لیے تلاش کروں حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت دی اور وہ وقت یاد کرو (اللہ فرماتا ہے) جب ہم نے فرعون والوں سے تمہیں نجات دی جن کا حال یہ تھا کہ تمہیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔'' (سورۃ اعراف)

مصر سے نکلے ہوئے انہیں تین مہینے ہوئے تھے جب وہ جبل سینا کے نیچے پہنچے اور ڈیرے لگالیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، اللہ کے حکم سے پہاڑ پر چڑھے اور اللہ سے ہم کلام ہوئے۔ اللہ نے انہیں پہاڑ پر سے پکارا اور کہا۔

''تو بنی اسرائیل سے میرے احسانات کا ذکر کردے۔ انہیں بتا کہ میں نے مصریوں سے کیا کیا اور تمہیں گویا عقاب کے پروں پر بٹھا کر اپنے پاس لے آیا۔ اگر تم میری بات مانو اور میرے عہد پر چلو تو سب قوموں میں سے تم میری خاص ملکیت ٹھہرو گے کیونکہ ساری زمین میری ہے۔ تم میرے لیے کاہنوں کی ایک مملکت اور ایک مقدس قوم ہوگے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ سے اترے اور اپنی قوم کے بزرگوں کو جمع کرکے یہ خوش خبری سنادی کہ اللہ تمہیں ایک مقدس قوم بنانے والا ہے اگر تم اس کے احسانات کو مانو اور اس کے احکام پر چلنے کا وعدہ کرو۔

قوم کے لیے یہ باتیں نئی نہیں تھیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ وہ یہ سب باتیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے چلے آئے تھے۔ غرقِ فرعون کی بات تو ابھی کل کی بات تھی۔ انہوں نے اللہ کے احسانات کو تسلیم کیا اور عہد کیا کہ ہم اللہ کے حکم پر چلیں گے اور وہ سب کریں گے جو اس نے ہم سے کہا ہے تاکہ ہم مقدس قوم کہلائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مرتبہ پھر جبل سینا پر گئے اور قوم کے جواب سے خدا کو آگاہ کردیا۔

''میری قوم تیرے احکام پر چلنے کا وعدہ کررہی ہے۔ اگر یہ اپنے کہے پر عمل کرتی ہے تو اسے تو اپنے وعدے کے مطابق مقدس قوم بنادے۔''

تب کالے بادلوں سے اللہ کی آواز آئی۔ ''اب تو اپنے لوگوں کے پاس جا اور آج اور کل ان کو پاک کر اور انہیں حکم دے کہ اپنے کپڑے دھولیں اور پاکیزگی اختیار کریں اور تیسرے دن تیار رہیں کیونکہ خداوند تیسرے دن سب لوگوں کے دیکھتے دیکھتے کوہ سینا پر اترے گا اور تو چاروں طرف حد باندھ کر ان سے کہہ دینا کہ کوئی اس پہاڑ پر نہ چڑھے اور نہ اس سے لگ کر چلے۔ جو کوئی اس پہاڑ کو چھونے کا ضرور مارڈالا جائے گا۔ کوئی جانور بھی اس کے قریب نہ آئے۔ آیا تو وہ بھی مارا جائے گا اور جب نرسنگا (سینگ کو بانسری کی طرح بنا کر بجاتے تھے) دیر تک پھونکا جائے تو وہ سب پہاڑ کے پاس آجائیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ پیغام بھی پہنچا دیا۔ بنی اسرائیل نے یہ سن کر فرماں برداری کی۔ غسل کیا، نئی پوشاکیں پہنیں۔ یہ پاکیزگی تین دن تک اختیار کیے رکھی۔

جب تیسرے دن کی صبح نمودار ہوئی تو آسمان پر گہرے بادل چھا گئے۔ یہ بادل بڑی زور سے گرجے اور بجلی چمکنے لگی۔ قرنا کی آواز گونجنے لگی۔ بنی اسرائیل اپنے ڈیروں میں تھے، خوف سے کانپنے لگے۔ خیمہ گاہوں سے نکلے اور پہاڑ کی طرف لپکے لیکن پہاڑ سے کچھ دور آ کر رک گئے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے ایک حد مقرر کر دی تھی۔ گہرے بادلوں نے کوہِ سینا کو اوپر سے نیچے تک اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر پہاڑ پر ایک زلزلہ سا طاری ہوا۔ پہاڑ ہلنے لگا۔ یہ ایسا خوفناک منظر تھا کہ بنی اسرائیل کھڑے کھڑے کانپ رہے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا کے حکم سے اوپر چڑھے اور لوگوں کو تاکید کرتے گئے کہ وہ ہرگز پہاڑ کے قریب نہ آئیں ورنہ ہلاک کر دیے جائیں گے۔ پہاڑ پر لرزہ طاری تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام قدم بہ قدم اوپر چڑھتے جا رہے تھے۔ اوپر پہنچنے کے بعد گہرے سیاہ بادلوں سے اللہ نے ان کو پکارا۔

اللہ عزوجل ان سے راز و نیاز فرما رہا تھا اور کلیم کے لقب کا مستحق فرما رہا تھا۔

اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا اور دس باتوں کی نصیحت فرمائی کہ جا اور قوم کو یہ باتیں پہنچا دے۔ اس وقت حضرت ہارون علیہ السلام بھی ان کے ساتھ تھے جنہوں نے یہ باتیں سنیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب نیچے آئے تو پوری قوم پکار اٹھی۔

''ہمیں یقین ہو گیا کہ آپ پروردگار عزوجل کی طرف سے پیغمبر ہیں۔ پس ہم خوف کرتے ہیں کہ کہیں مر نہ جائیں۔''

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کی کہی ہوئی یہ دس باتیں قوم کے سپرد کر دیں۔

''اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرنا اور غیر معبودوں کو نہ ماننا۔ کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔ اللہ کے نام کی جھوٹی قسم کھانے سے رکنا۔ شنبہ (ہفتہ) کے دن کی حفاظت کرنا یعنی پورے ہفتے میں عبادت کے لیے یہ ایک دن خاص رکھنا اور اس میں کام کاج سے چھٹی کرنا اور عبادت کرنا۔ اپنے والدین کا اکرام کرنا کہ تیری عمر زمین میں دراز ہو۔ تمہارے ہاں جو اولاد پیدا ہو اس کو قتل نہ کرنا، زنا نہ کرنا، چوری نہ کرنا۔ اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا۔ اپنے پڑوسی کی طرف التفات مت کرنا اور نہ اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے کی طرف خواہش کرنا۔''

سب لوگ جو نہایت ڈرے ہوئے تھے، ان احکام پر عمل کرنے پر بضد ہوئے۔ سب نے یک زبان ہو کر اقرار کیا کہ وہ ان باتوں پر ہمیشہ عمل کرتے رہیں گے تاکہ ان کی زندگیاں پاکیزہ ہوں۔

''اے موسیٰ! تو ہی ہم سے باتیں کر لیا کر اور ہم سن لیا کریں گے۔ خدا ہم سے باتیں نہ کرے۔ اس کا جلال ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ یہ نہ ہو کہ ہم خوف سے مر جائیں۔''

''دیکھو، خدا نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ کالے بادلوں میں میرے پاس آئے گا اور مجھ سے باتیں کرے گا۔ تم خوف مت کرو۔ وہ تمہارے امتحان کے لیے تمہارے پاس آئے گا اور تم سے باتیں کرے گا تاکہ تم کو اس کا خوف ہو اور تم گناہ نہ کرو۔''

ایک دن ایسا ہوا کہ کالا بادل سینا کے نزدیک طاری ہوا۔ سب لوگ مارے خوف کے بادل کے قریب گئے اور اپنے رب سے ہم کلام ہوئے۔ جب آپ واپس آئے تو بنی اسرائیل جوق در جوق آپ کے گرد جمع ہو گئے اور اصرار کرنے لگے کہ اللہ نے جو کچھ ہمارے بارے میں کہا ہے وہ بتائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ ''تم نہ آتے تو میں تمہیں بلانے ہی والا تھا تاکہ جو کچھ مجھ سے کہا گیا ہے، وہ میں تم تک پہنچا دوں۔ خداوند نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے کہہ دوں کہ تم نے خود دیکھا کہ میں نے آسمان سے تمہارے ساتھ باتیں کیں۔ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور چاندی سونے کے دیوتا اپنے لیے نہ گھڑ لینا۔ مٹی کی ایک قربان گاہ میرے لیے بنایا کرنا اور اس پر اپنی بھیڑ بکریوں اور گائے بیلوں کی سوختنی قربانیاں اور سلامتی کی قربانیاں چڑھانا اور جہاں جہاں میں اپنے نام کی یادگاری کرواؤں گا، وہاں میں تیرے پاس آ کر تجھے برکت دوں گا اور اگر تو میرے لیے پتھر کی قربان گاہ بنائے تو تراشے ہوئے پتھر سے نہ بنانا کیونکہ اگر اس پر تو اپنے اوزار لگائے تو تو اسے ناپاک کر دے گا۔ تو میری قربان گاہ پر سیڑھیوں سے ہرگز نہ چڑھنا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ''یہ احکام جیسے جیسے آئیں گے، میں تمہیں پہنچاتا رہوں گا۔''
''ہاں تو ہی ہمیں سنانا۔ ہمیں خدا سے بہت ڈر لگتا ہے۔''
''کاش تم ڈرنے والے بن جاؤ۔''
بنی اسرائیل بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ خدا، موسیٰ کو احکام دے اور وہ ہم تک پہنچائیں تاکہ ہم ان پر عمل کریں اور مقدس قوموں میں ہمارا شمار ہو۔

پھر ایک دن کالے بادلوں نے صحرا کے ایک حصے کو گھیر لیا۔ پہاڑ آگ سے دہکنے لگا اور دھواں اٹھتا دکھائی دینے لگا۔ بنی اسرائیل پہاڑ سے دور ہو گئے۔ جان لیا کہ احکام آئے ہیں جنہیں سننے کے لیے موسیٰ کو بلایا جا رہا ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے بادلوں کے دھوئیں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس دھوئیں میں گم ہو گئے۔ یہ ایسا تقدس مآب سماں تھا کہ لوگوں کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ یوشع بن نون، کالب بن یوفنہ اور کئی دوسرے صالح نوجوان جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت قریب تھے سجدے میں گرے ہوئے تھے اور دعائیں کر رہے تھے۔

''اے رب العالمین تو ہمارے لیے وہ احکام جاری کرنا جو ہمارے لیے آسانی پیدا کریں۔ ہم سے وہ کام ہرگز نہ لیجیو جو ہماری طاقت سے باہر ہو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب واپس آئے تو خیمۂ اجتماع کے سامنے بنی اسرائیل جمع ہو چکے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ انہیں خدا کے احکام سے آگاہ کیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ باہر آئے اور قوم سے خطاب کیا۔
''لوگو! تم نے پہاڑ پر آگ جلتے دیکھی؟ گہرے بادلوں کا سائبان دیکھا؟ اللہ نے ان بادلوں میں سے مجھ سے کلام کیا۔ اگر تم ڈر نہ گئے ہوتے اور مجھ سے یہ نہ کہہ دیا ہوتا کہ تو ہی ہم سے باتیں کر لیا کر نا لیکن خدا ہم سے باتیں نہ کرے تو وہ آواز تم بھی سنتے جو میں نے سنی۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہیں آئین اور احکام سناؤں تاکہ تم ان پر عمل کرو اور خدا جو ملک تمہیں دینے والا ہے اس میں داخل ہو جاؤ مگر فی الحال ہمیں یہیں رہنا ہے۔ خدا تمہیں امتحان میں ڈالے گا کہ تم اس کے کہے پر عمل کرتے ہو یا اپنی عقلیں دوڑاتے ہو۔ فرماں برداری کرتے ہو یا سرکشی اختیار کرتے ہو۔ میں تمہیں احکامِ خداوندی دے رہا ہوں۔ تم ان پر عمل کرو اور دوسری قوموں کے لیے مثال بن جاؤ۔ یہ کچھ احکام ہیں انہیں غور سے سن لو۔ اس کے بعد دوسرے احکام بھی آتے رہیں گے۔

سب سے پہلے مجھے غلاموں کے بارے میں بتایا گیا۔
''اگر غلام عبرانی ہے تو اس کی مدتِ خدمت صرف چھ سال ہوگی۔ ساتویں برس مفت آزاد ہو کر چلا جائے گا۔ وہ اکیلا آیا تھا تو اکیلا ہی جائے گا لیکن اگر بیوی کے ساتھ آیا تھا تو بیوی کو بھی اس کے ساتھ جانے دینا۔ اگر اس کی شادی دورِ غلامی میں اس کے مالک نے کرائی تھی تو وہ بیوی کو ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ اگر وہ بیوی کے بغیر جانا نہیں چاہتا تو آقا اس کا کان چھید دے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اپنی مرضی سے زندگی بھر کے لیے غلامی اختیار کر لی۔''

تشدد آمیز سلوک کے بارے میں ان باتوں پر عمل کرنا۔
''اگر کوئی کسی آدمی کو ایسا مارے کہ وہ مر جائے تو قاتل کو بھی مارا جائے۔ اگر دو شخص جھگڑیں اور ایک دوسرے کو پتھر ماریں اور وہ مرے تو نہیں، صرف زخمی ہو اور پھر اس کے زخم ٹھیک ہو جائیں اور وہ چلنے پھرنے لگے تو جس نے مارا تھا، وہ بری ہو جائے گا۔ اس کی سزا یہ ہوگی کہ وہ اس کا ہرجانہ بھر دے اور اس کا علاج کرائے۔

''اگر کوئی اپنے غلام یا لونڈی کو جان سے مار دے تو اسے ضرور سزا دی جائے لیکن اگر وہ ایک دو دن جیتا رہے تو آقا کو سزا نہ دی جائے۔ اس لیے کہ وہ غلام اس کا مال ہے۔

''اگر کسی حاملہ کو ایسی چوٹ پہنچے کہ اسے اسقاط ہو جائے تو اس کا شوہر جتنا جرمانہ تجویز کرے بھر دیا جائے۔ اگر اسقاط کے ساتھ کوئی اور بھی نقصان ہوا ہو تو آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، جلانے کے بدلے جلانا، زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ۔

''اگر کوئی اپنے غلام کی آنکھ پھوڑ دے تو آنکھ کے بدلے اسے آزاد کرنا ہوگا۔ اگر دانت توڑ دے تو دانت کے بدلے آزاد کرنا ہوگا۔

''اگر بیل کسی کو سینگ مارے اور وہ مرجائے تو بیل کو سنگسار کیا جائے اور اس کا گوشت نہ کھایا جائے۔ اگر بیل کو سینگ مارنے کی عادت تھی اس کے باوجود مالک نے اسے کھلا چھوڑ دیا تھا تو بیل کے ساتھ اس کے مالک کو بھی سنگسار کیا جائے یا فدیہ مانگا جائے تو فدیہ دے کر اپنی جان بچالے لیکن بیل سنگسار ہوگا۔

''اگر کوئی آدمی گڑھا کھولے اور اس کا منہ بند نہ کرے اور کوئی بیل یا گدھا اس میں گر جائے تو گڑھے کا مالک اس کا نقصان بھرے۔

''اگر کسی کا بیل دوسرے کے بیل کو ایسی چوٹ مارے کہ وہ مرجائے تو وہ جیتے بیل کو بیچیں اور اس کا دام آدھا آدھا آپس میں بانٹ لیں اور اگر معلوم ہوجائے کہ اس بیل کی پہلے سے سینگ مارنے کی عادت تھی اور اس کے مالک نے اسے باندھ کر نہیں رکھا تو اسے قطعی بیل کے بدلے بیل دینا ہوگا اور مرا ہوا جانور اس کا ہوگا۔

''اگر کوئی آدمی بیل یا بھیڑ چرالے اور اسے ذبح کردے یا بیچ دے تو وہ ایک بیل کے بدلے پانچ بیل اور ایک بھیڑ کے بدلے چار بھیڑیں دے۔

''اگر کوئی اپنے ہمسائے کے پاس گدھا، بیل یا بھیڑ یا کوئی اور جانور امانت رکھے اور وہ بغیر کسی کے دیکھے مرجائے یا چوٹ کھائے تو ان دونوں کے درمیان خداوند کی قسم ہو کہ اس نے اپنے ہمسائے کے مال کو ہاتھ نہیں لگایا اور مالک اسے سچ مانے لیکن اگر جانور اس کے پاس سے چوری ہوجائے تو وہ اس کا معاوضہ دے۔ اگر کوئی شخص اپنے ہمسائے سے کوئی جانور مستعار لے اور وہ زخمی ہوجائے یا مرجائے تو وہ ضرور اس کا معاوضہ اس کے مالک کو دے۔''

خداوند نے مجھے ایک ملاقات میں اخلاقی اور مذہبی قوانین سے بھی آگاہ کیا ہے۔ وہ بھی سن لو اور اس پر عمل کرو۔

''مسافروں کو مت ستانا اور نہ ان پر ظلم کرنا۔ اس لیے کہ تم خود بھی ملک مصر میں مسافر تھے۔ ان سے... نفرت نہ کرنا۔ کسی کو قرض دو تو اس سے سود نہ لینا۔ کسی ہمسائے کے کپڑے اگر گروی رکھو تو اسے سورج ڈوبنے تک واپس کردینا۔ جو اپنے باپ یا ماں کو مارے یا ان پر لعنت بھیجے، قطعی مار ڈالا جائے۔

جھوٹی بات نہ پھیلانا اور گواہ ہونے کے لیے شریروں کا ساتھ نہ دینا۔

اگر دشمن کا بیل یا گدھا بھٹکتا ہوا ملے تو اسے ضرور پھیر کرلے آنا۔

کاہن کو ہر ناپاکی سے دور رہنا چاہیے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام خطاب کر رہے تھے۔ بنی اسرائیل اسے بظاہر سن بھی رہے تھے لیکن مجمعے کے ایک حصے میں بے چینی سی تھی۔ کچھ لوگ یہ کہتے سنائی دے رہے تھے کہ ہمیں کیا خبر یہ باتیں موسیٰ اپنی طرف سے کر رہے ہیں یا واقعی خدا نے یہ باتیں ان سے کہی ہیں۔ اگر خدا نے کہی ہوتیں تو وہ صرف ہمیں ڈراتا نہیں، ہمیں خوش خبریاں بھی دیتا۔ ہم اپنے گھر بار چھوڑ کر مصر سے یہاں آگئے اور ہمارے لیے خوشی کا کوئی سامان ہی نہیں۔ ہمیں تو موسیٰ بتوں کی عبادت تک نہیں کرنے دیتا۔ یہ کیسے احکام ہیں کہ ہم صرف وہ کریں جو موسیٰ چاہے۔

یہاں کھڑے ہوئے وہی لوگ جو اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ مطالبہ کرچکے تھے کہ ہمیں بت بنا کر دے تاکہ ہم ان کی عبادت کرسکیں جیسے کہ سینا کے بت کدوں میں ہم نے دیکھی ہے۔ ان لوگوں میں سے چند نے چیخ چیخ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنا شروع کیا۔

''اے موسیٰ (علیہ السلام) تم ہم پر کب تک بوجھ ڈالتے رہو گے۔ اپنے خدا سے کیوں نہیں کہتے، ہمارے لیے ''عید'' کیوں نہیں اتارتا کہ ہم ناچیں اور گائیں۔ دوسری قومیں کیسے کیسے سوانگ بھرتی ہیں اور ہمیں صحرا میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کی طرف توجہ کی۔

''اے میری قوم کے نادان لوگو! تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ خدا تم سے غافل ہے۔ وہ یہ احکام اس لیے دے رہا ہے کہ تم پاکیزگی اختیار کرو اور دوسری قوموں کے لیے مثال بنو اور تمہارا حال یہ ہو رہا ہے کہ دوسری قوموں کی بے ہودہ باتوں کی نقالی کرتے ہو۔ اگر تمہاری یہی منشا ہے تو میں خدا سے سوال کرکے دیکھوں گا۔ ابھی اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتا۔''

ایسی بدمزگی طاری ہوگئی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خیمے میں چلے گئے۔

شریر گروہ اپنی فتح مندی پر مسکرا رہا تھا۔

''خداوند! ایک گروہ مسلسل شرارتوں پر تلا ہوا ہے۔ اس نے میرا خطاب بھی مکمل نہیں ہونے دیا۔ ان کے حق میں خوشی کے تہوار اتارنا کہ یہ میری باتیں سنیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام مسلسل تین دن تک اپنی قوم کے حق میں اپنے رب سے دعا کرتے رہے۔ آخر تین دن بعد آپ پر وحی نازل ہوئی۔ آپ نے قوم سے پھر خطاب کیا۔

''میری قوم کے لوگو! خدا نے تمہارے لیے تین اہم عیدوں کا اعلان کیا ہے لیکن خبردار! ان عیدوں پر سوانگ نہ بھرنا، مورتیوں کی پوجا نہ کرنا۔ یہ عیدیں شکرگزاری کی عیدیں ہیں۔ جو کچھ مجھ سے کہا گیا ہے وہ تم تک پہنچا رہا ہوں...... اور خبردار! اس بابت مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔

خداوند فرماتا ہے۔ ''تو میرے لیے سال بھر میں تین عیدیں منانا۔ پہلی عید، عید فطیر ہوگی۔ اس میں میرے حکم کے مطابق ابیب مہینے کے مقررہ وقت پر سات دن تک خمیری روٹی کھانا کیونکہ اس مہینے میں تو مصر سے نکلا تھا۔

(ابیب کا مہینا بہار کا مہینا تھا)

اور جب تیرے کھیت میں جسے تو نے محنت سے بویا پھل آئے تو فصل کاٹنے کی عید منانا۔ (یہ گویا بیج کا مہینا تھا)

اور سال کے آخر میں جب تو اپنی محنت کا پھل کھیت سے جمع کرے تو جمع کرنے کی عید منانا۔ خیموں پر کھجور کی شاخیں لپیٹنا، مہندی کی ڈالیاں لگانا اور مصر سے نکلنے کا زمانہ یاد کرنا۔

اور یاد رکھنا تینوں مرتبہ تمہارے ہاں کے سب مرد خدا کے آگے حاضر ہوا کریں۔

اور تو خمیری روٹی کے ساتھ میرے ذبیحہ کا خون نہ چڑھانا اور میری عید کی چربی صبح تک باقی نہ رہنے دینا۔

اپنی زمین کے پہلے پھلوں کا پہلا حصہ خدا کے گھر لانا۔''

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک طویل خطاب کیا اور اپنی قوم کو نصیحت کی۔

''اے بنی اسرائیل! اب تک خدا کی معرفت جو احکام میں تمہیں دے چکا اگر تم نے احکام پر عمل نہ کیا اور دوسرے معبودوں کی عبادت اور پرستش کرنے لگے تو تم پر لعنتیں نازل ہوں گی۔ تمہاری اولاد، تمہاری زمین اور تمہارے جانور سب لعنتی ہوں گے۔ تمہاری بداعمالیوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم دربدر پھرو گے۔ بیماریوں میں مبتلا ہو گے۔ آسمان جو تیرے سر پر ہے، پیتل کا ہو جائے گا اور زمین جو تیرے نیچے ہے، لوہے کی ہو جائے گی۔ بارش کے بدلے تیری زمین پر خاک اور دھول برسے گی۔ تیرے دشمنوں کے آگے تجھے شکست ہوگی اور جیسے اندھا اندھیرے میں ٹٹولتا ہے ویسے ہی تو دوپہر کو دن کے اجالے میں ٹٹولتا پھرے گا۔ تو اپنے کاموں میں ناکام رہے گا۔

اور اے لوگو! اگر تم نے نافرمانی کی تو تمہارے جانور تم سے چھین لیے جائیں گے۔ ہاں اگر تم نے فرماں برداری کی اور خدا کی باتوں پر عمل کیا تو تمہیں دنیا کی قوموں میں سرفراز کیا جائے گا اور برکتیں تم پر نازل ہوں گی اور جو دشمن ہوں گے ان پر تمہیں فتح دی جائے گی۔ جو ملک تمہیں اور باپ دادا کو دینے کی خدا نے قسم کھائی ہے وہ تمہیں مل کر رہیں گے۔ مگر یہ اسی وقت ہوگا جب تم خدا کی باتوں پر عمل کرو گے اور جو کچھ میں خدا کی طرف سے لاتا رہوں گا اس پر عمل کرو گے۔ یاد رکھو میں اپنی جانب سے کچھ بھی نہیں کہتا۔ میں خدا کی باتیں تم تک پہنچاتا ہوں کیونکہ تم کہہ چکے ہو کہ جو کچھ کہنا سنتا ہوا کرے تم ہی کہہ لیا کرو ورنہ یہ باتیں تم سے خدا کہتا۔''

اس کے بعد بھی جو پند و نصائح خدا کی طرف سے آتے رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم تک پہنچاتے رہے۔ ان کی قوم کبھی بے دلی کبھی شوق سے ان پیغامات کو سنتی رہی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خدا کا وعدہ تھا کہ جب بنی اسرائیل مصری غلامی سے آزاد ہو جائیں گے تو تم کو شریعت دی جائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ اب وہ وقت آگیا ہے۔ اپنی قوم تک انہوں نے پند و نصائح کی بہت سی باتیں پہنچا دی ہیں۔ اب اگر انہیں مکمل شریعت لکھی ہوئی مل جائے اور وہ ان باتوں کو قوم کو سکھائیں تو یہ بگڑی ہوئی قوم راہ راست پر آجائے۔ وہ کئی مرتبہ سوچ چکے تھے کہ ''طور'' پر جائیں اور خدا سے ہم کلام ہو کر قوم کے لیے شریعت حاصل کریں لیکن خدا کی اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتے تھے۔ وہ عالم بے تابی میں کئی مرتبہ پہاڑ تک گئے لیکن الٹے قدموں دوڑ آئے۔ ہیبت نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ اگر میں اجازت کے بغیر پہاڑ پر چلا گیا تو کہیں میرا شمار نافرمانوں میں نہ ہو جائے۔

راتیں اور دن اسی بے تابی میں گزر رہے تھے۔ بار بار خیال آتا تھا کہ کہیں کوئی خطا تو نہیں ہوگئی۔ میرا رب مجھ سے روٹھ تو نہیں گیا۔ دن رات کی فریادیں تھیں اور سجدہ گزاری تھی اور وحی کا انتظار تھا۔ بنی اسرائیل کا شریر گروہ جان بوجھ کر آپ سے پوچھتا رہتا تھا، خدا نے کوئی نئی ہدایت جاری کی ہو تو ہمیں پہنچائیں۔ آپ کے پاس ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ خدا کسی کے کہنے میں نہیں۔ وہ جب مناسب سمجھے گا تمہیں مخاطب کرے گا۔

اس گروہ نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا تھا کہ موسیٰ ہمیں مصر سے نکال لائے ہیں، اس لیے موسیٰ کا خدا ان سے روٹھ گیا ہے۔ اب وہ ان سے کبھی کلام نہیں کرے گا۔ اب بنی اسرائیل کے عام لوگ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ خدا نے اگر ہمیں چھوڑ دیا تو ان بیابانوں میں ہم کہاں تک بھٹکتے رہیں گے۔ ان میں سے بہت سوں نے تو یہ سوچ لیا تھا کہ وہ مصر واپس چلے جائیں۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتے لیکن انہیں کوئی ایسا مضبوط سردار نہیں مل رہا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام، یوشع بن نون، حضرت ہارونؑ اور ان جیسے دوسرے مضبوط سرداروں سے مقابلہ کرے اور انہیں یہاں سے نکال کر مصر کی طرف لے جائے۔ یہ بدبخت قوم ایک مرتبہ پھر اسی منزل پر کھڑی ہوئی تھی جہاں وہ یہاں آنے سے پہلے مصر میں کھڑی تھی۔ جب وہ فرعونِ مصر کے خوف سے مصر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اب انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف تھا کہ وہ انہیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔ ان کے پاس کوئی ایسا سردار نہیں تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کر سکتا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کا مقابلہ کیا تھا۔

جب یہ لوگ اس طرف سے مایوس ہوئے تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اس مایوسی کو امید میں بدلنے کے لیے یہ کہنا شروع کر دیا کہ بس کچھ دن کی بات ہے، موسیٰ خود تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اس کے بعد تم آزاد ہو گے جہاں چاہو چلے جانا۔

کچھ دنوں تک تو قوم کو یقین نہ آیا کہ جو باتیں کی جا رہی ہیں ان میں کوئی حقیقت ہو سکتی ہے لیکن جب تواتر سے یہ باتیں ہونے لگیں اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام لوگوں کے سامنے آنے سے گریز کر رہے ہیں...... بہت دنوں سے انہوں نے خطاب بھی نہیں کیا تو انہیں یقین آنے لگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام تک بھی یہ باتیں کسی نہ کسی طرح پہنچتی رہی تھیں۔ وہ وحی کے انتظار میں تھے اور بالآخر ایک دن وحی اتری۔ خدا ان سے کہہ رہا تھا۔

''میرے پاس پہاڑ پر آ اور وہیں ٹھہرا رہ اور میں تجھے پتھر کی لوحیں اور شریعت اور احکام جو میں نے لکھے ہیں دوں گا تا کہ تو ان کو سکھائے۔''

''میں اگر پہاڑ پر ٹھہرا رہا تو اس سرکش قوم کی دیکھ بھال کون کرے گا؟''

''تو اپنے پیچھے ہارون کو چھوڑ کر آ اور پھر دیکھ جس قوم کے لیے تو مجھ سے اتنی دعائیں کرتا ہے، وہ تیرے پیچھے کیا کرتی ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو بلایا اور انہیں خدا کے حکم سے آگاہ کیا۔

''خدا نے حکم دیا ہے کہ میں کوہِ طور پر آ کر عبادت میں مشغول ہو جاؤں۔ مجھے وہاں تیس راتیں اور تیس دن گزارنے ہوں گے۔ اس مدت میں آپ میرے خلیفہ اور نائب کے فرائض انجام دیں گے۔ رشد و ہدایت کا فریضہ آپ کو سونپا گیا ہے۔ تمام بنی اسرائیل کو میرے طریقہ کار پر عمل پیرا رکھنا۔ ان میں کسی طرح بھی انتشار پیدا نہ ہو۔''

''اگر قوم کے بزرگوں کو بلا کر یہ فیصلہ آپ اپنی زبان سے سنا دیں تو وہ آئندہ میری بات سنیں گے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام خیمۂ اجتماع سے باہر آئے اور قوم سے خطاب کیا۔

''مجھے کوہِ طور پر طلب کیا گیا ہے۔ وہاں مجھے تیس دن کا چلہ کاٹنا ہوگا تا کہ میں تمہارے لیے شریعت لے کر آؤں۔ میری عدم موجودگی میں حضرت ہارون تمہاری ہدایت کے لیے موجود ہوں گے۔ جس کسی کا کوئی مقدمہ ہو، وہ ان کے پاس لائے اور ان کے حکم پر عمل پیرا ہو۔

میں تمہیں ایک مرتبہ پھر تنبیہہ کرتا ہوں کہ تم کسی شکل یا صورت کی کھودی ہوئی مورت ہرگز نہ بنانا۔ کوئی بھی شبیہہ وہ مرد کی ہو یا عورت کی یا زمین کے کسی حیوان کی یا ہوا میں اڑنے والے کسی پرندے کی یا زمین میں رینگنے والے کسی کیڑے یا مچھلی کی ہو۔ جب آسمان کی طرف نظر کرو اور سورج، چاند اور تاروں کو دیکھو تو گمراہ ہو کر ان کو سجدہ مت کرنا۔ سمجھ لو کہ تمہارا

بہت غیور ہے۔ وہ اپنی ذات میں کسی کو شریک کرنے کا روادار نہیں۔''

بنی اسرائیل پر اس خطاب کا الٹا ہی اثر ہوا۔ یہ بات ان کے دلوں میں پختہ ہوگئی کہ یہ جو ہم سن رہے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے، یہ بات آج صحیح ثابت ہوگئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اب کے گئے، کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر گئے اور عبادت کے لیے اعتکاف میں بیٹھ گئے۔

جب مقررہ مدت کے دن گزر گئے تو آپ نے خدائے تعالیٰ سے ہم کلامی کی تیاری شروع کی۔ چونکہ مکمل ایک ماہ روزے ہی میں بسر کیے تھے اسی لیے خیال آیا کہ مسلسل بھوکا رہنے سے منہ سے بو آنے لگی ہوگی۔ شرمندگی سی محسوس ہوئی کہ خدا سے ہم کلام ہوتے وقت یہ بو ظاہر ہو۔ اس بو کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے ایک خوشبودار بوٹی کو چبایا اور کھایا۔

وحی الٰہی نے فوراً ٹوکا۔

''موسیٰ علیہ السلام! تم نے گفتگو کرنے سے پہلے روزہ افطار کیوں کرلیا۔ ہمیں تو تمہارا روزے کی حالت میں رہنا نہایت پسند تھا اور تم نے اجازت کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس سے پہلے تو تم ہر قدم ہماری اجازت کے بغیر نہیں اٹھاتے تھے۔''

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوا کہ ان سے خطا ہوئی ہے۔ نادانستگی میں انہوں نے خدا کو ناراض کردیا ہے۔ انہوں نے نہایت عاجزی سے روزہ افطار کرلینے کا جواز پیش کیا۔

''خدایا! مسلسل تیس روزوں کی وجہ سے میرے منہ سے بو آنے لگی تھی۔ مجھے گوارا نہیں ہوا کہ میں اس حالت میں آپ سے گفتگو کروں۔''

''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے نزدیک روزہ دار کے منہ کی بو مشک کی خوشبو سے بہتر ہے۔ موسیٰ! اس مدت کو بڑھا کر چالیس دن کردو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شکر ادا کیا کہ خطا کی سزا صرف یہ ملی۔

قرآن کریم نے وجہ بیان نہیں کی صرف اتنا بتایا۔

''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر دس راتیں بڑھا کر اسے پورا (چلہ) کردیا اور اس طرح پروردگار کے حضور آنے کی مقررہ میعاد چالیس راتوں کی پوری ہوگئی۔''

جب چلہ پورا ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ ہم کلامی بخشا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عشقِ بے پایاں نے غایت کیف وانبساط میں ایک اور مطالبہ کردیا۔

''جب تو نے مجھ کو لذت وکیف سماع سے نوازا ہے تو پھر لذتِ مشاہدہ ودیدار سے کیوں محروم رہوں۔ مجھ پر تجلی ذات آشکار کر۔''

ادھر سے جواب آیا۔ ''موسیٰ! تم تجلی ذات کا مشاہدہ نہیں کرسکو گے بلکہ تاب ہی نہ لاسکو گے۔''

عشقِ موسیٰ مسلسل اصرار کررہا تھا اور دوسری طرف سے مسلسل انکار ہورہا تھا۔ ناز دکھائے جارہے تھے، ناز اٹھائے جارہے تھے لیکن جو اللہ جانتا تھا، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں جانتے تھے۔ بچہ جب ضد کرتا ہے تو یہ نہیں دیکھتا کہ وہ چیز اسے مل بھی سکتی ہے یا نہیں۔ اسے تو بس ضد سے مطلب ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اسی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ یہ تو بڑوں کو معلوم ہوتا ہے اس ضد کو پورا کرنا بچے کے حق میں مفید بھی ہے یا نہیں۔

جب ضد بہت بڑھی تو اس طرف سے جواب آیا۔ ''اچھا دیکھو ہم اپنی ذات کی تجلی کا ظہور اس پہاڑ پر کریں گے۔ اگر یہ اس تجلی کو برداشت کرلے تو پھر تم یہ سوال کرنا'' اس کے بعد ''طور'' پر حضرت حق کی تجلی نے ظہور کیا تو پہاڑ کا وہ حصہ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس نظارے کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگئے۔

''اور جب موسیٰ (علیہ السلام) آیا تا کہ مقررہ وقت پر حاضری دے اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا تو پکار اٹھا' پروردگار! مجھے اپنا جمال دکھا کہ تیری طرف نظر کرسکوں۔ حکم ہوا تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔ ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ! اگر یہ (تجلی حق کی تاب لے آیا اور) اپنی جگہ ٹکا رہا تو تو بھی مجھے دیکھ سکے گا۔ پھر جب اس کے پروردگار نے تجلی کی تو اس تجلی نے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کردیا اور موسیٰ ...... غش کھا کر گر پڑا۔ جب موسیٰ ...... ہوش میں آیا تو بولا۔ خدایا! تیرے لیے ہر طرح کی تقدیس ہو۔ میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے یقین کرنے والوں میں ہوں۔'' (سورۃ اعراف)

اس راز و نیاز کے بعد توریت عطا کی گئی اور حضرت حق نے ان کو حکم کیا کہ اس پر مضبوطی سے قائم رہو اور اپنی قوم سے کہنا کہ وہ بھی ان احکام پر اس طرح عمل کریں کہ جو عمل نیک جس قدر زیادہ قرب الٰہی کا سبب ہے اس کو دوسرے اعمال پر ترجیح دے۔ میں نے اس کتاب میں تمہارے دینی و دنیوی فلاح کی تمام تفصیلات بیان کر دی ہیں اور حلال و حرام، محاسن و معائب، غرض تمام اوامر و نواہی کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور یہی میری شریعت ہے۔

تم بنی اسرائیل سے کہنا کہ میرے لیے نذر لائیں اور تم ان ہی سے میری نذر لینا جو اپنے دل کی خوشی سے دیں۔ تم ان سے سونا چاندی اور پیتل، ارغوانی اور سرخ رنگ کا کپڑا، بکری کی پشم اور مینڈھوں کی سرخ رنگی ہوئی کھالیں اور کیکر کی لکڑی اور چراغ کے لیے تیل لے لینا اور ان سے کہنا وہ میرے لیے ایک مقدس گھر بنائیں تاکہ میں ان کے درمیان سکونت کروں اور وہ کیکر کی لکڑی کا ایک صندوق بنائیں جس کی لمبائی ڈھائی ہاتھ اور چوڑائی ڈیڑھ ہاتھ اور اونچائی ڈیڑھ ہاتھ ہو اور تو اس کے اندر اور باہر خالص سونا منڈھنا اور اس کے اوپر گرداگرد ایک زریں تاج بنانا اور اس کے لیے سونے کے چار کڑے ڈھال کر اس کے چاروں پایوں میں لگانا۔ دو کڑے ایک طرف ہوں اور وہی دوسری طرف اور کیکر کی چوبیں بنا کر ان پر سونا منڈھنا اور ان چوبوں کو صندوق کے اطراف کے کڑوں میں ڈالنا کہ ان کے سہارے صندوق اٹھ جائے اور تو اس شہادت نامے کو جو میں تجھے دوں گا، اسی صندوق میں رکھنا۔ وہاں میں تجھ سے ملا کروں گا اور ان سب احکام کے بارے میں جو میں بنی اسرائیل کے لیے تجھے دوں گا، تجھ سے بات چیت کیا کروں گا۔

اور تو دو ہاتھ لمبی اور ایک ہاتھ چوڑی اور ڈیڑھ ہاتھ اونچی کیکر کی لکڑی کی ایک میز بھی بنانا اور اس کو خالص سونے سے منڈھنا اور اس کے گرداگرد ایک زریں تاج بنانا اور اس کے چاروں طرف چار انگل چوڑی ایک کنگنی لگانا اور اس کنگنی کے گرداگرد ایک زریں تاج بنانا اور سونے کے چار کڑے اس کے لیے بنا کر ان کڑوں کو چاروں کونوں میں لگانا جو چاروں پایوں کے مقابل ہوں گے۔ کیکر کی لکڑی کی چوبیں بنا کر ان کو سونے سے منڈھنا تاکہ میز ان ہی سے اٹھائی جائے اور تو اس کے طباق اور چمچے اور آفتابے اور انڈیلنے کے بڑے بڑے کٹورے سب خالص سونے کے بنانا اور تو اس میز پر نذر کی روٹیاں ہمیشہ میرے روبرو رکھنا۔

تو خالص سونے کا ایک شمع دان بنانا۔ وہ شمع دان اور اس کا پایہ اور ڈنڈی سب گھڑ کر بنائے جائیں اور اس کی پیالیاں اور لٹو اور اس کے پھول سب ایک ہی ٹکڑے کے بنے ہوں اور تو اس کے لیے سات چراغ بنانا۔ یہی چراغ جلائے جائیں تاکہ شمع دان کے سامنے روشنی ہو۔

خداوند کی حضوری کا خیمہ (مسکن) بنانا۔ اس مسکن کے لیے دس پردے بنانا۔ یہ بٹے ہوئے باریک کتان اور آسمانی قرمزی اور سرخ رنگ کے کپڑوں کے ہوں۔ ہر پردے کی لمبائی اٹھائیس ہاتھ اور چوڑائی چار ہاتھ ہو اور سب پردے ایک ہی ناپ کے ہوں اور تو بکری کے بال کے پردے بنانا تاکہ مسکن کے اوپر خیمے کا کام دیں۔ ایسے پردے گیارہ ہوں۔

اور تو اس خیمے کے لیے مینڈھوں کی سرخ رنگی ہوئی کھالوں کا غلاف بنانا اور ایک پردہ خیمے کے دروازے کے لیے آسمانی ارغوانی اور سرخ رنگ کے کپڑوں اور باریک بٹے ہوئے کتان کا بنانا اور اس پر بیل بوٹے کڑھے ہوئے ہوں اور اس پردے کے لیے کیکر کی لکڑی کے پانچ ستون بنانا اور ان کو سونے سے منڈھنا اور ان کے کنڈے سونے کے ہوں جن کے لیے پیتل کے پانچ خانے ڈھال کر بنانا۔

اور تو کیکر کی لکڑی کی قربان گاہ پانچ ہاتھ لمبی اور پانچ ہاتھ چوڑی بنانا۔ وہ قربان گاہ چوکھونٹی ہو اور اس کی اونچائی تین ہاتھ ہو اور تو اس کے لیے چاروں کونوں پر سینگ بنانا اور تو اس کی راکھ اٹھانے کے لیے دیگیں اور بیلچے اور کٹورے اور سیخیں و انگیٹھیاں بنانا۔ اس کے سب ظروف پیتل کے بنانا۔

وہ اسے ایسی ہی بنائیں جیسی تجھے پہاڑ پر دکھائی گئی ہے۔

اور تو بنی اسرائیل کو حکم دینا کہ وہ تیرے پاس زیتون کا خالص تیل روشنی کے لیے لائیں تاکہ چراغ ہمیشہ جلتا رہے۔ اردن اور اس کے بیٹے شام سے صبح تک شمع دان کو خداوند کے روبرو آراستہ رکھیں۔ یہ دستور العمل بنی اسرائیل کے لیے نسل در نسل سدا قائم رہے گا۔

یہ ہدایات دینے کے بعد خداوند نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ ”تو دھونے کے لیے پیتل کا ایک حوض اور پیتل کی ایک کرسی بنانا اور اسے خیمۂ اجتماع اور قربان گاہ کے بیچ میں رکھ کر اس میں پانی بھر دینا۔

تو بنی اسرائیل سے یہ بھی کہہ دینا کہ تم میرے "سبتوں" کو ضرور ماننا۔ جو کوئی اس کی بے حرمتی کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے۔ چھ دن کام کاج کیا جائے لیکن ساتواں دن آرام کا "سبت" ہے جو خداوند کے لیے مقدس ہے۔ جو کوئی سبت کے دن کام کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے۔"

عہد کے اس صندوق کی شہادت قرآن سے بھی ملی ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے۔

"اس کی سلطنت کی علامت یہ ہوگی کہ تمہارے پاس تابوت آئے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے سکینہ اور موسیٰ وآل ہارون کا بقیہ متروکہ یعنی ان کی نشانیاں ہوں گی اور اس کو ملائکہ اٹھائے ہوں گے۔ بے شک اس میں نشانی ہے تمہارے لیے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔" (سورۃ بقرہ)

یہ ان کے لیے کعبہ کے مانند تھا۔ اس کی طرف نماز وغیرہ میں رخ کیا جاتا تھا اور اس کے قرب کو تبرک سمجھا جاتا تھا۔

جب بنی اسرائیل کوئی ایسا جھگڑا یا مسئلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لاتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس کا جواب نہ ہوتا تو آپ تابوت کے پاس دونوں فریقوں کے درمیان کھڑے ہو جاتے۔ پھر ان کے پاس اس مسئلے کا فیصلہ نازل ہوتا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے چھ باتوں کا سوال کیا۔

سوال۔ تیرے بندوں میں سے کون سا بندہ سب سے زیادہ متقی ہے؟

جواب۔ جو ذکر کرتا رہے اور بھولے نہ۔

سوال۔ تیرے بندوں میں سے کون سا بندہ سب سے زیادہ سیدھی راہ چلنے والا ہے؟

جواب۔ جو ہدایت کی پیروی کرے۔

سوال۔ تیرے بندوں میں سے کون سا بندہ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے؟

جواب۔ جو لوگوں کے لیے بھی وہی فیصلہ کرے جو فیصلہ اپنے لیے کرے۔

سوال۔ تیرے بندوں میں کون سا بندہ سب سے زیادہ علم والا ہے؟

جواب۔ وہ عالم جو سیر نہ ہوتا ہو بلکہ لوگوں کے علم کو اپنے علم کے ساتھ جمع کرتا رہے۔

سوال۔ تیرے بندوں میں سے کون سا بندہ سب سے زیادہ عزت والا ہے؟

جواب۔ جب وہ قادر ہو جائے تو معاف کر دے۔

سوال۔ تیرے بندوں میں سے کون سا بندہ سب سے زیادہ مالدار ہے؟

جواب۔ وہ شخص جتنا بھی اس کو دیا جائے وہ اسی پر راضی ہو جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت دے دی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو قوم ہدایت بھیجنے کے باوجود بھی سمجھ سے کام نہیں لیتی اور گمراہی پر قائم رہتی ہے تو پھر ہم بھی اس کو گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں۔

قرآن عزیز نے اس حقیقت کو اس انداز میں بیان کیا ہے۔

"جو لوگ ناحق خدا کی سرزمین میں سرکشی کرتے ہیں ہم اپنی نشانیوں سے ان کی نگاہیں پھرا دیں گے۔ وہ دنیا بھر کی نشانیاں دیکھ لیں پھر بھی ایمان نہ لائیں۔ اگر وہ دیکھیں ہدایت کی راہ سامنے ہے تو کبھی اس پر نہ چلیں۔ اگر دیکھیں کہ گمراہی کی ٹیڑھی راہ سامنے ہے تو فوراً اس پر چل پڑیں۔ ان کی ایسی حالت اس لیے ہو جاتی ہے کہ ہماری نشانیاں جھٹلاتے ہیں اور ان کی طرف سے غافل رہتے ہیں اور جن لوگوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائیں اور آخرت کے پیش آنے سے منکر رہے تو ان کے سارے کام اکارت گئے۔ وہ جو کچھ بدلہ پائیں گے وہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ان ہی کے کرتوت کا پھل ہوگا جو وہ دنیا میں کرتے رہے۔" (سورۃ اعراف)

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمٰن۔ قصص الانبیاء، ابن کثیر۔ توریت، ......ارض القرآن، سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔

پُراسرار محافظ

نادیہ نور

کبھی کبھی انسان کی دیرینہ خواہشیں پوری نہ ہوپائیں تو مرنے کے بعد بھی دنیا میں بھٹکتی روحوں کا روپ دھار کر اپنا ادھوراپن دور کرنے کی کوشش میں مصروفِ عمل رہتی ہیں جیسے کہ یہاں... اگرچہ اس کا اپنا کوئی وجود نہ تھا مگر وہ ایک جیتے جاگتے وجود کو موت کے منہ سے کھینچ لایا کیونکہ اس کی خواہش کا حاصل بھی یہی تھا۔

ایک اسرار بھرے سفر کی بھیدوں بھری روداد

اپنے چھوٹے سے ٹورسٹ طیارے میں بیٹھ کر میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ دسمبر کا سرد مہینا چل رہا تھا۔ پائن کے اونچے اونچے درختوں پر برف کی سفید تہ جمی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ چاند کی روشنی میں آس پاس کی ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ ہیڈفون لگا کر اب میں کنٹرول ٹاور کے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ کنٹرول ٹاور کا اسٹاف میرے اڑان بھرنے کے ہی انتظار میں ہے۔ میرے اڑنے کے بعد ہی یہ لوگ اپنے اپنے گھر جانے کے لیے دوڑ پڑیں گے۔ آج کرسمس کی رات تھی۔ مجھے بھی کرسمس منانے کے لیے اپنے گھر جانے کی جلدی ہو رہی تھی۔ رات کے سوا دس بج رہے تھے۔ اچانک کنٹرول ٹاور کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ مجھے اڑان بھرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ میں نے جہاز کا کنٹرول سنبھال لیا۔

رن وے کی بتیاں اب تیزی سے دور ہوتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ چند لمحوں میں ہی رن وے پر دوڑتا ہوا میرا جہاز زمین سے اوپر اٹھ گیا۔ میری گود میں ایک نقشہ پڑا ہوا تھا جس کے ذریعے مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ مجھے کس سمت اور کس راستے سے جانا ہے لیکن مجھے نقشے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ راستہ پوری طرح سے میرے دھیان میں تھا۔ مجھے صرف چھیاسٹھ منٹ یعنی ایک گھنٹا اور چھ منٹ کے اندر اپنی مقررہ جگہ پر پہنچنا تھا۔ جب جہاز کئی ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا تو میں نے جہاز کے کمپاس کی سوئی پر نگاہ ڈالی۔ کمپاس کی سوئی دوسو پچاس ڈگری کی جانب اشارہ کررہی تھی۔ میرے اوپر تاروں سے بھرا ہوا آسمان تھا۔ میں دل ہی دل میں رات کو گھر پر ہونے والی پارٹی کے بارے میں سوچ سوچ کر خوش ہورہا تھا۔ مجھے لوکن ہیتھ کے ہوائی اڈے پر لینڈ کرنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں سے لندن جانے کے لیے کوئی نہ کوئی سواری ضرور مل جائے گی اور لندن سے رات کے وقت کوئی لفٹ لے کر میں صبح ناشتے کے ٹائم پر اپنے گھر آسانی سے پہنچ سکتا ہوں۔ جہاں پر میری خوب صورت بیوی جیکولین، میری ماں اور میرے دو بچے میرا انتظار کررہے تھے۔ اپنی فیملی کی یاد آتے ہی میں کچھ جذباتی سا ہوگیا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ میری اڑان کو اکیس منٹ ہوگئے تھے اور سب کچھ درست طریقے سے چل رہا تھا۔

پھر اچانک دس منٹ کے بعد ہی مشکلات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ذرا سی دیر پہلے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میرے ہیڈ فون سے جو دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی، وہ بالکل ہی بند ہوگئی ہے۔ ہیڈ فون کی خرابی کا علم مجھے ذرا دیر بعد ہوا تھا کیونکہ میں اپنے گھر اور فیملی کے تصور میں کھویا ہوا تھا اور پھر جب میں نے اپنے جہاز کے صحیح راستے اور سمت کا اندازہ لگانے کے لیے کمپاس کی طرف دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیونکہ اس کی سوئی دوسو پچاس کی ڈگری پر ٹھہرنے کے بجائے مسلسل گھومے جارہی تھی۔ اس سوئی کا اس طرح اچانک گھومتے رہنا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن میں نے اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی مگر شاید کمپاس بے کار ہوچکا تھا۔ میں پریشان ہوگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر جہاز کا کمپاس بگڑ جائے تو ماہر سے ماہر پائلٹ بھی مشکل میں پڑ سکتا ہے۔ میں نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی۔ اب مجھے اڑان بھرے ہوئے پورے چونتیس منٹ ہوچکے تھے، تب مجھے اچانک خیال آیا کہ مجھے لوکن ہیتھ کے کنٹرول روم سے رابطہ قائم کرنا چاہیے اور انہیں بتانا ہوگا کہ میں بغیر کمپاس کے اڑ رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے ٹرانسمیٹر کا بٹن دبایا اور بولنا شروع کیا۔ ”ہیلو...... ہیلو چارلی ڈیلٹا...... چارلی ڈیلٹا...... کالنگ نارتھ بلیو لینڈ کنٹرول۔“ میرا جہاز اس وقت سمندر کے اوپر سے گزر رہا تھا۔

میری آواز ٹرانسمیٹر میں ریسیو ہونے کے بجائے میرے کانوں سے ٹکرا کر واپس آرہی تھی۔ ٹرانسمیٹر بھی خراب ہوگیا تھا۔ میں اپنی جگہ سن ہوکر رہ گیا۔ ایک سیٹ والا جیٹ فائٹر ایک چھوٹے سے کیبن کی طرح ہوتا ہے جس میں اپنی تنہائی یا بوریت کو دور کرنے کے لیے ایک بٹن دبا کر دنیا کے الگ الگ کنٹرول ٹاور سے رابطہ کیا جاسکتا ہے اور دوسری طرف سے آنے والی آوازوں کو سن کر کسی حد تک تنہائی اور بوریت کو دور کیا جاسکتا ہے لیکن جب جہاز کا ریڈیو ٹرانسمیٹر ہی خراب ہوگیا ہو تو یہ تنہائی کتنی خوف ناک اور اذیت ناک ہوجاتی ہے۔ میں نے چینل جے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی کیونکہ چینل جے ہی بین الاقوامی ایمرجنسی چینل تھا لیکن وہاں سے بھی رابطہ نہیں ہوپایا اور تب مجھے حالات کی سنگینی کا شدت سے احساس ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہیڈ فون کمپاس اور یہ دس چینل والا ریڈیو ٹرانسمیٹر کیسے ناکارہ ہوگئے ہیں۔

رائل ائیر فورس میں دو برس تک ٹریننگ دی جاتی ہے اور خاص طور پر اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ کسی آفت یا جہاز میں خرابی کی صورت میں کس طرح جہاز کے پائلٹ کو اپنے دل و دماغ کو ٹھنڈا رکھ کر جہاز کو سنبھالنا چاہیے تاکہ جہاز کے ساتھ ساتھ اپنی اور مسافروں کی جان بھی بچائی جاسکے اور آج مجھ پر بھی وہ وقت آن پڑا تھا۔ کمپاس اور ریڈیو ٹرانسمیٹر بغیر کسی وجہ کے خراب نہیں ہوتے کیونکہ یہ دونوں چیزیں کاک پٹ کے الیکٹرک سرکٹ کے ذریعے کام کرتی ہیں۔ جس جگہ میرے پاؤں تھے، وہاں تاروں کا جال تھا۔ تاروں کے اس جال میں کہیں سے کوئی فیوز اڑ گیا تھا جس کی وجہ سے کمپاس اور ٹرانسمیٹر ریڈیو بے کار ہوگئے تھے۔

فورس میں تربیت کے دوران ہمارے سرسار جنٹ مارش کی ہدایتیں میرے ذہن میں گونجیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے حالات میں سب سے پہلے جہاز کا ایندھن بچانے کا کام کرنا چاہیے۔ جہاز کی رفتار کم کردی جائے پھر غور او دھیان سے جہاز کی مشینری اور دیگر آلات کا جائزہ لیا جائے۔ میں نے تمام آلات کا اچھے سے جائزہ لیا۔ کمپاس اور ریڈیو ٹرانسمیٹر کے سوا سارے آلات درست کام رہے تھے۔ ان حالات میں جہاز کو نیچے زمین پر اتار !

میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا جبکہ راستہ بھی میرا جانا پہچانا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے جہاز کو بلندی سے نیچے لانے کی کوشش کی۔ میری گھڑی بتا رہی تھی کہ میرے سفر کے پینتالیس منٹ گزر چکے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق سمندر کا دوسرا کنارہ صرف پانچ میل دور ہونا چاہیے تھا۔ چاند کی روشنی کافی تھی۔ مجھے راستہ صاف نظر آرہا تھا لیکن جیسے جیسے جہاز نیچے جارہا تھا، ویسے ویسے میرے اندر عجیب سی بے چینی اور گھبراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ سمندر کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی مجھے اپنے اندر سمو لینے کے لیے بےقرار ہے۔

اچانک جہاز نے ایک زوردار غوطہ لگایا اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ نیچے نگاہ کرتے ہی جسم میں کپکپاہٹ سی دوڑنے لگی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے جہاز کو ایک دائرے میں گھمانا چاہیے۔ جہاز کو چکر لگاتے دیکھ کر شاید ریڈار اسٹیشن کو خبر ہوجائے اور وہ میری مدد کرسکے۔ زندگی بچانے کے لیے یہ اب میری آخری امید تھی کہ شاید حفاظتی جہاز آجائے اور مجھے راستہ دکھا کر صحیح سلامت زمین پر اترنے میں میری مدد کرے۔ مجھے اب محافظ جہاز کا ہی آسرا تھا۔ میں نے ایندھن چیک کیا تو میٹر سے پتا چلا کہ میرے حصے کا ایندھن ابھی سلامت ہے۔ ابھی میں لوکن ہیتھ سے بہت دور تھا۔ میں جہاز کو پھر بلندی پر لے گیا اور چکر لگانا شروع کر دیے۔ دس منٹ اور گزر گئے۔ کمپاس کی سوئی اب بھی بلا وجہ ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ بجلی سے چلنے والے تمام آلات دھیرے دھیرے سست پڑتے جارہے تھے اور ایندھن صرف اتنا ہی رہ گیا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ تک اور اڑ سکتا تھا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ اب کسی بھی لمحے میرے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی یا میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھوں گا۔ میری جھنجلاہٹ کا یہ عالم تھا کہ بے جان پڑے ہوئے مائیک کو منہ سے لگا کر بے تحاشا گالیاں بکنے لگا۔ ''آخر تم لوگ میری آواز کیوں نہیں سن رہے ہو؟'' میں غصے سے کہہ رہا تھا۔ ''کیا تم لوگ بہرے ہوگئے ہو؟'' اس چیخنے چلانے میں پانچ منٹ اور گزر گئے۔ اب مجھے سو فیصد یقین ہوگیا کہ بس میری زندگی کے یہ آخری لمحات ہیں لیکن مجھے اس اچانک آنے والی موت سے ڈر نہیں لگ رہا تھا البتہ دل پر اس بات کا بوجھ ضرور محسوس ہوا کہ زندگی کے آخری لمحات میں میری فیملی میرے پاس یا میرے سامنے نہیں تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی مجھے مر جانا تھا۔ میں سمندر میں ڈوب کر مر جاؤں گا پھر میری لاش کو تلاش کر کے لوگوں کے سامنے لایا جائے گا تو میری لاش ناقابلِ شناخت ہوچکی ہوگی۔ میں ذہنی طور پر موت کے لیے تیار ہو چکا تھا کہ مجھے اپنے جہاز کے ذرا نیچے ایک بڑا سا سایہ دکھائی دیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ کوئی جہاز تھا جو مجھ سے ذرا نیچے میرے ساتھ ساتھ اڑ رہا تھا۔ میں حیران تو ہوا لیکن میری سمجھ میں آگیا کہ وہ جہاز میری توجہ اپنی جانب مبذول کرا کے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہتا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ میرے برابر آکر میری طرف بڑھنے لگا۔ وہ میرے نزدیک سے نزدیک تر آتا جارہا تھا۔ کچھ دیر میں دونوں جہازوں کا فاصلہ کم ہوکر صرف سو فٹ رہ گیا۔ ذرا دھیان سے جہاز کے ڈھانچے کا جائزہ لینے پر میں نے دیکھا کہ وہ ایک بہت پرانا اور ماسکوڈالٹرا کا بمبار جہاز ہے جس کا دوسری جنگِ عظیم میں بہت استعمال کیا گیا تھا۔ اس جہاز کا پائلٹ اپنے جہاز کو میرے قریب لاکر میرے تجسس کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ وہ عجیب انداز میں سر ہلا ہلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز تو سنائی نہیں دے رہی تھی مگر اس کے سر ہلانے کے اشارے سے میں یہ سمجھا کہ وہ اپنے جہاز کو غوطہ لگانے والا ہے۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں اپنے جہاز کو غوطہ لگا دیا جس کے نتیجے میں جہاز دو ہزار فٹ نیچے آگیا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے ویسا ہی اشارہ کیا۔ ٹھیک اسی وقت میں نے دیکھا کہ اس جہاز کے پچھلے حصے پر بڑے بڑے کالے حروف میں صرف دو لفظ لکھے ہوئے تھے...... جے اور کے۔ میرا جہاز ان دو غوطوں کے بعد کافی نیچے آگیا تھا اور تب میری نظر ایندھن کے میٹر پر پڑی۔ ایندھن کی ٹنکی بالکل خالی ہوچکی تھی کیونکہ میٹر پر زیرو پوائنٹ کا نشان صاف نظر آرہا تھا۔ خوف کی وجہ سے میری زبان خشک ہوگئی۔ مدد ملنے کے باوجود بھی اب میری موت یقینی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔

پائلٹ نے ایک مرتبہ پھر غوطہ لگانے کا اشارہ کیا۔ اس کا جہاز بڑی تیزی سے نیچے کی طرف جارہا تھا۔ اس بار تو میرا دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔ میں نے دیکھا کہ مجھے راستہ دکھانے والا محافظ بغیر روشنی کے ہی جہاز اڑا رہا ہے۔ اس نے اپنے جہاز کو میرے جہاز کے بے حد قریب لاکر مجھے اشاروں سے یہ سمجھایا کہ زمین آگئی ہے اور تم جہاز کو فوراً نیچے اتار لو اور سچ مچ میرا جہاز نیچے آگیا۔ اس کے پہیے زمین کو چھونے لگے۔ میں نے اپنے حواس یکجا کیے اور پوری قوت سے کنٹرول کو پکڑ لیا۔

اس طرح میرا جہاز صحیح سلامت زمین پر اتر آیا اور میں بچ گیا۔ مجھے یقین نہیں ہو پا رہا تھا۔ میرا محافظ مجھے حفاظت سے زمین پر اتارنے کے بعد اب اپنے جہاز کے ساتھ اوپر کی طرف جا رہا تھا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ جہاز بادلوں کے جھنڈ میں کھو گیا۔ کچھ وقت تک میں تشکر آمیز نگاہوں سے سر اٹھائے اس طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اسی وقت عہد کیا کہ رائل ائرفورس کے ہیڈ کوارٹر سے فون کر کے جے، کے جہاز کے پائلٹ کا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔ میں اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے شدید سردی محسوس ہوئی۔ یہ ٹھنڈ اتنی سخت تھی کہ میرا جسم کپکپانے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر سردی سے بچنے کی کوشش کی۔ آس پاس کا جائزہ لیا تو میں دنگ رہ گیا۔ میرا جہاز رن وے پر ضرور کھڑا تھا مگر کوئی ائرپورٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ رن وے پر لال پیلی روشنی والے بلب روشن تھے اور نہ ہی آس پاس کہیں روشنی نظر آ رہی تھی۔ خود کو تنہا کسی ویرانے میں پا کر میرے تن بدن میں ایک بار پھر کپکپاہٹ سی ہونے لگی مگر اسی وقت مجھے دور سے آتی کسی کار کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ وہ شاید کوئی کار یا جیپ تھی جو میری طرف ہی آ رہی تھی ذرا دیر میں وہ قریب آ کر مجھ سے دس فٹ کی دوری پر رک گئی۔ اس کے بعد میں نے ایک بھاری آواز سنی۔

''ہیلو!'' آواز سن کر میں پھرتی سے باہر نکل آیا۔ رائل ائرفورس کی وردی میں ملبوس ایک شخص اپنی جیپ کے پاس کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ ''اس جیپ میں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں ائرفورس کے میس میں لے چلوں گا۔'' شاید میرے جہاز کو دیکھ کر وہ بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ اسی لیے میں بھی کچھ کہے بغیر ٹھنڈ سے کانپتا ہوا آگے بڑھا اور چپ چاپ اس کی جیپ میں بیٹھ گیا۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور اسے موڑنے کے بعد سیدھا چل پڑا۔ راستے میں اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

''تم خوش قسمت ہو جو بچ گئے۔''

''بالکل...... مجھے واقعی یقین نہیں ہو رہا کہ میں بچ گیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور اسے ساری تفصیل بتا دی اور اپنے محافظ کے بارے میں بھی بتا دیا۔

وہ غور سے میری بات سنتا رہا اور درمیان میں ''ہوں ہاں'' کر کے کچھ پوچھ بھی لیتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس نے کچھ پی رکھی ہے۔ ایک جگہ اس نے جیپ روک دی اور بولا۔ ''اس ہوائی اڈے کا نام آر اے ایف منٹن ہے لیکن اب یہ جہازوں کے آنے جانے کے قابل نہیں رہا ہے۔''

اتنا کہہ کر اس نے باہر دیکھا اور اتر گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ایک پرانے سے کنٹرول ٹاور کے پاس وہ رک گیا۔

''یہاں سے آر اے ایف کا نزدیک ترین آپریشن اسٹیشن کتنی دور ہے؟'' میں نے پوچھا۔

میرا سوال سن کر وہ ایک منٹ تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''میرے خیال میں میرین سینٹ جارج نزدیک ترین آپریشنل اسٹیشن ہو سکتا ہے۔'' اس کا جواب سن کر مجھے معلوم ہوا کہ اس نامعلوم محافظ کی مہربانی سے میری جان تو بچ گئی ہے لیکن اب میں شاید ایک ایسی جگہ پھنس گیا ہوں جہاں سے مجھے کوئی مدد نہیں مل سکے گی۔ یہاں نہ تو کوئی جہاز تھا اور نہ ہی کوئی آپریشن سسٹم۔ میں اس وقت ایک ویران سے ائرفیلڈ میں تھا۔ ہم لوگ میس کے ہال نما کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ہال خاصا بڑا تھا مگر اس میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چاروں طرف ایک وحشت ناک سی بے ترتیبی نظر آ رہی تھی۔ فرش پر دھول مٹی کی موٹی موٹی تہ جمی ہوئی تھی اور دیواروں کی سفیدی سیاہی میں بدل چکی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ بہت عرصے سے کسی نے صفائی کی جانب توجہ نہیں دی تھی۔ میرے میزبان نے اپنا نام فلائٹ لیفٹیننٹ مورگن بتایا اور اس نے یہ بھی کہا تھا۔

''یہاں اس وقت میرے علاوہ صرف ایک ہی آدمی ہے، یہاں کا پرانا خدمت گار فرینک گریٹ...... باقی کے تمام لوگ کرسمس کی چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔ میں یہاں کا انچارج ہوں۔ یہاں کل بیس افراد کام کرتے ہیں۔'' میں دھیان سے اس کی بات سنتا رہا۔ مجھے سخت سردی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے سردی سے کانپتا دیکھ کر مورگن نے اونچی آواز میں فرینک کو پکارا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے دوست کہ میں ایک اچھا میزبان ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ اس وقت یہاں جو کچھ موجود ہے، اس میں سے ہی تمہارے کھانے پینے کا انتظام کرنا پڑے گا۔''

اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب وہ جانے لگا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا مجھے فون استعمال کرنے کی اجازت ہے؟'' مورگن نے اثبات میں سر ہلایا اور فرینک کو تلاش کرنے کا کہہ کر اس ہال روم سے باہر چلا گیا۔

ایک چھوٹی سی میز پر فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ آدھی رات سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا۔ اب کرسمس منانے کا خواب بس خواب ہی رہ گیا تھا لیکن میں نے شکر کیا کہ میری زندگی بچ گئی تھی۔ اگر زندگی ہی نہ رہتی

میں کیسے کرسمس منا سکتا تھا۔

میں نے نزدیکی ائربیس میرین سینٹ جارج کا نمبر تلاش کر کے فون ملایا۔ دوسری جانب سے ریسیور اٹھایا گیا تو میں نے ڈیوٹی کنٹرولر سے بات کرانے کو کہا لیکن مجھے جواب دیا گیا۔ ''اب یہاں سے کوئی جہاز اڑنے والا نہیں ہے اسی لیے کنٹرولر سر یہاں موجود نہیں ہیں لیکن جونیئر آفیسر موجود ہیں...... کیا انہیں فون دوں؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور جونیئر کنٹرولر کو اپنی مشکلات اور مصیبت سے آگاہ کر دیا۔ میری پوری بات سن لینے کے بعد جونیئر کنٹرولر بولا۔

''ہمیں آپ کی مشکلات جان کر بہت دکھ ہوا ہے لیکن کرسمس کی وجہ سے آپریشنل سسٹم شام پانچ بجے سے بند ہے جس کی وجہ سے کوئی کام نہیں ہو سکتا اس لیے فوری طور پر ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔'' اس نے مجھے آر اے ایف میرم یا آر اے ایف لوکن ہیتھ سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے غصے سے ریسیور پٹخ دیا۔ آر اے ایف میرم نارکون سے تقریباً اسی میل دور تھا اور وہاں تک جانے کے لیے سڑک کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا جبکہ لوکن ہیتھ تو میرم سے بھی ڈیڑھ سو میل آگے تھا۔ میرے جہاز کا ایندھن ختم ہو گیا تھا اور اس ویران ائرفیلڈ سے تو ایندھن ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے دل میں ایک بار پھر مایوسی اور ناامیدی کے گہرے بادل چھا گئے۔

مجھے اپنے اس نامعلوم محافظ کی یاد بھی آ رہی تھی جس نے عین وقت پر میری راہنمائی کی اور میری جان بچائی۔ اگر وہ نہ آتا تو میری موت یقینی تھی۔ میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے گولکسٹر کے ہیڈ آفس فون کیا۔ میں اس پائلٹ کے نام کے بارے میں نہیں جانتا تھا اسی لیے میں نے جہاز کا حوالہ دیا اور پوچھا۔ ''مجھے اس ماسکوڈا جہاز کے پائلٹ سے بات کرنی ہے جو آج رات ازان پر تھا۔ میں راستہ بھول گیا تھا۔ اس پائلٹ نے اچانک کہیں سے نمودار ہو کر میری درست راہنمائی کر کے میری جان بچائی ہے۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ماسکوڈا جہاز ہی تھا؟'' دوسری جانب سے حیرت زدہ آواز میں پوچھا گیا۔

''بالکل...... وہ ماسکوڈا ہی تھا۔'' میں نے یقین سے کہا۔ ''میں نے اسے دو بار بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس

سنہری باتیں

☆ جو شخص اپنے راز کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ وہ اپنی سلامتی کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔

☆ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تلاش رزق میں بیٹھ جائے اور دعا کرے کہ اے خدا مجھے رزق دے۔ کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ آسمان سے سونا اور چاندی نہیں برستا۔

☆ ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت نیک عورت ہے۔

☆ جو عیب سے واقف کرے، وہ دوست ہے۔

☆ ظالموں کو معاف نہ کرو کیونکہ یہ غریب پر ظلم ہوگا۔

☆ نیکی کے بدلے نیکی ادائیگی حق ہے اور بدی کے بدلے نیکی کرنا احسان میں داخل ہوتا ہے۔

☆ دوستی تین باتوں سے مستحکم ہوتی ہے۔ دوست کو اچھے نام سے پکارو۔ کوشش کرو کہ سلام میں پہل تم کرو۔ اس کو بٹھاؤ پھر خود بیٹھو۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

پر کالے حروف میں جے کے لکھا ہوا تھا۔''

''اچھا...... لیکن پھر بھی تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ کوئی اور جہاز ہوگا۔''

''ہرگز نہیں۔'' میں جھٹ سے بولا۔ ''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔''

''مگر ماسکوڈا جہاز تو اب کسی کمپنی کے استعمال میں نہیں ہیں۔'' دوسری طرف سے تحمل سے کہا گیا۔ ''شاید یہ اب دنیا کے کسی بھی ملک کے پاس نہیں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد چند دنوں کے لیے ان سے کام لیا جاتا رہا لیکن پھر اسے ناکارہ قرار دے دیا گیا تھا۔'' میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔

دوسری جانب سے ''ہیلو ہیلو......'' کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے خود کو سنبھالا اور جلدی سے پوچھا۔ ''آپ لوگوں کے اسکواڈ میں ماسکوڈا کے کتنے جہاز تھے؟''

''تقریباً چھ جہاز تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں انہوں نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا مگر جنگ کے بعد انہیں ناقص قرار دے کر توڑ کر ملبے کے گودام میں ڈال دیا گیا۔

شاید ان میں سے کسی ایک جہاز کا ڈھانچا اب بھی کسی گودام میں موجود ہو۔''

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی نے ان چھ جہازوں میں سے کسی ایک جہاز کو حکومت سے اپنے لیے خرید لیا ہو۔'' میں نے نکتہ اٹھایا۔

''ایسا ممکن ہوسکتا ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''اس بارے میں تم کہیں اور سے معلومات حاصل کرسکتے ہو، لیکن اگر فرض کرلیا جائے کہ ماسکوڈا جہاز کسی نے خریدا ہوگا تو پھر بھی اس کا اب تک قابلِ استعمال رہنا ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کے خراب ہوجانے والے تمام پرزے اب دستیاب ہی نہیں ہیں اسی لیے میرا ذاتی خیال ہے کہ اس کا وجود باقی نہیں رہا۔''

''اچھا...... پھر......'' میری بات ابھی ہو ہی رہی تھی کہ دوسری طرف سے کہا گیا۔

''ہیپی کرسمس......'' اور سلسلہ منقطع کردیا گیا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے پی رکھی ہے اور جان بوجھ کر الٹی سیدھی باتیں کررہا ہوں۔ میں نے بھی دھیرے سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ میرا سر بھاری ہورہا تھا۔ کیسی عجیب باتیں ایک ساتھ ہی اور ایک ہی وقت میں ہوئیں۔ جہاز کا ہیڈفون خراب ہوگیا پھر ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد جہاز کا پیٹرول ختم ہوگیا اور بوکھلا کر میں راستہ بھی بھول گیا۔ تب ایک نامعلوم شخص نے میری مدد کی اور میری زندگی بچائی لیکن اب تک اس اجنبی محافظ کا مجھے کچھ پتا نہیں لگ رہا تھا کہ آخر وہ کون تھا؟

میں یہ باتیں ہی سوچ رہا تھا کہ بوڑھے فرینک نے آکر مجھے بتایا کہ میرے سونے کا انتظام کردیا گیا ہے اور مجھے روم نمبر گیارہ میں جانا ہے۔ میں خاموشی سے اٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ گیارہ نمبر کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن میرے لیے آتش دان سلگا دیا گیا تھا، میں سخت سردی محسوس کررہا تھا اسی لیے فوراً ہی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ فرینک واپس پلٹ گیا اور میرے لیے کھانا لے آیا۔ اب مجھے خود بھی بھوک محسوس ہورہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے خود کو بہتر محسوس کیا۔ میرے اندر اب خوف کچھ کم ہوگیا تھا۔ اب میرا جی چاہ رہا تھا کہ کسی سے بات چیت کروں۔ لیکن لیفٹیننٹ مورگن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اپنے روم میں جاکر سوچکا تھا۔ اب یہاں میرے سامنے بوڑھا خدمت گار فرینک ہی تھا اس لیے میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''مسٹر فرینک! آپ تو یہاں کافی عرصے سے ہوں گے...... ہے نا؟''

''جی ہاں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے چھبیس برس ہوگئے ہیں۔'' فرینک مسکراتے ہوئے بولا۔ ''جب میں یہاں آیا تھا تو یہاں کی رونق ہی الگ تھی۔ اس وقت یہ اسٹیشن نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔ یہاں کے تمام روم آفیسرز اور پائلٹوں سے بھرے رہتے تھے۔ ہر وقت ہنسی مذاق کا دور چلتا رہتا تھا۔ وہ بھی کیا دن تھے۔'' فرینک دلچسپی سے مجھے پرانی باتیں سناتا رہا اور میں سگریٹ سلگا کر کمرے میں ٹہلتے ہوئے اس کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ میرے دائیں جانب والی دیوار پر زنگ آلود ٹین کا بڑا سا فریم لٹک رہا تھا جس میں ایک بڑی سی بلیک اینڈ وائٹ تصویر لگی ہوئی تھی۔ فریم کی طرح وہ تصویر بھی بہت پرانی تھی جس کے شیشے پر دھول کی ایک موٹی سی تہ جم کر اس تصویر کو بھی دھندلا رہی تھی۔ یہ ایک نوجوان کی تصویر تھی جو پائلٹ کی وردی میں ملبوس تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ یہ وردی آج سے پچیس سال پہلے کی سرکاری وردی تھی۔ تصویر میں وہ نوجوان پائلٹ اپنا ایک ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں بڑی تیز چمک تھی اور اس کے پیچھے ایک ہوائی جہاز کھڑا تھا۔ میں تصویر کے اور نزدیک ہوگیا۔ یہ ماسکوڈا جہاز تھا۔ یہ ہوبہو ویسا ہی جہاز تھا جس نے آج میری مدد کرکے میری جان بچائی تھی۔ اس نوجوان کا چہرہ بھی اب مجھے کچھ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ ابھی میں اس تصویر کو غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ کمرے کی کھڑکی تیز ہوا کے جھونکے سے کھل گئی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے اور ٹھنڈی ہوا کا سرد جھونکا کمرے میں گھس آیا۔ فرینک نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی بند کردی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کتنی تیز ہوا ہے۔'' میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور تجسس سے پوچھا۔

''مسٹر فرینک! اس تصویر میں یہ پائلٹ کون ہے؟''

فرینک نے گردن اٹھا کر اس تصویر کو دیکھا پھر کہا۔

''یہ تو مسٹر جیک کیکر کی تصویر ہے۔ جنگ کے دوران میں یہ یہاں آیا تھا۔ وہ آئرش تھا۔ بہت ہی نیک دل اور عمدہ شخص تھا اور اسی کمرے میں رہتا تھا، فرینک کی آنکھیں اس تصویر پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

''یہ جیک کیکر کون سے اسکواڈ میں تھا...... تمہیں معلوم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' فرینک نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ فضائی مددگار اسکواڈ میں تھا اور ماسکوڈا جہاز

اڑاتا تھا۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر تصویر کو غور سے دیکھا۔ تصویر والے جہاز کے پچھلے حصے پر کالے رنگ میں دو لفظ لکھے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے...... جے اور کے۔ یہ دونوں الفاظ بالکل اس جہاز پر لکھے ہوئے لفظ جیسے ہی تھے جس نے آج مجھے موت کے منہ میں جانے سے بچایا تھا۔ اب میرے ذہن میں آ رہا تھا کہ ''جے کے'' کا مطلب جیک کیکلز ہی ہوسکتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میری الجھن دور ہوگئی۔

میں سوچ رہا تھا کہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد شاید جیک کیکلز ریٹائر ہوگیا ہوگا مگر جہاز اڑانے کے شوق کی خاطر پرائیویٹ طور پر فضا میں بھٹک جانے والے جہازوں کو راستہ دکھاتا ہوگا۔ اس نے اپنا ماسکوڈا جہاز سرکار سے خرید لیا ہوگا اور آج کہیں سے واپس آتے وقت اس نے میرے جہاز کو آسمان پر چکر لگاتے دیکھ لیا اور میری مدد کو پہنچ گیا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے، میں مسٹر جیک کیکلز کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گا اور اس کا شکریہ ادا کروں گا۔

فریک ابھی تک اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''وہ سچ میں ایک بہت ہی نفیس اور عمدہ انسان تھا اور ساتھ ساتھ وہ بہترین پائلٹ بھی تھا۔ اس کے ساتھی اور دوست اکثر اس کی بہادری کی باتیں کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ اس کی آنکھیں بہت تیز ہیں۔ وہ گھپ اندھیرے میں بھی سب کچھ صاف دیکھ لیتا تھا۔ وہ بہت ہی عجیب آدمی تھا۔ اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کے بعد بھی اپنا جہاز اڑا کر بھولے بھٹکے ہوئے جہازوں کی مدد کرنے کے لیے نکل پڑتا تھا۔ ہزاروں فٹ کی بلندی پر کتنے ہی مصیبت اور آفت میں پھنس جانے والے لوگوں کی اس نے بروقت مدد کی اور بے شمار زخمی لوگوں کو طبی امداد پہنچائی۔''

میں اس تصویر کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ اس آدمی کی جوانی کی تصویر ہے جس نے اچانک آکر میری مدد کی۔ یہ انسان اگر اپنی بھرپور جوانی میں اتنا رحم دل، دوسروں کا خیر خواہ اور ہمدرد ہوسکتا ہے تو اب بڑھتی ہوئی عمر میں اس کے نیک جذبات کا کیا عالم ہوگا۔ نیکی اور مدد کے جذبات تو اس کے اندر ہزاروں گنا بڑھ گئے ہوں گے۔ میں نے تصویر سے نگاہ ہٹائی اور بوڑھے فریک کی جانب دیکھا جو اب بھی سنجیدہ انداز میں اس کی بات کر رہا تھا۔ ''ایک بار میں نے مسٹر جیک سے کہا تھا کہ آپ بار بار اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر دوسرے لوگوں کی مدد کے لیے کیوں اندھے کنوئیں میں کود پڑتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا تھا...... کوئی بھی دورانِ پرواز کسی مشکل یا مصیبت میں پھنس جائے اور اسے مدد کی ضرورت ہو تو میں خراب سے خراب تر موسمی حالات میں اپنی جان پر کھیل کر بھی اس کی مدد کو پہنچ جاؤں گا اور اسے خیریت سے زمین پر لے آؤں گا۔''

''اوہ۔'' میں بولا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہ ابھی تک اسی جوش و جذبے کے ساتھ بھولے بھٹکے لوگوں کی مدد کر رہا ہے۔''

میری بات سن کر فریک کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ افسردگی سے بولا۔ ''نہیں...... اگر وہ زندہ ہوتے تو شاید اب تک ایسا ہی ہو رہا ہوتا مگر وہ تو جنگ کے سال بھر بعد کرسمس کی رات کو اپنے جہاز پر اڑے تو پھر واپس زمین پر ہی نہیں آئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ فضا میں ان کے جہاز میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی اور وہ شمالی سمندر میں گر کر غرق ہوگئے۔ ان کی لاش کو بہت تلاش کیا گیا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔'' فریک کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے لیکن اس کے لہجے میں بہت عقیدت تھی۔

''کیا؟'' میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے فریک کو دیکھنے لگا۔ ''تو وہ کون تھا؟''

''کون...... کس کی بات کر رہے ہو؟'' فریک نے حیرت سے پوچھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں گھبرا کر بولا۔ ''وہ جیک کیکلز ہی تھا جس نے آج میری جان بچائی ہے۔ میرے جہاز کا ایندھن ختم ہوگیا تھا اور ٹرانسمیٹر بھی خراب ہوگیا۔ میں راستہ بھی بھول گیا تھا بس چند لمحوں میں ہی میری موت یقینی تھی کہ کہیں سے یہی ماسکوڈا جہاز جس پر ''جے کے'' والے حروف لکھے، میں نے صاف دیکھے تھے وہ میری مدد کو آگیا اور میرے آگے آگے چل کر مجھے راستہ دکھاتا رہا۔ تبھی تو میں یہاں زندہ سلامت اتر پایا ہوں۔ میرے جہاز میں پیٹرول کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے اسی لیے میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ جیک کیکلز زندہ ہے۔''

''نہیں۔'' فریک نے ایک بوجھل سی سانس لی اور بولا۔ ''وہ 1920ء کی کرسمس کی رات تھی جب وہ اپنے جہاز پر اڑا تھا اور آج بھی کرسمس کی رات ہے۔ اب تم آرام کرو، میں بھی چلتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر فریک اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور جاتے ہوئے بولا۔ ''ہیپی کرسمس اینڈ گڈ نائٹ۔''

سنگین خاتمہ

نشور ہادی

سب سے خوب صورت تحفہ اللہ نے انسان کو عقل و شعور کا دیا جس کی بدولت وہ غلط اور صحیح میں فرق کرپاتا ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ جب اس انتخاب کا وقت آتا ہے تو انسانی فطرت اسے اکثر لالچ اور مفاد کے نام پر انتہائی پستی میں گرادیتی ہے۔اسے بھی اپنی ذات پر اتنا ہی گھمنڈ تھا کہ ہر پسندیدہ چیز اور شخصیت پر اپنا استحقاق قائم رکھنے کے لیے ہر حد سے گزر جاتا تھا مگر... بڑے کرّوفر سے مستقبل بنانے والا ... ماضی کی کوتاہیوں میں ایسا الجھا کہ اپنے حال کو بھی فراموش کر بیٹھا جبکہ دوسری جانب دوستوں کے روپ میں ملنے والے دشمن اسے بڑے پیار سے تباہی کی طرف دھکیلتے رہے اور جب خود اذیتوں میں مبتلا ہوئے تو احساس ہوا کہ ناحق کسی کو گناہ کی طرف راغب کرکے خود انہوں نے کتنی بڑی عاقبت نا اندیشی کا ثبوت دیا...

ایک بے بنیاد بات پر زندگی کی عمارت کو متزلزل کرنے
والے ضمیر فروش لوگوں کی عبرت اثر داستان

فرانس کے دارالحکومت پیرس کے ایک کیسینو میں موسیقی کی لہریں بہت دھیرے دھیرے ہچکولے کھا رہی تھیں۔ اسے دیکھنے کی خواہش فیصل کی تھی جو نوشابہ اور زید کا اکلوتا بیٹا تھا جس کی عمر کچھ ہی دن بعد چھ سال کی ہو جاتی لیکن ذہنی طور پر وہ آٹھ نو سال کے لڑکوں سے کم نہ تھا۔ اس نے انگریزی فلموں میں بڑے ہوٹلوں وغیرہ کی رقص گاہوں میں عورتوں اور مردوں کو رقص کرتے دیکھا تھا۔ اس لیے اس نے ایسی کوئی رقص گاہ دیکھنے کی ضد کی تھی۔

زید نے اپنی مصروفیت کے باعث اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ پیرس سے اپنے وطن کی واپسی سے ایک دن پہلے اس کی خواہش پوری کردی جائے گی۔ وہی خواہش پوری کرنے کے لیے فیصل اپنے والدین کے ساتھ وہاں آیا تھا۔

نوشابہ اور زید کی شادی کو سات سال ہونے والے تھے۔ وہ دونوں ہی جرنلزم سے وابستہ تھے۔ وہ اپنے وطن کے ایک سب سے بڑے اخبار میں ملازم تھے۔ وہیں ان کا رومان پروان چڑھا تھا اور انہوں نے شادی کرلی تھی۔ فیصل کی پیدائش کے بعد نوشابہ نے ملازمت چھوڑ دی تھی تاکہ اپنے نوزائدہ بیٹے کی بھرپور تربیت کرسکے۔

زید بہ دستور ملازم رہا تھا اور اس نے ترقی بھی بے مثال کی تھی۔ پہلے ہی سال میں اس نے ایسی غیر معمولی رپورٹیں دی تھیں کہ اسے اخبار میں باضابطہ طور پر انویسٹی گیٹنگ رپورٹر کا درجہ مل گیا تھا۔ اس کے بعد بھی اس کی رپورٹیں تہلکہ مچاتی رہیں اور اس کی تنخواہ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا رہا۔ لوگ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ اسی کی رپورٹس کی وجہ سے اخبار کی سرکولیشن میں چالیس فیصد اضافہ ہوا تھا۔

فرانس میں ہونے والے ایک اسکینڈل کی تفتیش کرنے اور رپورٹ تیار کرنے کے لیے اخبار ہی نے اسے فرانس بھیجا تھا۔ اسکینڈل کا تعلق کیونکہ پیرس سے تھا اس لیے وہ یہیں آیا تھا اور ساتھ میں اپنی بیوی اور بیٹے کو بھی لے آیا تھا۔

نوشابہ نے جرنلزم ایک مغربی ملک میں پڑھا تھا لیکن وہ زید کی طرح بہت کامیاب اور مقبول جرنلسٹ نہیں بن سکی تھی۔

رقص گاہ کے فرش پر چاروں طرف میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ درمیانی جگہ رقص ہی کے لیے مخصوص تھی۔ جو لوگ میز کرسیوں پر بیٹھے تھے، کسی نہ کسی چیز سے شغل کررہے تھے۔ زیادہ تر شراب ہی پی رہے تھے۔ خود زید بھی پی رہا تھا۔ نوشابہ اور فیصل کے سامنے کافی کی پیالیاں تھیں۔

''آپ پانی ہی پیتے رہیں گے ڈیڈی۔'' فیصل بولا۔

''ہوں۔'' زید مسکرا دیا۔ پانی کی طرح سفید جن کو فیصل پانی ہی سمجھ رہا تھا۔

نوشابہ جانتی تھی کہ زید وھسکی پسند کرتا تھا لیکن وہ بہت پہلے زید سے کہہ چکی تھی کہ وہ فیصل کی موجودگی میں شراب نہ پیا کرے اور اگر پیے تو صرف جن پیے تاکہ فیصل اسے پانی ہی سمجھے۔

نوشابہ اور فیصل کافی پی چکے تھے جب یہ دونوں ہی نہیں، زید بھی چونک گیا۔

''ہیلو نوشی!'' لہجہ غیر ملکی تھا اور چہرے مہرے سے بھی وہ کسی مغربی ملک کا باشندہ معلوم ہورہا تھا۔

''ہیلو بیری! اتنے برس بعد تمہیں یہاں اچانک دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' نوشابہ نے مسکراتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ ''بیٹھو!''

بیری بیٹھتے ہی سوالیہ نظروں سے زید کی طرف دیکھنے لگا۔

نوشابہ نے اس سے زید اور فیصل کا تعارف کرایا، پھر زید سے کہا۔ ''ہم ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ میرا مطلب ہے، میں اور بیری۔ ویسے اس کا نام بیرنگٹن ہے۔ بیرنگٹن اسکاٹ۔ ہم بے تکلف دوست رہے ہیں۔''

''خوشی ہوئی نوشی کے شوہر سے مل کر۔'' بیرنگٹن نے زید کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''نوشی کے شوہر سے مل کر۔'' زید کی مسکراہٹ تلخ تھی۔ ''مجھ سے مل کر تو نہیں ہوئی۔''

بیرنگٹن ہنسا۔ ''میں نے مذاقاً کہا تھا۔''

زید نے اس سے مصافحہ تو کیا لیکن سرد مہری سے۔ اسی وقت رقص کے لیے موسیقی شروع ہوئی۔

''نوشی!'' بیرنگٹن بولا۔ ''آج کی اچانک ملاقات کی خوشی میں ایک راؤنڈ کیوں نہ ہوجائے؟'' اس کا اشارہ رقص کے راؤنڈ کی طرف تھا۔

''تم جانتے ہو مجھے رقص کے اسٹیپس نہیں آتے۔ یہ موسیقی بھی میرے لیے اجنبی ہے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں...... بس ٹانگیں چلاتی رہنا۔''

''لوگ ہنسیں گے۔''

''یہاں کوئی کسی پر نہیں ہنستا۔ بس مسکرا کر رہ جاتا ہے۔ آؤ، پلیز۔'' بیرنگٹن نے کھڑے ہوتے ہوئے نوشابہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

نوشابہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کچھ تذبذب سے کھڑی ہوئی تھی۔

''آپ بھی ڈانس کریں گی ممی!'' فیصل خوش نظر آیا۔

زید کے چہرے پر ناگواری کا تاثر تھا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ ایسے معاملوں میں دخل اندازی کو مغرب میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

بیشتر لوگ اپنی میزوں سے اٹھ کر رقص کے فرش پر جا چکے تھے۔ جو دو ایک اب جا رہے تھے، ان میں بیرنگٹن اور نوشابہ بھی تھے۔

نوشابہ نے کن انکھیوں سے دیکھ لیا تھا کہ زید کے چہرے پر ناگواری کا تاثر تھا۔ دو تین پل کے لیے نوشابہ کے دماغ میں کچھ خیالات چکرائے جنہیں اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔

رقص کے بعد وہ دونوں ہی میز کی طرف لوٹے۔

''میں نے بل پے کر دیا ہے۔'' زید گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''اب ہمیں چلنا چاہیے۔ گیارہ بج چکے ہیں۔ کل ہماری فلائٹ بھی ہے، جلدی سو جانا چاہیے۔''

''چلیں۔'' نوشابہ نے بھی اتنے ہی گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

''کل تم لوگ جا رہے ہو؟'' بیرنگٹن نے پوچھا۔

''ہاں۔'' نوشابہ نے جواب دیا۔ ''زید کو یہاں کچھ کام تھا۔ وہ ہو بھی چکا ہے۔ ہم یہاں آئے بھی بس دس دن کے لیے تھے۔ زید کو اکیلے ہی آنا تھا لیکن فیصل پیرس دیکھنے کے لیے مچل گیا۔ اسی کی وجہ سے میں بھی آ گئی تھی۔ ہماری کل کی سیٹیں بک ہیں۔''

بیرنگٹن نے پیار سے فیصل کا گال تھپتھپایا۔

نوشابہ بولی۔ ''آج بھی ہم آرام ہی کرتے لیکن فیصل کو کیسینو دیکھنے کا شوق تھا۔ اسی کی وجہ سے آ گئے۔ ہمارے ملک میں کیسینو ہے نہیں۔ فیصل جیمز بانڈ کی فلمیں بہت دیکھتا ہے۔ آج سے پہلے انہی فلموں میں دیکھے تھے کیسینو اس نے۔''

''میں تمہیں یہاں کا بہت شاندار کیسینو دکھا سکتا ہوں۔'' بیرنگٹن نے فیصل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی مجھے وہیں جانا ہے۔ پچھلے ہفتے ہی کھلا ہے وہ کیسینو۔ بڑی دھوم ہے اس کی پیرس میں۔''

''دکھائیں۔'' فیصل نے پرشوق انداز میں کہا۔

''نہیں۔'' زید نے سختی سے کہا۔ ''اب جا کے آرام بھی کرنا ہے۔ تم بھول رہے ہو، کل ہماری فلائٹ ہے۔''

نوشابہ بولی۔ ''جب تمہیں وہاں جانا تھا تو یہاں کیوں آئے تھے؟''

''یہاں سے ایک دوست کو ساتھ لینا تھا لیکن وہ ملا ہی نہیں۔ شاید اکیلا ہی چلا گیا ہوگا۔'' پھر وہ ہنسا۔ ''اس بہانے تم سے ملاقات ہوگئی۔ اب اگر کل تم لوگ واپس نہ جا رہے ہوتے تو میں اصرار کر کے تم لوگوں کو اپنے ساتھ وہاں لے جاتا۔ دراصل کل میرا برتھ ڈے ہے، لیکن منا رہے ہیں میرے کچھ دوست۔ انہوں نے اس کیسینو میں میرے اعزاز میں پارٹی رکھی ہے۔ بارہ بجے میں وہیں کیک کاٹوں گا۔''

''شاندار۔'' نوشابہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہماری ملاقات پہلے ہو جاتی اور مجھے تمہاری سالگرہ کا علم ہوتا تو میں تمہارے لیے کوئی گفٹ خرید لیتی۔ ایک دن پہلے ہی دے دیتی۔''

''یہ بھی میرے لیے گفٹ ہے کہ تم سے غیر متوقع طور پر ملاقات ہوگئی۔'' بیرنگٹن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ خبر میرے لیے بہرحال اچھی نہیں ہے کہ تم کل ہی جا رہی ہو۔ دو ایک دن اور رکتیں تو میں تمہیں پیرس کے خاص خاص مقامات کی سیر کراتا۔''

''ہم رک جاتے لیکن کل کی سیٹیں بھی بک ہیں اور زید نے اپنے دفتر اطلاع بھی دے دی ہے کہ ہم کل پہنچ رہے ہیں۔ میں وہاں سے تمہارے لیے گفٹ ضرور بھیجوں گی۔''

''خوشی ہوگی مجھے۔'' بیرنگٹن نے کہا۔ ''اچھا اپنا وہاں کا سیلولر نمبر تو دو۔ کبھی کبھی ہیلو ہائے ہو جایا کرے گی۔''

نوشابہ کے پرس میں ملازمت کے زمانے کے چند وزیٹنگ کارڈز پڑے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک کارڈ اس نے بیرنگٹن کو دے دیا۔

''اب اٹھو بھی۔'' زید نے بڑبڑانے والے انداز میں نوشابہ سے کہا اور کھڑا بھی ہو گیا۔ اس کے ساتھ باقی تینوں افراد کو بھی اٹھنا پڑا۔

''میرا کارڈ بھی رکھ لو۔'' بیرنگٹن نے اٹھتے وقت نوشابہ کو اپنا کارڈ دیا اور ہنس کر بولا۔ ''گفٹ بھیجنے کے لیے تمہیں میرا پتا تو درکار ہوگا۔''

''یقیناً۔ بائی دی وے...... شادی تو کر لی ہوگی تم نے؟''

''دو بار۔''

''کیا مطلب؟ یہاں تو ایک سے زیادہ شادی کی اجازت نہیں۔''

''دوسری شادی پہلی کو طلاق دینے کے بعد کی تھی لیکن نباہ اس سے بھی نہیں ہو سکا۔ پہلی طلاق شادی کے آٹھ ماہ بعد ہوئی تھی۔ دوسری سے چھ مہینے بعد ہی نوبت آ گئی طلاق کی۔ دونوں ہی کو مجھ سے کچھ اختلافات ہو گئے تھے

لیکن ہم نے جھگڑا نہیں کیا۔ دوستانہ انداز میں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اب اکیلا ہی رہتا ہوں۔''

''تیسری شادی کا ارادہ کب ہے؟'' زید کا انداز کچھ طنزیہ تھا۔

بیرنگٹن نے وہ طنز محسوس کیا یا نہیں لیکن جواب ہنس کر ہی دیا۔ ''اب فی الحال دو ایک سال اکیلا ہی رہنا چاہتا ہوں۔''

''کافی ترقی کر لی ہے تم نے۔'' نوشابہ نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا، بیرنگٹن کا کارڈ اب دیکھا۔ ''ڈائریکٹرز میں سے ہو اس کمپنی کے اور کمپنی بھی یہاں کی چند بڑی کمپنیوں میں سے ایک ہے۔''

''دیکھوں۔'' زید نے کارڈ لینے کے لیے نوشابہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

نوشابہ نے کارڈ اسے دے دیا۔

بیرنگٹن بولا۔ ''اب دوبارہ فرانس آؤ تو مجھے بھولنا نہیں۔''

''یقیناً۔'' نوشابہ نے جواب دیا۔ ''مجھے علم ہی نہیں تھا کہ تم پیرس میں ہو۔'' زید نے بیرنگٹن کا کارڈ نوشابہ کو واپس کر دیا۔

باتیں کرتے ہوئے وہ چاروں کلب سے باہر آ گئے تھے۔ پھر الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے وہ اپنی اپنی کار میں جا بیٹھے۔ زید نے کرائے پر کار لی تھی جو دوسرے دن ائرپورٹ پہنچنے کے وقت تک اسی کے پاس رہتی۔

راستے میں فیصل، بیرنگٹن اور نوشابہ کی دوستی اور اس کی تعلیم کے زمانے کی باتیں کرتا رہا جس کا سبب صرف تجسس تھا۔

زید نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد بھی وہ کسی خیال میں کھویا رہا۔ نوشابہ کو اس بارے میں کچھ اندازہ تھا لیکن اس نے خود کوئی بات چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

بارہ بج چکے تھے جب نوشابہ کو نیند آ گئی لیکن وہ کوئی ناخوشگوار خواب تھا کہ ڈیڑھ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ زید کمرے میں نہیں تھا۔

نوشابہ کو خیال آیا کہ وہ دوسرے کمرے میں جا کر اپنی تیار کردہ رپورٹ کو فنشنگ ٹچ دے رہا ہوگا۔ اس نے کروٹ لے کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ چند منٹ تک وہ ناخوشگوار خواب اس کے ذہن میں چکراتا رہا، پھر اسے نیند آ گئی۔ اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا کہ دوسرے کمرے میں جا کر زید سے کہے کہ دوسری صبح روانگی ہے اس لیے اب اسے سو جانا چاہیے۔

☆☆☆

تیرہ گھنٹے کی فلائٹ تھی۔ دوسرے دن جب وہ اپنے وطن پہنچے تو وہاں بھی دن ہی تھا۔ دفتر سے ایک کار انہیں لینے آ گئی تھی۔ اس نے انہیں گھر پہنچایا اور پھر چلی گئی۔

''تم چلو، میں دفتر جا رہا ہوں۔'' زید نے کہا۔

ان کا بنگلا ایک پوش علاقے میں تھا۔ زید نے گیراج سے کار نکالی اور دفتر روانہ ہو گیا۔

اپارٹمنٹ میں پہنچ کر فیصل بولا۔ ''میں نہاؤں گا ممی!''

''جاؤ، نہالو!'' نوشابہ نے کہا۔ ''میں اتنی دیر ذرا لیٹ جاتی ہوں پھر شاپنگ کے لیے چلیں گے۔''

''کیا لینا ہے ممی؟'' فیصل نے پوچھا۔

''کچھ خریدنا ہے۔ تم نہانے جاؤ۔''

فیصل چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد نوشابہ نے اپارٹمنٹس کے چوکیداروں میں سے ایک چوکیدار بابر خان سے ٹیکسی منگوائی اور فیصل کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئی۔ وہ بیرنگٹن کو اس کا برتھ ڈے گفٹ جلد از جلد بھیج دینا چاہتی تھی۔ کہنے کو ہو جاتا کہ اس نے گفٹ بھیجنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی تھی۔ بیرنگٹن سے ملنا اس کے لیے خوشی کا سبب بنا تھا۔ وہ اس کے مغربی دوستوں میں سب سے اچھا شخص تھا۔

ایک شاپنگ سینٹر سے اس نے تاج محل کا ایک بڑا ماڈل خریدا۔ وہ جانتی تھی کہ بیرنگٹن کو مشرق کی قدیم چیزیں بہت پسند تھیں۔

بڑا ماڈل تھا اس لیے اس کی پیکنگ میں دیر تو لگتی لیکن اسے ہوائی جہاز سے جانا بھی بیرونِ ملک تھا اس لیے خصوصی پیکنگ میں خاصا وقت لگا۔

دوسرا کام نوشابہ نے یہ کیا کہ وہ گفٹ پیک فوری طور پر ڈسپیچ بھی کر دیا۔ اس دوران میں فیصل اس سے سوالات کرتا رہا تھا۔ نوشابہ نے اسے بتا دیا کہ وہ بیرنگٹن کو اس کا برتھ ڈے گفٹ بھیج رہی ہے۔

''مجھے انکل بیرنگٹن بہت اچھے لگے تھے ممی!'' فیصل نے کہا۔ ''جب میں بڑا ہو جاؤں گا نا تو ان سے ملنے پیرس ضرور جاؤں گا۔''

نوشابہ ''ہوں ہاں'' کرتے ہوئے اس کی زیادہ تر باتیں ٹالتی رہی تھی۔ اس کے دماغ میں کچھ خیالات چکرا رہے تھے۔ ان خیالات کا تعلق زید سے تھا جس نے کیسینو سے ہوٹل پہنچنے کے بعد اور پھر سفر کے دوران میں بھی اس سے بہت رسمی سی باتیں کی تھیں۔ وہ چپ چپ اور کھویا سا رہا تھا۔ نوشابہ کچھ اندازہ بھی لگا چکی تھی کہ اس کا سبب کیا تھا۔

شاپنگ سے واپسی پر نوشابہ نے فیصل سے کہا۔ ''کل تمہیں اسکول جانا ہے، جا کر تیاری کرو۔''

''تیاری تھوڑی کرنا ہے۔ بس کتابیں اٹھانا ہیں۔''
فیصل نے معصومیت سے جواب دیا۔
نوشابہ کچھ نہیں بولی اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ وہ زید کے موڈ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پہلے بھی ایسا کئی مرتبہ ہو چکا تھا۔ وہ جب زیر تعلیم تھی تو کئی لڑکیوں اور لڑکوں سے اس کے تعلقات بہت اچھے رہے تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو مقامی طلبا نہیں تھے، مختلف ملکوں سے آئے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی ان میں سے کسی کا فون آجاتا تو بھی زید کا موڈ کچھ خراب ہو جاتا مگر پھر دو چار گھنٹوں میں ٹھیک بھی ہو جاتا لیکن اس مرتبہ صورتِ حال کچھ زیادہ خراب محسوس ہو رہی تھی اور کسی وقت اس سے زیادہ خراب بھی ہو سکتی ہے، نوشابہ سوچ رہی تھی۔
زید مقررہ وقت پر اپنے دفتر سے واپس آیا۔
''چائے بناؤں؟'' نوشابہ نے پوچھا۔
زید اثبات میں سر ہلا کر کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ نوشابہ ایک طویل سانس لے کر کچن کی طرف چلی گئی۔
چائے پیتے ہوئے فیصل بھی ان کے ساتھ تھا پھر وہ قریب کے پارک میں اپنے... ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے چلا گیا۔
زید بھی کچھ کہے بغیر اٹھا تھا کہ نوشابہ بول پڑی۔
''سنو زید! مجھے کچھ بات کرنا ہے۔''
زید نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر بیٹھ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
''پیرس میں......'' نوشابہ بولی۔ ''ہماری واپسی سے چار دن پہلے کی بات ہے۔ ہم شاپنگ کرنے گئے تھے تو وہاں میرا اسی زمانے کا ایک دوست ملا تھا جو اطالوی ہے۔ وہ بہت سرسری سی ملاقات تھی۔ اس نے بس ہوٹل کا نام پوچھا تھا۔ اسی شام اس نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے چائے پر بلالیا تھا۔ ہم ہوٹل کے ہال ہی میں ملے تھے۔ میں نے تم سے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا لیکن تم ٹال گئے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ تمہیں کیا ضرورت ہے ہماری پرائیویٹ باتیں سننے کی۔''
''ہوں۔''
''مجھے تمہارا وہ انداز اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ مجھ سے صرف اپنی شادی کے سلسلے میں مشورہ کرنے آیا تھا۔ اس کی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہونے والی ہے جو ہمارے ساتھ ہی زیر تعلیم رہی تھی۔ یہ میں نے اس لیے بتایا کہ میں بھی اس سے واقف ہوں۔''
''ظاہر ہے۔'' زید نے کہا۔ ''ساتھ پڑھا ہے تو جانتی ہی ہوگی۔''
''بس وہ مجھ سے کچھ مشورہ کرنا اس لیے چاہ رہا تھا کہ وہ ہمارے ہی ملک کی ہے۔ اب بھی یہیں رہتی ہے۔ نیلم نام ہے اس کا۔ کئی بار گھر بھی آچکی ہے۔ دیکھا ہے تم نے اسے۔''
''یہ کیا باتیں لے بیٹھیں تم؟'' زید نے الجھ کر کہا۔
''بہت ضروری باتیں ہیں۔'' نوشابہ نے سنجیدگی سے کہا پھر بولی۔ ''خیر!...... اس سے پہلے کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ میرے غیر ملکی دوستوں کے فون...... یاد ہے نا؟''
''ہاں! تو پھر؟''
''ہر بار تمہارا موڈ خراب ہوا تھا۔''
''غلط خیال ہے تمہارا۔ مجھے کچھ پریشانی ہوگی۔''
یہ سراسر جھوٹ تھا۔ نوشابہ جانتی تھی لیکن اس نے بحث نہیں کی۔
''پھر اس رات۔'' نوشابہ بولی۔ ''بیرنگٹن کے ساتھ میرا رقص تمہیں اتنا برا لگا تھا کہ تمہارا موڈ اب تک خراب ہے۔''
''ہاں۔'' زید نے کچھ توقف سے کہا۔ ''مجھے یہ اچھا نہیں لگا تھا کہ میری بیوی کی کمر پر کسی اور کا ہاتھ ہو۔''
''میں اس کی......'' نوشابہ کچھ کہتے کہتے مصلحتاً رک گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ بات زیادہ آگے نہ بڑھے۔ رک کر اس نے کہا۔ ''میں نے خاصا وقت مغرب میں گزارا ہے۔ وہاں کی کچھ باتیں میرے مزاج کا حصہ بن چکی ہیں۔ ہو سکتا ہے شادی کے بعد بھی ایسا کچھ ہوا ہو اور تمہارا موڈ خراب ہوا ہو لیکن میں نے اس وقت اس پر توجہ نہیں دی تھی لیکن بیرنگٹن کے معاملے کے بعد مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ کسی وقت بات اس سے بھی زیادہ بڑھ سکتی ہے۔''
''تو پھر...... تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''
''تلخیاں بڑھ سکتی ہیں جس کا کوئی منفی نتیجہ بھی نکل سکتا ہے۔''
''تم صاف صاف بات نہیں کر رہی ہو۔''
''صاف بات کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ کسی شعر کا ایک مصرع یاد آ رہا ہے...... بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم۔'' نوشابہ نے نظریں جھکا لیں۔
زید اسے گھورنے لگا۔ ''تمہارا مطلب ہے...... طلاق؟''
نوشابہ نے سر کو آہستگی سے اثبات میں جنبش دی پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ ''مجھے بیرنگٹن کی ایک بات بہت اچھی لگی تھی۔ اس کی دو شادیاں ہوئیں اور دونوں بار طلاق بھی ہوگئی لیکن یہ عمل خوش گوار انداز میں ہوا۔ ہمارے معاملات بھی اس حد تک کیوں جائیں کہ یہ اقدام ناخوش گوار انداز میں کیا جائے۔''

''تم نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے؟''
''کل سے اب تک اسی بارے میں سوچتی رہی ہوں۔''
زید یک لخت اٹھا اور کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی کا رخ اس پارک کی طرف تھا جہاں بچے کھیل رہے تھے۔
نوشابہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ دو تین منٹ گزر گئے۔ آخر وہ بولی۔ ''میری بات کا جواب دینے کے بجائے تم وہاں جا کھڑے ہو گئے ہو۔''
''ہاں۔'' زید سنجیدگی سے مڑا۔ ''میں فیصل کو دیکھ رہا تھا۔''
''میری بات کا فیصل سے کیا تعلق؟''
''گہرا تعلق ہے۔ اس کے ذہن پر اس کا بہت خراب اثر پڑے گا۔''
''کچھ دن میں بھول جائے گا۔''
''بچپن کی باتیں ذہن سے چپک کر رہ جاتی ہیں۔''
''میں اس کی تربیت ایسے انداز میں کروں گی کہ......''
''تم اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہو گی... یعنی طلاق کے بعد؟''
''ہاں۔''
''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن اس کے ذہن سے یہ بات ہرگز نہیں نکل سکے گی اور وہ اس کا ذمے دار مجھے سمجھے گا۔ اشتعال میں وہ مجھے قتل بھی کر سکتا ہے۔''
نوشابہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''قتل کی بات تمہارے ذہن سے چپک کر رہ گئی ہے۔''
''ہوتا ہے ایسا!''
''بے تکی باتیں کرنے لگے ہو تم۔''
زید جواب میں کچھ کہے بغیر اٹھا اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ نوشابہ اپنی جگہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ پھر اس نے بیرونی دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ زید نے یقیناً بڑی زور سے دروازہ بند کیا تھا۔
کسی خیال سے نوشابہ اٹھ کر گیلری میں پہنچی۔ ایک منٹ بعد ہی اسے زید نظر آیا جو کار میں تھا۔ کار پھاٹک کی طرف بڑھ رہی تھی۔
نوشابہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خواب گاہ میں آ کر لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں بہت سے خیالات چکرا رہے تھے۔ ان میں زید کی بعض نہایت غیر معمولی باتیں بھی تھیں۔ ان باتوں کی وجہ سے نوشابہ کو شبہ ہوا تھا کہ کسی واقعے کی وجہ سے زید کے دماغ میں کوئی نفسیاتی گرہ پڑ گئی ہے۔ اس وقت بھی اس نے یہ غیر معمولی بات کہی تھی کہ زید طیش میں آ کر اسے قتل کر دے گا۔
نوشابہ کچھ افسردہ ہو گئی۔ اب شاید ضروری ہو گیا تھا کہ زید کا نفسیاتی علاج کرایا جائے لیکن اس کا اب وقت اس لیے نہیں رہا تھا کہ وہ زید سے طلاق کا قطعی فیصلہ کر چکی تھی۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ اگر موقع ملا تو وہ ابصار کو اس بارے میں بتائے گی جو زید کا دفتری ساتھی ہی نہیں، بچپن کا دوست بھی تھا۔
شام سے رات ہوئی لیکن زید واپس نہیں آیا۔ جب کھانے کا وقت بھی گزرنے لگا تو اس نے فیصل کو کھانا کھلایا۔ خود اسے بالکل بھوک نہیں تھی۔ فیصل کے استفسار پر اس نے کہا۔ ''جب تمہارے ڈیڈی آئیں گے تو انہی کے ساتھ کھاؤں گی۔''
''ڈیڈی اب تک کیوں نہیں آئے ممی؟'' فیصل نے پوچھا۔
''دفتر کا کوئی ضروری کام ہے۔ تم کھانا کھاؤ، پھر جا کر ایک گھنٹے پڑھو اور سو جاؤ۔ جب دیر سے سوتے ہو تو دوسرے دن اسکول جانے میں دیر ہو جاتی ہے۔''
فیصل کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔
نوشابہ کا ذہن منتشر ہو رہا تھا۔ اس نے دھیان ہٹانے کے لیے ٹی وی کھول لیا۔ بار بار چینل بھی بدلتی رہی۔ پھر ایک انگریزی نیوز چینل لگا لیا جہاں سے خبریں ختم ہونے والی تھیں۔ ان میں سے ایک خبر نے اسے نہ صرف چونکایا بلکہ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔
وہ خبر بیرنگٹن کے قتل کے بارے میں تھی۔ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی اور بیرنگٹن ہوگا لیکن اسکرین پر بیرنگٹن کی تصویر بھی آئی اور یہ بھی بتایا گیا کہ وہ فلاں کمپنی کا ڈائریکٹر تھا۔ یہ خبر غالباً پہلے بھی آ چکی تھی۔ اس وقت اس کا فالو اپ دیا جا رہا تھا۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا کہ اس کا قتل اس رات ہوا جب اس نے اپنا برتھ ڈے منایا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق قتل رات کے ڈیڑھ اور ڈھائی بجے کے درمیان ہوا تھا۔
خبریں ختم ہو گئیں لیکن نوشابہ سکتے کی سی کیفیت میں ٹی وی کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ جب اس رات وہ ڈیڑھ بجے کے قریب اچانک جاگی تھی تو زید کمرے میں نہیں تھا۔
''نہیں نہیں......'' وہ بڑبڑائی۔ ''زید نے تو ایسا ہرگز نہیں کیا ہوگا۔''

☆☆☆

اخبار کے دفتر میں ریما، ابصار سے کہہ رہی تھی۔ ''کل تو زید پیرس سے آتے ہی اپنی رپورٹ سمٹ کرانے آ گیا تھا جبکہ کل اسے آرام کرنا چاہیے تھا لیکن آج غائب ہے۔''

''فون آیا تھا اس کا۔'' ابصار نے جواب دیا۔ ''کچھ طبیعت خراب ہوگئی ہے۔''
''ارے!'' ریما کے منہ سے نکلا، پھر اس نے کہا۔ ''وہ جس دن نہیں آتا، اس دن دفتر میں ایک کمی کا احساس ہوتا ہے۔''
''کل تک انتظار کرو۔'' ابصار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کمی دور ہوجائے گی۔ ویسے تم اس کے معاملے میں کچھ جذباتی بھی ہو۔''
''جذباتی تو یہ ہے اس کے معاملے میں۔'' نیلم، ابصار کی میز کے قریب آگئی تھی۔
یہ معمول تھا کہ دوپہر کو دفتر کی کینٹین میں وہ چاروں ساتھ ہی کھانا کھایا کرتے تھے۔
''بکواس مت کرو۔'' ریما نے نیلم کو گھورتے ہوئے کہا۔
وہ چاروں ہی ایک دوسرے سے کچھ کم یا کچھ زیادہ بے تکلف تھے۔
''بکواس نہیں ہے یہ۔'' نیلم نے کہا۔ ''لیکن یہ تمہاری بیڈلک ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ نوشابہ نے اسے تم سے پہلے چھاپ لیا تھا۔''
''بس کر نیلم کی بچی! بال نوچ لوں گی میں تیرے!''
''یہ جملہ کہا ہے دیہاتی لڑکیوں کی طرح۔'' نیلم ہنسی۔
''ختم کرو یار یہ جھگڑا۔'' ابصار بول پڑا۔ ''کھانے کا مینیو دیکھو...... چوہے دوڑنے لگے ہیں پیٹ میں۔''
''ابھی ایک بھی نہیں بجا۔'' ریما نے کہا۔ ''کیا آج ناشتا کیے بغیر آگئے تھے دفتر؟''
''یہی سمجھ لو!''
نیلم مینیو دیکھنے لگی۔ پھر ان کی یہ گپ شپ کھانے کے بغیر بھی جاری رہی۔
''دفتر کا وقت ختم ہوگا تو اسے دیکھنے چلیں گے۔'' ریما نے کہا۔
''احمقانہ بات ہے۔'' ابصار نے کہا۔ ''موسم ایسا ہوگیا ہے کہ بخار وغیرہ ہوگیا ہوگا۔ ایسے میں کوئی دیکھنے کے لیے آئے تو بیمار کے ذہن پر دباؤ اور بڑھ جاتا ہے۔ ایسی کوئی سیریس بات نہیں ہوگی کہ دیکھنے کے لیے جانا اخلاقی ذمے داری ہو۔''
''غیر اخلاقی سہی!''
''تو تم چلی جانا۔'' ابصار نے کہا اور اٹھ کر واش بیسن کی طرف بڑھ گیا۔
اس طرح یہ موضوع ختم ہوگیا لیکن اگر وہ زید کے گھر جاتے تو اسے بھلا چنگا ہی دیکھتے...... اس نے فون پر غلط اطلاع دی تھی کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بس اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے شاید رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔
جس وقت نیلم، ریما اور ابصار دفتر کی کینٹین میں اس کے بارے میں بات کر رہے تھے، وہ اپنے گھر پر نوشابہ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔
فیصل اسکول گیا ہوا تھا۔
''آج تم دفتر نہیں گئے۔'' نوشابہ بولی۔
''رات کو نیند نہیں آئی تھی۔ طبیعت ڈل ہوگئی ہے۔''
''تم نے میری کل کی بات کا جواب بھی نہیں دیا۔''
''جواب ہی سوچنے کے باعث نیند نہیں آئی۔''
''تو......'' نوشابہ رک کر سنجیدگی سے بولی۔ ''سوچ لیا کچھ؟''
''نوشابہ!'' زید نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے کہ طلاق ہوجائے؟''
''میں نہیں چاہتی کہ وہ نوبت آئے جب یہ معاملہ ناخوشگوار ماحول میں اپنے انجام کو پہنچے۔''
''مگر میرا خیال کچھ اور ہے۔''
''وہ کیا؟''
''اگر چند سال بعد طلاق ہوئی تو تمہارا جسم ڈھلک چکا ہوگا۔ چہرہ بھی شاید مرجھا جائے جبکہ ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ تم چھ سال کے بچے کی ماں ہو۔ تم خوب صورت ہو ابھی۔ جسم بھی کسا ہوا ہے۔ تمہیں کوئی بھی بیوی کی حیثیت سے قبول کرلے گا۔''
غصے سے نوشابہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''تم غالباً چاہتے ہو کہ ہماری علیحدگی ناخوشگوار ماحول میں ہو۔''
''میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس خیال آیا تھا ذہن میں کہ تم دوسری شادی کرنا چاہتی ہو۔''
نوشابہ نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر اس نے کہا۔ ''میرا خود سے یہ وعدہ ہے کہ میں اب بھی شادی نہیں کروں گی۔ میری بقیہ زندگی صرف فیصل کے لیے وقف ہوگی۔''
''میں اس پر کیوں یقین کرلوں؟''
''نہ کرو۔'' نوشابہ نے کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔ اس نے صحیح طور پر ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔
زید نے اسے روکا بھی نہیں۔ نوشابہ اپنے کمرے میں آگئی۔ بستر پر لیٹ کر وہ اپنے بکھرے ہوئے جذبات پر

قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔
ذرا دیر بعد زید بھی کمرے میں آ گیا۔ نوشابہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے محسوس کیا کہ زید بھی بستر پر لیٹ گیا تھا۔ نوشابہ نے آنکھیں بند ہی رکھیں۔ وہ ڈر رہی تھی کہ زید پھر کوئی کڑوی کسیلی بات نہ کہہ دے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ طلاق ناخوشگوار ماحول میں ہو، لیکن زید خاموش ہی لیٹا رہا۔
کچھ وقت اسی طرح گزرا، پھر کال بیل کی آواز سنائی دی۔ نوشابہ جلدی سے اٹھی۔
''میرے دفتر سے کوئی نہ آ گیا ہو۔'' زید بڑبڑایا۔ ''آج میں فون بھی نہیں کر سکا کہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کردوں۔''
لیکن زید کا یہ گمان غلط نکلا۔ دفتر سے کوئی نہیں آیا تھا بلکہ فیصل اسکول سے آ گیا تھا۔
نوشابہ نے فیصل کو کھانا کھلاتے ہوئے کہا۔ ''کھانا کھا کے اسکول کی یونیفارم اتار کر کپڑے اچھے سے پہننا، پھر چلنا ہے۔''
''کہاں ممی!''
''تمہارے نانا کا فون آیا تھا۔ وہ چاہ رہے ہیں کہ کچھ دن تم ان کے ساتھ رہو۔ اپنے کپڑے اور کتابیں وغیرہ سمیٹ لینا۔ میں سوٹ کیس میں وہ سب خود رکھوں گی۔''
''دن بھی تو بہت ہو گئے تھے نا ممی!'' فیصل خوش ہو کر بولا۔ ''نانا جان مجھ سے محبت بھی تو بہت کرتے ہیں۔''
''ہوں۔'' نوشابہ اس وقت زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔
''ڈیڈی تو دفتر گئے ہوں گے۔ انہیں بتا دیا تھا؟''
''ہوں۔''
فیصل کھانا کھا کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نوشابہ اپنے کمرے میں لوٹی اور اپنے ملبوسات نکال کر ایک سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔ اپنا دیگر ضروری سامان وہ صبح اٹھتے ہی ایک اٹیچی کیس میں رکھ چکی تھی۔ زید اس وقت سویا تو نہیں تھا لیکن دوسری طرف کروٹ لیے لیٹا ہوا تھا۔
ایک سوٹ کیس میں جتنے کپڑے آ سکتے تھے، وہ رکھ کر اس نے سوٹ کیس بند کیا۔ زید خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جب نوشابہ سوٹ کیس بند کر چکی تو وہ بولا۔
''کسی لمبے سفر پر جا رہی ہو کیا؟'' جملہ کچھ طنزیہ تھا جو سپاٹ لہجے میں ادا کیا گیا تھا۔
''ابو کے گھر جا رہی ہوں۔'' نوشابہ نے کہا۔ ''وہیں انتظار کروں گی طلاق نامے کا۔ خواہش ہے کہ تم مجھے زیادہ انتظار نہ کراؤ۔'' نوشابہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا اور سوٹ کیس کے اسٹریپ کسنے لگی۔
زید نے کچھ رک کر پوچھا۔ ''فیصل کہاں ہے؟''
''اپنے کمرے میں۔'' نوشابہ نے اب بھی زید کی طرف متوجہ ہوئے بغیر جواب دیا۔
''وہ سمجھ رہا ہوگا کہ میں دفتر چلا گیا ہوں گا۔''
''ہاں۔''
''کیا مجھ سے نہیں ملاؤ گی اب اسے؟''
''ابھی بھیجتی ہوں اسے۔'' نوشابہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ جتنی تیاری کر سکتی تھی، کر چکی تھی۔ وہ فیصل کے کمرے میں پہنچی۔
''میرے موزے...... ممی! میرے موزے نہیں مل رہے ہیں۔''
''تمہیں اپنی ہی چیزوں کا پتا نہیں ہوتا۔ میں دیکھتی ہوں۔ تم ذرا جا کر بابر سے کہہ دو کہ وہ ایک ٹیکسی لا دے۔ سامان اٹھانے کے لیے ٹیکسی ڈرائیور کو بھی بھیج دے۔ اسے یہ بھی بتا دے کہ کہاں جانا ہے۔ تمہیں اپنے نانا کے گھر کا پتا تو معلوم ہی ہے۔''
''جی اچھا ممی!'' فیصل دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔
بابر خاں بنگلے کے چوکیدار کا نام تھا جسے سامنے ہی کی سڑک سے ٹیکسی مل جاتی۔ نوشابہ کو فیصل کے موزے ہی نہیں، کچھ اور چیزیں بھی ڈھونڈنی پڑیں۔ فیصل جلد ہی واپس آ گیا۔
''کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں رکھتے۔'' نوشابہ بولی۔ ''تمہارے نئے جوگرز کا ڈبا نہیں مل رہا ہے۔ خیر میں دیکھ لیتی ہوں، تم اپنے ڈیڈی سے مل آؤ۔''
''ڈیڈی آ گئے دفتر سے؟''
''ہاں۔''
فیصل دوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ نوشابہ نے جوگرز کا ڈبا تلاش کیا۔ وہ رکھ کر اس نے سوٹ کیس بند کیا۔ پھر وہ سوٹ کیس اور ایک اٹیچی کیس اٹھا کر کمرے سے نکلی اور بیرونی دروازے پر گئی۔ سامان وہیں رکھ دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور کو اندر بلایا جائے۔
پھر وہ اپنے کمرے کی طرف لوٹنا ہی چاہتی تھی کہ کال بیل کی آواز آئی۔ بابر نے ٹیکسی کی آمد کا بتایا۔
''اچھا، ایک منٹ رکو۔''
اب نوشابہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں

پہنچی۔اس وقت زید بستر پر بیٹھا فیصل کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''یہ تو بتادو کہ تم مجھے قتل کب کرو گے؟''

''کیوں یہ فضول باتیں کر رہے ہیں بچے سے!'' نوشابہ نے کہتے ہوئے فیصل کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ ''چلو!'' اس نے فیصل سے کہا۔

''چابی لے لو گاڑی کی۔'' زید نے نوشابہ کی طرف چابی بڑھائی۔ ''کسی سے بھجوا دینا۔''

''میں نے ٹیکسی منگوالی ہے۔'' نوشابہ نے فیصل کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

گاڑی کی چابی زید کے ہاتھ میں ہی رہ گئی اور اس نے بستر پر گر کر آنکھیں بند کرلیں۔ ایک منٹ بعد ہی اس نے بیرونی دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ آواز کمرے تک نہیں آئی تھی لیکن دروازہ کافی زور سے بند کیا گیا تھا۔ اس طرح نوشابہ نے زید کو اطلاع دی تھی کہ وہ اپارٹمنٹ سے باہر جاچکی ہے۔

زید بستر پر پڑا چھت کو تکتا رہا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ پھر نہ جانے کیا کیا سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔ رات بھر کا جاگا ہوا تو وہ تھا ہی۔

آنکھ اس وقت کھلی جب اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے بخار محسوس کیا۔ اٹھ کر اس نے روم فریج کھولا۔ فریج میں دوپہر کے کھانے کا سامان بھی تھا جو وہ مائکرو ویو اوون میں گرم کر کے کھا سکتا تھا۔

''جب مجھے چھوڑنا ہی ہے تو آخر وقت میں اتنا خیال رکھنے کی بھی کیا ضرورت تھی؟'' اس نے دل ہی دل میں کہا اور پانی کی بوتل نکال کر فریج بند کردیا۔

پانی پینے سے پہلے اس نے تھرما میٹر نکال کر اپنا ٹمپریچر لیا جو سو کے قریب تھا۔ اب اس نے کچن کا رخ کیا۔ ٹمپریچر کی وجہ سے اس نے ٹھنڈا پانی پینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس نے سادہ پانی لیا اور ایک گھونٹ لی کر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ دراز کھول کر ایک ٹیبلٹ نکال کر پانی سے نگلی تو اسے خفیف سی تکلیف ہوئی۔

''نزلے کی تحریک بھی ہے۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

پانی کا گلاس رکھ کر اس نے روم فریج سے ایک سینڈوچ نکال کر کھایا۔ اسے بعد میں خیال آیا تھا کہ اسے خالی پیٹ ٹیبلٹ نہیں کھانی چاہیے تھی۔ سینڈوچ بھی اس سے بہ مشکل کھایا گیا۔ اس کے بعد وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ موسم سرد نہیں تھا لیکن ٹمپریچر کی وجہ سے اس نے چادر اوڑھ لی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پسینا آنے سے بخار اتر جائے گا۔

لیکن پانچ بجے تک بھی اس کی حالت نہیں سنبھلی بلکہ بخار کچھ زیادہ محسوس ہونے لگا۔ سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس سے بہ مشکل اٹھا جاسکا۔ اب اسے ہلکی سی سردی بھی لگ رہی تھی۔ اس نے الماری سے سویٹر نکال کر پہنا اور شال بھی اوڑھ لی۔ پھر بخار کی دو گولیاں کھا کر لیٹ گیا۔

لیٹا ہی تھا کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔

''اوہ.....'' اس نے سوچا، آج اس نے دفتر فون بھی نہیں کیا تھا۔ وہاں سے کوئی آسکتا تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور دروازے پر پہنچا۔

''کون ہے؟'' اس نے دروازے کے بالکل قریب پہنچنے سے پہلے ہی پوچھا تھا۔

''میں ہوں زید..... ریما۔'' باہر سے آواز آئی۔

زید نے آٹومیٹک لاک ہوجانے والا دروازہ کھولا۔

''ارے!'' ریما پریشانی سے بولی۔ ''کیا زیادہ طبیعت خراب ہوگئی؟''

زید سویٹر پر شال اوڑھے ہوئے تھا۔ بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر تمتماہٹ بھی تھی اس لیے کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی۔

''ہوں۔'' زید واپس مڑا۔ ''آؤ! دروازہ کھلا مت چھوڑنا۔''

''نوشابہ کہاں ہے؟'' ریما نے اندر آتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

وہ اور اس کے دوسرے ساتھی بھی نوشابہ کو جانتے تھے۔

''اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی ہے۔'' زید نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

ریما نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر بھی وہ چلی گئی؟''

''آج صبح طبیعت ٹھیک ہوگئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد خراب ہوئی ہے۔''

''تو اسے فون کر کے بلالیا ہوتا۔'' ریما اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

''اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ٹیبلٹ کھالی تھی میں نے۔ خیال تھا کہ طبیعت سنبھل جائے گی۔'' زید نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھو!'' اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

ریما نے کرسی بستر کے قریب گھسیٹ لی اور بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''بخار تیز معلوم ہوتا ہے۔ کتنا بخار ہے؟''

''ابھی اٹھا ہوں تو ٹمپریچر نہیں لیا۔''

ریما نے سرہانے رکھا ہوا تھرما میٹر دیکھا تو اٹھا لیا۔

معلوم ہوا کہ اس وقت زید کا ٹمپریچر ایک سو دو سے بھی قدرے زیادہ تھا۔

''ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہے۔'' ریما کے لہجے میں تشویش تھی۔

''ہمت نہیں ہو رہی ہے جانے کی!''

''نوشابہ کو فون کرو۔ وہ کسی ڈاکٹر کو لے کر آجائے گی۔''

''ارے نہیں، کیوں ڈسٹرب کروں اسے۔ ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

''بیکار کی بات ہے۔'' ریما نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ ''میں بلاتی ہوں ڈاکٹر کو۔'' وہ نمبر ملانے لگی۔ ''جاننے والے ہیں وہ میرے۔ شام کے کلینک پر نہیں بیٹھتے۔ اگر وہ کہیں مصروف نہ ہوئے تو ابھی آ......'' وہ ایک دم چپ ہو کر ماؤتھ پیس میں بولی۔ ''میں ریما بول رہی ہوں ڈاکٹر صاحب! آپ بزی تو نہیں ہیں اس وقت......تو پھر میں آپ کو زحمت دینا چاہوں گی۔ میرے ایک دوست کی طبیعت خاصی خراب ہے۔ اگر آپ اسے دیکھنے آجائیں تو شکرگزار ہوں گی......جی......جی ہاں۔ پتا آپ کو بتا دیتی ہوں۔ آپ بہت آسانی سے پہنچ جائیں گے۔'' وہ پتا بتانے لگی۔

زید آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ ڈاکٹر آدھے گھنٹے میں ہی آگیا۔ اس نے زید کا معائنہ کیا، پھر بولا۔ ''کوئی خاص وجہ تو نہیں ہے۔ آپ کسی ذہنی دباؤ کا شکار تو نہیں؟'' اس نے زید سے پوچھا۔

''مجھے تو احساس نہیں۔'' زید نے جھوٹ بولا۔

''اچھا میں دوا دیتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے اپنا میڈیکل باکس کھولتے ہوئے کہا۔ ''انجکشن بھی لگاؤں گا۔ اگر دو گھنٹے کے اندر اندر آپ کا بخار نہ اترا تو دو ایک ٹیسٹ کروانے ہوں گے۔''

''کسی بات کا شبہ تو نہیں ہے آپ کو ڈاکٹر؟'' ریما نے تشویش سے پوچھا۔

''میرے خیال میں تو تشویش کی کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات لاشعوری ذہنی دباؤ بھی ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ دو گھنٹے میں ٹھیک ہو جائیں گے۔''

اس نے زید کو ایک انجکشن لگایا اور ایک ٹیبلٹ بھی دی۔ پھر کچھ ٹیبلٹس ریما کو دیتے ہوئے بولا۔ ''ان کو ابھی نیند آجانا چاہیے۔ اگر نہ آئے تو یہ دو ٹیبلٹس اور دے دیجیے گا اور مجھے فون پر بتا دیجیے گا۔''

''بہتر ہے۔''

ڈاکٹر کو رخصت کرنے کے بعد ریما نے زید سے پوچھا۔ ''نوشابہ سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟''

''ارے نہیں، اس سے کیا جھگڑا ہوگا۔''

''اچھا آنکھیں بند کر کے خاموش لیٹے رہو۔ نیند آجانی چاہیے۔''

''تم کب تک بیٹھو گی؟ نیند آجائے تو چلی جانا۔''

''ٹھیک ہے۔''

پندرہ منٹ میں ہی زید کو نیند آگئی۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے ریما کے ساتھ نیلم اور ابصار کو بھی دیکھا۔

''سب کو جمع کر لیا تم نے!'' وہ فوراً ریما سے بولا۔

''اب تم خود کو کافی بہتر محسوس کر رہے ہو گے۔'' ابصار نے کہا۔ ''ریما تمہاری نبض دیکھتی رہی ہے۔ پانچ منٹ پہلے اس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ تمہارا بخار اتر چکا ہے۔ خود میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ تمہارا جسم اب گرم نہیں ہے۔''

''نوشابہ کو فون کرنا چاہیے تھا تمہیں۔'' نیلم بولی۔

''ہمیں اگر وہاں کا نمبر معلوم ہوتا تو فون کر چکے ہوتے۔''

اس دوران میں ہی ریما ٹمپریچر لینے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ ٹمپریچر لے کر تصدیق ہو گئی کہ اب اسے ذرا بھی بخار نہیں تھا۔

''فائن۔'' نیلم بولی۔

''اوہ!'' زید نے گھڑی دیکھی۔ ''میں پانچ گھنٹے سویا ہوں۔ تم لوگ کب سے ہو؟''

''ریما نے فون کیا تھا کہ تم ابھی ابھی سوئے ہو۔'' ابصار نے جواب دیا۔

''جب سے ہو تم لوگ یہاں؟''

''ہاں۔'' ابصار نے ہی جواب دیا۔ ''ریما کو اکیلا چھوڑ کر کیسے چلے جاتے؟ بہت پریشان تھی یہ۔ تم نے آج کچھ کھایا بھی ہے؟''

''صبح بس ناشتا کیا تھا۔''

''میں نے فریج میں کھانا دیکھا ہے۔'' ریما بول پڑی۔ ''ابھی گرم کر دیتی ہوں۔''

''نہیں ریما! کھانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا ہے۔''

''تو دودھ اور ڈبل روٹی لے لو۔ کچھ تو کھانا چاہیے۔ کمزوری تمہارے چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے۔''

ریما فریج میں رکھا ہوا دودھ گرم کر لائی۔ ڈبل روٹی بھی موجود تھی لیکن زید سے بس ایک سلائس ہی کھایا جاسکا، البتہ دودھ کا گلاس اس نے پی لیا۔

''اب تم لوگوں کو جانا چاہیے، دس بج چکے ہیں۔'' زید نے کہا۔ پھر ریما سے بولا۔ ''تمہارے گھر والے تو پریشان

ہو گئے ہوں گے۔‘‘

’’میں نے فون کر دیا تھا گھر۔‘‘ ریما نے جواب دیا۔ ’’کہہ دیا تھا کہ آج دفتر میں کام بہت زیادہ ہے۔ دیر سے آؤں گی۔‘‘

نیلم اور ابصار کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے گھر میں اکیلے ہی رہتے تھے۔ نیلم کے والدین کا گھر قریب کے ایک شہر میں تھا۔ وہ دس پندرہ دن میں وہاں کا چکر لگا لیتی تھی۔ ابصار اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کے والدین اور چھوٹا بھائی کینیڈا میں جا بسے تھے۔ انہیں وہاں کی شہریت مل گئی تھی۔ ابصار کو اپنے وطن سے پیار تھا اس لیے وہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں گیا تھا۔

’’تمہیں اب تین چار دن آرام کرنا چاہیے۔‘‘ ابصار بولا۔ ’’تین دن تو یقیناً۔ نیلم! تم چھٹی کی درخواست ٹائپ کرو۔‘‘ اس نے ایک گوشے میں رکھے ہوئے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔

نیلم اٹھ کر کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھی جس کے قریب ہی پرنٹر بھی رکھا ہوا تھا۔

’’شاید میڈیکل سرٹیفکیٹ کی بھی ضرورت پڑے۔‘‘ نیلم نے ٹائپ کرنے کے لیے کمپیوٹر کھولا۔

’’اس کی ضرورت پڑنا تو نہیں چاہیے۔‘‘ ریما نے کہا۔ ’’زید کا ریکارڈ بہت اچھا ہے اور اگر ضرورت پڑی تو اس کا بندوبست کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ انہی ڈاکٹر صاحب سے سرٹیفکیٹ لے لیا جائے گا جن کو میں نے بلایا تھا۔‘‘

’’وہ تو خیر ہو جائے گا۔‘‘ ابصار نے کہا۔ ’’لیکن تم نوشابہ کو تو اطلاع دے دو۔‘‘

’’دے دوں گا۔‘‘ زید نے سر ہلایا۔

’’ابھی ہمارے سامنے فون کرو۔‘‘

’’آخر ایسی بھی کیا جلدی ہے؟‘‘

’’سچ بتانا زید! نوشابہ سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟‘‘

’’سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جھگڑے کا۔‘‘

ابصار نے اس معاملے میں بحث نہیں کی لیکن اس کے چہرے پر سوچ بچار کا تاثر آ گیا تھا۔

نیلم نے درخواست ٹائپ کر کے اس کا پرنٹ نکالا اور زید کو دیا۔ زید نے اس پر دستخط کر دیے۔ ابصار نے درخواست لے کر جیب میں رکھ لی۔ اس کے بعد وہ تینوں رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

نوشابہ، فیصل اور سامان کو دیکھ کر اس کے والدین پریشان ہو گئے تھے۔

’’یہ..... یہ سب..... یہ سب کیا ہے نوشابہ!‘‘ اس کی ماں گھبرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ’’اس وقت..... رات کے گیارہ بج رہے ہیں..... اور..... یہ..... کیا زید سے.....‘‘

’’اوہ..... نو..... نو مما!‘‘ نوشابہ ماں سے لپٹ کر چھلنی جگر ہوتے ہوئے بھی زبردستی ہنسی۔ ’’کچھ ویسا نہیں ہے جیسا آپ لوگوں نے سمجھا ہے۔ بس تھوڑا سا جھگڑا، تھوڑی سی تلخی ہوئی تھی زید سے۔ میں جلدی آ جاتی لیکن میں اسی ڈر سے اپنی ایک دوست کے گھر چلی گئی تھی کہ آپ لوگ فیصل اور سامان کو میرے ساتھ دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھنے لگیں گے۔‘‘

’’بیٹھو..... بیٹھ جاؤ!..... بیٹھ جاؤ۔‘‘ نوشابہ کے باپ نے کہا۔ ’’تمہارا جواب بالکل الجھا ہوا ہے۔ بیٹھ کر اطمینان سے بتاؤ..... کیا ماجرا ہے۔‘‘

’’دراصل۔‘‘ ماں باپ کو مطمئن کرنے کے لیے نوشابہ ایک کہانی سوچ چکی تھی۔ ’’ہوا یہ کہ ہم ابھی تو آئے ہیں فرانس سے۔ کل آپ سے بات تو ہوئی تھی فون پر مما..... میں نے بتایا تھا نا مما کہ ہم لوگ آ گئے ہیں۔ دو ایک دن میں آئیں گے آپ سے ملنے!‘‘

’’وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اس وقت.....‘‘

’’وہ بھی بتاتی ہوں۔‘‘ نوشابہ نے ماں کی بات کاٹی۔ ’’یہ اخبار کے مالکان اور ایڈیٹر وغیرہ سب بہت ظالم ہوتے ہیں۔ کسی کی گھریلو زندگی سے انہیں کوئی سروکار ہی نہیں۔ آج ہی انہوں نے ایک اور اسائنمنٹ دے دیا زید کو۔ برما میں مسلمانوں کے جو حالات ہیں، اسی کی رپورٹنگ کے لیے انہوں نے فوراً زید کو وہاں جانے کا حکم بھی دے دیا۔ آج زید کی روانگی کا بندوبست بھی کر دیا۔ انہیں کل ہی اس بارے میں بتا دیا تھا لیکن وہ الجھتے رہے کہ مجھے بتائیں یا نہ بتائیں لیکن آج آخر بتانا ہی پڑا۔ ان کی فلائٹ جو تھی آج۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ لعنت بھیجیں اس اخبار کی ملازمت پر۔ کوئی دوسرا اخبار انہیں فوراً لینے پر آمادہ ہو جائے گا لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی۔ اس پر ہم میں کچھ تلخ باتیں بھی ہو گئیں۔ ایک تو مجھے برما کے حالات سے ڈر لگ رہا تھا، دوسرے میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ مجھے تنہائی میں ڈر لگے گا، لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی۔ شام کی فلائٹ سے وہ جا بھی چکے ہیں۔‘‘ نوشابہ نے یہ کہانی بہت سوچ سمجھ کر گڑھی تھی۔

فیصل اس وقت نانا کی گود میں بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔

’’تو جب تمہیں ہمارے پاس آنا ہی تھا تو اسی وقت

آجاتیں۔'' ماں نے کہا۔

''میں گھر سے تو اسی وقت نکل پڑی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو یہاں کا پتا بھی بتا دیا تھا لیکن پھر وہی خیال آیا جو ابھی بتا چکی ہوں۔ آپ لوگ مجھے اس طرح دیکھ کر پریشان ہوجاتے۔ بس اسی لیے میں اپنی ایک دوست کے گھر چلی گئی تھی۔ پھر رات کے کھانے کے بعد اس نے مجھے سمجھایا کہ میں شوق سے اس وقت تک اس کے گھر میں رہوں جب تک چاہوں لیکن یہ بات چھپے گی تو نہیں۔ کسی دن آپ لوگ اچانک میرے گھر پہنچیں گے تو انہیں گھر مقفل ملے گا۔ کال بیل کا جواب بھی نہیں ملے گا تو وہ موبائل پر تم سے رابطہ کریں گے یا انہیں پڑوس میں ہی کسی سے حقیقت کا علم ہوجائے گا۔ وہ صورتِ حال ان کے لیے زیادہ پریشان کن ہوگی۔''

''ٹھیک تو سمجھایا اس نے تمہیں!'' باپ نے کہا۔

''جی۔'' نوشابہ نے کہا۔ ''بس اسی لیے میں اس وقت چلی آئی۔''

''کم از کم فون تو کردیتیں کہ آرہی ہو۔''

''زید پر اتنا غصہ تھا کہ فون کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔''

''اب تم ان لوگوں کے سونے کا بندوبست کرو۔'' نوشابہ کے والد نے اس کی ماں سے کہا۔ ''فیصل تو میری گود میں ہی سوگیا ہے۔''

''انتظام کیا کرنا ہے۔'' نوشابہ کی والدہ نے کہا۔ ''نرگس کا کمرا ہے تو سہی...... جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی، ویسا ہی ہے۔''

نرگس نوشابہ کی چھوٹی بہن تھی جس کی کچھ ہی عرصے پہلے شادی ہوئی تھی۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' نوشابہ کے والد نے کہا۔ ''فیصل کے لیے چھوٹا کمرا کل دن میں ٹھیک کروادینا۔''

اس طرح نوشابہ اپنی چھوٹی بہن کے کمرے میں پہنچ گئی۔ فیصل کو اس نے بستر پر لٹا دیا اور اٹیچی کیس سے اپنا اور فیصل کا ضروری سامان نکالنے لگی۔ اس نے اپنے اداس چہرے پر جو نقاب ڈال لیا تھا، وہ کمرے میں آتے ہی اتر گیا۔ اتنی دیر تک ضبط کرتے کرتے اس کے اعصاب ٹوٹنے لگے تھے اس لیے اب اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبانے لگیں۔

اگرچہ جو کچھ ہوا تھا، اس کی ذمے دار وہ خود تھی لیکن اس کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں رہا تھا۔

اس نے فیصل کی کتابیں، اسکول کا یونیفارم اور اپنی ضرورت کا کچھ سامان نکالا اور اٹیچی کیس سے نکالا ہوا فریم ہاتھ میں لیے وہ بستر پر لیٹ گئی۔

فریم میں زید کے مسکراتے ہوئے چہرے کی تصویر تھی جو نوشابہ اپنے ساتھ لانا نہیں بھولی تھی۔ زید سے اسے اتنا ہی پیار تھا، اتنی ہی محبت تھی کہ اس سے الگ ہونا اس کے لیے ایک جگر خراش عمل تھا لیکن اب اس کے لیے صورتِ حال ہی ایسی ہوگئی تھی کہ وہ یہ اقدام اٹھائے۔

زید کی عجیب وغریب نفسیاتی کیفیت اس کے لیے دو ڈھائی سال سے اذیت کا باعث بنی ہوئی تھی۔ عجیب عجیب حرکتیں ہوتی رہتی تھیں اس سے عجیب عجیب الفاظ نکلتے رہتے تھے اس کے منہ سے اور جب اسے بعد میں یاد دلاؤ تو وہ کہتا تھا کہ اسے تو ایسا کچھ یاد ہی نہیں۔

اس کی یہ کیفیت دفتر میں کبھی نہیں ہوئی تھی ورنہ نوشابہ اس سے محبت ہوجانے کے بعد اس سے شادی کرنے کے بارے میں ہزار بار سوچتی۔

اس کی انہی کیفیات میں سے ایک کیفیت کی شدت اس وقت آئی تھی جب نوشابہ حاملہ ہوئی تھی۔

''یہ بچہ دنیا میں آئے گا تو نہ جانے کب مجھے قتل کر بیٹھے۔''

پھر غالباً فیصل چار سال کا ہوچکا تھا تو زید نے اسی سے پوچھنا شروع کردیا تھا کہ ''تم مجھے کب قتل کروگے بیٹا!''

اور اب طلاق کی بات ہوئی تھی تو بھی اس کی زبان پر یہی جملہ آیا تھا۔

کسی وقت زید کا موڈ کچھ زیادہ خوش گوار ہوتا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی کہ اسے کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔

لیکن اس بات پر زید کا موڈ یکلخت خراب ہوجاتا تھا اس لیے کچھ دن بعد نوشابہ نے اس سے یہ کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

''صبر کر نوشابہ!'' اس نے اپنے دل میں کہا تھا۔

پھر فرانس جانے سے کچھ دن پہلے تو ایک خوف ناک واقعہ پیش آیا۔ اس دن شام کو نوشابہ کے موبائل پر ایک کال آئی۔ کال کرنے والا اس کے کالج کے زمانے کا ایک لڑکا واجد تھا۔ وہ اس وقت نشے میں تھا یا نہیں، یہ تو نوشابہ نہیں سمجھ سکی تھی لیکن اس کی بے ہودہ باتوں پر اسے غصہ آگیا تھا۔ اس نے ڈانٹ پھٹکار بھی کرڈالی تھی پھر فون بند کردیا تھا۔ زید اس وقت قریب ہی موجود تھا۔ اس نے نوشابہ کی ڈانٹ پھٹکار سن لی تھی۔ اس نے اس بارے میں سوال کیا تو نوشابہ نے اسے بتا بھی دیا تھا کہ کالج کے ایک شہدے لڑکے نے جانے کیسے اس کا موبائل نمبر معلوم کرلیا تھا اور اب اس سے بے ہودہ باتیں کررہا تھا۔ وہ باتیں ایسی تھیں جو نوشابہ اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی لیکن زید کے بہت زیادہ کریدنے پر اس نے وہ ساری باتیں بتادی تھیں اور وہ سب کچھ سن کر زید کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔

"ارے بھول جائیے یہ سب!" نوشابہ نے اس سے کہا تھا۔ "شہدوں کی یہ حرکتیں اب عام بات ہے۔"

زید نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا اور نوشابہ گھر کے کسی کام میں معروف ہوگئی تھی۔

دوسرے دن زید رات کو دیر سے آیا۔ ان دنوں اس کے پاس کوئی اسائنمنٹ نہیں تھا، عموماً پانچ بجے تک واپسی ہو جاتی تھی لیکن جب سات بج گئے اور وہ نہیں آیا تو نوشابہ نے اس کے دفتر فون کیا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ صبح آیا تو تھا لیکن اپنے کسی ذاتی کام سے چھٹی لے کر چلا گیا تھا۔ اس سے پہلے نوشابہ اس کے موبائل سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش میں ناکام ہو چکی تھی۔ زید کا موبائل بند ملا تھا۔ دفتر سے یہ اطلاع سننے کے بعد اس کی تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ فیصل کو تو اس نے کچھ کھلا پلا کر سلا دیا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ وہ بے چینی سے وقت گزارتی رہی۔ وہ بھی اس طرح کہ کبھی خواب گاہ میں ہوتی، کبھی لاؤنج میں چلی جاتی اور وہاں ٹہلتی رہتی۔ دو مرتبہ زید سے موبائل پر بھی رابطہ کرنا چاہا تھا لیکن اب بھی دونوں مرتبہ موبائل بند ملا تھا۔ اس طرح اس کی تشویش بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔

شاید گیارہ بجے یا اس کے بعد کا وقت تھا کہ اس نے کار کے انجن کی آواز سن کر اطمینان کی سانس لی۔ وہ زید کی کار کے انجن کی آواز پہچانتی تھی۔ اسے سن کر وہ اپنی خواب گاہ میں آگئی۔ اسے غصہ آنے لگا تھا کہ زید نے اسے اتنا پریشان کیا۔ کم از کم موبائل پر تو رابطہ کر لیتا۔

پھر کچھ وقت گزر گیا۔ اتنی دیر میں زید کو خواب گاہ میں آجانا چاہیے تھا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے اٹھی اور پھر اسے کچھ عجیب سی آوازیں سنائی دیں تو اس کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ آواز کہاں سے آرہی تھی۔ وہ اپنی خواب گاہ سے نکل آئی اور ایک طرف بڑھنے لگی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ آواز کس طرف سے آرہی تھی۔ یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ آواز بنگلے کے باہر سے آرہی تھی۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوئی جو زیر استعمال نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ آواز لان کی طرف سے آرہی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ اس وقت آواز آنا بند ہو گئی تھی لیکن نوشابہ نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ محسوس کرنے لگی کہ اس کی ٹانگیں بے جان ہونے لگی ہیں۔ اس کے لیے کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ بہ مشکل اپنی خواب گاہ تک لوٹی۔ اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ سی پھیلی ہوئی تھی۔ ذہن پر غبار سا چھانے لگا تھا۔

اسے اندازہ نہیں رہا کہ زید کتنی دیر بعد خواب گاہ میں آیا تھا۔ اس نے تعجب کا اظہار کیا کہ نوشابہ اب تک سوئی نہیں تھی۔ وہ اتنی دیر تک جاگنے کی عادی نہیں تھی۔

زید کے استفسار پر وہ چیخ پڑی۔ "یہ تم نے کیا کیا زید...... یہ تم نے کیا کیا؟" وہ زید کا گریبان پکڑ کر ہذیانی انداز میں چیختی ہی چلی گئی۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور پھر نوشابہ کے والد کمرے میں داخل ہوئے۔

"کیا ہوا نوشابہ؟ کیا ہوا؟"

اس وقت نوشابہ چونکی۔ وہ زید کی تصویر دیکھتے دیکھتے سو گئی تھی۔ پھر اس نے خواب میں وہی سب کچھ دیکھا تھا۔ زید کے آنے پر وہ اس کا گریبان پکڑ کر چیخنے لگی تھی۔

باپ کی آواز سن کر وہ چونکی اور اسے احساس ہوا کہ خواب دیکھ کر اس کی آنکھ کھل گئی تھی لیکن وہ چیختی رہی تھی۔ اس کی وہی چیختی ہوئی آوازیں سن کر اس کے والد دوڑے چلے آئے تھے۔

فیصل کی آنکھ بھی کھل چکی تھی اور وہ نوشابہ سے لپٹا ہوا روہانسی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "کیا ہوا مما! کیا ہو گیا آپ کو......"

"کیا تم نے کوئی خواب دیکھا ہے بیٹی؟" اس کے والد اس کے قریب بیٹھ گئے۔

"جی...... جی......" نوشابہ کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ اس وقت اس کی والدہ بھی کمرے میں آگئیں۔

"کوئی خواب دیکھ کر ڈر گئی ہے۔" والد نے اس کی والدہ کو بتایا۔ "پانی پلاؤ اسے!"

پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس نے فیصل کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

اسے پانی پلایا گیا۔ جب اس کی حالت سنبھل گئی تو والد اور والدہ اسے سونے کی تاکید کر کے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

دوسرے دن زید کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ آنکھ بھی جلدی کھلی تھی۔ کچن میں جا کر اس نے سلائس سینکنے کے لیے ٹوسٹر میں ڈالے اور چائے کے لیے پانی چولہے پر رکھا۔ اسی وقت اسے اپنے کمرے کی طرف سے موبائل کی گھنٹی سنائی دی۔ وہ موبائل ساتھ لے کر کچن میں نہیں آیا تھا۔ وہ کمرے میں لوٹا، کال ریما کی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟" اس نے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

''کمزوری تو محسوس ہو رہی ہوگی۔ میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ اتنی جلدی تمہیں فون کر بیٹھی۔ یہ بھی خیال نہیں رہا کہ اس طرح تمہاری نیند خراب ہوگی۔''

''نہیں، میں جلدی اٹھ گیا تھا۔''

''اچھا میں فوراً آرہی ہوں۔ تمہیں ناشتا کرا کے پھر دفتر جاؤں گی۔''

''نہیں ریما!'' زید نے جلدی سے کہا۔ ''ضرورت نہیں ہے اس کی۔ میں ابھی کچن ہی میں تھا۔ ناشتا تیار ہی سمجھو۔ تم آنا تو بعد میں کسی وقت آجانا۔ دفتر تو میں آؤں گا نہیں۔ چھٹی کی درخواست دے ہی چکا ہوں۔ چائے کے لیے پانی رکھ کر آیا ہوں۔ جل جائے گا سارا پانی۔ میں اب بند کرتا ہوں فون۔''

''ٹھیک ہے۔ تم ناشتا کرو۔'' ریما نے کہہ کر فون بند کردیا۔

ناشتا کرنے کے بعد زید بستر پر لیٹا نوشابہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے وہ دن بھی یاد آیا جب نوشابہ کے کالج کے ایک آوارہ لڑکے واجد نے اسے فون کیا تھا اور بے ہودہ باتیں کی تھیں۔

واجد نے ایسے واہیات جملے کہے تھے جو نوشابہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی تھی لیکن زید کے شدید ترین اصرار پر اس نے ساری باتیں بتادی تھیں۔

ان باتوں نے زید کا خون کھولا دیا تھا۔ یہ بات اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی کہ کوئی اس کی بیوی کے جسمانی خطوط پر ایسے بے ہودہ تبصرے کرے۔

دوسرے دن جب وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا اور نوشابہ کچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی تو زید نے الماری سے شراب کی ایک بوتل نکال کر جلدی سے لے جا کر اپنی کار کی سیٹ کے نیچے رکھ دی تھی۔ اسے یقین تھا کہ واجد جیسے لوگ تو اچھی شراب کیا، ٹھرا بھی پی جاتے ہوں گے۔

دفتر جا کر وہ وہاں ایک گھنٹے رکا، پھر دفتر ہی کے ایک کام کے بہانے وہاں سے روانہ ہوا۔ وہ نوشابہ کے کالج کے کئی مہذب دوستوں کو جانتا تھا جن میں سے کوئی ملازمت کر رہا تھا تو کسی نے کوئی کاروبار شروع کر دیا تھا۔ زید کا خیال تھا کہ ان میں سے کسی کو تو واجد کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی۔

زید کسی طرح بھی واجد کا گھر معلوم کرنا چاہتا تھا، اس سے ملنا چاہتا تھا۔

نوشابہ کے وہ دوست اسے بھی جانتے تھے۔ ابتدا میں

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالہ حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 900 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: مرزا ثمر عباس فون نمبر: 0301-2454188

سرکولیشن منیجر سید منیر حسین 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

اس کی ملاقات جن دو دوستوں سے ہوئی، وہ واجد اور اس کی حرکتوں سے تو واقف تھے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ تیسرے دوست سے ملنے پر زید کی امید بر آئی۔

''وہ آپ کو کیسے یاد آ گیا زید صاحب!'' دوست نے مسکرا کر پوچھا۔ ''وہ ایسا تو نہیں جس سے کوئی شریف آدمی تعلقات رکھنا چاہے۔''

''مجھے اس سے تعلقات نہیں رکھنا ہیں۔''

''تو پھر اس کے بارے میں چھان بین کیوں کر رہے ہیں؟ میرے علم کے مطابق تو آپ ایک مشہور صحافی ہیں، پولیس یا اس جیسے کسی ادارے سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ میں کسی اور وجہ سے چھان بین کر رہا ہوں۔''

''تیسرے درجے کا بدمعاش ہے وہ!'' بتایا گیا۔ ''میں اسے... کچھ زیادہ اس لیے جانتا ہوں کہ میں جس کالونی میں رہتا ہوں، اس کے قریب ہی غریبوں کی ایک بستی بھی ہے۔ واجد وہیں کہیں رہتا ہے۔ اسی طرف ایک سبزی مارکیٹ بھی ہے۔ میں اس طرف جاتا رہتا ہوں۔ ایک دوبار وہ مجھے وہیں ملا تھا۔ ہم ایک ہی کالج میں پڑھے ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ وہ بھی مجھے پہچان سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے ایسی باتیں کی تھیں جیسے بے تکلف ہونا چاہتا ہو لیکن میں ٹال گیا۔ وہ مجھے جس دکان پر ملا تھا، اسی دکان دار نے مجھ سے پوچھا کہ میں واجد کو کیسے جانتا ہوں۔ وہ مجھے ایک شریف انسان کی حیثیت سے جانتا ہے اس لیے اسے واجد سے میرے تعلقات پر حیرت ہوئی تھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ وہ اسی کالج میں پڑھا ہے جہاں میں پڑھتا تھا لیکن اس سے میں نے تعلقات نہیں رکھے۔ اب وہ یہاں نظر آیا تو اس نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی۔ پھر دکاندار نے ہی مجھے بتایا کہ اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس کے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ گھر سے نکلنے کے بعد وہ بہت لوفر قسم کے لوگوں سے مل گیا۔ کوئی واردات بھی کر بیٹھا تھا۔ چھ مہینے کے لیے جیل بھی جا چکا ہے۔''

''اس کا گھر بھی دیکھا آپ نے؟''

''اس دکاندار کو معلوم ہوگا۔ میں نے اس سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔''

''اس دکان کی نشاندہی کر دیں۔ میں اس سے معلوم کروں گا۔''

''ابھی تک آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ آخر اس کے بارے میں......''

''دراصل۔'' زید نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ''میں شہر کے اس قسم کے لوگوں کی نفسیات سمجھنا چاہتا ہوں۔ اس بارے میں اپنے اخبار کے لیے ایک رپورٹ تیار کرنا ہے۔''

''اوہ اچھا، اب بات سمجھ میں آئی۔ تو آپ اس دکاندار سے مل لیں۔ اس کو واجد کے گھر کا پتا ضرور معلوم ہوگا۔ اس نے مجھے اتنا تو بتایا تھا کہ وہ اسی بستی کے ایک مکان میں اکیلا رہتا ہے۔ میں نے ضروری نہیں سمجھا کہ اس کا ٹھیک ٹھیک پتا پوچھوں۔''

یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد اور نوشابہ کے اس کالج فیلو کے اصرار پر چائے پینے کے بعد زید وہاں سے رخصت ہوا۔ اس وقت ایک بجنے والا تھا۔

زید نے کار کی رفتار کم کی اور سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اگر وہ اپنی کار میں واجد کی بستی کا رخ کرتا تو لوگ اس کی طرف ضرور متوجہ ہوتے۔ سوچتے سوچتے ایک تدبیر اس کے ذہن میں آ ہی گئی۔ اس نے کار ایک ایسی جگہ روکی جہاں قریب ہی پرانے ملبوسات کی دکانیں تھیں۔ وہاں ٹھیلے بھی کھڑے ہوتے تھے۔ وہ متوسط طبقے کے لیے شہر کا سب سے بڑا بازار تھا۔ وہاں سے زید نے معمولی سی شلوار قمیص اور سرخ رنگ کا ایک بڑا رومال خریدا۔ وہاں سے لوٹ کر وہ سامان اپنی کار میں ڈالا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا۔

ڈھائی بجنے والے تھے جب اس نے کار اس کالونی کی ایک گلی میں روکی جہاں نوشابہ کا وہ کالج فیلو رہتا تھا جس سے زید نے واجد کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ اس نے کئی گلیوں میں گھوم کر اس گلی کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ وہاں سناٹا تھا۔

انجن بند کر کے اس نے اپنے کپڑے اتارے اور وہ کپڑے پہن لیے جو اس نے خریدے تھے۔ شلوار قمیص پہننے کے بعد اس نے سرخ رومال مفلر کی طرح اپنی گردن میں ڈال لیا۔ اب اس کی وضع قطع ایک معمولی شخص کی سی تھی۔ مفلر کی طرح کا سرخ رومال بھی لوگ اس طرح گردن میں نہیں باندھتے۔

اب وہ کار سے اترا۔ دروازہ مقفل کیا اور اس بستی کی طرف چل پڑا جہاں واجد رہتا تھا۔

وہ دکان تلاش کرنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی جس سے واجد کا پتا معلوم کیا جا سکتا تھا۔ وہاں سے اس نے بلا وجہ تھوڑا سا سامان خریدا اور جو چیزیں خریدی تھیں ان کی تعریف بھی کی۔

دکاندار بولا۔ ''میں دونمبر مال نہیں رکھتا۔''

''پر اپن تو دونمبر ہے یار!'' زید نے لوفرانہ انداز میں آنکھ مارتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''اور ادھر ہی کہیں اپنا ایک دو نمبری دوست بھی رہتا ہے۔ اسی کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں۔ بہت دن ہوئے جب ایک بار آیا تھا۔ بھول گیا ہوں۔ تم کو تو پتا ہوگا اس علاقے کے ہر گھر کا کہ ادھر کون رہتا ہے۔''

''کس کو ڈھونڈ رہے ہو تم؟'' دکاندار نے پوچھا۔

زید کے حلیے کی وجہ سے دکاندار نے اسے واجد ہی کے قبیل کا شخص سمجھا ہوگا۔

''واجد نام ہے اس کا۔'' زید نے بتایا۔

دکاندار واجد کے گھر سے واقف تھا۔ اس نے زید کو بتادیا۔

زید اپنی اس کامیابی سے مطمئن ہوا اور اس طرف چل پڑا جدھر دکاندار کے بیان کے مطابق واجد کا گھر تھا۔

وہ اس گھر تک پہنچ بھی گیا۔ یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا۔

''اے بھائی صاب!'' اس نے ایک شخص کو روک کر پوچھا۔ ''یہ واجد ہی کا گھر ہے نا؟''

''ہاں جی، اسی کا ہے۔'' جواب ملا۔ جواب دینے والے نے گھر کے دروازے پر بھی نظر ڈالی تھی۔ ''دن میں تو وہ گھر پر بہت کم رہتا ہے۔ رات کو آتا ہے۔ کبھی نہیں بھی آتا۔'' یہ کہہ کر جواب دینے والا آگے بڑھ گیا۔

پانچ چھ گھنٹے کا انتظار...... زید نے سوچا۔

اس کے سر پر ایک دھن سوار تھی جس کے لیے وہ دس گھنٹے بھی انتظار کرسکتا تھا۔ وہ بستی میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ ایک جگہ اسے تنور والا معمولی ہوٹل دکھائی دیا۔ اس نے دوپہر کو کھانا نہیں کھایا تھا۔ یہاں اچھا کھانا ملنے کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی لیکن پیٹ کا جہنم تو پُر کرنا ہی تھا۔

زید نے جیسے تیسے کچھ کھایا، پھر وہاں سے نکل کر ایک چائے خانے کی طرف چل پڑا۔ بستی میں گھومتے ہوئے وہاں اس کی نظر پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ چائے خانے میں فلمی گانوں کے ریکارڈ بج رہے تھے اور اسی بستی کے یا وہاں کے رہنے والوں جیسے لوگ چائے پی رہے تھے۔

زید اس چائے خانے میں جا بیٹھا۔ وہاں لوگوں کی چائے کی پیالیاں دیکھ کر اسے اس خیال سے متلی سی ہوئی کہ ان پیالیوں میں چائے کیسے پیے گا۔

پھر اس وقت اس نے اطمینان کی سانس لی جب ایک شخص کے سامنے اسے ٹھنڈے مشروب کی بوتل نظر آئی۔ اس نے اپنے لیے بوتل ہی منگوالی۔

دو گھنٹے وہاں گزارنے کے لیے اس نے دو بوتلیں پیں، پھر وہاں سے نکل کر اور واجد کے گھر کا ایک چکر لگانے کے بعد ایک اور چائے خانے میں جا بیٹھا۔ کسی طرح وقت تو گزارنا ہی تھا۔

رات تک کا وقت اس نے اسی طرح ادھر ادھر گھومتے ہوئے گزارا۔ اندھیرا پھیلنے کے آدھے گھنٹے بعد اس نے واجد کے گھر کا تیسرا چکر لگایا۔ ذہن میں آنے والے اس خیال سے وہ پریشان تھا کہ شاید آج رات واجد گھر نہ لوٹے۔

لیکن اس وقت اس نے سکون کی سانس لی جب ایک شخص کو اس گھر کا قفل کھولتے ہوئے دیکھا۔ اس کے خیال میں اس طرح قفل کھولنے والا واجد ہی ہوسکتا تھا۔

''اے بھائی!'' زید نے بے تکلفانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ادھر کوئی واجد نام کا آدمی رہتا ہے؟''

وہ تالا کھولتے کھولتے رک کر مڑا تو گھٹیا قسم کی شراب کا ایک بھبکا زید کے چہرے سے ٹکرایا۔

''میں ہی ہوں واجد!'' وہ زید کو سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم کون ہو، کیا کام ہے مجھ سے؟''

''مجھے کسی نے بھیجا ہے تمہارے پاس!''

''کس نے؟''

''ایک بڑا آدمی ہے۔ اسے مجھ جیسے اور تم جیسے دو آمیوں کی ضرورت ہے کسی کام کے لیے۔ مجھے تو جانتا ہے وہ پہلے سے۔ تمہارا نام بھی اس نے کسی سے سنا ہوگا۔ اسی نے بتایا تھا تمہارا نام۔ گھر تو بڑی مشکل سے ملا۔''

''مشکل سے کیوں؟ بستی میں سب جانتے ہیں واجد بادشاہ کو۔'' وہ سینہ پھلا کر بولا۔ وہ خاصے نشے میں تھا۔

''تو پھر بولو۔'' زید نے کہا۔ ''کام کے چالیس ہزار دے رہا ہے وہ۔ بیس ہزار میرے ہوں گے اور بیس ہزار تمہارے۔''

''پیسے والا آدمی ہے؟''

''ہاں۔''

''تو پھر ایک ہی کام ہوگا۔ کسی لونڈیا کو اٹھوانا ہوگا۔''

''بالکل یہی بات ہے۔''

''کسی چھوٹی موٹی جگہ سے اٹھانا ہے تو چالیس ہزار ٹھیک ہیں۔'' واجد نے کہا۔ ''کوئی بڑا پھڈا ہو تو چالیس ہزار سے بات نہیں بنے گی۔''

''اس نے تو مجھے یہی بتایا ہے کہ ہم اسے اس کے گھر سے بھی اٹھا سکتے ہیں۔ کسی بڑے گھر کی لڑکی کو تو اس کے گھر سے اٹھانا مشکل ہے۔''

''کہاں سے اٹھانا ہے؟ اور روکڑ کس طرح ملے گا؟''

''روکڑا اسی سے ملے گا۔ ابھی چلنا ہوگا اس کے پاس .... وہ بتائے گا لڑکی کا نام پتا۔ تصویر بھی دے گا۔''

''رکشا کرنا پڑے گا؟''

''نہیں۔ اس نے تمہیں تلاش کرنے کے لیے مجھے کار دی ہے۔ کالونی میں کھڑی ہے۔''

''اپنی کار دے دی؟'' واجد حیرت سے بولا۔

''اس کے پاس کوئی ایک کار تھوڑی ہے۔''

''کار دے دی۔'' واجد بڑبڑایا۔ اس کے چہرے سے اس کے شبہے کا اظہار ہونے لگا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بات ہو کہ پولیس نے اسے پھانسنے کے لیے کوئی جال بُنا ہے۔

''دیر نہیں کرنا ہے یار......! وہ نقد روپیہ لیے بیٹھا ہے۔ کام بھی ہمیں آج دو تین گھنٹے میں کرنا ہے۔''

''چالیس کم ہیں۔'' واجد بولا۔

''چل کر بات کرلو۔ وہ پچاس بھی دے سکتا ہے۔ میں تو اس لیے راضی ہو گیا کہ پھر کبھی اسے بڑے کام کے لیے بھی ہمارا ہی خیال آئے گا۔ زیادہ پیسا بھی ملے گا۔ اگر تمہارا دل نہیں مان رہا ہے تو چھوڑو۔ میں واپس جا کر اسے بتا دیتا ہوں۔''

''چل یار!'' واجد نے زید کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''جانا کتنی دور ہے؟''

''کار سے آدھے پون گھنٹے کی بات ہے۔ تمہیں بوریت بھی نہیں ہوگی، پیتے ہوئے چلیں گے۔''

''ہے تمہارے پاس؟'' واجد نے جلدی سے پوچھا۔

''بہت ہی مہنگی۔ اسی نے دی تھی کہ لو مزے کرو۔''

''بلیک لیبل؟'' واجد نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بلیک لیبل کیا بیچتی ہے اس کے آگے۔'' زید نے مڑتے ہوئے کہا۔ ''ٹائم نہیں ہے، بارہ بجے سے پہلے کرنا ہے۔ لڑکی کا باپ کسی ٹیکسٹائل مل میں ہے۔ بارہ بجے گھر آجاتا ہے۔ ابھی تو وہ اکیلی ہوگی۔''

واجد اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ''غریب گھر کی ہے؟''

''ہاں، لیکن ہوگی ایسی کہ سیٹھ اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔'' زید نے بائیں آنکھ دبا کر کہا۔ ''یہ بھی کہا ہے اس نے کہ وہ اسے دو دن اپنے پاس رکھ کر ہمیں دے دے گا۔ کوئی جگہ ہے تیرے پاس؟''

''اپنا گھر جو ہے۔ تو وہ ہمیں دے دے گا۔ لڑکی کا باپ رپورٹ تو کرائے گا؟''

''اس کے علاقے کے تھانے کا انچارج سیٹھ کا دوست ہے۔ وہ معاملہ دبا دے گا۔ ابھی سیٹھ کے ساتھ وہ بھی ملے گا نہیں۔''

کار تک پہنچتے پہنچتے زید نے واجد کا شوق اور بھڑکا دیا۔ سب سے زیادہ اطمینان تو واجد کے لیے یہ تھا کہ پولیس کی طرف سے خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔

زید نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ واجد کو اپنے برابر میں بٹھایا اور سیٹ کے نیچے سے بوتل نکال کر واجد کی طرف بڑھائی۔ ''شروع کر۔''

''پیک ہے!'' جاوید نے بوتل ہاتھ میں لے کر دیکھی تھی۔

''ہاں ایک گھونٹ لے کر مجھے دے۔ ایک گھونٹ میں بھی لوں گا۔'' زید نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''مگر اتنی بھی نہیں پینی کہ کام کرنا مشکل ہو جائے۔ بوتل تو بعد میں بھی ہمارے پاس رہے گی۔'' واجد نے بوتل کھول کر ایک بڑا گھونٹ لیا۔ زید چاہتا بھی یہی تھا۔

''گولی!'' واجد بولا۔ ''گولی لگی ہے سینے میں، پر ہے زوردار چیز۔'' وہ اپنا سینہ سہلانے لگا۔ بوتل اس نے زید کی طرف بڑھا دی۔

''نہیں۔'' زید نے کہا۔ ''میں ذرا رک کر لوں گا۔ ٹریفک میں ہیں ابھی۔ اس سے نکل جائیں۔ ایک سنسان راستہ پکڑنا پڑے گا۔''

''چل ٹھیک ہے۔'' واجد کی آواز بھرا گئی۔ اس نے کچھ زیادہ ہی بڑا گھونٹ لے ڈالا تھا۔ جب آدمی پہلے ہی پیے ہوئے ہو تو ہوس اور بڑھ جاتی ہے۔

''چڑھی تو نہیں؟'' زید نے اسے اکسایا۔

''نہیں پیارے! اتنی سی کیا چڑھے گی؟ ایک گھونٹ اور لے لوں؟ ابھی اتنا نشہ نہیں ہوگا کہ کام نہ کر سکوں۔''

''پی لے۔''

واجد نے ایک گھونٹ اور لیا۔

کار اب زیادہ ٹریفک سے نکل کر ایک ایسی سڑک پر تھی جہاں بہت کم ٹریفک تھا۔ دو میل آگے جا کر ایک ایسی سڑک پر مڑا جا سکتا تھا جو اس وقت بالکل سنسان ملتی۔ پھر آٹھ دس میل تک کوئی آبادی ہی نہیں تھی۔ زید کو ادھر ہی جانا تھا۔

''مزہ آ گیا۔'' واجد نے بوتل پر اس طرح ہاتھ پھیرا جیسے اسے اس پر پیار آرہا ہو۔ اس کی آواز میں لکنت آگئی تھی۔ دو گھونٹ میں اس نے دو پیگ سے زیادہ پی لی تھی اور جب گھر لوٹا تھا، تو بھی پیے ہوئے تھا۔

''ایک گھونٹ اور لے لے۔'' زید نے کہا۔ ''پھر مجھے دے۔''

''نشہ......نشہ تو نہیں ہوا مجھے؟'' واجد بولا۔
''تو خاصا دھاکڑ پینے والا لگتا ہے۔'' زید ہنسا۔
واجد نے ایک گھونٹ اور لیا۔
''لے۔'' اس نے بوتل زید کو دی۔
زید نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر بوتل رانوں کے بیچ میں دبائی۔
''تو......تو نہیں...... پیے گا؟'' واجد بولا۔
''آگے ایک پولیس چوکی ہے۔ اس سے آگے نکل کر پیوں گا۔'' زید نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔ ''بعض پولیس والے تو تجھے پہچانتے ہی ہوں گے۔ یہاں بہت کم لائٹ ہے لیکن نظر پڑ سکتی ہے۔'' زید نے کار روک دی۔ ''چل جلدی سے پیچھے جا۔'' وہ خود بھی کار سے اترا۔
واجد نے دروازہ تو کھول لیا تھا لیکن اترنے میں دقت محسوس کر رہا تھا۔ زید نے اسے سہارا دے کر اتارا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیلا۔
''لیٹ جا سیٹ پر!'' زید نے کہا۔ اس دوران میں وہ آگے پیچھے نظریں دوڑا تا رہا تھا اور اسے تسلی ہوگئی کہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ دکھائی نہیں دی تھی۔
واجد کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ اسے سیٹ پر لیٹنے میں بھی دقت ہوئی۔ زید نے اسے پھر سہارا دیا۔
''میں...... میں...... لیٹ جاؤں گا یار!'' واجد نے کہا۔
لیکن زید نے اسے سہارا دیا۔ اسے عجلت تھی۔ اس نے پچھلی سیٹ سے ہی ہاتھ بڑھا کر اگلی سیٹ سے بوتل اٹھائی۔
''تھوڑی سی اور پی لے، پھر بند کروں۔'' زید نے بوتل اس کے منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔
واجد فوری طور پر اور نہیں پینا چاہتا تھا لیکن زید نے زبردستی اس کے حلق میں ایک گھونٹ اور الٹ دیا۔
''ہا......'' واجد نے ایک طویل سانس لی۔
''بس اب خاموش پڑا رہ۔'' زید نے بوتل بند کر کے کہا اور باہر آکر دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس نے انجن اسٹارٹ ہی رکھا تھا۔ کار فوراً حرکت میں آگئی۔ اب اس نے یوٹرن لیا۔ یوٹرن لینے کے بعد اس نے اندرونی لائٹ جلائی اور اس کا زاویہ بدل کر پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے واجد کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔
دس منٹ بعد وہ اس سڑک کے قریب پہنچ جاتا جہاں کچھ ٹریفک رواں ملتا۔
زید نے کار اس سڑک پر پہنچنے سے پہلے ہی پھر روکی۔ اس مرتبہ اس نے انجن بھی بند کیا تھا۔ بوتل لے کر وہ پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر اندر گیا جہاں واجد آنکھیں بند کیے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ زید نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔
''سونے...... دے یار!'' واجد کی آواز منمناتی ہوئی سی تھی۔
''سیٹھ کا گھر آگیا ہے۔'' زید نے کہا۔
''کون...... کون سیٹھ؟'' اب وہ اپنا ہوش بڑی حد تک کھو چکا تھا۔
''تو پھر گہری نیند سو جا۔ ایک گھونٹ اور لے لے۔'' زید نے بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ خود واجد نے بھی منہ کھول دیا تھا۔ زید نے اس بار بھی چاہا کہ ایک بڑا گھونٹ واجد کے حلق میں انڈیل دے لیکن پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکا۔ واجد نے بوتل سے منہ ہٹا لیا تھا۔ کچھ شراب اس کے ہونٹوں سے بہہ کر اس کے کپڑوں پر پھیل گئی تھی۔
''اتنا بھی کافی ہے۔'' زید زیر لب بڑبڑایا۔
بوتل بند کر کے اس نے اگلی سیٹ پر ڈالی اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ وقت دیکھنے کے بعد اس نے سڑک کا جائزہ لیا۔ اس بار بھی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کسی جانب نظر نہ آئیں۔
زید نے پچھلی سیٹ کے دونوں دروازے کھول دیے تاکہ واجد کو زیادہ سے زیادہ ہوا لگ سکے اور شراب کی اثر پذیری بڑھ سکے۔
پندرہ منٹ بعد اس نے دروازے بند کر کے واجد کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس مرتبہ واجد کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ وہ پوری طرح مدہوش ہو چکا تھا۔
''اب تم ہمیشہ کے لیے سو جاؤ۔'' زید نے واجد کو نفرت سے دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر رکھ دیے۔ ''اب نوشابہ کو ہمیشہ اپنے خوابوں میں لاتے رہنا۔''
واجد نے فون پر نوشابہ سے یہ جملہ بھی کہا تھا۔
زید نے یکلخت واجد کی گردن پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ بڑھایا۔ واجد مچلا لیکن اب اس میں مزاحمت کی زیادہ طاقت نہیں تھی۔ شراب کے باعث بڑی حد تک سلب ہو چکی تھی۔ زید اپنے ہاتھوں کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ جلد ہی واجد کی مزاحمت نے بالکل دم توڑ دیا۔ اب وہ بالکل بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ اس کی زبان باہر نکل پڑی تھی اور آنکھیں اتنی ابل آئی تھیں جیسے کسی بھی لمحے اپنے حلقوں سے ابل کر باہر آجائیں گی۔
زید نے اس کی گردن سے اپنے ہاتھوں کی گرفت ختم کی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس نے اپنی ساری ہی

طاقت صرف کر ڈالی تھی جبکہ شاید اس کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف نفرت کے جذبے نے زید کی ساری طاقت صرف کروا ڈالی تھی۔

زید نے جاوید کی نبض دیکھی، پھر اس کے سینے سے کان لگا کر دل کی دھڑکن کا حال جاننا چاہا اور مطمئن ہو گیا۔ نہ نبض چل رہی تھی، نہ دل دھڑکنے کا احساس ہوا تھا۔ واجد یقینی طور پر مر چکا تھا۔

زید نے اس کا بے جان جسم نشست کے نیچے پائدان میں دھکیل دیا اور پچھلی سیٹ سے اتر کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ انجن اسٹارٹ کر کے وہ کار حرکت میں لے آیا۔ رفتار بھی بڑھانا شروع کی۔ جلد ہی وہ اس سڑک پر پہنچ گیا جہاں تھوڑا بہت ٹریفک تھا۔ زید مطمئن رہا۔ بہت قریب سے گزرنے والی کسی گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اس کی کار کی پچھلی نشست کے پائدان میں پڑا ہوا جسم نہیں دیکھ سکتے تھے۔

کار تیز رفتاری سے چلاتا ہوا وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ ہارن کی آواز سن کر چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ زید کار اس حد تک آگے نکال لے گیا کہ سرونٹ کوارٹر چند فٹ پیچھے رہ جائے پھر وہ کار سے اترا۔ چوکیدار پھاٹک بند کر کے لوٹ رہا تھا۔

''گل زاد کل سے نہیں آیا۔'' زید نے اسے ہزار ہزار کے تین نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے اس کا ایک پڑوسی مل گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ گل زاد کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ تم ابھی ٹیکسی پکڑ کر اس کے گھر جاؤ۔ اسے دو ہزار روپے دے دینا۔''

گل زاد گھر میں مالی کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس طرح زید چوکیدار کو ٹالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے خود پھاٹک بند کیا اور کار میں بیٹھ کر اسے آگے بڑھایا۔ کار گیراج یا پورچ میں لے جانے کے بعد وہ اسے عقبی لان کی طرف لایا۔ وہاں اس نے کار روکی، انجن بند کیا اور اتر کر پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔

واجد کی لاش وہ لان میں ہی دفن کرنا چاہتا تھا۔ زمین کھودنے کے لیے وہ مالی کی کدال استعمال کرتا۔

اس کا خیال تھا کہ زمین کھودنے کی آواز اس کی خواب گاہ تک نہیں پہنچ سکے گی اور اگر پہنچی بھی تو بہت مدھم ہوگی۔ سوتی ہوئی نوشابہ وہ آواز نہیں سن سکے گی۔

اس کام میں اسے ایک گھنٹا لگا۔ اس کے بعد اس نے لان میں لگے ہوئے نل سے ہی اپنے ہاتھ دھوئے، بکھرے ہوئے بال درست کرتا ہوا وہ اپنی کار کی طرف گیا۔

کار گیراج میں کھڑی کر کے وہ گھر میں داخل ہوا۔ اس کی عدم موجودگی میں گھر کا بیرونی دروازہ بند نہیں ہوتا تھا۔ چوکیدار اور مالی اس کے بھروسے کے آدمی تھے۔

اپنی خواب گاہ کا دروازہ اس نے بہت آہستگی سے کھولا تاکہ نوشابہ کی آنکھ نہ کھلے لیکن اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی نوشابہ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی سنجیدگی میں وحشت بھی تھی۔

''تم ابھی سوئی نہیں؟'' زید نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''زید!'' نوشابہ کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ''لان میں تم نے کسے دفن کیا ہے؟''

زید دم بخود رہ گیا۔ اسے ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ نوشابہ نے وہ سب کچھ دیکھ لیا ہوگا۔

زید چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر آگے بڑھ کر نوشابہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ''کسی کو قتل کیا ہے تم نے زید!'' نوشابہ کا انداز ہذیانی تھا۔

''کول ڈاؤن...... کول ڈاؤن۔'' زید اسے بستر کی طرف لے گیا۔ ''بھول جاؤ اسے جو تم نے دیکھ لیا ہے۔''

''کسے قتل کیا ہے تم نے زید؟'' نوشابہ اس مرتبہ روہانسی ہو گئی۔

''واجد کو۔'' زید نے اسے بستر پر بٹھا دیا اور اس کے گال تھپکتے ہوئے بولا۔ ''میں ایسے لوگوں کو معاف نہیں کر سکتا جو میری بیوی سے ایسی باتیں کریں۔ انہیں خواب میں دیکھیں اور......'' زید چپ ہو گیا۔ آگے کی بات ایسی نہیں تھی جو وہ اپنی زبان پر لا سکتا۔ وہ نوشابہ سے بھی یہ بات بہ مشکل اگلوا سکا تھا۔

''سکون سے لیٹ جاؤ۔'' زید نے اسے بہ آہستگی لٹا دیا اور خود بھی اس کے برابر میں لیٹ گیا۔ اس نے فوری طور پر کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے۔ ''بس اپنی زبان بند رکھنا ہمیشہ۔ تم یقیناً مجھے پھانسی کے تختے پر دیکھنا نہیں چاہو گی۔ میں نے جو کچھ کیا ہے، اس سے اندازہ لگا لو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں واجد جیسے لوگوں کا وجود زمین پر برداشت نہیں کر سکتا۔''

نوشابہ اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔

''اگر پولیس کو معلوم ہو گیا تو؟'' وہ سسکتی ہوئی بولی۔

''نہیں معلوم ہوگا۔ بہت سوچ سمجھ کر طریقے سے ختم کیا ہے اسے۔ بس تمہاری زبان بند رہنا چاہیے۔ اس

بارے میں اب بات بھی نہ کرنا۔“

وہ بہ مشکل تمام نوشابہ کو پُرسکون کرسکا لیکن مکمل پُرسکون وہ کئی دن میں ہوسکی تھی۔ کئی دن تک وہ باتیں کرتے کرتے گم صم ہوجاتی تھی۔ بتدریج ہی وہ خود کو سنبھال سکی۔ اس کی وجہ سے زید بھی پریشان رہا۔ آخر جب اسے یقین ہوگیا کہ نوشابہ اب بالکل ٹھیک ہوگئی ہے اور معمول کی زندگی گزارنے لگی ہے، تبھی وہ مطمئن ہوسکا۔

☆☆☆

حقیقت یہ تھی کہ نوشابہ نے صرف ظاہری طور پر خود کو پُرسکون کیا تھا۔ واجد کا قتل کسی نہ کسی وقت اس کے دل میں چٹکی لیتا ہی رہتا تھا۔ زید کے ساتھ فرانس بھی اس لیے گئی تھی کہ زیادہ سے زیادہ دھیان بٹا سکے۔

وہاں کیسینو میں ہیرنگٹن کے ساتھ رقص بھی تذبذب کے عالم میں کیا گیا تھا۔ اسے خیال آیا تھا کہ زید کو کہیں یہ بات بھی بری نہ لگے۔ وہ یہ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہاں کی تہذیب سے ناآشنا ہے۔ ہیرنگٹن نے اس سے باتیں بھی بڑے شائستہ انداز میں کی تھیں۔ کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا تھا جسے پست یا گھٹیا کہا جاسکتا۔

لیکن جب واپس آنے پر اس نے ٹی وی کی خبروں میں ہیرنگٹن کے قتل کے بارے میں سنا تھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ اس نے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ زید پیرس میں کسی کو قتل کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ویسے اسے یہ بات بری بہرحال لگی تھی جس کا اس نے اظہار بھی کیا تھا۔

اس رات اگرچہ وہ رات کو خواب گاہ سے غائب تھا لیکن نوشابہ نے خود کو یقین دلایا تھا کہ وہ دوسرے کمرے میں اپنی رپورٹ پر کام کررہا ہوگا۔

ہاں، اس بات کا یقین نوشابہ کو بہرحال تھا کہ زندگی کے کسی خاص واقعے کے سبب زید کے دماغ میں کوئی ذہنی گرہ ضرور پڑگئی تھی۔

کبھی کبھی اسے یہ خیال بھی آتا کہ اسے اپنے بیٹے ہی سے یہ خطرہ تھا کہ وہ اسے قتل کردے گا۔ اس خطرے کو سمجھتے ہوئے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس سے بچنے کے لیے فیصل ہی کو مارڈالتا۔

ازدواجی تعلقات کی بڑھتی ہوئی خرابی کے باعث بھی اسے یہ ڈر رہنے لگا تھا کہ تلخیاں اتنی نہ بڑھ جائیں کہ طلاق کی نوبت آجائے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کی علیحدگی خراب حالات کی وجہ سے ہو اور وہ پھر کبھی زید سے ملنا تو درکنار کبھی دیکھ بھی نہ سکے۔ وہ زید سے بہت محبت کرتی تھی۔ اسی لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ زید سے الگ رہنے لگے۔ طلاق کا مطالبہ کرتے وقت اسے یقین تھا کہ زید اسے طلاق نہیں دے گا۔ وہ بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا لیکن اس مطالبے کو جواز بنا کر وہ زید سے علیحدگی ضرور اختیار کرسکتی تھی اور یہ اس نے کرلیا تھا۔

علیحدگی اختیار کرنے کا ایک سبب یہ خطرہ بھی تھا کہ زید کہیں فیصل کو قتل نہ کر بیٹھے۔ عورت اپنے شوہر سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرتی ہو، وہ اولاد کی محبت سے زیادہ نہیں ہوتی۔

زید سے محبت ہی کے باعث وہ اس کی ایک تصویر بھی اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ طلاق کی بات کرتے وقت اس نے زید کا یہ مطالبہ بھی تسلیم کرلیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے ضرور ملتا رہے۔ اس بہانے نوشابہ کو اسے دیکھنے کا، اس سے دو ایک باتیں کرنے کا موقع تو مل جاتا۔

والدین کو اس نے ایک جھوٹی کہانی سنادی تھی تاکہ فوری طور پر کوئی ہنگامی صورتِ حال پیدا نہ ہو۔ آگے چل کر تو بات کھلنی ہی تھی۔ جھوٹی کہانیاں زیادہ عرصے تک نہیں چلتیں۔

ایک دن بعد وہ ٹیکسی کرکے فیصل کو اسکول چھوڑنے گئی۔ پرنسپل کو اس نے بتایا کہ وہ فیصل کو اسکول چھوڑنے خود آیا کرے گی لہٰذا اسکول کی گاڑی نہ بھیجی جائے۔

یہ فیصلہ اس نے اس لیے کیا تھا کہ فیصل اسکول کے علاوہ ہر وقت اس کی نظر میں رہا کرے۔ وہ ہر قسم کی احتیاط برتنا چاہتی تھی۔ اس نے پرنسپل سے یہ بھی کہا کہ اگر زید فیصل سے ملنے آئے تو اسے فیصل کو اسکول سے باہر لے جانے نہ دیا جائے اور اگر زید کوئی سنگین سبب بتا کر لے جانا چاہے تو اس کی تصدیق وہ فون پر خود کرے گی۔

پرنسپل کو اس قسم کی باتیں عجیب سی لگی تھیں لیکن اسے کوئی سوال کرنے کا حق نہیں تھا تاہم اس نے سوچا ضرور ہوگا کہ شاید میاں بیوی کے درمیان کسی قسم کی کشیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ خیال نوشابہ کو بھی تھا کہ پرنسپل یہ بات سوچ سکتی ہے لیکن نوشابہ کو اس کی پروا نہیں تھی کہ پرنسپل کیا سوچ سکتی ہے یا کیا سوچے گی۔

جب وہ اسکول سے لوٹی تو اس کی ماں نے کہا۔ ”تم کار کیوں نہیں لائیں؟“

”کل بتایا تو تھا میں نے۔ کچھ تلخی ہوگئی تھی اس لیے میں نے غصے میں کار کی چابی نہیں لی، ٹیکسی کرکے آگئی۔“

”یہ بھی اچھا نہیں لگے گا کہ تم فیصل کو اسکول چھوڑنے یا واپس لانے کے لیے ٹیکسی میں جاؤ اور ٹیکسی سے واپس آؤ۔“

''مجبوری ہے مما!''

''تمہارے والد آجائیں دفتر سے۔ ان سے بات کروں گی۔ وہ کوئی مناسب بندوبست کریں اور ہاں اسکول کی گاڑی یہاں بھی تو آسکتی ہے۔''

نوشابہ کو خیال تھا کہ اس قسم کی بات ہوسکتی ہے لہٰذا اس نے اس کا جواب بھی سوچ لیا تھا۔ ''وجہ ہے مما!'' اس نے کہا۔ ''زید کے نہ ہونے سے میرا ذہن کچھ منتشر رہے گا۔ فیصل کے معاملے میں یہ ذمے داری اپنے سر لینے سے میرا کچھ وقت اس ذمے داری کی طرف بھی لگا رہے گا۔''

''تو بھی ٹیکسی مناسب نہیں۔ تمہارے والد اتنے دن کے لیے کوئی کار خرید لیں جتنے دن زید برما میں رہتا ہے بلکہ گاڑی خرید ہی لیں۔ مجھے بھی کسی وقت کہیں جانا ہوتا ہے تو انہیں دفتر فون کرکے ان کی گاڑی منگواتی ہوں۔ شوفر لے کر آتا ہے۔''

''جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' نوشابہ نے بات ختم کی۔

اسی دن شام کو اس کے موبائل کی گھنٹی بجی اور اس نے اسکرین پر زید کا نمبر دیکھا تو اس کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوگئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور دھیمی آواز میں بولی۔ ''امید ہے آپ نے طلاق نامہ تیار......''

''سنو!'' زید نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ابھی تک تمہارا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا ہے؟''

''میں نے ایسی کوئی بات تو نہیں کی تھی جسے تم میرا غصہ کہہ رہے ہو۔''

''تم یہاں سے گئی اسی طرح تھیں۔ تم طلاق کے مسئلے کو خوش اسلوبی سے طے کرنا چاہتی ہو تو مجھ سے کہہ سکتی تھیں کہ میں تمہیں چھوڑ آؤں۔ ٹیکسی کی کیا ضرورت تھی؟''

''اسے تم میری جھنجلاہٹ سمجھ لو۔ میں غصے میں نہیں تھی۔''

''خیر! میری تو کل طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ تمہیں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کے لیے خاصا وقت مل گیا ہے۔''

''کیا طبیعت خراب ہوئی تھی؟'' نوشابہ نے جلدی سے پوچھا۔

زید ہنسا۔ ''بے چین ہوگئی نا؟ محبت کرتی ہو تم مجھ سے؟''

''میں نے کب کہا کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔ محبت تو مجھے تم سے ہمیشہ رہے گی۔ طلاق تو حالات کی وجہ سے وقت کا تقاضا ہے۔ میں اس کے لیے کسی ناخوشگوار وقت کا انتظار کیوں کروں۔''

''یعنی تمہارا مطالبہ بدستور قائم ہے؟''

''ہاں۔''

زید نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں اپنے بیٹے سے کس طرح ملا کروں گا؟''

''یہ بات طے کی جاسکتی ہے۔ میں کب چاہتی ہوں کہ تم فیصل سے نہ ملو۔ یہ تو تمہارا حق ہے۔''

''ایک دن اور سوچ لو۔''

''دس دن بعد بھی میرے فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔''

''اچھا تو سنو!'' زید کے لہجے میں سختی آگئی۔ ''میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا اور تنہا زندگی بھی نہیں گزاروں گا۔ دوسری شادی کرلوں گا۔''

ازخود طلاق کا مطالبہ کرنے کے باوجود اس خیال سے نوشابہ کے دل کو جھٹکا لگا کہ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی لے لے گی۔

زید کہتا رہا۔ ''تم مقدمہ کرنا چاہو تو کردینا۔ دیکھ لوں گا میں سب۔''

''میں کوئی مقدمہ نہیں کروں گی۔'' نوشابہ کی آواز کچھ بھرا گئی۔ ''تم شوق سے دوسری شادی کرلینا۔ میں تمہاری دشمن تو نہیں ہوں کہ تمہیں تنہائی کی زندگی گزارنے کی اذیت پہنچاؤں۔ میں خلع لینے کے لیے بھی عدالت کا رخ نہیں کروں گی لیکن اب ہم ساتھ کبھی نہیں رہیں گے۔''

''میں ضرور دوسری شادی کرلوں گا، تم میرے خلاف کوئی قدم اٹھاؤ یا نہ اٹھاؤ۔'' زید نے کچھ غصے سے کہا اور کوئی جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

نوشابہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ اب اس کی زندگی کی باقی راتیں اس تکلیف کے ساتھ گزرتیں کہ اس کے بجائے کوئی اور لڑکی زید کے ساتھ ہے۔

☆☆☆

چھٹیوں کے دن زید نے گھر میں ہی گزارے تھے اور نہ جانے کیا سوچتا رہا تھا۔ ریما اور ابصار اس سے ملنے آتے رہے تھے البتہ نیلم پہلے دن کے بعد پھر نہیں آئی تھی۔ ریما کا معاملہ اس کے برخلاف تھا۔ وہ دو مرتبہ رات کو دوبارہ بھی اس سے ملنے آئی تھی اور دونوں مرتبہ اس کے لیے تازہ کھانا لے کر آئی تھی جبکہ ڈیپ فریزر میں نوشابہ کئی ڈشز رکھ کر گئی تھی۔ دس دن تک بھی زید کو کھانے کے لیے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔

''میں تو ڈیپ فریزر کا کھانا ایک دن بعد بھی نہیں کھا سکتی۔'' ریما نے کہا تھا۔ ''اچھا ہی نہیں لگتا۔ تمہارے لیے بھی اس خیال سے لاتی رہی ہوں کہ شاید تمہیں بھی اچھا نہیں لگتا ہو۔''

لیکن زید سمجھ گیا تھا کہ ریما نے بار بار اس کے پاس آنے کے لیے بہانہ تراشا تھا۔ خاصے عرصے پہلے ہی زید نے ریما میں تبدیلی محسوس کرلی تھی، اپنی طرف اس کا جھکاؤ محسوس کرلیا تھا، وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔

وہ چاروں کیونکہ بے تکلف تھے اس لیے ابصار ایک مرتبہ ریما کو چھیڑ بھی چکا تھا۔ ''تم اپنی شادی کے بارے میں کیوں نہیں سوچ رہی ہو......؟ خاصی عمر ہوگئی ہے تمہاری۔''

ابصار کا انداز چھیڑنے کا تھا لیکن ریما نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ ''امکان نہیں ہے کہ میری شادی ہوسکے۔''

''کیوں بھئی!'' ابصار ہنسا تھا۔

''جس سے میں شادی کرنا چاہتی ہوں، وہ پہلے ہی شادی کرچکا ہے۔''

''تو پھر وہ زید ہی ہوگا۔'' نیلم بول پڑی تھی۔

''یہ بکواس ضرور کروگی تم!'' ریما نے چیخ کر کہا تھا۔

زید کی بات آنے پر وہ نیلم سے اسی قسم کے جملے کہا کرتی تھی۔

ان باتوں کے وقت زید موجود نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اسے بعد میں ابصار سے معلوم ہوا تھا۔

نوشابہ سے اپنے تعلق کے بارے میں زید نے بھی انہیں بتادیا تھا۔ یہ بات ایسی تھی جو زیادہ عرصے چھپائی نہیں جاسکتی تھی۔ گھر میں نوشابہ کی عدم موجودگی کے بارے میں وہ کب تک جھوٹ بول سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ اس کے قریبی دوست تھے۔

ابصار اور ریما نے اس پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔ ابصار نے تو یہ پیشکش بھی کی تھی کہ وہ نوشابہ کے گھر جاکر اسے سمجھانے کی کوشش کرسکتا ہے لیکن زید نے اسے روک دیا تھا۔

''وہ کسی کی نہیں سنے گی۔'' زید نے کہا تھا۔ ''اگر اسے رام کرسکتا ہوں تو میں ہی کرسکتا ہوں۔''

''تو کوشش کی تم نے؟''

''آج ہی فون کیا تھا۔''

''کیا کہا نوشابہ نے؟''

''وہ اپنے مطالبے پر اڑی ہوئی ہے۔ میں نے اسے یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ میں دوسری شادی کرلوں گا اور اسے طلاق بھی نہیں دوں گا۔''

زید نے ان دونوں کو وہ ساری باتیں بتادیں جو فون پر نوشابہ سے ہوچکی تھیں۔ اس موضوع پر خاصی دیر تک بات ہوئی لیکن زید نے ابصار کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ جاکر نوشابہ کو سمجھائے۔

اس کے بعد ریما نے بھی وہی پیشکش کی جو ابصار کر چکا تھا لیکن زید نے اس کی بھی نہیں سنی۔

''نیلم نہیں آئی پہلے دن کے بعد۔'' زید نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

''بتا رہی تھی کہ کچھ مصروفیت ہوگئی ہے لیکن تمہارے بارے میں روزانہ ہی پوچھتی رہی ہے۔'' ریما نے بتایا۔

''دفتر کے معاملات کیسے چل رہے ہیں؟'' زید نے ایک اور سوال داغا۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ دوبارہ نوشابہ کے بارے میں بات نہ ہو۔

پھر جس دن زید کی چھٹی ختم ہو رہی تھی، ابصار دوپہر کو ہی آگیا۔

''دفتر نہیں گئے آج؟ خیریت؟'' زید نے پوچھا۔

''رات کو گھر میں ایک چھوٹی سی تقریب تھی۔ تین بجے سو سکا تھا۔ اسی لیے جاگا بھی گیارہ بجے کے بعد تو سوچا کہ اب چھٹی ہی کرلی جائے۔ ناشتا کرکے تمہاری طرف نکل آیا۔'' ابصار نے جواب دیا۔

''کل سے تو میں بھی دفتر آؤں گا۔''

''میرا تمہارے گھر آنے کا ایک سبب یہ بھی تھا...... دفتر میں تو زیادہ بات نہیں ہوسکتی۔''

''کیا کوئی لمبی چوڑی بات ہے؟''

''نہیں، کچھ ایسی لمبی چوڑی بھی نہیں ہے۔ ایک بار پھر نوشابہ کے گھر جانے کے لیے تم سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔''

''میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اگر وہ کسی کی بات سمجھ سکتی ہے تو صرف میری...... اور آج مجھے یقین ہوگیا کہ وہ میری بھی نہیں مانے گی۔ آج میں نے اسے دوسری بار فون کیا تھا۔ اب تو مجھے غصہ بھی آگیا ہے۔ پہلے تو میں نے اسے دوسری شادی کی صرف دھمکی دی تھی لیکن آج فیصلہ کرلیا ہے کہ میں دوسری شادی کرلوں گا۔''

ابصار کے چہرے پر تشویش کے آثار گہرے ہوگئے۔

''فیصل سے میں ملتا ہی رہوں گا۔'' زید نے بات جاری رکھی۔ ''یہ طے کرلیا ہے نوشابہ سے! چھٹی کے دن میں اس کے گھر چلا جایا کروں گا ایک آدھ گھنٹے کے لیے۔''

''نوشابہ کے والدین......''

''وہ بتاچکی ہے انہیں۔'' زید نے بات کاٹ دی۔

''یہ اس کی جذباتی بات بھی ہوسکتی ہے کہ وہ تم پر مقدمہ نہیں کرے گی اور خلع کے لیے بھی عدالت کا رخ نہیں کرے گی۔''

''دوسری صورت میں تو میں اسے کوئی ایسی سزا دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں تم سے کہ آج مجھے غصہ آگیا ہے۔''

''دوسری شادی کے بارے میں تمہارا فیصلہ قطعی ہے؟''

''سو فیصد۔''

ابصار قدرے رک کر بولا۔ ''ریما کے بارے میں تمہارے خیالات کیا ہیں؟''

زید مسکرا دیا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس کے جذبات سے بے خبر ہوں؟ بہت عرصے سے جانتا ہوں میرے دوست کہ میری طرف اس کا جھکاؤ بہت ہے۔''

''تمہیں بھی پسند ہے وہ؟''

''دوسری شادی کا فیصلہ کرنے کے بعد سے میرے ذہن میں ریما ہی ہے۔''

''ہوں۔'' ابصار نے سر ہلایا۔ ''ریما اچھی لڑکی ہے۔ کب بات کرنے کا ارادہ ہے اس سے؟''

''کسی وقت بھی کرلوں گا۔ اب تو وہ رات کو میرے لیے کھانا لے کر بھی آتی ہے۔''

''تیار تو وہ ہوجائے گی۔''

کچھ دیر بعد ابصار چلا گیا۔ وہ آیا ہی اس لیے تھا کہ نوشابہ سے بات کرنے کے لیے ایک بار پھر زید سے اجازت لینے کی کوشش کرے لیکن اب معاملہ بہت بگڑ چکا تھا۔

زید کو نوشابہ سے اتنی ہی محبت تھی کہ وہ اس دن بہت ڈسٹرب تھا۔ عموماً وہ دوپہر کا کھانا ڈیپ فریزر سے نکال کر گرم کر کے کھالیا کرتا تھا لیکن اس دن وہ ایسا محسوس کررہا تھا جیسے اس کی بھوک مرگئی ہو۔ اس نے شراب کی بوتل نکال لی۔ عموماً وہ رات کے کھانے سے پہلے ہی پیا کرتا تھا لیکن اس دن اس نے اسی وقت سے پینی شروع کردی۔

دفتر کا وقت ختم ہونے پر معمول کے مطابق ریما اور ابصار کو آنا چاہیے تھا لیکن ابصار نہیں آیا۔

''آج وہ دفتر بھی نہیں آیا۔'' ریما نے بتایا۔

''بتایا تھا اس نے مجھے۔''

''کب؟'' ریما چونکی۔

''دوپہر کو آگیا تھا۔''

''آج تم نے دن میں پینی شروع کردی؟''

شراب کی بوتل اور آدھا پیگ اس کے سرہانے ہی رکھا تھا۔

''ہاں۔'' زید نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ذہن بہت منتشر تھا۔''

''کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا آج؟''

''نوشابہ کو آج بھی فون کیا تھا۔ وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے...... غصہ آگیا تھا مجھے۔''

''ابصار کو تو تم نے روک دیا تھا۔ مجھے اجازت دے دو۔ میں ایک بار اسے سمجھانے کی کوشش کر کے دیکھ لیتی ہوں۔''

زید نے اسے کچھ تعجب سے دیکھا، پھر گلاس اٹھا کر آدھا پیگ ایک ہی سانس میں پی گیا۔

''میں نے سنا ہے کہ اتنی تیزی سے نہیں پینی چاہیے۔''

''مجھے ذہنی جھٹکا لگا تھا تمہاری بات پر۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں کی میں نے زید!''

''نوشابہ کو سمجھانے کی بات کی تھی نا تم نے؟''

''تو اس سے ذہن کو جھٹکا کیوں لگا؟''

زید خفیف سا مسکرایا۔ ''تمہارے لیے میدان صاف ہوگیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''دیکھو ریما!...... دفتر میں بہت عرصہ ہم ساتھ گزار چکے ہیں۔ میرے بارے میں تمہارے خیالات جب نیلم اور ابصار سے چھپے نہیں رہ سکے تو مجھ سے کیسے چھپ سکتے ہیں۔''

ریما کی نظریں جھک گئیں۔

''تم مجھ سے محبت کرتی ہو نا؟'' زید بولا۔

اب جو ریما نے نظریں اٹھائیں تو اس کی آنکھیں کچھ بھیگی ہوئی سی تھیں۔

''لیکن میں خودغرض نہیں ہوں زید!'' اس کی آواز بھی بھرّا گئی۔ ''میں یہ کیسے چاہ سکتی ہوں کہ تمہاری ازدواجی زندگی برباد ہوجائے۔ تم ایک بیٹے کے باپ بھی بن چکے ہو۔ جس سے محبت ہو، کیا اس کی زندگی منتشر ہوتے ہوئے دیکھی جاسکتی ہے؟''

''خوب!'' زید دھیرے سے ہنسا۔ ''تمہارا یہ روپ میرے سامنے پہلی بار آیا ہے۔''

''کیسا روپ؟''

''تم فلسفیانہ انداز میں بھی بات کرسکتی ہو۔''

''یہ فلسفہ تو نہیں زید! جس سے محبت ہو، اسے ٹوٹتے پھوٹتے ہوئے دیکھنا بھی تکلیف دہ ہوتا ہے۔''

''لیکن اب تو میں ٹوٹ پھوٹ چکا ہوں۔''

''میں جب تنہا ہوتی ہوں تو تمہاری اس کیفیت کے خیال سے مجھے بڑی اذیت پہنچتی رہتی ہے۔''

''غیر معمولی خیالات ہیں تمہارے۔''

''میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ محبت اگر سچی ہو یعنی اگر اس

میں کوئی کھوٹ نہ ہو تو اس میں منفی خیالات کا عمل دخل ہو ہی نہیں سکتا۔''

زید نے اسے مستحسن نظروں سے دیکھا اور گلاس میں شراب انڈیلنے لگا۔

''میں آج بہت دل شکستہ ہوں۔ تمہیں مجھ سے محبت ہو تو مجھے پینے سے نہ روکو۔''

''گلاس بھی تم نے پورا بھر لیا ہے۔ پانی نہیں ملاتا کیا؟''

''اب تک پانی ملا کر ہی پی ہے لیکن اب ایسے ہی پی لینا چاہتا ہوں۔ میں جس کرب میں ہوں، اس سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا ہوں۔''

''میرے بارے میں تمہارے کیا احساسات ہیں؟''

''اگر میں تمہارے اس خیال کو غلط نہیں سمجھا ہوں تو میرا جواب یہ ہے کہ تمہاری محبت نے میرے دل میں بھی تمہارے لیے محبت پیدا کر دی ہے اور ابھی تم نوشابہ کی نسبت سے جو باتیں کر چکی ہو، انہوں نے تو مجھے گرویدہ ہی کر دیا ہے تمہارا۔ تم ابصار سے پوچھ لینا۔ دوسری شادی کے سلسلے میں صرف تم ہی میرے ذہن میں آئی تھیں۔'' زید نے گلاس رکھ کر اپنا موبائل اٹھایا۔ ''میں تمہیں ابصار کی آواز سنانا چاہتا ہوں، یہاں ذرا قریب آجاؤ۔'' اس نے بستر پر ایک طرف سرکتے ہوئے کہا۔ وہ نیم دراز حالت میں بھی شراب پی رہا تھا۔

ریما قدرے تذبذب کے ساتھ اٹھی۔ ''کیا سنانا چاہتے ہو؟''

''بیٹھو تو!'' ریما بستر کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

ابصار کے فون سے رابطہ ہو گیا تھا۔ زید نے اس سے کہا۔ ''آج جب تم سے دوسری شادی کی بات ہو رہی تھی تو میں نے کس لڑکی کا نام لیا تھا؟''

پھر اس نے جواب سنے بغیر موبائل ریما کے کان سے لگا دیا۔ دوسری طرف سے آتی ہوئی مدھم آواز زید نے بھی سنی۔

''ریما کی بات کی تھی تم نے!''

زید نے فوراً موبائل ریما کے کان سے ہٹا کر اپنے کان سے لگا لیا۔

''لیکن تمہیں مجھ سے یہ پوچھنے کا خیال کیوں آ گیا؟'' ابصار نے پوچھا تھا۔

''پھر کسی وقت بتاؤں گا۔'' زید نے کہا۔

''تمہاری بھاری آواز سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم نے دن میں ہی پینی شروع کر دی ہے۔''

اس وقت ریما نے بستر سے اٹھنا چاہا لیکن زید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

''ہاں، آج بہت منتشر ہوں۔'' زید نے کہا۔ ''تم نہیں آئے آج؟''

''دوپہر کو آ تو چکا ہوں۔ نیلم سے کچھ بات کرنی ہے۔ اس کی طرف آ رہا ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ کل دفتر آؤں گا تو ملاقات ہوگی۔'' زید نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ریما کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

''سن لیا تم نے؟'' زید نے اس سے پوچھا۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی زید...... میں تمہیں جھوٹا کیوں سمجھتی۔''

''میں تمہارا ہاتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔'' زید نے اس کا ہاتھ قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی بہت دلچسپی مجھے پامسٹری سے بھی ہے۔''

''تو بتاؤ مجھے کچھ!'' ریما نے اشتیاق سے پوچھا۔

''دیکھنے تو دو اچھی طرح۔''

ریما مستفسرانہ نظروں سے زید کی طرف دیکھتی رہی، کبھی اپنے ہاتھ پر بھی نظر ڈال لیتی تھی۔

''شادی کے تقریباً ایک سال بعد تمہاری زندگی میں کوئی خاص موڑ آئے گا۔''

''کیسا موڑ؟'' ریما نے پوچھا۔

''اتنی زیادہ پامسٹری نہیں جانتا۔'' زید نے اس کے ہاتھ پر نظریں جمائے جمائے پیگ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔

''اچھا اور کوئی بات؟'' ریما نے پوچھا۔ ''میری زندگی کتنی ہے؟''

''زندگی تو بہت ہے تمہاری۔ میرے بعد بھی زندہ رہوگی۔''

''یہ...... یہ تو...... نہیں ہونا چاہیے۔'' ریما کی آواز کانپ گئی۔

''ہوسکتا ہے میں سمجھنے میں غلطی کر رہا ہوں۔''

زید نے بستر پر آڑا ہو کر اپنا سر ریما کی گود میں رکھ دیا۔ ریما کچھ کسمسائی لیکن کچھ بولی نہیں۔ اس کا ہاتھ اب بھی زید کے ہاتھ میں تھا۔

''اور کوئی بات؟'' ریما نے پوچھا۔

''نہیں۔ کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اب بس اس لکیر پر غور کر رہا ہوں جو یہ بتا رہی ہے کہ شادی کے بعد تمہاری زندگی میں ایک موڑ آئے گا۔''

(بقیہ حصہ اگلے ماہ)